آپ سے کیا پردہ

خاتون کی ڈائری

مجھ سے ملیے

انٹرویو

مارچ 2021
جلد 48 شمارہ 11
قیمت 70 روپے

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

نفسیات

بیوٹی بکس

خط وکتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617 Fax: 92-21-32766872 0317 2266944
Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

خواتین مارچ کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

انسان کی سرشت بھی عجیب ہے۔ جب کسی سے محبت کرتا ہے تو اس کی خامیاں بھی اسے خوبیاں نظر آتی ہیں۔ اس کی بشری خامیوں کا ذکر بھی اسے ناگوار گزرتا ہے اور جب کسی سے نفرت کرتا ہے تو نفرت کی ساری حدیں پار کر کے وہ برائیاں بھی اس سے منسوب کر دیتا ہے جو اس میں پائی بھی نہیں جاتیں۔ اس کا وجود بھی گوارا نہیں ہوتا ہے۔

مہذب معاشروں میں اختلاف رائے کو ایک صحت مند عمل سمجھا جاتا ہے۔ وہاں کسی شخص کی سوچ اور اس کی رائے کی عزت کی جاتی ہے۔ اس کو تحفظ دیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں اختلاف رائے کو دشمنی بنا لیا جاتا ہے۔ بہت زیادہ رواداری اور دوسروں کے جذبات کا احترام تو پہلے بھی نہ تھا لیکن ایسی صورت حال بھی نہ تھی۔ اب تو اندھی محبت اور شدید نفرت کے جذبات وحشت و جنون کی شکل اختیار کر رہے ہیں۔ ہم دوسروں کے مؤقف کی عزت تو کیا کریں گے۔ ہم کسی کی بات سننے کو بھی تیار نہیں ہیں۔ دلیل کے بجائے گالی اور گولی کا استعمال کیا جاتا ہے۔

کسی معاشرے میں جب یہ کیفیت پیدا ہو جائے تو وہاں نہ اخلاقی اقدار سلامت رہتی ہیں، نہ انسانی جانوں کو تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے اردگرد یہی منظر نامہ تشکیل پا رہا ہے۔ حالیہ ضمنی انتخابات میں دو انسانی جانوں کے ضیاع کا المناک واقعہ اس کی مثال ہے۔

کچھ دن، کچھ تاریخیں قوموں کی تاریخ میں ہمیشہ روشن اور سنہری حرفوں میں لکھی جاتی ہیں۔ 23 مارچ سنہ ۱۹۴۰ء ایسی ہی تاریخ ہے۔ اس دن برصغیر کے مسلمانوں کے لیے امید کی کرن طلوع ہوئی۔ وہ نظریہ پیش کیا گیا جس کی بنا پر پاکستان معرض وجود میں آیا۔ ایک علیحدہ وطن۔ ہماری شناخت۔ ہمیں آزادی کی نعمت حاصل ہوئی۔ نعمت کی قدر نہ کرنا ناشکری ہے۔ اور ناشکری اللہ تعالیٰ کو شدید ناپسند ہے۔ اپنے پاک وطن کی قدر کریں۔ آپ کی نسلوں کی بقا اس سے وابستہ ہے۔

سالگرہ نمبر۔ سروے،

یوں تو مصنف کی تحریر اس کی سوچ کی آئینہ دار ہوتی ہے لیکن قاری کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ مصنف سے کچھ گفتگو کرے، کوئی سوال کرے۔ کوئی ملاقات کی صورت نکلے۔ لاکھوں کی تعداد میں قارئین کی اپنی پسندیدہ مصنفہ سے ملاقات ممکن نہیں۔ اس لیے ہم نے اس بار سالگرہ نمبر میں قارئین کو موقع دیا ہے کہ وہ اپنی پسندیدہ مصنفہ سے کوئی ایک سوال پوچھ سکیں۔

آپ اپنی پسندیدہ مصنفہ سے کوئی سوال پوچھنا چاہتی ہیں تو ہمیں لکھ کر بھجوا دیں۔ سالگرہ نمبر میں ہم مصنفین کے جواب شائع کریں گے۔

مصنفین سے درخواست،

مصنفین سے درخواست ہے کہ وہ اپنی تحریریں جلد از جلد بھجوا دیں تاکہ سالگرہ نمبر میں شامل ہو سکیں۔

اس شمارے میں،

- جزا و سزا۔ نگہت سیما کا مکمل ناول، • صلہ دعا پایا۔ فریدہ بتول کا مکمل ناول،
- راحت جبیں، عفت سحر طاہر اور نمرہ احمد کے ناول، • عطیہ خالد کا ناولٹ۔ ساگر کرم تم فرماؤ تو،
- سائرہ رضا، ثانیہ مرتضیٰ، وردہ بخاری اور قرۃ العین خرم ہاشمی کے افسانے، • باتیں دانا ماجد علی خان سے،
- آپ کی پسندیدہ مصنفہ جبیں جیمس سے ملاقات، • کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- ہمارے نام، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔
قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔
پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔
کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔
ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

توبہ واستغفار کا بیان

بخشش طلب کرنے کا حکم اور اس کی فضیلت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔
''آپ بخشش مانگیے اپنی لغزش کے لیے اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کے لیے۔'' (محمد 19)
نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔
''اللہ سے بخشش مانگیے بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا، نہایت مہربان ہے۔'' (النساء، 106)
اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔
''پس اپنے رب کی خوبیوں کے ساتھ اس کی پاکیزگی بیان کریں اور اس سے بخشش مانگیں، بلاشبہ وہ خوب توبہ قبول کرنے والا ہے۔'' (النصر۔3)
اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔
''پرہیزگار لوگوں کے لیے، ان کے رب کے پاس باغات ہیں (اللہ تعالیٰ کے اس قول تک) اور رات کے آخری پہر میں استغفار کرنے والے ہیں۔'' (آل عمران 15-18)
اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے۔
''جو شخص کسی برائی کا ارتکاب کرے یا اپنے نفس پر ظلم کرے، پھر اللہ سے بخشش طلب کرے تو وہ اللہ کو بہت بخشنے والا، نہایت مہربان پائے گا۔'' (النساء، 110)
نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔
''اور اللہ تعالیٰ تیری موجودگی میں ان کو عذاب دینے والا نہیں ہے اور (اسی طرح) اللہ ان کو عذاب نہیں دے گا جبکہ وہ بخشش مانگنے والے ہوں۔'' (الانفال۔33)
اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔
''اور وہ لوگ جب کسی برائی کا ارتکاب کر لیتے ہیں یا اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں۔ اور اللہ کے سوا کوئی گناہوں کو معاف کرنے والا نہیں اور وہ

اپنے کیے پر جانتے ہوئے اصرار نہیں کرتے۔" (آل عمران 135 اس موضوع پر کثیر آیات ہیں اور مشہور ہیں)۔

دن میں ستر بار

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

"میں دن میں ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار کرتا اور اس کی طرف توبہ کرتا ہوں۔" (بخاری)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر تم گناہ نہ کرو تو اللہ تمہیں ختم کر کے ایسے لوگ پیدا فرمائے گا جو گناہ کریں گے اور پھر اللہ سے استغفار کریں گے، تو اللہ ان کو معاف فرمائے گا۔" (مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ کو گناہ کا ارتکاب کرنا پسند ہے، بلکہ اس انداز بیان سے اصل مقصد توبہ و استغفار کی اہمیت کو واضح کرنا ہے کیونکہ گناہ تو ہر انسان سے ہوتا ہے، کوئی انسان گناہوں سے پاک یا محفوظ نہیں۔ لیکن اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو گناہ کر کے اس پر اڑتے نہیں ہیں، بلکہ توبہ و استغفار کا اہتمام کرتے ہیں اور اللہ کی بارگاہ میں گڑگڑاتے ہیں۔ توبہ و استغفار سے بندے کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم ہوتا ہے، اس لیے یہ بہت پسندیدہ عمل ہے۔

استغفار

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مجلس میں سو مرتبہ (یہ استغفار کہتے ہوئے) شمار کرتے

رَبِّ اغْفِرْلِي وَتُبْ عَلَيَّ إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ○

اغفرلی، وتب علی......

"اے اللہ! مجھے بخش دے، مجھ پر رجوع فرما، بے شک تو بہت رجوع فرمانے والا، نہایت مہربان ہے۔" (اسے ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ اور امام ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

فوائد و مسائل:

1۔ اس سے دعا کا ایک ادب یہ معلوم ہوا کہ دعا کے مطابق اللہ کے صفاتی نام استعمال کیے جائیں، جیسے توبہ استغفار میں اس کی صفت توابیت اور صفت غفوری و رحیمی کا اور دنیا کے معاملات میں اس کے جواد، کریم اور معطی وغیرہ ہونے کا ذکر کیا جائے۔

ہر غم سے نجات

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص استغفار کی پابندی کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے ہر تنگی سے نکلنے کا راستہ بنا دیتا اور ہر غم سے اسے نجات عطا کرتا ہے اور اسے ایسی جگہ سے روزی دیتا ہے جہاں سے اس کو گمان بھی نہیں ہوتا۔" (ابوداؤد)

سید الاستغفار

حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"بندے کا یہ کہنا سید الاستغفار (استغفار کا سردار) ہے۔

ترجمہ: اے اللہ! تو میرا رب ہے۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ تو نے ہی مجھے پیدا کیا اور میں تیرا

بندہ ہوں اور میں جہاں تک طاقت رکھتا ہوں تیرے عہد اور وعدے پر قائم ہوں اور میں اپنے کیے ہوئے عمل کے شر سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ میں ان نعمتوں کا اقرار کرتا ہوں جو تو نے مجھ پر کیں اور میں اپنے گناہوں کا بھی اعتراف کرتا ہوں۔ چنانچہ تو مجھے معاف کردے۔ بے شک تیرے سوا کوئی گناہوں کو معاف کرنے والا نہیں۔"

جو شخص یہ (کلمات استغفار) دن میں دل کے یقین کے ساتھ پڑھے اور شام ہونے سے پہلے اسے موت آجائے تو وہ جنتی ہے اور جو اسے یقین کے ساتھ رات کو پڑھے اور صبح ہونے سے پہلے اسے موت آجائے۔ تو وہ جنتی ہے۔" (بخاری)

فوائد و مسائل:

1۔ اس میں استغفار کے کچھ آداب بیان کیے گئے ہیں۔ مثلاً اللہ کی ذات و صفات پر کامل اعتماد و یقین۔ اللہ کی نعمتوں کا اقرار و اعتراف اور اس کے مقابلے میں اپنی کوتاہیوں کا اعتراف اور بارگاہ الٰہی میں عجز و نیاز کا اظہار وغیرہ۔ یہ دعا ان تمام باتوں کو جامع ہے، اس لیے اسے استغفار کا سید (سردار) قرار دیا گیا۔

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (سلام پھیر کر) اپنی نماز سے فارغ ہوتے تو تین مرتبہ استغفار فرماتے اور یہ دعا پڑھتے۔

"اے اللہ! تو سلام ہے اور سلامتی، تیری ہی طرف سے ملتی ہے۔ اے عزت و جلالت کے مالک! تو بڑی برکتوں والا ہے۔"

استغفار

حدیث کے راویوں میں سے ایک راوی امام اوزاعی سے پوچھا گیا آپ استغفار کیسے کرتے تھے۔ انہوں نے کہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے استغفر اللہ، استغفر اللہ "میں اللہ سے بخشش مانگتا ہوں۔ میں اللہ سے بخشش مانگتا ہوں۔" (مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ سلام پھیرنے کے فوراً بعد مذکورہ دعا پڑھنا مسنون عمل ہے۔ اس مسنون دعا کو چھوڑ کر لا الہ الا اللہ کا ورد یا صلوٰۃ و سلام وغیرہ پڑھنا اور وہ بھی باآواز بلند، سنت رسول ﷺ سے انحراف ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات سے قبل یہ کلمات کثرت سے پڑھتے تھے۔

سبحان اللہ وبحمدہ......"اے اللہ! میں تیری پاکیزگی بیان کرتا ہوں، تیری خوبیوں کے ساتھ۔ میں تجھ سے معافی کا طلب گار ہوں۔ اور تیری بارگاہ میں توبہ کرتا ہوں۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ ویسے تو ہر وقت اور ہر دم ہی توبہ استغفار کا اہتمام ضروری اور بہتر ہے لیکن زندگی کے آخری ایام میں تو بالخصوص اس کی بہت ضرورت ہے اور اس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل بھی ہو جاتا ہے۔

معافی

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔" "اے ابن آدم! جب تک تو مجھے پکارتا رہے گا۔ اور مجھ سے امید وابستہ رکھے گا تو تو جس حالت پر بھی ہوگا میں تجھے معاف کرتا رہوں گا اور میں کوئی پروا نہیں کروں گا۔

اے ابن آدم! اگر تیرے گناہ آسمان تک پہنچ جائیں، پھر تو مجھ سے معافی طلب کرے تو میں تجھے بخش دوں گا اور میں کوئی پروا نہیں کروں گا۔ اے ابن آدم! اگر تو زمین بھر گناہوں کے ساتھ میرے پاس آئے۔ پھر تو مجھے اس حال میں ملے کہ تو نے میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا ہو تو

میں بھی اتنی مغفرت کے ساتھ تجھے ملوں گا جس سے زمین بھر جائے۔" (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث حسن ہے۔)

فوائد و مسائل:

اس میں گناہ گاروں کے لیے خوش خبری ہے۔ لیکن کون سے گناہ گار؟ جو گناہوں پر اصرار نہیں کرتے اور سچے دل سے توبہ کر کے اللہ سے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں۔ گناہ کتنے بھی زیادہ ہوں۔ اللہ کی مغفرت و رحمت اس سے بھی زیادہ وسیع ہے، لیکن شرط وہی ہے جو قرآن نے بیان کی ہے، کہ وہ گناہ پر اصرار نہ کریں کیونکہ اصرار کے ساتھ توبہ و استغفار ایک بے معنی عمل ہے۔ جب انسان نے گناہ چھوڑا ہی نہیں ہے۔ بلکہ وہ مسلسل اس کا ارتکاب کر رہا ہے تو اس کی بابت اللہ سے یہ کہنا کہ یا اللہ مجھے معاف کر دے، ایک عجیب بات ہے، بلکہ اللہ سے مذاق ہے، اس لیے ان احادیث سے یہ سمجھ لینا کہ محض زبان سے استغفر اللہ پڑھ لینے سے ہر صغیرہ اور کبیرہ گناہ معاف ہو جائے گا۔ نادانی ہے کیونکہ استغفر اللہ پڑھنا تو توبہ نہیں ہے، صرف ایک درخواست اور دعا ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنے قانون کے مطابق رد یا قبول فرماتا ہے۔ جب کہ توبہ یہ ہے کہ انسان گناہ کے ارتکاب سے باز آ جائے، پھر اس پر بارگاہ الٰہی میں ندامت کا اظہار کرے اور دل میں یہ عزم رکھے کہ آئندہ اس گناہ کا ارتکاب نہیں کروں گا۔ اس قسم کی سچی توبہ اللہ تعالیٰ ضرور قبول فرماتا ہے اور کوئی اور مانع نہ ہو تو اس کی مغفرت یقینی ہے۔

صدقہ اور استغفار

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اے عورتوں کی جماعت! صدقہ کیا کرو اور کثرت سے استغفار کیا کرو، اس لیے کہ میں نے جہنم میں اکثریت عورتوں کی دیکھی ہے۔"

تو ان میں سے ایک عورت نے کہا۔ "اے اللہ کے رسول! ہم عورتوں کے زیادہ جہنمی ہونے کا سبب کیا ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا: "تم لعن طعن زیادہ کرتی ہو اور خاوند کی ناشکری کرتی ہو...... میں نے عقل اور دین میں ناقص ہونے کے باوجود تم عورتوں سے زیادہ عقل مند پر غالب آ جانے والا کوئی نہیں دیکھا۔"

اس نے پوچھا۔ "ہمارے اندر عقل اور دین کی کیا کمی ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "نقصان عقل تو یہ ہے کہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر ہے (پس یہ عقل کی کمی کی دلیل ہے) اور (مخصوص ایام میں) وہ نماز نہیں پڑھتیں (رمضان میں روزہ نہیں رکھتیں۔ یہ نقصان دین ہے)" (مسلم)

فوائد و مسائل:

اس حدیث میں عورت کی ایک فطری کمی، نقصان عقل، بیان کی گئی ہے یعنی مرد کے مقابلے میں اس کے اندر عقل کی کمی ہے۔ اسی کا لحاظ کرتے ہوئے شریعت نے عورت کی گواہی کو مرد کی گواہی کے مقابلے میں آدھا قرار دیا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے عورت مرد کے مقابلے میں جسمانی اعتبار سے کمزور اور نازک ہے اور اسی جسمانی نزاکت کے پیش نظر شریعت اسلامیہ نے اسے کسب معاش کی ذمہ داریوں سے فارغ رکھا ہے، کیونکہ اس کے لیے اسے گھر سے باہر نکل کر جدوجہد کرنی پڑتی جو اس کی جسمانی نزاکت اور دیگر مقاصد شریعت کے خلاف بات تھی۔ مغرب میں، جو مساوات مرد و زن کا سب سے بڑا علم بردار ہے۔ سو سالہ جدوجہد کے بعد بھی عورت مرد کے مساوی درجے پر فائز نہیں ہو گی۔ وہاں آج بھی تمام کلیدی عہدوں پر مردوں ہی کا قبضہ ہے۔ ان کی تمام اہم ملکی و بین الاقوامی پالیسیاں مرد

ہی بناتے ہیں اور ان کے تمام ضروری معاملات میں مردوں ہی کا مکمل دخل ہے۔

2۔ اس لیے اس کی عزت اسی میں ہے کہ اسلام نے اس کی فطری کمزوری کے پیش نظر اس کا جو دائرہ عمل تجویز کیا ہے، وہ اسے قبول کرے اور اپنی سرگرمیوں کا دائرہ اسی فطری حد کے اندر محدود رکھے۔ اس سے تجاوز کرکے وہ اپنے نسوانی عظمت و وقار سے بھی محروم ہو جائے گی جیسا کہ آج مغرب کی عورت محروم ہو چکی ہے۔

3۔ عورتوں کو کثرت سے استغفار اور صدقہ کرنے کے علاوہ، خاوندوں کی ناشکری اور غیبت و بدگوئی اور لعن طعن سے بھی اجتناب کرنا چاہیے۔ تاکہ وہ جہنم کا ایندھن بننے سے بچ جائیں۔

دل اور اعمال

حضرت ابوہریرہ عبدالرحمن بن صخر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''اللہ تعالیٰ تمہارے جسموں اور تمہاری صورتوں کو نہیں دیکھتا بلکہ وہ تمہارے دلوں اور عملوں کو دیکھتا ہے۔'' (مسلم)

فائدہ:

1۔ اس حدیث سے بھی اخلاص اور صحیح نیت کی اہمیت واضح ہے، اس لیے ہر نیک عمل میں اس کا اہتمام ضروری ہے اور دل کو ہر اس چیز سے صاف رکھنا چاہیے۔ جس سے وہ عمل برباد ہو سکتا ہے، جیسے ریاکاری اور نمود و نمائش کا جذبہ یا دنیا کا لالچ یا اسی قسم کے اور گھٹیا مفادات، تاہم دلوں کا حال چونکہ صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، اس لیے اعمال کی اصل حقیقت قیامت والے دن ہی واضح ہوگی جب کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے اچھا یا برا بدلہ ملے گا۔ دنیا میں انسان کے ساتھ اس کے ظاہری اعمال کے مطابق ہی معاملہ کیا جائے گا اور اس کی باطنی کیفیت کو اللہ کے سپرد کر دیا جائے گا۔

نیک بیوی

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے۔

''مومن کو اللہ کے تقویٰ کے بعد نیک بیوی سے بہتر کوئی چیز نہیں مل سکتی۔ (ایسی بیوی کہ) جب وہ اسے کوئی حکم دے تو وہ اس کی تعمیل کرے، جب اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے تو اسے خوش کر دے، اگر اسے کوئی قسم دے تو وہ قسم پوری کر دے، اگر وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو'' (سفر وغیرہ میں چلا جائے) تو اپنی ذات کے بارے میں اور اس کے مال کے بارے میں اس سے مخلص رہے۔ (خیانت نہ کرے۔)

دین والی عورت سے نکاح کرنا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

1۔ ''عورتوں سے چار چیزوں کی وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے (کسی سے) اس کے مال کی وجہ سے (کسی سے) اس کے حسب و نسب کی وجہ سے (کسی سے) اس کے حسن و جمال کی وجہ سے (کسی سے) اس کی دین داری (اور نیکی) کی وجہ سے۔ تو دین دار عورت (کے حصول میں) کامیاب ہو جا۔ تیرا بھلا ہو۔''

فوائد و مسائل:

1۔ نکاح کا تعلق زندگی بھر کے لیے ہوتا ہے، اس لیے زندگی کا ساتھی تلاش کرنے میں کوشش کی جاتی ہے کہ وہ ایسا فرد ہو جس کے ساتھ زندگی خوش گوار ہو جائے۔

ایک دن اردو کے طالب علموں کے ساتھ

انشا جی

جب ہم چین گئے تو چینی زبان سے بالکل کورے تھے، لیکن ہمت کرے انسان تو کیا نہیں ہو سکتا۔ سترہ اٹھارہ دن بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ دو لفظ نہایت روانی سے بولنے لگے۔ ایک نی ہاؤ (مزاج شریف) دوسرا چائی چن (یعنی اچھا پھر ملیں گے)۔ سو مہمان کو یہی دو لفظ آنے چاہئیں، باقی گفتگو کے لیے ترجمان موجود ہیں۔ ہاں یاد آیا۔ ایک اور لفظ بھی ہم برجستہ اور باموقع بول کر چینیوں کو حیران کرتے تھے، وہ ہے شے شے (یعنی شکریہ) بعضوں نے پوچھا بھی کہ آپ نے اتنی جلدی اتنی چینی زبان کیسے سیکھ لی۔

چند دن بعد ہم جاپان گئے تو جاپانی زبان میں بھی اسی طرح مہارت حاصل کرنے کا عزم کیا۔ کیونکہ ہم کو لسانیات سے ہمیشہ شغف رہا ہے۔ افسوس کہ وہاں ہمارا قیام مختصر تھا یعنی کل آٹھ دن۔ اس کے باوجود ہم جاپانی زبان میں شکریہ ادا کرنے پر قادر ہو گئے۔ یعنی "آری گاتو گزائی مش" کا لفظ اہل زبان کی طرح بولتے تھے۔ اگر کچھ فرق تلفظ میں تھا بھی تو تھوڑا سا جھک کر سینے پر ہاتھ رکھنے سے سننے والا جان لیتا تھا کہ ہم اظہار ممنونیت کر رہے ہیں۔ ایسے بھی اعتراض کرنے والے موجود ہیں۔ جنہوں نے کہا کہ واہ ایک ہفتے میں ایک لفظ جان لینا کیا کمال ہے۔ ہمارے قارئین انصاف سے کہیں، ان میں سے کتنوں کو معلوم تھا "آری گاتو گزائی مش کا"؟ ہمیں یقین ہے کہ ہم چند ماہ اور وہاں رہتے تو ان ہی کی زبان میں صاحب سلامت کرنے لگتے۔

ہاں تو چین میں ایسا بھی ہوا کہ ترجمان پاس نہ تھا پھر بھی ہم کو کبھی چینیوں سے مکالمت میں دقت نہ ہوئی۔ ہم نی ہاؤ، شے شے، شے شے کرتے جاتے حتیٰ کہ اس کی بات ختم ہو جاتی اور ہم چائی چن چائی چن کہہ کر رخصت ہو جاتے۔ ممکن ہے ہم چینی زبان میں مزید لیاقت بھی پیدا کرنے کی کوشش کرتے بلکہ اب یاد آتا ہے کہ ہم گرم پانی بھی چینی زبان ہی میں طلب کرتے تھے اور کے سوائے کہتے تھے لیکن ڈاکٹر عالیہ امام کی مثال کو دیکھ کر ہم نے تحصیل السنہ کا ارادہ ترک کر دیا۔ وہ وہاں کئی ماہ سے ہیں۔ پیکنگ ریڈیو پر کام کرتی ہیں۔ ایک روز تشریف لائیں تو ہم نے کہا۔

"آپ کے لیے چائے کا بندوبست کریں؟"

فرمایا۔ "کرو۔"

ہم نے کہا۔ "مشکل یہ ہے کہ ہم اردو میں کر سکتے ہیں یا حد سے حد انگریزی میں۔ بیرا ہم بلائے دیتے ہیں۔ گفتگو آپ کیجیے گا۔"

بیرا آیا۔ بیگم عالیہ امام نے اپنے لکھنوی لہجے میں بہت کچھ کہا۔ اتنا یاد ہے کہ بیچ کے مرکبات تھے۔ بیرا اکثر اسر ہلاتا رہا اور ہم نے ازراہ تحسین عالیہ امام صاحبہ کو دیکھا بلکہ کہا بھی کہ آپ نے ایسی قابل رشک مہارت کیسے پیدا کی؟

انہوں نے بتایا کہ..... "آدمی ذہین ہو تو چینی زبان مشکل نہیں۔" چونکہ ہم یہ شرط پوری نہ کر سکتے تھے لہٰذا کچھ دل گیر اور مایوس ہو گئے لیکن اتنے میں بیرا آ گیا۔ دیکھا کہ وہ قد آدم گلاس دودھ کے ہیں۔

بیگم عالیہ بیرے پر بہت خفا ہوئیں کہ تم اتنی چینی زبان بھی نہیں سمجھتے کہ..... "میں کہوں چائے تو چائے لے آؤ۔" لیکن وہ بس کھڑا ہاتھ ملتا رہا۔ دل میں ضرور شرمندہ ہوا ہوگا۔

اردو کے مشہور ادیب خاطر غزنوی بھی وہاں ہیں اور ان کا کام ہی تحصیل زبان ہے تاکہ واپس آ کر یہاں چینی زبان سکھائیں۔ ہم نے دیکھا کہ وہ ٹیکسی والے کو سمجھا لیتے ہیں کہ کدھر چلنا ہے۔ بولے دو ڈھائی سو لفظ سیکھ گیا ہوں۔ پانچ ہزار لفظ سیکھ کر اخبار پڑھا جا سکتا ہے۔

ہم نے کہا۔ "کتنے دن لگیں گے۔"

بولے۔ "بشرط حیات چند برس اور......"

ہم نے کہا۔ "خیر یہ رہا اخبار، کچھ تو پڑھو۔"

کافی دیر کوشش کے بعد انہوں نے کئی لفظوں پر انگلی رکھی کہ یہ آتے ہیں فی الحال......

خیر قطرہ قطرہ بہم شود دریا۔

پھر ایک روز ہم نے سوچا کہ دیکھیں چینی لوگ اردو سیکھتے ہیں تو کیسی سیکھتے ہیں۔ اگر چینیوں کو اپنی زبان کے مشکل اور پیچیدہ ہونے پر ناز ہے تو ہم کو بھی ہے۔ خیر ایک روز بندوبست ہوا اور ہم لوگ پیکنگ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں جا نکلے۔

پہلے تو ایک بیٹھک میں وائس چانسلر صاحب نے ہمیں شرف ملاقات بخشا۔ پھر تعارف کراتے کراتے کہا۔

"یہ ہیں مادام شان یون، یہاں اردو پڑھاتی ہیں۔"

ہم نے کہا۔ "آئیے بیگم صاحبہ! ہمارے پاس آجائیے۔" وہ مسکراتی ہوئی اٹھ کر آ گئیں اور بولیں۔

"آپ ابن انشاء صاحب ہیں نا۔ آپ کی نظمیں ہم نے پڑھی ہیں۔ افکار ہمارے پاس آتا ہے، آپ کی کتاب ہماری لائبریری میں ہے۔"

چائے وائے پینے کے بعد ہم نے وہ کتابیں نذر کیں جو ہم یہاں سے لے گئے تھے اور مادام شان یون نے کہا۔ "آئیے آپ کو طالب علموں سے ملائیں۔"

پیکنگ یونیورسٹی ایک وسیع و عریض رقبے میں پھیلی ہوئی ہے۔ راستے میں مختلف شعبوں کی عمارتیں تھیں۔ ہر جگہ طالب علموں کے ٹھٹ تھے جو ہمیں دیکھ کر دو رویہ کھڑے ہو جاتے اور تالیوں سے استقبال کرتے۔ رسم یہ ہے کہ مہمان بھی جواباً تالی بجاتا ہے۔ چین کے قیام کے دنوں میں ہم کو ہر روز اتنی تالیاں بجانا پڑتی تھیں کہ رات کو آ کر ہاتھ آگ پر سینکتے تھے اور روغن کی مالش کرتے تھے۔

شعبہ اردو کے طالب علم ہمارے خیر مقدم کے لیے پہلے سے کھڑے تھے۔ ان میں آدھے لڑکے تھے، آدھی لڑکیاں۔ بڑے تپاک سے علیک سلیک ہوئی۔ بعض فر فر بولتے تھے، بعض اٹک اٹک کر۔

ہم نے کہا۔ "چلیے کلاس دیکھیں۔ لیکن طالب علم مصر تھے کہ پہلے ہم ان کی قیام گاہیں دیکھیں۔" وہاں دکھانے کی کوئی ایسی بات نہ تھی۔ بہت چھوٹے چھوٹے کمرے تھے اور ہر ایک میں ایک دو منزلہ چارپائی ایک کونے میں ایک میز اور کتابوں کے لیے ایک الماری۔ ایک طالب علم نیچے کی چارپائی پر سوتا تھا، دوسرا اوپر۔ سختا تھا۔ ویسے نرم گدے اور اجلی چادریں تھیں۔ ہم لوگ قریب قریب سب کے سب دو کمروں میں تقسیم ہو گئے۔ وہاں اتنی کرسیاں کہاں تھیں۔ بس چارپائیوں پر اور میز پر چڑھ بیٹھے۔ باقی باتیں تو فروعات تھیں۔ اردو کی محبت اور شوق اصل چیز تھی۔ اکثر لڑکے اور لڑکیاں فر فر بولتے تھے اور سب سے تعجب کی بات یہ تھی کہ کسی سے تذکیر و تانیث کی کوئی غلطی سنی نہ گئی۔ جیسی اندرون پاکستان ہم مختلف علاقوں کے لوگوں سے ضرور ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ دیکھا پتہ تھے۔ بعضوں کے نقشیات اور املا میں کوئی غلطی پیچ کی نہ تھی۔

ہم نے کہا۔ "پڑھتے کیا ہیں آپ لوگ؟" معلوم ہوا اچھی خاصی لائبریری اردو کتابوں کی ہے اور پھر اخبار جنگ آتا ہے۔ اس میں سے مضامین اور اداریے یا خبریں لے کر سائیکلو اسٹائل کرالی جاتی ہیں اور طالب علموں میں بانٹ دی جاتی ہیں۔ ہم نے دیکھا تو پہلا ہی سبق صدر ایوب کے دورہ چین پر تھا۔

لائبریری میں گئے تو واقعی نئے ادب کی بہت سی اچھی کتابیں موجود تھیں اور طالب علم ہمارے بعض ہم عصروں کا ذکر ان کی کہانیوں کے حوالے سے کرتے تھے۔ مادام نے کہا۔ "میں آپ کی نظم شنگھائی کا ترجمہ چینی میں کر رہی ہوں۔"

ہمارے وفد کے رکن جو اردو کے آدمی تھے۔ ان کی سرشاری کا بیان کرنا مشکل ہے۔ اتنی دور ایک مختلف تہذیب کے ملک میں اردو کے پودے کو پھولتے پھلتے دیکھنا واقعی ایک جذباتی تجربہ تھا۔

ہم نے مادام سے کہا کہ...... "ان طالب علموں کو ہم چائے کی دعوت دیتے ہیں، ان سب کو لائیے۔ وہاں اور باتیں ہوں گی۔ ہم ان کو کتابیں دیں گے اور واپس پاکستان جا کر کتابوں کی لین ڈوری باندھ دیں گے۔" یاد رہے کہ ایسے وعدے وفا نہیں ہوا کرتے۔

طالب علم تو پھر آئے اور ہمارے ساتھ چائے پی۔ ان کو کتابیں بھی ہم نے دیں لیکن مادام کسی وجہ سے تشریف نہ لا سکیں۔ تیس برس کی ہوں گی۔ بہت پسندیدہ اطوار کی اور سنجیدہ۔ ہم نے کہا کہ ہماری ڈائری میں اپنے دستخط دے دیجیے۔ انہوں نے یہ مہربانی کی کہ دستخطوں کے علاوہ ایک عبارت بھی لکھ دی۔ ان کا خط کم از کم ہمارے خط سے تو بہتر ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ طالب علموں نے اتنی مہارت فقط دو سال بلکہ کم میں حاصل کی تھی اور بیگم صاحبہ نے بھی اردو ایک چینی سے پڑھی ہے۔

باصلاحیت مصنفہ

جبیں چیمہ سے ملاقات

شاہین رشید

آج ہم آپ کی ملاقات جس شخصیت سے کرا رہے ہیں۔ ان کا نام ہے جبیں چیمہ بہت اچھی مصنفہ تو ہیں ہی، اس کے ساتھ ساتھ نہایت بااخلاق اور شگفتہ مزاج بھی ہیں۔ انکساری ان کے مزاج کا حصہ ہے۔ قدرت نے انہیں ہر طرح سے نوازا ہے۔ اس کے باوجود غرور و تکبر انہیں چھو کر نہیں گزرا بہت خوش گفتار ہیں جتنا اچھا لکھتی ہیں، اتنا ہی اچھا بولتی ہیں۔ جب بھی فون پر بات ہوئی۔ بات سے بات نکلتی گئی۔ وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ جبیں کی سب سے بڑی خوبی ان کی مثبت سوچ ہے۔ وہ لکھتے ہوئے مذہبی اور معاشرتی اقدار کو مدنظر رکھتی ہیں۔ خصوصاً دیہی زندگی پر بہت اچھا لکھتی ہیں۔ آیئے ملتے ہیں جبیں چیمہ سے۔

"کیسے مزاج ہیں؟"

"الحمد للہ......!"

"اپنے اور اپنے فیملی بیک گراؤنڈ کے بارے میں بتایئے......؟"

"جی......ضرور...... میرے والد چوہدری اسلم چیمہ ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہائش پذیر تھے۔ تحصیل وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ میں یہ گاؤں تھا۔ وہ اپنے علاقے کے پہلے گریجویٹ تھے اور اس مسجد کے معماروں میں شامل تھے جس کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا تھا۔

"کہ مسجد" تو بنادی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے

میرے والد اپنے علاقے کی جانی پہچانی شخصیت تھے۔ وہ اپنے علاقے کے دیگر زمین داروں سے بہت مختلف تھے۔ وہ ایک ایسے زمین دار تھے جن کا دل ایمان کی حرارت سے سرشار تھا...... تو اس گھرانے میں میری پیدائش ہوئی۔ میرے والد تحریک پاکستان کے سرگرم کارکن تھے۔ اس لیے دین اور ملت کی محبت میری گھٹی میں تھی۔

ہم پانچ بہن بھائی ہیں...... میرے بڑے بھائی جسٹس افتخار احمد چیمہ" جو ہائی کورٹ سے ریٹائرڈ ہوئے تو حامد ناصر چٹھہ کے مقابلے میں الیکشن لڑا اور 30 ہزار ووٹوں سے انہیں شکست دی وہ دس سال تک "ایم این اے" رہے۔ ان کے دو بیٹے ہیں عثمان اور رضوان۔

ان کے بعد میری بڑی بہن "باجی تسنیم" ہیں جو کہ بیرسٹر ہیں اور ان کی ایک ہی بیٹی ہے سلمٰی اور وہ بھی بیرسٹر ہے اور اس کے میاں بھی بیرسٹر ہیں۔ اور میری یہ بہا بھی اپنی ایک بیٹی اور بیٹے کے ساتھ لندن میں ہی رہائش پذیر ہے۔

تیسرا نمبر میرا ہے۔ میں نے اسی چھوٹے سے

گاؤں میں آنکھ کھولی جہاں میری شادی ہونے تک بجلی تک نہیں تھی۔ سڑکوں کا نام و نشان تک نہ تھا۔ شہر تک رسائی کا ذریعہ ریل گاڑی تھی۔ ہائی اسکول چونکہ وزیر آباد میں تھا تو میں چھٹی جماعت سے روزانہ ایک میل پیدل چل کر گاڑی لیتی...... اور واپسی پر بھی گاڑی جو گاؤں سے ایک میل دور 'منصور والی' اسٹیشن پر رکتی تھی وہاں سے پیدل گھر آتی...... گرمی ہو یا سردی یہ روز کا معمول تھا۔

کبھی کبھار ایسا ہوتا تھا کہ مجھے اسٹیشن تک چھوڑنے والی "مائی" پیچھے رہ جاتی تھی میرے بیگ سمیت اور میں ٹرین میں بیٹھ کر اسکول چلی جاتی تھی۔ اور وہاں کلاس ٹیچر ہوم ورک کی کاپی چیک کرنے کے لیے مجھ سے مانگتیں تو سب ہنسنے لگتے تھے کہ یہ خود تو آگئی ہے مگر بیگ نہیں لائی......

خیر میں میٹرک کے بعد لاہور کالج چلی گئی...... جہاں سے میں نے "بی اے" کیا ایم اے پولیٹیکل سائنس پنجاب یونیورسٹی سے کیا۔ اور پھر ایم اے کے فوراً بعد میری شادی ہو گئی۔

میرے میاں صاحب کا تعلق "پھرے والا" سے ہے جہاں ان کے والد کو کئی مربع زمین ملی تھی...... وہ سرگودھا کو چھوڑ کر وہیں آباد ہو گئے تھے...... یہ میرے بھائی جان کے دوست تھے۔ اور ان دنوں مانچسٹر یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کر رہے تھے جبکہ میرے بھائی لندن میں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

میرے میاں صاحب کا نام ڈاکٹر فیض احمد ہے...... میٹرک، ایف ایس سی، بی ایس آنرز اور ایم ایس سی میں گولڈ میڈلسٹ ہیں......

انہوں نے اندرون ملک اور بیرون ملک کی یونیورسٹیوں میں پڑھایا اور ان کے بہت سے پیپرز بھی شائع ہوئے۔ جن کی تعداد ہزاروں میں ہے۔

ہماری شادی 1977 میں ہوئی...... ان دنوں یہ قائد اعظم یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے۔ باہر سے پی

ایچ ڈی کر کے آئے تھے اور کافی ماڈرن خیالات کے تھے...... شادی کے چند ماہ کے بعد ہی ہم لیبیا کے شہر طرابلس چلے گئے...... وہاں ہم آٹھ سال رہے اور ہمارے تینوں بچے وہیں پیدا ہوئے۔

ہمارا بڑا بیٹا سعد احمد "فارن سروس" میں ہے۔ اور گزشتہ پانچ سال سے نیویارک میں "یو این او" میں بطور کونسلر فرائض انجام دے رہا ہے...... بہت قابل ہے ہمارا بیٹا! بہت محنتی اور لائق ہے۔ اس کے دو بیٹے "حسین" اور "مصطفیٰ" ہیں۔ اور ایک بیٹی "ایمن" ہے۔

سعد کے بعد "ملیحہ احمد" ہے جو ڈاکٹر ہے اور آج کل یونیورسٹی آف امریکہ سے "نیورولوجی" میں فیلو شپ کر رہی ہے۔ اس کے میاں وسیم سجاد کارڈیالوجسٹ ہیں اور بہت قابل ہیں۔ ان کی تین بیٹیاں ہیں۔ رانیہ وسیم، مومنہ وسیم، اور رحما وسیم...... ان بچوں میں ہماری جان ہے......

میری بیٹی کے بعد میرا لاڈلا بیٹا اسامہ احمد تھا جو کہ تیس سال کی عمر میں چترال میں ڈپٹی کمشنر کے عہدے پر تعینات تھا۔ تعیناتی سے کچھ ماہ پہلے ہم نے

اس کی شادی کی...... چترال کے ڈی سی ہاؤس میں
اس نے اپنی بیٹی "ماہ رخ" کی ولادت کی خبر سنی۔ یہ
واحد خوشی تھی جو اس نے اتنی مصروفیات میں سے
وقت نکال کر سنی۔

وہ چودہ ماہ وہاں ڈپٹی کمشنر رہا اور چودہ ماہ میں
اس نے چودہ سالوں والا کام کیا۔ دن کو دن اور رات
کو رات نہیں سمجھا۔ ٹوٹے پھوٹے راستوں پر چل کر

میں میتھس کے ٹیچر ہیں۔ میرے دونوں بیٹوں نے سی
ایس ایس کیا ہوا ہے۔ اور بیٹی ڈاکٹر ہے۔ تو جواب آیا
کہ "بھئی ہم نہ تو بڑے عہدوں کے رعب میں آتے
ہیں اور نہ ہی ڈگریوں کے رعب میں آتے ہیں......"
تو میں نے پوچھا۔ "کہ اگر کسی کے پاس عہدہ ہے تو
کیا وہ کسی کے پوچھنے پر بھی نہ بتائے کہ وہ کیا کرتا
ہے۔"

بروقت لوگوں کو مدد پہنچانے پر لوگ حیران رہ جاتے۔
اس نے چترال کے لوگوں کے دل میں ایسا گھر کیا کہ
وہ اسے اپنا محسن سمجھنے لگے۔ پھر ان ہی لوگوں کی فلاح
کے لیے کسی ایجنسی کے ساتھ ایک میٹنگ رکھی ہوئی
تھی اور اس میٹنگ کے لیے آتے ہوئے ہماری بہت
ہی پیاری بہو آمنہ اور میرے جگر کا ٹکڑا ماہ رخ سمیت
شہادت پائی "ایئر کریش" یہ وہ حادثہ ہے جس نے
ہماری زندگی سے زندگی نچوڑ لی۔ (پی آئی اے کا
حادثہ 2018 اس طیارے میں جنید جمشید بھی سفر
کر رہے تھے) جانے کیسے اب تک زندہ ہیں۔

میرے بعد میرے بھائی ڈاکٹر نثار احمد چیمہ
ہیں جو ڈی جی ہیلتھ کے عہدے سے ریٹائر ہوئے
اور آج کل ایم این اے ہیں۔ ان کی ایک بیٹی اور تین
بیٹے ہیں۔

اور میرا سب سے چھوٹا بھائی ذوالفقار احمد چیمہ
ہے جو آئی جی پولیس رہ چکا ہے ایکسپریس اخبار میں
بدھ کے دن کالم لکھتا ہے۔

اور...... ہاں مجھے ایک بات یاد آئی کہ جب میں
نے اسامہ کا رشتہ کرنا تھا تو کسی نے ایک بریگیڈیئر
صاحب کی بیٹی کا بتایا۔ میری ان سے فون پر بات
ہوئی تو انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کہاں کی
ہیں......؟ اور آپ کے بھائی کیا کرتے ہیں؟ تو میں
نے بتایا کہ میرے بڑے بھائی ہائی کورٹ کے جج
تھے، آج کل ایم این اے ہیں۔ دوسرے بھائی ڈی
جی ہیلتھ ہیں اور تیسرے بھائی آئی جی پولیس ہیں۔
میرے میاں پی ایچ ڈی ہیں اور NUST یونیورسٹی

بات کسی پر رعب ڈالنے کی نہیں۔ بلکہ ہمیں
زندگی کے اسٹیج پر جو کردار کرنے کے لیے دیے گئے
انہوں نے یہ وردیاں پہن رکھی تھیں۔ ورنہ جب گیا
سکندر دنیا سے تو دونوں ہاتھ خالی تھے۔ یہ تھا ہمارا
خاندانی بیک گراؤنڈ۔

میرے چھوٹے بھائی کی ساری زندگی انتہائی
کٹھن اور مصروف گزری۔ جس علاقے میں گئے
جرائم کو جڑ سے نکال پھینکا۔ ایسے میں اپنے لیے
وقت ہی نہیں ملا کہ کوئی آشیانہ بنتا جس میں رونق دنیا
کا کوئی سامان ہوتا۔ ہمارے والدین اسی حسرت میں
دنیا سے چلے گئے۔ میرا یہ بھائی قوم کا سرمایہ ہے۔ اللہ
اسے سلامت رکھے۔

"بہت تفصیل سے آپ نے بتایا۔ بہت اچھا
لگا۔ اب آئیے لکھنے کی طرف...... کب سے لکھنا
شروع کیا۔ کس عمر سے؟"

"مجھے بچپن سے ہی اردو لٹریچر سے بہت لگاؤ
تھا۔ چھٹی جماعت میں تھی تو اے آر خاتون اور نسیم
حجازی کو پڑھتی تھی بلکہ پڑھ چکی تھی۔ میری بڑی بہن
آمنہ میرے لیے لائبریری سے کتابیں منگوائی تھیں
میں ٹرین کے سفر میں یا ویٹنگ روم میں بیٹھ کر پڑھتی
رہتی تھی۔ اس کے علاوہ "ایم اسلم" کے ناول منگوائی
تھی جس میں لیڈی ہملٹن کے جمپر کا اکثر ذکر
ملتا ہے۔ "حور" اور "زیب النساء" میں ٹرین کے سفر
میں ہی پڑھ کر ختم کر دیا کرتی تھی۔ ان رسالوں میں
ایک رائٹر "کشور عمر" بہت خوب صورت لکھا کرتی
تھیں اور ان کی تحریروں میں کوئی نہ کوئی مقصد ضرور

پوشیدہ ہوتا تھا اور مجھے ایسی ہی بامقصد تحریریں پسند تھیں۔ رومانس والی تحریریں پسند نہیں تھیں۔ ذرا اور بڑی ہوئی تو رضیہ بٹ کو پڑھا۔ ان کے ناولوں پر فلمیں بھی بنیں۔ مگر وہ صرف عشق و محبت کے قصے تھے۔ کسی خاص مقصد کے تحت نہیں لکھے گئے تھے۔

وقت کے ساتھ ساتھ باقی ادیبوں کو بھی پڑھا جن میں خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، احمد ندیم قاسمی، اشفاق احمد، بانو قدسیہ سے لے کر عصمت چغتائی کو بھی پڑھا۔ منٹو اور بیدی اور کرشن چندر کو بھی پڑھا۔ مگر خود نہ ایسے افسانے لکھے اور اگر کچھ لکھا بھی تو آگے بھیجنے کی ہمت نہ ہوئی۔ ساتویں آٹھویں جماعت سے لکھنا شروع کیا لیکن کسی کو بتایا نہیں تھا کہ والدین کو بھی نہیں۔"

"پھر...... کب خیال آیا کہ لکھ کر چھپانا بھی چاہیے؟"

"ہاں مجھے یاد ہے کہ جب میں ایف اے میں تھی تو امتحان میں اردو کے پرچے میں 'آپ بیتی' لکھنے کو کہا گیا۔ میں نے ایک مظلوم لڑکی کی ایسی دردناک آپ بیتی لکھی کہ جس کی سوتیلی ماں اس کے سر پر ابلتا ہوا پانی ڈال دیتی ہے اور اس کے سر کی جلد کے ساتھ اس کے بال بھی اتر جاتے ہیں۔

تو مجھے یاد ہے کہ "مس زاہدہ" میرا پرچہ سینے سے لگائے ہمارے چاروں سیکشنوں میں گئیں اور وہاں آپ بیتی پڑھ کر سنائی...... میں تو امتحان دے کر اپنے گاؤں چلی گئی تھی۔ وہ مجھے ڈھونڈتی رہیں۔ جب میں ملی اور انہیں بتایا کہ یہ محض افسانہ تھا تو وہ ماننے کے لیے تیار ہی نہ تھیں...... اور یہی کہتی رہیں کہ "صبر کرنا ہی ٹھیک ہے۔"

خیر، جب میں ایم اے کی طالبہ تھی تو میں نے پہلا افسانہ لکھا اور خلاف معمول اسے میز پر ہی چھوڑ کر آگئی۔ تو میری دوست ڈاکٹر ام کلثوم جو کہ "پکار" میگزین کی ایڈیٹر تھیں انہوں نے میرا افسانہ اس میں چھاپ دیا...... (یہ طالبات کا رسالہ ہے اور آج بھی یہ رسالہ اسلامی جمعیت طالبات نکالتی ہیں) اس کے بعد جو کچھ بھی لکھا اپنے لیے ہی لکھا...... اور کبھی کہیں نہیں بھیجا...... آپ کا یہ سوال کہ کب چھپوانے کا خیال آیا۔ تو آج سے بیس اکیس سال پہلے ایک افسانہ لکھا اور "بتول" میگزین میں بھیجا۔ وہ شائع ہو گیا۔ اور پھر لکھنے کا سلسلہ چل نکلا۔"

"پہلا ناول...... رسپانس کیا ملا؟"

"عمراں لنگھیاں" میرا پہلا ناول تھا اور یہ ایک ایسی بچی کی کہانی ہے جو اپنے ایک شاطر استاد کی باتوں میں آکر گھر والوں سے چوری نکاح کر لیتی ہے۔ گھر والے چونکہ اس بات سے بے خبر ہوتے ہیں تو وہ اس کی شادی کی تاریخ مقرر کر دیتے ہیں اور وہ مہندی والے دن گھر سے بھاگ جاتی ہے۔ اس کے بعد اس کا دردناک انجام ہوتا ہے۔ یہ ناول میں نے نوعمر لڑکیوں کے لیے لکھا۔ اور اس کو چھپوانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس ناول کے چھپوانے میں میری دوست فرزانہ چیمہ کا بڑا ہاتھ ہے۔ یہ اس وقت چھپا جب میں اسامہ، اس کی بیوی اور بچی کے بعد ڈپریشن کی حالت میں امریکہ میں اپنے بیٹے اور بچی کے پاس

تھی اور وہیں مجھے اس ناول کی کاپیاں ملیں۔

اس کے بعد میں نے اپنے پیارے بیٹے "اسامہ" شہید کی یادداشتیں لکھیں۔ "اے میرے اسامہ" کے نام سے جو سراسر میرے ٹوٹے پھوٹے دل کے نوحے تھے۔ جو ہر وقت اس کے لیے تڑپتا تھا اور سارا وقت میری آنکھوں میں اس کی یاد میں آنسو بہتے رہتے تھے۔ اس کتاب کو جس جس نے پڑھا وہ روئے بنا نہیں رہا۔ حتیٰ کہ جب میں نے یہ کتاب "اصل" کو بھیجی تو اس نے مدت تک اسے ہاتھ نہیں لگایا۔ اسے اتنا دکھ تھا۔

میری تیسری کتاب "دوام زندگی" ہے، یہ میرے افسانوں کا مجموعہ ہے جو میں نے 2000 سے 2018 تک کے درمیان لکھے تھے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے خواتین ڈائجسٹ میں ایک افسانہ لکھا۔ "ایک تھی ریشم" وہ شائع ہو گیا۔ تو پھر میں نے میری آپا لکھا اور پھر ایک ناولٹ "بے لوث خاری" لکھا۔

"آپ نے خواتین ڈائجسٹ اور شعاع میں بہت کم لکھا۔ کیوں؟"

"اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ میں "رومانس" نہیں لکھ سکتی۔ دیگر رائٹرز کی جو تحریریں چھپتی ہیں وہ بڑی زبردست ہوتی ہیں۔ ڈائیلاگ بھی ہوتے ہیں اور بہت اچھے ہوتے ہیں، مگر کیا کروں کہ میری فکر میری سوچ، امت مسلمہ سے ہٹتی ہی نہیں ہے، خاص طور پر 9/11 کے بعد مسلمانوں پر جو گزری، خواہ وہ افغانستان ہو شام ہو، عراق ہو، یمن ہو یا لیبیا۔ مجھے ان عورتوں اور بچوں کی تکلیفوں، مظالم اور سخت دل مسلمانوں کی بے حسی اور چشم پوشی آٹھ آٹھ آنسو رلاتی ہے۔ میں نے کئی سال تک ان پر لکھا۔"

"آج کل کس میگزین میں زیادہ لکھ رہی ہیں۔ اور آئیڈیاز کہاں سے لیتی ہیں؟"

"آج کل "عفت" میگزین میں "مثالی ماں" کے عنوان سے میری کہانیاں مسلسل شائع ہو رہی ہیں۔ اور آئیڈیاز کہاں سے آتے ہیں تو اخبار کی کوئی چھوٹی سی خبر، کوئی واقعہ، کسی سے سنی ہوئی کوئی بات ...... دل کو لگ جاتی ہے تو تخلیق کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اور آئیڈیا کسی بھی وقت آسکتا ہے۔ اس کے لیے کوئی وقت یا کوئی جگہ مخصوص نہیں ہے۔ اور جب آئیڈیا آتا ہے تو چند دن اس پر سوچ بچار کرتی ہوں اور پھر لکھنا شروع کرتی ہوں...... اور جو آئیڈیا ذہن میں آتا ہے تو پھر ماحول، کرداروں کے اور اس جگہ کے کچر کو ذہن میں رکھ کر لکھنا شروع کرتی ہوں تو پھر لکھتی ہی چلی جاتی ہوں۔"

"کوئی ایسی کہانی جس کے لیے آپ کا خیال تھا کہ بہت ہٹ ہوگی مگر نہیں ہوئی۔ اور عام سی کہانی ہٹ ہوگئی؟"

"جی میرا خیال تھا کہ میرا ناول "میزان عدل" بہت ہٹ ہوگا۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ شہری حلقوں کی طرف سے اسے وہ پذیرائی نہ ملی جس کی میں توقع کر رہی تھی۔ جبکہ میرا ایک افسانہ "مفلس قوم" جو میں نے بیٹھے بیٹھے ایک ہی نشست میں لکھ دیا، وہ بہت پسند کیا گیا۔"

"آپ نے بتایا تھا کہ آپ کے گھر والوں کو اب پتا چلا ہے کہ آپ لکھتی ہیں تو ہمارے قارئین کو بھی بتائیے؟"

"میں ساتویں آٹھویں جماعت سے لکھ رہی ہوں اور کسی کو نہیں بتایا تھا والدین کو تو پتا ہی نہیں تھا کہ میں لکھ بھی سکتی ہوں کیونکہ میں اپنی تحریریں چھپا کر رکھتی تھی اور بھائیوں کو بھی ابھی چند سال پہلے ہی پتا چلا ہے کہ میں لکھ بھی سکتی ہوں۔ اور میں آپ کو ایک واقعہ سناتی ہوں کہ جب میری کتاب "عمراں لنگھیاں" شائع ہوئی تھی اور وہ پبلشر نے یہ کتاب میرے تینوں بھائیوں کو بھجوادی۔ میرے بڑے بھائی افتخار احمد چیمہ باہر اپنی حویلی میں بیٹھے تھے کہ انہیں کسی نے یہ کتاب پکڑائی۔ انہوں نے بھیجنے والے کا نام دیکھا اور بیٹھے بیٹھے پوری کتاب پڑھ لی۔ موجودہ دور میں وہ بھی بچیوں کو بے راہ روی کا شکار ہوتے دیکھ رہے تھے۔ اس لیے انہیں یہ کتاب بے حد

پسند آئی۔ انہوں نے میرے درمیان والے بھائی کو بتایا کہ سلیم منصور خالد (پبلشر) نے بچوں کے بارے میں بہت اچھی کتاب لکھی ہے تو بھائی نے ہنستے ہوئے کتاب سامنے رکھی اور کہا یہ "تو باجی جیمی نے لکھی ہے" تو وہ بہت حیران ہوئے۔

اسی طرح میں نے چند دن پہلے اپنے ماموں زاد بھائی ڈاکٹر آفتاب احمد چیمہ کو "دوام زندگی" پڑھنے کے لیے دی تھی تو ان کا فون آیا کہ آپ کسی بھی ہیں؟ وہ بہت حیران ہوئے...... میرے میاں اور بچوں نے کبھی بھی میری تحریروں کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ لیکن اسامہ کے بعد وہ کہتے ہیں کہ "چلو امی کسی کام میں مصروف تو ہیں" ورنہ کہتے تھے کہ امی اب بس بھی کر دیں "عمراں لنگھیاں" تک گئے یہ ناول پڑھتے پڑھتے اور یہ ختم ہی نہیں ہو رہا۔

اب تو میاں صاحب بھی ہر تحریر کو سراہنے لگے ہیں اور "بڑی آپا" کا تو آئیڈیا ہی انہوں نے دیا تھا۔ میری کتاب دوام زندگی کے بارے میں چھوٹے بھائی نے ایکسپریس اخبار میں کالم بھی لکھا۔ اب میرے بچے میری تحریروں پر تنقید نہیں کرتے۔ پہلے سعد میرے پاس بیٹھ جاتا تھا میری کہانی کے پرخچے اڑانے۔ اب اسامہ کے بعد سب بہت سنجیدہ ہو گئے ہیں۔ رونق میلہ زندگی سے ختم ہو گیا ہے۔"

"رائٹرز میں کس کا انداز تحریر آپ کو پسند آیا؟"

"مجھے ساجدہ حبیب کے انداز تحریر نے بہت متاثر کیا تھا اور کیا ہے...... اب انہوں نے لکھنا چھوڑ دیا ہے۔ میں ان کے طرز تحریر سے متاثر ضرور تھی مگر ان جیسا لکھ نہیں سکی کیونکہ کسی کو کاپی کرنا بہت مشکل ہے۔ میرا اپنا ہی انداز ہے۔"

"رومانس کے بغیر نا صرف زندگی نامکمل ہے بلکہ تحریر بھی...... آپ کہتی ہیں کہ میں رومانس لکھ نہیں سکتی۔ وجہ؟"

"میرے خیال میں پیار کے مختلف انداز ہیں...... ماں اور بچے کا پیار...... دنیا کا سب سے انوکھا اور بے لوث پیار ہے۔ ایک پیار باپ اور بچے کا ہوتا ہے جس میں باپ بیٹوں سے زیادہ بیٹیوں سے پیار کرتا ہے اور جب میں باپ بیٹی کے پیار کے بارے میں لکھتی ہوں تو میری نظروں کے سامنے میرے والد ہوتے ہیں، اور ایک رومانس ہے میاں بیوی کا جس کے سر پر یہ معاشرہ قائم ہے اور میرے خیال میں سب سے خوب صورت اور سچا اور کھرا رومانس میاں بیوی کا ہے...... اور جب میں میاں بیوی کے رومانس کے بارے میں لکھتی ہوں تو آسانی سے لکھ لیتی ہوں کیونکہ میں نہ خود اور نہ ہی اپنے قاری کو کسی کے بیڈروم میں لے جاتی ہوں اس لیے کہ مجھے پتا ہے کہ بحیثیت ایک مسلمان اور ادیب میری حدود کیا ہیں...... کن باتوں کو بیان کرنے سے روکا گیا ہے اور کن باتوں کو میں کھول کھول کر بیان کر سکتی ہوں۔

مجھے اپنی کہانیوں میں میاں بیوی کا پیار دکھاتے ہوئے بے انتہا خوشی ہوتی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ کن باتوں سے شیطان جلتا ہے اور کن باتوں سے "رحمٰن" خوش ہوتا ہے۔ نچلے درجے کا رومانس تو جوان لڑکے اور لڑکی کا ہوتا ہے۔ جس کو رحمٰن ناپسند اور شیطان پسند کرتا ہے۔ رحمٰن کا حکم ہے کہ کسی کو پسند کرتے ہو تو سیدھے سیدھے شادی کا پیغام دے دو اور شادی کر لو...... جبکہ شیطان کہتا ہے کہ شادی میں کیا پڑا ہے، ذمہ داریاں، بچے...... اصل مزا تو شادی کے بغیر ہے۔ فکر نہ فاقہ۔ ہاتھوں میں ہاتھ لیے نہروں کے کنارے بیٹھے رہو۔ عورتیں تعریفوں سے بہت جلد بے وقوف بن جاتی ہیں۔ میں اس تھرڈ کلاس رومانس پر یقین نہیں رکھتی۔ اگر کبھی لکھوں بھی تو عورت کو عبرت کا نشان بنا دیتی ہوں۔

"آپ اتنا لکھتی ہیں...... کبھی معاوضہ ملا؟"

"الحمدللہ۔ میں نے ایک لفظ بھی معاوضے کے لیے نہیں لکھا۔ بلکہ جو کچھ لکھا وہ اللہ کے ہاں سے معاوضے کی امید پر لکھا۔ ڈراموں اور فلموں کے لیے نہیں لکھا بلکہ مجھے ان سب رائٹرز پر افسوس ہوتا ہے کہ جن کے ہاتھ میں قلم ہے اور وہ امت مسلمہ جو کہ ناک

حالت سے گزر رہی ہے اس کے بارے میں نہیں لکھتیں۔" عام سے ڈرامے لکھ رہی ہیں۔ مجھے میری تحریر کا پہلا معاوضہ "آنچل" نے بھجوایا۔ منی آرڈر آیا اور میاں صاحب کو دکھایا اور کہا کہ ہم بھی کماؤ ہو گئے ہیں۔ انہوں نے اتنے ہی پیسے اور پکڑائے اور کہا کہ جاؤ اپنے لیے کچھ لے آؤ۔ کبھی کبھی لگتا ہے کہ جیسے میں اپنے لیے لکھتی ہوں اور کبھی کبھی لگتا ہے کہ اپنی دوستوں کے لیے لکھتی ہوں...... دوستوں کی چہکتی آوازیں مجھے بتاتی ہیں کہ میں نے کیسا لکھا تو دل بہت خوش ہوتا ہے۔"

"ٹی وی ڈراموں کی طرف کیوں نہیں آئیں آپ؟ اور بیٹے کے بارے میں لکھی گئی کتاب کو ڈرامائی تشکیل دینے کا خیال نہیں آیا؟"

"بیٹے کے لیے لکھی گئی کتاب میری ذاتی چیز ہے اور میں نہیں چاہتی کہ اس پر ڈرامے بنیں نہ ہی فلمیں۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے بہت نوازا ہے۔ چترال میں جو پارک اسامہ نے بنوایا تھا، وہ اسی کے نام ہے۔ اسامہ کے نام پر ایک اکیڈمی ہے۔ بحریہ کی جو کہ کافی بڑی ہے۔ ایک سرکاری زمین دی ہے کہ اس پر اسامہ کے نام کی بلڈنگ بنے گی۔ پشاور میں چارسدہ روڈ پر ایک بہت بڑا برج ہے، وہ اسامہ کے نام پر کردیا ہے۔ ایبٹ آباد کے ایک چوک کا نام اسامہ رکھ دیا گیا ہے۔ اس کے نام پر کافی کچھ سرکار نے دیا ہے۔

اسی طرح پی آئی اے نے بھی ہمیں کافی پیسے دیے ہیں۔ جو پیسے ہمیں اس کے ملے ہیں، اس کے لیے ہماری خواہش ہے کہ حکومت ہمیں ایسی جگہ دے جہاں ہم اس کے نام کا کلینک بنادیں۔

اب آئیں ڈراموں کی طرف تو میں نہیں چاہتی کہ میری کسی بھی تحریر پر کوئی ڈرامہ بنے کیونکہ پڑھنے اور دیکھنے میں فرق ہوتا ہے اور میں کافی پرانے خیالات کی ہوں...... اور اسلام سے ہٹ کر مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ نہ پیسہ، نہ شہرت...... کیونکہ ڈراموں میں جس طرح کا ماحول، لباس اور حرکات و سکنات دکھائی جاتی ہیں۔ وہ مجھے گوارا نہیں۔ اس لیے کہ حساب کتاب جب اللہ تعالیٰ کے یہاں ہوگا تو پوچھ گچھ تو سب کی ہوگی...... میرا اعمال نامہ پہلے ہی بوجھل ہے، اسے مزید بوجھل نہیں کرنا چاہتی۔"

"آپ کے لکھنے کا بہترین وقت کون سا ہے؟"

"بہترین وقت وہ ہوتا ہے جب میں اکیلی ہوتی ہوں، سردی ہو یا گرمی...... لاؤنج میں ہیٹر کے آگے قالین پر چادر بچھا کر اس پر جائے نماز بھی رکھتی ہے۔ سردی ہو تو ہیٹر چلالیتی ہوں، گرمی میں پنکھا...... کبھی کبھار ٹیرس میں ہم میاں بیوی نہایت خاموشی کے ساتھ اپنا اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔"

"آپ نے گاؤں میں جنم لیا...... یاد تو آتا ہوگا؟"

"بالکل یاد ہے۔ ہمارا گاؤں ندی کنارے تھا۔ جیسے دیگر گاؤں ہوتے ہیں، گھر سے چند منٹوں کے فاصلے پر ہمارا کینوؤں کا باغ تھا اور میں نے اور میرے چھوٹے بھائیوں نے زندگی کے ابتدائی سال اسی باغ میں بھاگتے دوڑتے گزارے۔ ٹیوب ویل کی مخصوص آواز، ٹالیوں کے گھنے درخت...... سردیوں میں پرالی کے ڈھیر پر دھوپ میں بیٹھ کے گنے چوسنا اور دھان کی پکی فصل جیسے سارے کھیت سونے کے ہوں۔ مجھے ہریالی، بادل اور بارش بہت پسند ہیں۔ میں چاندنی راتوں، درختوں پھولوں اور پہاڑوں میں مدتوں رہ سکتی ہوں مگر اب ان پہاڑوں میں جانے کو میرا دل نہیں چاہتا کہ ان پہاڑوں میں میرا اسامہ کہیں کھو گیا ہے۔"

"فارغ اوقات میں کیا کرتی ہیں اور آپ مزاج کی کیسی ہیں؟"

"آج کل تو فارغ اوقات کو ترس گئی ہوں۔ بہت سی چیزیں مکمل ہونے کے لیے پڑی ہیں۔ گھر کی صفائی ستھرائی کراتے کراتے گیارہ بج جاتے ہیں۔ اگر تو کھانا پکنے والا ہو تو جلدی سے وہ چڑھا دیتی ہوں اور جس دن کھانا پکا ہوا ہو اس دن عیش ہوتے ہیں۔ پھر میں جلدی سے کاغذ قلم، پانی کا گلاس اور ٹیلی فون سنبھال کے اوپر ٹیرس کا رخ کرتی ہوں۔ اللہ کا حکم ہوتا ہے تو کچھ لکھ لیتی

ہوں، ورنہ دور سڑک پر بھاگتی دوڑتی گاڑیوں کو دیکھتی رہتی ہوں جو زندگی کا پتا دیتی ہیں۔ یا پھر نیلے آسمان پر اڑتے ہوئے پرندے دیکھتی رہتی ہوں...... اور کسی نہ کسی سوچ میں کھوئی رہتی ہوں۔

ظہر کی اذان کے ساتھ ہی ٹیرس سے اتر کر کھانا ٹیبل پر لگاتی ہوں اور ہم میاں بیوی کھانا کھاتے ہیں۔ کھانے سے قبل ظہر کی نماز کی ادائیگی کرتی ہوں اور ہم میاں بیوی کھانے سے فارغ ہو کر یا تو دھوپ میں بیٹھ جاتے ہیں یا پھر اپنی مخصوص جگہ پر ہیٹر کے سامنے بیٹھ کر کچھ نہ کچھ پڑھتی رہتی ہوں۔ میاں صاحب اپنی اسٹڈی میں پڑھائی لکھائی میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ وہ ایک مخصوص وقت پر چائے پینے کے عادی ہیں اور اکثر خود ہی بنا لیتے ہیں۔

سردیوں میں تو ظہر، عصر اور مغرب ایسے ہوتے ہیں جیسے کسی دوڑ میں حصہ لیا ہو۔ رات کو عشا کی نماز کے بعد جلدی سونے کی عادی ہوں۔ اللہ مہربان ہو تو نیند جلدی آجاتی ہے، ورنہ جانے والے کی یاد میں آنسو بہاتی رہتی ہوں۔ صبح فجر کی اذان سے پہلے ہی ہم دونوں اٹھ جاتے ہیں۔

آپ نے پوچھا کہ میرا مزاج کیسا ہے؟ یہ تو کوئی دوسرا ہی بتا سکتا ہے کہ میں کیسی ہوں...... ہاں یہ میں ضرور کہوں گی کہ میں نے بچوں کی پرورش میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ ان کو ابتدائی کلاسیں میں نے ہی پڑھائیں۔ اللہ سے جوڑنے کے لیے بھی مجھ سے جو ہو سکا، میں نے کیا...... اور اپنے بچوں کو شروع سے لے کر آخر تک جو بات تواتر کے ساتھ بتائی وہ ان کے کردار کے بارے میں تھی...... اور حرام و حلال رزق کے بارے میں۔

میری بیٹی اور بہو ماشاءاللہ دونوں ڈاکٹر ہیں۔ میری بیٹی نے ہمیشہ لمبی اور فل بازوؤں والی قمیص پہنی...... اپنے لباس کا ہمیشہ خیال رکھا۔ اسی طرح میری بہو نے بھی امریکہ میں رہتے ہوئے ہمیشہ چادر لی۔ اور کبھی بے پردگی کے نزدیک نہیں گئی۔ میری نواسیاں اسکول میں دوپٹہ لے کر جاتی ہیں اور پانچ وقت کی نمازی ہیں۔ ان کو قرآن پاک ہم میاں بیوی نے پڑھایا۔ میں جس راستے پر چلی، اس سے پیچھے نہیں ہٹی، نہ اللہ کے دین پر کوئی سمجھوتا کیا۔

"کھانے میں آپ کو کیا پسند ہے؟"

"جب تک شادی نہیں ہوئی تھی، تو کھانے میں بھی پسند ناپسند تھی۔ مگر شادی کے بعد تو پہلے سال پتا چلا کہ پوری کے پوری گھر میاں بھنڈیاں، اور کریلے پکانے پڑیں گے تو دن میں تارے نظر آگئے۔ بھنڈی میں بھی پیاز زیادہ ہو تو بھی پیاز ہی رہ جاتی تھی اور کریلے بھی بغیر کڑواہٹ کے اور بھی بہت ہی کڑوے بن جاتے تھے۔ وہ ایک مشکل سال تھا جو گزر گیا۔

اب تو مدت ہو گئی چولہا چکی کرتے ہوئے۔ الحمدللہ میں سب کچھ خود پکاتی ہوں۔ وہ چیزیں پکاتی ہوں جو میاں کو پسند ہیں۔ ہمارے گھر میں آج تک پائے، نہاری اور کوفتے نہیں بنے۔ کیوں کہ میاں صاحب نہیں کھاتے۔ میں کبھی کبھار باہر سے منگوا لیتی ہوں۔ ویسے مجھے باہر کا کھانا زیادہ پسند نہیں ہے۔ مجھے اپنے گھر کا کھانا کسی بھی فائیو اسٹار ہوٹل سے زیادہ اچھا لگتا ہے۔

"اپنی کمائی کہاں خرچ کرتی ہیں؟"

"الحمدللہ۔ میری کوئی ذاتی کمائی نہیں ہے۔ میرے میاں نے مجھے گھر میں ملکہ بنا کر رکھا ہوا ہے۔ میں نے سیاہ کیا، سفید کیا، انہوں نے پوچھا نہیں۔ وہ ہر مہینے مجھے ایک مخصوص رقم پکڑا دیتے ہیں، میں نے نہ پیسوں کا تقاضا کیا نہ کسی بات پر ضد کی...... نہ پیسوں کے معاملے میں کبھی لڑائی ہوئی۔ مجھے اچھے کپڑوں، جوتوں اور بیگز کا شوق ہے بلکہ تھا...... میرے آدھے شوق اسامہ لے گیا آدھے عمر لے گئی۔"

اس کے ساتھ ہی ہم نے جبیں چیمہ صاحبہ سے اجازت چاہی، اس شکریہ کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں وقت دیا۔

تھیٹر، فلم اور ٹی وی کے فنکار

رانا ماجد علی خان سے باتیں

شاہین رشید

1 ''اصلی نام؟''

''رانا ماجد علی خان۔''

2 ''پیار کا نام؟''

''پیار کا کوئی نام نہیں ہے۔ مگر امی مجھے مولیا مولیا پکارتی ہیں۔ ہاہاہا۔''

3 ''تاریخ پیدائش؟''

''21 ستمبر 1992ء۔''

4 ''قد/ستارہ؟''

''چھ فٹ، کیونکہ میری ماں نے بہت دعائیں کی تھیں کہ اس کا قد چھ فٹ ضرور ہو...... اور میرا استارہ ورگو (سنبلہ) ہے۔''

5 ''مادری زبان؟''

''پنجابی اور اردو میری مادری زبانیں ہیں۔''

6 ''بہن بھائی آپ کا نمبر؟''

''ہم چار بھائی ہیں اور میں سب سے چھوٹا ہوں۔''

7 ''تعلیم؟''

''ایل ایل بی آنرز لندن یونیورسٹی۔''

8 ''شوبز میں آمد؟''

''بس اچانک ہی ہوئی۔ جب اولیولز میں تھا تو اسکول میں تھیٹرز کرتا تھا تو بہت حوصلہ افزائی ہوتی تھی اور بہت ایوارڈز ملتے تھے...... پھر کراچی آ کر میوزیکل شوز کیے...... کراچی آرٹس کونسل میں تو بس کرتے کرتے فیصل قریشی سے دوستی ہوگئی اور انہوں نے مجھے ڈرامے میں چانس دیا...... اور اس کے بعد یہ سلسلہ چلتا رہا اور چل رہا ہے۔''

9 ''شادی؟''

''ابھی نہیں ہوئی۔''

10 ''بچپن کی بری عادت جو مشکل سے گئی؟''

''اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتا تھا...... گندا رہتا تھا مشکل سے نہاتا تھا...... مگر اب اپنی صحت کا بہت خیال رکھتا ہوں۔ صفائی ستھرائی پہ دھیان نہیں دیتا تھا۔''

11 ''اپنی پہلی کمائی کس کے ہاتھ میں رکھی اور کتنی تھی؟''

''پہلی بار جب تھیٹرز کا کمرشل پلے کیا تو اس میں مجھے پچیس ہزار ملے۔ چاہتا تھا کہ والدہ کو دوں مگر وہ پاکستان میں نہیں تھیں امریکہ میں تھیں اس لیے خود ہی خرچ کر لیے۔''

12 ''بچپن کا پہلا پیار؟''

''ایک ٹیچر سے پیار ہو گیا تھا...... وہ انگریزی کی ٹیچر تھیں۔''

13 ''آپ کا سورج کب طلوع ہوتا ہے؟''

''کام پر جانا ہو تو جلدی طلوع ہو جاتا ہے یعنی صبح صبح ورنہ دیر سے نکلتا ہے...... کیونکہ رات کو دیر سے سوتا ہوں۔''

14 ''صبح کیا نہ ملے تو صبح نہیں ہوتی؟''

''اگر اچھی سی چائے نہ ملے تو صبح نہیں ہوتی۔ چائے بہت ضروری ہے اور چائے کا میں بہت شوقین ہوں۔''

15 ''کیا برداشت نہیں بھوک یا غصہ؟''

''نہ بھوک برداشت ہوتی ہے اور نہ ہی غصہ پہلے میں بہت شارٹ ٹیمپر تھا مگر اب وقت کے ساتھ ٹھیک ہو گیا ہوں غصہ کیا اب تو بھوک بھی برداشت ہو جاتی ہے۔''

16 ''پاکستان کے لیے کیا سوچتے ہیں؟''

''میں بہت محب وطن آدمی ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ پاکستان دنیا کے نمبرون ملکوں میں شمار ہو۔

پاکستان میری جان ہے اور مجھے بہت مواقع ملے پاکستان سے باہر کام کے مگر پاکستان میں رہنا مجھے بہت پسند ہے۔

17 ''سیاست میں کون پسند ہے؟''

''شیخ رشید، بڑے زبردست سیاست دان ہیں۔ مجھے بڑے اچھے لگتے ہیں۔''

18 ''کس ملک کی شہریت کی خواہش ہے؟''

''میرے بھائی کے پاس امریکہ کی شہریت ہے۔ والدین کے پاس بھی ہے اور ہوسکتا ہے کہ کل کو مجھے بھی امریکہ کی شہریت مل جائے۔ مگر میرے لیے تو پاکستان ہی سب کچھ ہے۔''

19 ''کیا آپ کورونا کا شکار ہوئے۔ لاک ڈاؤن میں وقت کیسا گزرا؟''

''میں شروع میں ہی کورونا کا شکار ہو گیا تھا۔ اور بڑا مشکل ٹائم تھا۔ لاک ڈاؤن میں بڑا اچھا وقت گزرا...... والدین کے ساتھ وقت بہت اچھا گزرا۔''

20 ''شوبز میں کیا اچھا ہے؟ کیا برا ہے؟''

''اچھا یہ ہے کہ بڑے اچھے لوگوں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ مائنڈ سیٹ بنتا ہے اور برا یہ کہ لوگ اندر اور باہر سے مختلف ہوتے ہیں بناوٹی ہوتے ہیں۔ جب تک آپ کے پاس کام ہے سب آپ کے ہیں۔''

21 ''کھیلوں سے لگاؤ...... کون سا کھیل پسند ہے؟''

''مجھے کرکٹ بہت پسند ہے۔ اسکول میں گلی محلوں میں بہت کرکٹ کھیلی ہے۔ رمضان میں ٹورنامنٹ کا انعقاد کرتے تھے سب دوست۔''

22 ''زندگی سے کیا سیکھا؟''

''زندگی سے انسان ہمیشہ ہی کچھ نہ کچھ سیکھتا رہتا ہے۔ انسان ہمیشہ نامکمل رہتا ہے۔ لوگوں کو سمجھنا اور رشتوں کا ٹوٹنا جڑنا سیکھا۔''

23 ''پہلی بار کیمرے کا سامنا کیا تو کیا کیفیت تھی؟''

''عجیب سی کیفیت تھی کیونکہ میں تھیٹر کا عادی تھا تو اونچی آواز میں بات کرنے کا عادی تھا۔''

24 ''تین چیزیں جنہیں خریدنا آپ کا خواب ہے؟''

''بہت خوب صورت سا گھر، اسپورٹس کار اور ایک چینل خریدنا بنانا چاہتا ہوں۔''

25 ''گزشتہ دو سالوں میں کون سا ڈرامہ بہت پسند آیا؟''

''بہت کم ڈرامے دیکھتا ہوں ...... ''الف'' سیریل بہت پسند آیا تھا۔''

26 ''تنہائی کا احساس کب ہوتا ہے؟''

''جب کراچی میں ہوتا ہوں تب...... اور جب کام نہیں کر رہا ہوتا تب۔ لاہور میں فیملی ہے تو وقت اچھا گزر جاتا ہے۔''

27 ''دل کی دھڑکن کب تیز ہو جاتی ہے؟''

''جب کوئی پریشانی ہو فیملی کی طرف سے۔''

28 ''زندگی میں کچھ واپس ملے تو کیا لینا پسند کریں گے؟''

''ایک اچھا اور خوش گوار وقت جو میں نے گزارا وہ واپس لینا چاہوں گا۔''

29 ''گھر میں سب سے زیادہ پیار اور ڈانٹ

کس سے پڑی؟"
"سب سے بڑے بھائی سے کافی ڈانٹ پڑتی رہی ہے۔ دوسرے نمبر کے بھائی زاہد سے بہت پیار ملا اور والدہ سے۔"
30 "اپنی بیماری کو سیریس لیتے ہیں؟"
"نہیں بیماری کو سیریس نہیں لیتا۔ چل (chill) رہتا ہوں اور فیملی میں کوئی بیمار ہو تو پریشان ہو جاتا ہوں۔ جیسے والدہ کے لیے پریشان رہا اور ہوں۔"
31 "کتنے ڈرامے، کمرشلز اور فلمز کر چکے ہیں؟"
"دس بارہ ڈرامے۔ فلم زیر تکمیل ہے اور کمرشلز نہیں کیے۔"
32 "رومینٹک رول آسانی سے کر لیتے ہیں یا نیگیٹو؟"
"میں تو ہر کردار آسانی سے کر لیتا ہوں اور انجوائے بھی کرتا ہوں۔ ورسٹائل فنکار بننا چاہتا ہوں۔ رومینس کرنا بھی بڑا آرٹ ہے۔"
33 "ادب سے لگاؤ؟"
"کافی ہے۔ شعر و شاعری کا بہت شوق رہا ہے۔ غالب اور علامہ اقبال کو بہت پڑھا ہے۔"
34 "کوئی فیصلہ جو غلط ثابت ہوا؟"
"کافی فیصلے غلط ہوئے مگر ان سے سیکھا بھی بہت ہے۔"
35 "کوکنگ سے لگاؤ...... کبھی شیف بننے کا خیال آیا؟"
"نہیں کوئی شوق نہیں ہے نہ پکانے کا اور نہ ہی شیف بننے کا' چائے اچھی بنا لیتا ہوں۔"
36 "آپ برانڈ کانشس ہیں؟"
"برانڈز اچھے لگتے ہیں مگر کانشس بالکل بھی نہیں ہوں۔"
37 "ایک نصیحت جو کرنا چاہتے ہیں ہم عصروں کو؟"
"اچھے لوگوں کو کبھی نہ کھوئیں۔ ہر صورت میں رشتہ قائم رکھیں بڑا سکون رہتا ہے۔"
38 "آپ کو نفرت ہے؟"
"نہیں...... کسی سے نہیں محبت کرنا ہی سیکھا ہے۔"
39 "کبھی غربت میں وقت گزارا؟"
"زمانہ طالب علمی میں ہر نوجوان جدوجہد کے دور سے گزر رہا ہوتا ہے...... تو وہ ہی وقت غربت کا تھا۔"
40 "ڈرائیونگ کے دوران کون سا گانا زیادہ سنتے ہیں؟"
"کوئی مخصوص نہیں ہے ہر طرح کے سنتا ہوں اور ڈرائیونگ کے دوران ہی سنتا ہوں۔ نصرت فتح علی خان کو زیادہ سنتا ہوں۔"
41 "ڈاکٹرز، حکیم اور ہومیو پیتھک، کس پر یقین ہے؟"
"صحت دینے والی اللہ کی ذات ہے...... مگر پھر بھی ڈاکٹرز کا نام لوں گا۔"
42 "پاکستان میں کیا چیز فری ملنی چاہیے؟"
"تعلیم فری ملنی چاہیے۔ جیسے بیرون ملک میں ہے۔"
43 "کیا دل سے اترا ہوا شخص پہلے جیسا مقام حاصل کر سکتا ہے؟"
"نہیں...... اس کو میں معاف تو کر دیتا ہوں مگر وہ پھر پہلے جیسا مقام حاصل نہیں کر سکتا۔"
44 "محفل میں بیٹھ کر موبائل استعمال کرنے والوں کے لیے کیا کہیں گے؟"
"سب ہی ایسا کرتے ہیں اور میں بھی ایسا کرتا ہوں۔ مگر ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ فون سے باہر بھی دنیا ہے۔"
45 "حکومت پاکستان سے مطمئن ہیں؟"
"ہاں...... میں تو مطمئن ہوں۔ خوش ہوں اور سپورٹر ہوں۔"
46 "ملک سے باہر جاب کی آفر آئے تو؟"
"تو ضرور کروں گا۔ خاص طور پر ایکٹنگ کے لیے بلائیں تو ضرور جاؤں گا۔"

47 ''غصے میں آپ کا ردعمل؟''
''منحصر ہے کہ کس بات پر غصہ آیا ہے۔ ردعمل بھی اسی حساب سے ہوتا ہے۔''

48 ''ٹی وی ٹاک شو کے بہترین اینکر؟''
''کافی ہیں پہلے دور کے نعیم بخاری۔ آج کے دور کے کامران شاہد۔ وسیم بادامی۔ ڈاکٹر شاہد مسعود اور کپیل دیو (؟)...... اور معین اختر کو بہت زیادہ مس کرتا ہوں۔''

49 ''ایک نصیحت جو بری لگتی ہے؟''
''دیکھو اداکاری کے ساتھ ساتھ کچھ اور کام بھی ہونا چاہیے...... جبکہ اداکاری ایک فل ٹائم جاب ہے۔''

50 ''جوائنٹ اکاؤنٹ یا سنگل...... کیا پسند ہے؟''
''بھائی کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ مگر سنگل زیادہ بہتر ہے۔''

51 ''ایک ڈیٹ جو یاد ہے؟''
ہنستے ہوئے ''ایک نہیں کافی یاد ہیں۔ چھوڑ دیں۔''

52 ''ایک کھانا جو ہر وقت کھا سکتے ہیں؟''
''باربی کیو...... تکہ، مچھلی، میکڈونلڈ، مٹن، خوش خوراک ہوں۔''

53 ''اپنی پرفارمنس میں کیا کمی محسوس ہوتی ہے؟''
''یہ تو دیکھنے والے ہی بتا سکتے ہیں مگر میں اپنا تجزیہ کرتا رہتا ہوں۔ کوئی کمی نہیں ہے بس محنت کی ضرورت ہے۔''

54 ''اپنا ڈراما دیکھ کر کیا سوچتے ہیں؟''
''اور کتنا اچھا کر سکتا ہوں۔ ڈراما بھی اور فلم بھی۔''

55 ''اچھا ڈراما چل رہا ہو تو؟''
''تو ریموٹ رک جاتا ہے۔''

56 ''کوکنگ یا کھانا...... کیا پسند ہے؟''
''کوکنگ بالکل پسند نہیں...... بس کھانا پسند ہے۔''

57 ''کون سا رول کرنے کی خواہش ہے؟''
''ایسا رول جو سوسائٹی میں کوئی چینج لا سکے۔ بہت ہی لیڈر ٹائپ کردار کرنا چاہتا ہوں۔''

58 ''آپ کا کوئی ناقابل فراموش کردار؟''
''میرا نہیں خیال کہ میں نے ایسا کوئی کردار اب تک کیا ہے۔ پھر بھی ''منتظر'' میں بھٹی صاحب کا ینگ پروفیسر کا کردار ''کوئی چاند رکھ'' میں ضیا کا کردار۔''

59 ''کوئی کردار جو کرنے سے منع کیا؟''
''ایک بہت ہی شیطان ٹائپ کا منگھو رول تھا۔ پیچھا چھڑا رہتا ہے۔''

60 ''کس سیاست دان کا رول کرنے کی خواہش ہے؟''
''ذوالفقار علی بھٹو کا...... بہت اچھے اسپیکر تھے۔ بہت خواہش ہے میری۔''

61 ''چاند پر پہنچ کر پہلا پتھر کس کو ماریں گے؟''
''چاند پر پہنچ کر کیا کسی کو پتھر مارنا۔''

62 ''آپ کی فیوچر پلاننگ؟''
''پلاننگ نہیں کی...... بس ایک دھن ہے جس پر چلتا رہتا ہوں۔''

63 ''کس کام کو کرنے کے لیے بہت سوچتے ہیں؟''
''آج کل تو کوئی بھی ڈراما سائن کرنے سے پہلے بہت سوچتا ہوں۔''

64 ''پسندیدہ فوڈ اسٹریٹ؟''
''عرب اسٹریٹ سنگاپور کی سلطان مسجد کے پاس۔ بہت ہی خوب صورت جگہ ہے۔ پاکستان میں انارکلی کی فوڈ اسٹریٹ اور لاہور میں ہی ''مال ون۔''

65 ''آئینے کو کتنا وقت دیتے ہیں؟''
''تو کمنٹس......''
''عید، 14 اگست، 6 ستمبر اور جب ساری فیملی اکٹھی ہو تو میرے لیے تہوار ہوتا ہے۔ دوست یار اچھے پیارے۔''

68 ''مرنے کا سین کرنا کیسا لگتا ہے؟''
''ڈسٹربنگ ہوتا ہے۔''

69 ''اپنے تجربے سے سیکھتے ہیں یا؟''
''زیادہ تر تو اپنے ہی تجربے سے سیکھتا ہوں۔ دوسروں سے کچھ تھوڑا بہت سیکھا ہے۔''

70 ''کون سی چیز نشے کی حد تک پسند ہے؟''
''چائے..... بچپن میں کوکا کولا بہت پیتا تھا۔''
71 ''گھر سے نکلتے ہوئے کیا کیا چیزیں لازمی رکھتے ہیں؟''
''والٹ، موبائل فون پاور بنک۔ اس ٹائپ کی چیزیں لازمی رکھتا ہوں۔ گاڑی میں پرفیوم اور ماسک تو رکھا ہی رہتا ہے۔''
72 ''مہینے میں کتنی بار کھانا گھر سے باہر کھاتے ہیں؟''
''آج کل فیملی سے دور ہوں تو زیادہ تر گھر سے باہر کھاتا ہوں۔''
73 ''کھانا بیڈ پہ کھاتے ہیں یا ڈائننگ ٹیبل پر؟''
''بیڈ پہ..... کو کر یا اچھی عادت نہیں ہے۔ ہاں فیملی کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پہ کھاتا ہوں۔''
74 ''بی پی ہائی ہو جاتا ہے تو.....؟''
''تو پھر سامنے والے کی خیر نہیں ہوتی۔''
75 ''اچھی اور بری خبر سب سے پہلے کس کو سناتے ہیں؟''
''اپنے زاہد بھائی کو سناتا ہوں۔''
76 ''اپنا کل سوچ کے کیا احساسات ہوتے ہیں؟''
''اپنی غلطیوں کا احساس ہوتا ہے۔ مگر غلطیوں سے ہی انسان سیکھتا ہے۔ کچھ اچھے کام جو کیے ہوتے ہیں ان کو سوچ کر خوشی بھی ہوتی ہے۔''
77 ''سگنل پہ کھڑے ہو کر کیا سوچتے ہیں یا کن چیزوں کا جائزہ لیتے ہیں؟''
''بھیڑ ہو یا نہ ہو اکثر چیزوں کو بہت نوٹس کرتا ہوں۔''
78 ''بچپن میں کن فنکاروں کو پسند کرتے تھے؟''
''سنجے دت۔ آج بھی ہیں۔ امیتابھ بچن، سلمان خان، گووندا بہت پسند ہے۔ پاکستان سے ندیم، محمد علی صاحب، معین اختر، سہیل احمد، لمبی فہرست ہے، جو حیات ہیں اللہ انہیں لمبی زندگی دے۔''
79 ''خواتین رائٹرز میں پسندیدہ رائٹر؟''
''زنجبیل، قیصرہ حیات، عمیرہ احمد۔''
80 ''بچپن میں کون سے گیم پسند تھے؟''
''بچپن سے لے کر اب تک کرکٹ بہت پسند ہے۔''
81 ''شاپنگ کے وقت کس کا خیال سب سے پہلے آتا ہے؟''
''زیادہ شوق نہیں ہے ضرورت کے تحت شاپنگ کرتا ہوں اور زاہد بھائی جو باہر رہتے ہیں وہ کافی چیزیں لے آتے ہیں۔''
82 ''کب ہواؤں میں اُڑتا ہوا محسوس کرتے ہیں؟''
''جب فیملی مجھ پر فخر کرتی ہے..... یا دوست حوصلہ افزائی کریں فخر کریں۔ سیٹ پہ سین او کے ہونے پر کوئی تعریف کرے تب۔''
83 ''کبھی چھپ چھپ کر لوگوں کی باتیں سنیں؟''
''نہیں..... کبھی نہیں اچانک سے کوئی بات سنائی دے جائے وہ اور بات ہے۔''
84 ''اپنی کمائی کس پر خرچ کرتے ہیں؟''
''گھومنے پھرنے پر..... کھانے پینے پر۔''
85 ''کبھی نجومی کو ہاتھ دکھایا؟''
''میں ان باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔''
86 ''کوئی سیلیبریٹی جس کا آپ انٹرویو کرنا چاہتے ہیں؟''
''اداکار شاہ رخ خان کا تو میں بہت بڑا فین ہوں۔''
''اگر آپ کی شہرت کو زوال آ جائے تو؟''
''عزت و شہرت اور زوال اوپر والا ہی دیتا ہے۔ ابھی شہرت کی بلندی میں نے دیکھی نہیں ہے۔''
☆

عابدہ وحید......راولپنڈی

یہ پہلی بار تھا کہ کسی رسالے میں خط لکھا۔ جب بیٹا خواتین لے کر آیا تو میں بالکل چپ رہی کہ شاید سارے لوگ بھول گئے ہوں گے مگر میاں صاحب کو یاد تھا۔ زور سے بولے ''بچوں تمہاری ماما نے خط لکھا تھا، ڈائجسٹ میں دیکھو چھپا کہ نہیں'' میں نے سوچا کہ لو بھئی نہ چھپا ہوا تو بڑی شرمندگی ہوگی بچوں کے سامنے۔ میاں صاحب نے جلدی جلدی ڈائجسٹ کھولا۔ ''چھپا ہے...... چھپا ہے'' خوشی سے بولے۔ خط تو نہ پڑھا البتہ میرے خط پر آپ کا تبصرہ پڑھنے لگے۔ خوشی سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آپ نے میرے طرز بیان کو پسند کیا۔ وہ عورت جس نے لکھنے کے نام پر پچھلے چھ مہینوں سے سودے کی لسٹ بھی نہیں بنائی، آپ نے اس کی تعریف کی۔ میں پڑھنے کی بے حد شوقین ہوں، حقیقتاً ان لوگوں میں سے ہوں جن کو اگر کوئی مڑا تڑا کاغذ بھی مل جائے تو سیدھا کرکے پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ پہلے بھی کئی بار خط لکھنے کا سوچا مگر لکھ نہ سکی، اس لیے کہ میں خواتین مہینے کے آخر میں ختم کرتی ہوں۔ یہ کیا کہ دو دن میں ختم کر لیا اور پھر ہاتھ جھاڑ کر بیٹھ گئے۔ میرے نزدیک کتاب پڑھنا ایک تفریح ہے کوئی کام نہیں کہ ختم کرنے کی جلدی ہو۔

سردیوں میں (پنڈی کی سردی) کتاب پڑھنے کا اپنا ہی مزا ہے۔ دھوپ میں چارپائی پر لیٹ جائیں اور ٹانگیں پھیلا کر کتاب پڑھیں۔ مجھے لگتا ہے اس سے بڑی عیاشی کوئی نہیں۔ اس سال ممتاز مفتی کی ''تلاش'' پڑھی۔ پچھلے سال ''علی پور کا ایلی'' اور کرنل محمد خان کی ''بجنگ آمد'' پڑھی۔ اس سے پچھلے سال شہاب نامہ پڑھا۔ جو کتاب قوت خرید سے باہر ہو، وہ مانگ کے پڑھتی ہوں۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی کہ میاں صاحب نے سب سے پہلے خواتین میں میرا خط پڑھا۔ غصہ آ گیا۔ بولے ''تم نے شہر کا نام ہی نہیں لکھا۔ تمہیں لکھنا چاہیے تھا راولپنڈی۔'' زور دیا راولپنڈی پر۔ راولپنڈی کیا میں تو کراچی سے ہوں۔ کراچی میرا شہر، ایک شہر بے مہر، ایک شہر بے مثال۔ اک شہر دلنواز۔ راولپنڈی تو میں شادی کے بعد آئی تھی۔ ورنہ تو میرا شہر کراچی ہے۔ کراچی کی کوئی بھی چیز مجھے ناپسند نہیں ہے۔ دھوئیں اور دھول سے بھری ہوا، جگہ جگہ کچرے کے ڈھیر۔

نادرہ خاتون

خط بھجوانے کے لیے پتا۔

خواتین ڈائجسٹ۔ 37۔ اردو بازار کراچی۔

Email:info@khawateendigest.com

سال کے بارہ میں سے دس مہینے گرمی کے۔ لوگوں کے مزاج کا چڑچڑاپن، مجھے کچھ بھی برا نہیں لگتا۔ جس قسم کے حالات میں کراچی والے رہتے ہیں، اس کے بعد چڑچڑاپنا تو بنتا ہے۔ کراچی کی ایک زبردست تفریح، ہفتہ وار بازار ہیں۔ پنڈی میں اس قسم کے بازار نایاب ہیں۔

اس بار خواتین ہاتھ میں آیا تو حسب معمول پہلے ''کرن کرن روشنی'' پڑھا۔ خالدہ جیلانی کے بارے میں پڑھ کر بڑا افسوس ہوا۔ اللہ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ راحت جبیں کی زرمین ایک سمجھدار اور باشعور لڑکی لگتی ہے۔ آثار بتاتے ہیں کہ ناول آگے جا کر اور زیادہ دلچسپ ہوگا۔ ''ایک تھی ماٹو'' بس ٹھیک ہی تھا۔ نفیسہ کی تحریریں کمال کی ہوتی ہیں۔ ''تو ہے وہ خواب'' کی اشنا نے سیدھا راستہ چنا، نہ اپنے آپ کو مشکل میں ڈالا نہ اپنے خاندان کو۔ ''رقص شرر'' کا اختتام ہو گیا۔ نہ جانے کیوں ایسا لگا جیسے فائزہ کہانی کا یہ اینڈ نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ یہ اختتام کسی مجبوری سے کیا گیا۔

"حالم" ابھی نہیں پڑھی۔ "عشق تم سے ہے" اچھی تھی حالانکہ اس قسم کی کہانیاں بارہا لکھی جا چکی ہیں۔ لیکن طرز بیاں کسی بھی کہانی کو اچھا یا برا بنا دیتا ہے۔ نوشین کے طرز بیان نے کہانی کو دلچسپ بنایا۔ "خاموشی کو بیاں ملے" اچھا تھا۔ فہمیدہ بہن نے اتنی لکھاری بہنوں کے نام لکھے، میں حیران رہ گئی۔ یقیناً ان کی یادداشت غضب کی ہے ان میں سے بیشتر اب بہت ہی کم لکھتی ہیں لیکن انہوں نے ان کو بھی یاد رکھا۔ یہ ان کی محبت ہے۔ میری رائے ہے کہ ایک ایسا سلسلہ شروع کریں جس میں کسی شاعر کے مختصر حالات بتائیں اور ان کی منتخب شاعری ہو۔

☆ پیاری عابدہ! آپ نے ہمیں یاد کیا، بہت شکریہ۔ یہ حقیقت ہے کہ کراچی کا حلیہ بری طرح بگاڑ دیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود جو ایک بار کراچی میں رہ چکا ہو، اسے کبھی نہیں بھولتا۔ ہمیشہ یاد کرتا رہتا ہے۔ اس بار ہم نے آپ کے شہر کا نام خاص طور پر لکھا ہے۔ اپنے میاں صاحب کو دکھا دیجیے گا۔

عابدہ! اتنا اچھا لکھتی ہیں، کبھی افسانہ نگاری کی طرف بھی توجہ نہیں دی۔ خواتین کے دوسرے سلسلوں کے لیے بھی لکھیں۔

ثنا مسلم رانا...... کلورکوٹ ضلع بھکر

آپ نے میرا خط شائع کیا۔ گھر والوں سے داد کے ساتھ انعام بھی وصول کیا۔ امی کو خط اور جواب پڑھ کر سنایا۔ "کرن کرن روشنی" سے ایمان کو تازہ کیا۔ انشاء جی واہ کیا بات ہے۔ عباس اشراف اعوان سے ملاقات اچھی رہی۔ ڈاکٹر فرید نے اچھے مشورے دیے لیکن اسکن اسپیشلسٹ کا انٹرویو لیں اور چہرے پر دانوں سے متعلق ضرور سوال کریں، پلیز۔ راحت جبیں نے سادہ سی کہانی لکھی لیکن وقت کی ضرورت ہے۔ "چاندنی چوک کی گلی" نے واقعی اچھا سبق دیا۔ زندگی گزارنے کا سنہری اصول خوش اخلاقی اور اطاعت۔ "ایک تھی مالو" اتنی ضد اچھی نہیں ہوتی۔ اینڈ ڈراموں والا تھا۔ جبث سے سب اچھا ہو گیا۔ "زندگی کے نئے راستے" آج کی جنریشن بہت حساس ہے (بھی ہم)۔ آفرین کا فیصلہ اچھا ہے، گڈ۔ "تو ہے وہ خواب" کیمرو مائرہ اچھا رہا۔ عائشہ نصیر شکریہ آپ نے اشنا کو بھاگنے سے بچایا۔ "رقص شرر" موسیقی واقعی شیطان کی روح کی غذا ہے۔ میں تو ویسے ہی کم میوزک سنتی ہوں لیکن باقی سب کو بھی بتایا کہ کم کر دیں میوزک۔ اینڈ ٹھیک رہا۔ "حالم" جو سب سے پہلے پڑھا، ہمیشہ کی طرح زبردست۔ "عشق تم سے ہے" وادیاں اور وہاں کے مخلص، محنتی لوگ واقعی عشق کے قابل ہیں۔ بھلا ایسی محبت کرنے والے کہاں ملتے ہیں سوائے پاکستان کے۔ "بابا کے نام" اینڈ کچھ اچھا نہیں لگا۔ شہلا آنٹی کا تو بتایا نہیں کیا ہوا۔

☆ شہلا آنٹی اپنی جگہ ہیں، ان کا کیا ہونا تھا۔ آپ خواتین کے سب سلسلوں میں شرکت کر سکتی ہیں، پوچھنے کی ضرورت نہیں۔

ماریہ اور کلثوم...... نامعلوم شہر

شعاع، خواتین اور کرن ہماری جان ہیں۔ میرے خیال میں ہر لڑکی کو یہ پڑھنے چاہئیں کیونکہ ماں کے بعد یہ دوسری ماں ہے جو ہماری تربیت کرتی ہے۔ ساری رائٹر بہت اچھا لکھتی ہیں لیکن نمرہ احمد جی! کیا بات ہے آپ کی۔ آپ کہانی کیا ہیں (بتایئے گا ضرور، ہاہاہا)۔ "رنگ ریز میرے" بھی اچھا ہے۔ "زندگی ہم تجھے گزاریں گے" اچھی شروعات۔ ہمارے گاؤں میں ڈائجسٹ نہیں ملتے، ہماری خالہ ساس قریبی شہر سے لا کر دیتی ہیں۔ ہماری خالہ ساس بہت اچھی ہیں۔ آپی رسالہ پڑھ کر باہر ہی رکھ دیتی ہیں۔ خالہ ہمارے رسالے اٹھا اٹھا کر اندر رکھتی رہتی ہیں اور کہتی ہیں پڑھ کر اندر رکھا کرو۔ بچے پھاڑ دیں گے۔ کسی مہینے رسالہ نہ ملے تو ہم سے زیادہ وہ پریشان ہوتی ہیں۔ اللہ ان کا سایہ ہمارے سر پر قائم رکھے۔ ہم دو بہنیں ایک ہی گھر میں بیاہی ہیں۔ ہم اگر "جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" میں شرکت کریں، تو شائع کریں گی۔

☆ ماریہ اور کلثوم! آپ نے ہماری محفل میں شرکت کی، بہت خوشی ہوئی۔ آپ کی خالہ ساس واقعی بہت اچھی ہیں۔ ہماری طرف سے ان کا شکریہ ادا کر دیں، اللہ تعالیٰ انہیں عافیت میں رکھے۔

"ناتا جوڑا ہے" کے سلسلہ میں ضرور شرکت کریں، پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ سلسلہ قارئین کے لیے ہی شروع کیا گیا ہے۔

کوثی جمال...... منڈی یزمان

مبہوت کر دینے والا ٹائٹل۔ گیندے کے پھولوں سے آراستہ، سفید لباس میں ماڈل روبی بٹ آنکھوں کو

خیرہ کر گئی۔ "لمحی حشتی" ارے یہ کیا؟ آہ! آپا خالدہ ہمیں داغ مفارقت دے گئیں۔ اللہ ان کے درجات بلند کرے اور جنت الفردوس میں اعلا مقام عطا کرے، آمین۔ شمارے کی جان "کرن کرن روشنی" سے فیضی یاب ہوئے۔ عباس اشرف" سے ملاقات بس ٹھیک تھی البتہ ڈاکٹر فرید الدین سے ملاقات بہت فائدہ مند رہی، ممہ ممس کے ساتھ۔ "سراپا محبت" اور "بہت یاد آئیں گی" آنکھ نم کر گئی۔ ایک اور خوشی مصنفہ ساجدہ حبیب کے بھائی کو اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں جگہ دے، آمین۔

"رقص شرر" کا رقص بہت عمدگی سے اختتام پذیر ہوا۔ ویل ڈن فائزہ شمرین۔ میں نے نوٹ کیا ہے اکثر سلسلے والے ناولز میں مصنفہ "زمین" نام بہت استعمال کرتی ہیں اور بہت سے نئے نئے یونیک نیم ہیں۔ وہ استعمال لائے جاسکتے ہیں۔ "ایک تھی ماؤ" کی آخری چند لائنز میں......

"اپنے بارے میں گھڑی گھڑی کی خبر سارے عالم میں نشر کرنا حماقت اور وقت کا زیاں ہے۔ اپنی خوشی اور اپنے غم، اپنے خیر خواہوں سے شیئر کرو اور بس......" چند جملوں میں کہانی کا نچوڑ اور سبق آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے۔ "چاندنی چوک کی کمی" حقیقت پر مبنی تحریر۔ بہت سے درد وا کر گئی۔

"بابا کے نام" نام پڑھ کر ہی آنکھیں بھیگ گئیں کیونکہ یہ رشتہ بائیس برس پہلے ہم سے بچھڑ گیا، جب میری عمر گیارہ برس تھی۔

19 مارچ کو بہار کے موسم میں جمال ہاؤس میں اس نادر نمونے مابدولت نے قدم رنجہ فرمایا اور آج ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر گیا۔ اب آپ اس درخت کو بیری کے درخت سے تشبیہ مت دیجیے گا۔

جنوری کی ایک کہر زدہ اور دھند آلود صبح جب پاس کھڑا بندہ دکھائی نہیں دے رہا تھا کہ باجی رمضان بی بی سر پر گوشت کی پرات دھرے پاٹ دار آواز لگاتی جمال ہاؤس میں داخل ہوئیں۔ "اماں سائرہ! کدھر ہیں آپ۔ جلدی سے باہر آئیے۔ اور یہ اپنی بکری کا گوشت لے لیں۔"

اماں جھٹ سے تسبیح کرتے اپنے کمرے سے بھاگیں۔ "اے رمضان بی بی! کیا بک رہی ہو؟"

اماں نے ایک عدد بکری رمضان بی بی کو مستعار دی تھی تاکہ مزید افزائش نسل ہو جائے اور آمدنی کا معقول ذریعہ بن جائے مگر ہائے ری قسمت۔ وہ بھی اس جہان فانی سے کوچ کر کے ہماری چار دن کی عیاشی کا سامان ہو گئی۔

"ارے گوڑ ماری! کیا ہوا میری بکری کو۔ تیرا ستیاناس جائے تو اسے صبح صبح ذبح کر کے لے آئی؟"

"اماں! دو دن سے اس کی طبیعت ناساز تھی۔ پیٹ پھول گیا تھا اور وہ بے سدھ پڑی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا۔ حرام جائے گی، حلال کر لیں۔ میرے بیٹے نے جھٹ پٹ چھری چلا دی۔ اللہ اور دے دے گا، آپ کاہے کو پریشان ہو گئیں۔ ٹھنڈ کا موسم ہے، چار دن یخنی بنا کر پئیں۔"

"اس سے پہلے کہ میں تیری یخنی بنا دوں، میری نظروں سے اوجھل ہو جا۔"

وہ اپنا سا منہ لے کر رفو چکر ہو گئیں اور ساتھ ساتھ بڑی آپا کو تاکید کر گئیں کہ "میری پرات اور رونا، رومال کسی بچے کے ہاتھ بھجوا دیجیے گا۔" آپا مسکرا کر رہ گئیں۔

شام کو اماں منہ میں بوٹی بھی چبائی جا رہی تھیں اور افسوس بھی کرتی جا رہی تھیں۔ ہم سب سراپا قہقہہ تھے۔

"خبریں وبریں" اس بار بہت مختصر تھیں۔ "خاموشی کو بیاں ملے" آپا فہمیدہ جاوید اور ثانیہ مرید کے جوابات متاثر کن تھے۔ "موسم کے پکوان" میں چکن مونگ پھلی کے ساتھ بہت مختلف اور مزے کی لگی۔ اماں کو بھی آپا نے مٹن چاؤ من بہت دل سے بنا کر کھلایا پھر کہیں اگلے دن ان کے ماتھے کے بلوں میں کمی واقع ہوئی۔

☆ پیاری گوشی! ہم آپ کی اماں کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ بکری کا داغ مفارقت دے جانا اور اس کی نسل سے وابستہ خوابوں کا ٹوٹ جانا معمولی سانحہ نہیں تھا۔ کیا کریں، مشیت ایزدی پر کس کا بس چلتا ہے۔ خیر چلیں بکری کے مزے دار کھانوں نے کچھ اشک شوئی تو کر دی۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

فرحانہ...... اسلام آباد

خالدہ جیلانی کی وفات کا پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔ سب سے

پہلے "رنگ ریز میرے" ہم نے صفحات بڑھ جانے کا کہا، آپ نے کہانی ہی شائع نہیں کی (بہت خوب)۔ ایسے کب تک چلے گا، آپ کو بہت زیادہ اقساط جمع کر کے ناول شروع کرنا چاہیے۔ "زندگی ہم تجھے گزاریں گے" تیسری قسط میں ہی شادی کی بات۔ زرمین کو میٹرک تو کرنے دیں، ویسے منشی صاحب کے منہ پر گھونسا بہت اچھا مارا۔ "رقص شرر" کہانی اپنے خوب صورت پیغام کے اچھی تھی لیکن آخر میں کچھ زیادہ ہی ڈرامائی سین کر دیے۔ "عشق کر کے" اچھا ناول تھا۔

"ایک تھی نازو" نفیسہ ناز ہم نے تو پہلے بھی کہا تھا کہ آپ کا انداز بیان آسیہ رزاقی جیسا ہے، بہت خوب۔ "عالم" آخری قسط کا انتظار ہے۔ "موسم کے پکوان، آپ کی بیاض" سے پڑھتے ہوئے خالدہ جی ایک افسردہ سی سانس اور دعا نکلی۔ "خامشی کو بیاں ملے" واہ فہمیدہ جی کمال کا سلسلہ لکھا۔ اب بات ہو جائے "ہمارے نام" سب سے پہلے تو اپنے نام کے ساتھ شہباز دیکھ کر خوب ہنسی، آپ بھی نا ہمیں کیسے کیسے خوش رکھتی ہیں۔ ایک دفعہ مجھے گوجرانوالہ کی بنا دیا۔

پیاری فرحانہ آپ کہانیوں کے نام لکھیں تاکہ ریکارڈ چیک کر کے بتا سکیں آپ کی کہانیاں قابل اشاعت ہیں یا نہیں۔

شبانہ عندلیب...... گوجرانوالہ

غیر حاضری کی وہی وجہ کرونا...... جس نے ہمیں کیا پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ ہمارے گھر میں ہمارے ابو کو چھوٹی عید کو جو سادہ بخار چڑھا، وہ کب کرونا میں بدل گیا پتا ہی نہیں چلا۔ بخار نے ایسا نچوڑا کہ پھر کمزوری سے ابو کو فالج ہو گیا۔ بہت سخت وقت تھا وہ۔ امی کے بعد ابو ہی ہم بہن بھائی کا سہارا ہیں۔ کب رات ہوتی، کب سویرا...... کچھ خبر نہیں۔ کبھی ہاسپٹل، کبھی فزیوتھراپسٹ کے پاس۔ بس ایسے ہی وقت گزر گیا۔ بس اللہ تعالیٰ کا بے حد شکر ہے کہ اب وہ ٹھیک ہیں۔ اپنے پیروں پر کھڑے ہیں۔ چلتے پھرتے ہیں ورنہ تو واش روم تک میں بھائی لے کر جاتا تھا۔ اللہ اسے اس کا اجر دے۔ اس نے نہ رات دیکھا نہ دن...... اندر باہر کے سب کام بخوبی انجام دیے۔

اس دوران پرچہ تو برابر لگتی رہی، بس پڑھنے کا وقت اس سردی میں ملا۔ "عالم" وقتاً فوقتاً زیر مطالعہ رہا۔ ویسے اب کہانی کو سمیٹ دیں تو اچھا ہے۔ ڈاکٹر فرید الدین سے ملاقات بہت فائدہ مند رہی، بہت سی کام کی باتیں پتا چلیں۔ "رقص شرر" اب پڑھوں گی، سب قسطیں اکٹھی جو ہو گئی ہیں۔ ہمارے یہاں سردی بہت تھی تو بہت سے کام ادھورے رہ جاتے تھے، اب وہ بھی پورے کرنے ہیں۔ آپ کے یہاں موسم کیسا ہے؟

مجھے اور میری پوری فیملی کو "کرن کرن روشنی" بہت پسند ہے۔ گزشتہ مہینے غیر مسلم ممالک میں رہائش سے متعلق بہت ہی گراں قدر معلومات ملیں جو آج تک نہیں ملی تھیں اور کچھ ماہ پہلے اذان سے متعلق احادیث پڑھنے کا موقع ملا۔ ایسی معلومات پر میں آپ سب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔

☆ پیاری شبانہ! آپ کے والد کرونا اور پھر فالج کے حملے سے صحت یاب ہو گئے، دلی مبارک باد۔ اللہ تعالیٰ نے آپ لوگوں پر بڑا کرم کیا اور والد صاحب چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کا سایہ آپ کے سر پر سلامت رکھے، آمین۔

حریم نواز...... ملتانی بستی سوکڑ

آپ نے "عالم" کی قسطوں کی تعداد غلط لکھی ہے۔ عالم کی اقساط کی تعداد چھتیس نہیں چھیالیس ہے۔ بہت سی قاری بہنوں نے اس پر تنقید بھی کی۔ جو مجھے اچھی نہیں لگی۔ میرا تو دل چاہتا ہے "عالم" کبھی ختم نہ ہو۔ عفت سحر کی "رنگ ریز میرے" بالکل بھی اچھی نہیں۔ فائزہ شیرین کی "رقص شرر" بھی اچھی لگی۔ ان کو بہت مبارک باد۔ راحت جبیں کی "زندگی ہم تجھے گزاریں گے" بھی عمدہ تحریر ہے۔ باقی سارے افسانے، ناولٹ اور مستقل سلسلے بھی عمدہ تھے۔ شاہین آپی میری درخواست ہے کہ کرکٹرز کا بھی انٹرویو لیا کریں۔

☆ پیاری حریم! اس بار آپ کا نام درست لکھا ہے ہم نے۔ اور خط بھی پورا شامل ہے۔ ہم پہلے بھی کئی بار کہہ چکے ہیں، خط ایڈٹ کرنا ہماری مجبوری ہوتی ہے۔ ہمیں خود اچھا نہیں لگتا لیکن اگر ہم ایڈٹ نہ کریں تو پھر چند ہی خط شامل ہو سکیں گے۔

بقیہ صفحہ نمبر 243 پر

عفت سحر طاہر

ہائی وے پر ٹرالر اور کار کا شدید ایکسیڈنٹ ہوتا ہے ٹرالر کا ڈرائیور بھاگ جاتا ہے، کار بری طرح پچک جاتی ہے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا مرد اور اگلی نشست پر ہی بیٹھی عورت خون میں لت پت ہیں۔ ریسکیو عملے کا انتظار ہے کہ وہ آئے تو گاڑی کی باڈی کاٹ کر لاشیں نکالی جائیں اسی وقت گاڑی سے ایک بچے کے رونے کی آواز آتی ہے۔

ہاسپٹل میں چار لوگ آئی سی یو کے باہر بیٹھے ہیں نرس باہر آ کر کہتی ہے آپ کے پیشنٹ کو ہوش آ گیا ہے۔ وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔

سرخ پھولوں سے سجی گاڑی پوش ایریا کے ایک بنگلے کے آگے رکتی ہے تو۔ دولہا کی ماں ملازمہ سے کہتی ہے کہ دلہن کو لے کر اندر آؤ۔ ملازمہ دلہن کو بیڈروم میں بٹھا کر جانے لگتی ہے تو دلہن اس سے سردرد کی گولی مانگتی ہے۔ ملازمہ کہتی ہے کہ چائے بھی لے آؤں۔

دولہا کمرے میں آتا ہے۔ تو وہ اس کی شکل دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔ وہ ایک بچی کو لے کر آتا ہے کہ اس کے لیے میں نے تم سے شادی کی ہے۔

زمین کو ہواؤں میں اڑنے اور اونچے خواب دیکھنے کا شوق ہے حریم اس کی چھوٹی بہن اسے سمجھاتی ہے۔

زمین کی سہیلی گل کہتی ہے کہ تمہیں عبادو سیم پوچھ رہا تھا۔

زمین اپنی دوست صوما کی سالگرہ میں جانے کی ضد کرتی ہے لیکن اس کی اماں کو اعتراض ہوتا ہے کہ جوان جہان لڑکی آدھی رات کو سالگرہ میں سے واپس آئے گی تو محلے والے کیا کہیں گے۔ اس کے اصرار پر ابا سے جانے کی اجازت
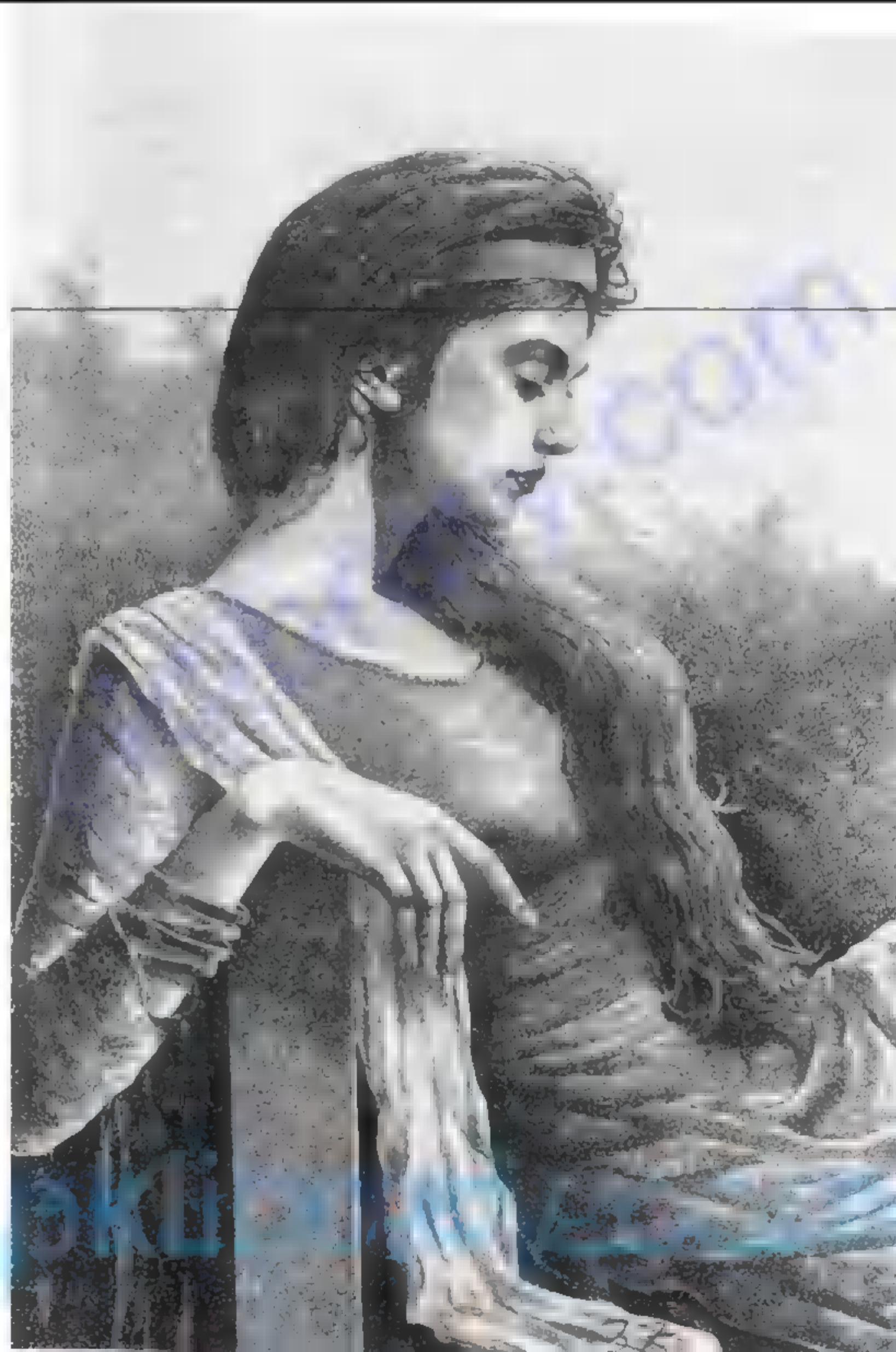
دے دیتے ہیں لیکن اس کی اماں ناراض ہی رہتی ہیں۔
زمین صوما کی سالگرہ کی تقریب میں (جو کہ ہیم پر تھی) گھر سے تیار ہو کے نہیں جاتی بلکہ گل کے گھر سے تیار ہو کر جاتی ہے۔ راستے میں گل رانا سعید سے عباد وسیم کے متعلق بات کرتی ہے کہ رانا سعید عباد کا دوست ہے وہ عباد سے زمین کی دوستی کرا دے۔ وہ کہتا ہے کہ اپنی دوست کو بربادی کے راستے پر مت ڈالو۔ پارٹی میں زمین کی عباد سے ملاقات ہوتی ہے لیکن وہ کسی الطاف کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگلی ملاقات میں گل بتاتی ہے کہ عباد وسیم، رانا سعید سے تمہارا پوچھ رہا تھا۔ زمین بے یقین ہوتی ہے۔
وہ اپنے حواس میں نہیں تھی۔ فیملی ڈاکٹر فریحہ کی ویسے کی صبح اس کا چیک کرنے آیا تو اس نے کہا کہ شاکڈ اور ڈپریسڈ ہیں، میڈیسن دوں، آرام کرائیں شام تک بہتر ہو جائیں گی۔

گل زمین کو آفس کے بعد لے کر کلب آ جاتی ہے زمین کا موڈ آف ہے۔ وہاں ان کی ملاقات عباد وسیم سے ہوتی ہے۔ دونوں کے درمیان رکھائی سے بات چیت ہوتی ہے۔ عباد وسیم ان کے جوس کا بل ادا کر دیتا ہے۔ زمین کو برا لگتا ہے۔
نصرت زلفی کو کہتی ہیں کہ اٹھ کر دکان پر چلا جا لیکن وہ نہیں سنتا۔ وہ زمین کی ہم راہی کا خواب دیکھتا ہے نصرت کہتی ہیں کہ وہ پڑھی لکھی لڑکی تجھ سے شادی سے انکار کر دے گی۔ زلفی کہتا ہے کہ وہ میرے بچپن کی منگ ہے۔
زمین کے پاس چھٹی والے دن عباد کا فون آتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ دن گزارنا چاہتا ہے۔ زمین، گل کے گھر کا بہانہ کر کے اس کے بتائے ہوئے ریسٹورنٹ میں اس کا انتظار کرتی ہے۔
عباد وسیم کے ساتھ ایک بھرپور دن گزار کر زمین خوشی خوشی گھر لوٹ آتی ہے۔ زمین کو اس کی کھوجتی چمکتی آنکھوں کی گہرائی کا اندازہ نہیں ہوتا۔
زمین کی غیر موجودگی میں اماں کے پیٹ میں درد ہوتا ہے۔ حریم ابا کے گھر میں نہ ہونے کی وجہ سے زمین کو فون کرتی ہے، فون بند ہونے کی صورت میں وہ تھک ہار کر گل کے نمبر پہ کال کرتی ہے، اسے مبارک باد دیتی ہے تو وہ حیران رہ جاتی ہے کہ کس چیز کی مبارک باد اور اپنے گھر میں صبح سے کپڑے دھونے کی مظلومیت کا رونا روتی ہے۔ حریم پریشان ہو جاتی ہے۔ ابا آ جاتے ہیں وہ اماں کو ڈاکٹر کے پاس لے جاتے ہیں۔
زمین کے آنے پر حریم اس سے پوچھتی ہے کہ وہ کہاں گئی، زمین سچ اسے بتا دیتی ہے۔
عباد وسیم، رانا سے ملتا ہے تو زمین کی بات ہوتی ہے، رانا کہتا ہے کہ وہ شریف گھرانے کی ہے اس کو بخش دے۔ عباد ہنسنے لگتا ہے۔
مائرہ صبح صبح پھپھو کے گھر پہنچتی ہے جہاں عباد وسیم اور نزہت ناشتہ کر رہے ہیں۔ مائرہ اور نزہت کی معنی خیز باتوں سے انجان بنتا عباد وہاں سے اٹھ کر چلا جاتا ہے۔
حریم بے ساختہ میرب کو پیار کرتی ہے، وہ گھبرا جاتی ہے۔
نزہت گھر واپسی پر حریم کو کہتی ہیں کہ وہ میرب کے سلسلے میں کوئی کوتاہی برداشت نہیں کریں گی۔
حریم عباد وسیم کے بارے میں معلومات حاصل کرنے اس کے شوروم تک آ جاتی ہے عباد اسے دھمکاتا ہے وہ اس سے کہتی ہے کہ تم خراب کیریکٹر کے ہو۔ میری بہن کا پیچھا چھوڑ دو۔ زمین پتا چلنے پر ناراض ہوتی ہے اور عباد سے معذرت کرتی ہے وہ معذرت قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔
مارک ڈینیئل کو بتاتا ہے کہ اس کی مسلمان لڑکے سے دوستی ہے۔ نصرت پھپھو تاریخ طے کرنے کے لیے مٹھائی اور شادی شدہ بیٹی کو لے کر آتی ہیں۔ زمین گھر میں نہیں ہوتی۔
حریم کو وہ اس کے گھر لے کر آتا ہے اماں اور طوبیٰ بہت خوش ہوتی ہیں لیکن بابا کے آنے سے پہلے اسے جانے کا کہتی ہیں۔
عباد کی برتھ ڈے کے موقع پر عباد زمین کو اپنے فلیٹ پر تنہا بلاتا ہے، وہاں جانے کے بعد زمین کو باپ کی بات یاد آتی ہے کہ دو نامحرموں کے بیچ تیسرا ہمیشہ شیطان ہوتا ہے۔
عباد زمین کو اپنے فلیٹ پر بلاتا ہے۔ اس کے قریب آنے پر وہ وہاں سے واپس آ جاتی ہے۔ عبد کی پرکھ کر وہ پورا اترتی ہے۔ ادھر نصرت پھپھو تاریخ لینے آ جاتی ہیں۔ اماں اور حریم کے پوچھنے پر زمین شادی کی ہامی بھر لیتی

ہے۔ نصرت، پھپھو اور زلفی خوش ہو جاتے ہیں۔ کجل فون کر کے زمین کو لاتی ہے۔ وہاں عباد وسیم موجود ہوتا ہے اور اسے پروپوز کرتا ہے۔ زمین خوشی خوشی گھر آتی ہے۔
رات میں حریم زیم سے کہتی ہے کہ شادی کا کارڈ پسند کرلو۔ وہ کہتی ہے پہلے لڑکا تو پسند کرلوں۔ پھر اسے بتاتی ہے کہ عباد وسیم نے اسے پروپوز کیا ہے۔ دروازے میں کھڑی اماں یہ سن کر بے سدھ ہو کر گر پڑتی ہیں۔

چودھویں قسط

سب اداس لوگوں کی ایک سی کہانی ہے
ایک جیسے لہجے ہیں، ایک جیسی تانیں ہیں
شہر یار پر سب کی ایک سی اڑانیں ہیں
سب اداس لوگوں کے بے مراد ہاتھوں پر
ایک سی لکیریں ہیں
سب کے زرد ہونٹوں پر
قرب کی مناجاتیں، وصل کی دعائیں ہیں
بے چراغ راتوں میں بے شمار شکنوں کے
ایک سے فسانے ہیں
کھلکھلاتے لمحوں میں بے وجہ اداسی کے
ایک سے بہانے ہیں
اشک آنکھ میں رکھ کے مسکرانے کی
ایک سی تشریحیں، ایک سی وضاحت ہے
ایک جیسے شعلوں میں سب کے خواب جلتے ہیں
ایک جیسی باتوں پر سب کے دل دھڑکتے ہیں
سب اداس لوگوں کی ایک سی کہانی ہے

حریم نے اس ساری گرما گرمی کے بعد حالات کا احتجاباً آتے دیکھا تو غیر جانب داری سے اپنا جائزہ لینے پر مجبور ہو گئی۔ وہ چاہے جیسے بھی بدتر حالات میں یہاں تک پہنچی ہو...... لیکن آگے اپنی زندگی کو اس نے اپنے ہاتھوں سے تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔
واقعی..... کجل نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اس سارے معاملے میں ایک وہی بے وقوف تھی۔ جو خواہ مخواہ کی جذباتیت میں اپنے بگڑے حالات کو خراب سے خراب تر کرتی چلی جا رہی تھی۔ جو یقیناً نازرہ کے حق میں جاتا۔
"مجھے کچھ وقت دو پلیز...... میں میرب کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتی۔" حریم نے اپنے آنسو اندر اتارتے ہوئے کہا۔
(میرے یہاں ہوتے ہوئے کوئی میرب کے ساتھ اتنی نفرت کا اظہار کر رہا ہے میرے بعد تو شاید اس سے بھی برا کرے)
اس نے عجیب سی نگاہوں سے حریم کو دیکھا۔
"سب کچھ ہی تمہارا تھا۔ تم ہی کو ٹھیک سے استعمال کرنا نہیں آیا۔"
"میں اب سب کچھ ٹھیک کرنا چاہتی ہوں۔ پلیز۔" اس نے اضطراری طور پر کہتے ہوئے بے اختیار اس کا

ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا، اس نے ایک نظر حریم کے ہاتھوں میں تھمے اپنے ہاتھ پر ڈالی دوسری حریم کے ستے ہوئے چہرے پر۔

''اوکے۔'' اس نے بے تاثر لہجے میں کہا۔

''لیکن یہ لاسٹ چانس ہے حریم مصطفیٰ! اس کے بعد تمہیں یہاں سے جانا پڑے گا۔ اس گھر سے بھی اور یقیناً ہماری زندگیوں سے بھی۔''

اس نے حریم کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ محسوس کرتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں سے چھڑایا تو وہ خجل سی ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔

''میرب کے ہر اچھے برے کی ذمہ دار اب تم ہو حریم! میں ایک منٹ نہیں لگاؤں گا تمہیں گھر سے باہر کرنے میں۔''

وہ واپس بیڈ کی طرف پلٹ گیا تو حریم نے بے اختیار پرسکون سی ہو کر گہری سانس لی وہ یقیناً آنے والے دنوں میں اپنی زندگی کو بہتر بنا سکتی تھی...... لیکن شاید یہ اس کا خیال ہی تھا۔

مائرہ نے اس گھر میں اپنے قدم جمانے کی پوری تیاری کر رکھی تھی، وہ روزانہ صبح ناشتے کے وقت پہنچ جاتی، اپنی پھپھو اور اس کے بیٹے کے ساتھ گپیں لگاتی اور پھر اس کے شوہر کے ساتھ بڑے استحقاق کے ساتھ گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھ کر آفس کے لیے نکل جاتی۔

ایسے میں نزہت کے لیے حریم کو سنبھلنے کے لیے ایک اور چانس دینا سخت ناپسندیدہ عمل تھا۔

''اسے میرب کی آیا گیری کرنے دیں پھپھو! اس سے آگے نہیں بڑھ سکے گی وہ۔'' مائرہ نے نخوت سے کہا تو انہیں خاموش ہونا پڑا۔ ویسے بھی وہ جانتی تھیں مائرہ کو میرب میں زیرو پرسنٹ بھی دلچسپی نہیں تھی، حریم کا اسے سنبھال لینا مائرہ کے لیے جان کی خلاصی کا باعث تھا، اسے میرب کو مصنوعی طور پہ پچکارنا بھی پہاڑ لگتا تھا، عباد اور زمین کی محبت کی جیتی جاگتی نشانی پہ اسے پیار آ بھی کیسے سکتا تھا۔ انہوں نے گہری سانس کھینچی اور ناشتے کے بعد کی میڈیسن کھانے کے لیے اٹھ گئیں۔

''سنو......'' وہ مائرہ کے پیچھے آفس کے لیے نکل رہا تھا جب سن گلاسز بالوں پہ چڑھاتے ہوئے حریم کی آواز پہ ٹھٹکا۔

''موسم بدل رہا ہے۔ میرب کی کچھ شاپنگ کرنی ہے میں نے۔''

''ہم...... اپنی آؤٹ لٹ پہ موجود ہے سب کچھ......''

''میں خود میرو کے لیے اپنی پسند سے لینا چاہتی ہوں۔'' حریم نے کہا۔

''ڈرائیور کے ساتھ آ جانا۔'' وہ کہتے ہوئے واپس ہوا۔

''اے۔ ایک اور بات بھی تھی۔'' وہ گہری سانس بھرتے ہوئے پلٹا۔

''وہ...... میں اماں سے ملنے جانا چاہتی ہوں۔''

''تو جاؤ۔ کس نے روکا ہے۔''

''میں...... میرب کو ساتھ لے جانا چاہتی ہوں۔'' وہ اٹکی۔

''نہیں۔'' وہ فی الفور سختی سے بولا۔

''تم میرب کو اپنے ساتھ کہیں نہیں لے جا سکتیں حریم! یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ خود جہاں تمہارا دل کرتا ہے جاؤ، کوئی پابندی نہیں تم پر۔''

وہ جس انداز میں بات ختم کر کے گیا تھا اس نے حریم پہ واضح کر دیا کہ وہ اب میرب کے معاملے میں اس پر

اعتبار نہیں کرتا تھا۔ اسے موقع شاید مجبوراً دیا تھا کہ اپنی غلطی سدھار سکے۔ وہ تھکے ہوئے انداز میں پیچھے کرسی پہ ڈھے گئی۔

زندگی اک جہد مسلسل بن گئی تھی۔ روز نیا کنواں کھودنا پڑ رہا تھا...... نئی توانائی...... نئی سوچ...... نئی امید...... اور حاصل وصول کچھ بھی نہیں۔

☆☆☆

"بھئی، شادی میں ابھی کافی وقت سہی.... پر میرا دل ہے کہ اپنی بہو کی پسند سے کپڑے لتے خرید کر اس کا بکسا بھر دوں۔ آٹھ دس ماہ گزرتے کون سا وقت لگتا ہے۔"

نصرت چائے میں بسکٹ ڈبوتی بڑے لاڈ سے کہہ رہی تھیں۔ اماں کے چہرے پہ مسکراہٹ نے چمک پیدا کردی۔ طوبیٰ نے بے اختیار حریم کا زرد پڑتا چہرہ دیکھا۔

"تم نے تو تیاری شروع کردی ہوگی۔" نصرت بھابی کا چہرہ دیکھتے ہوئے وثوق سے بولیں پھر ان کے کچھ جواب دینے سے پہلے ہی کہنے لگیں۔

"ہاں بھئی۔ لڑکیوں کے تو سو ارمان ہوتے ہیں، جہیز میں یہ بھی ہو، وہ بھی ہو...... کپڑا لتا، زیور فرنیچر...... عین شادی کے روز بھی بازار کا ایک چکر لازمی ہوتا ہے ان کا۔"

"بالکل۔ بیٹیوں کے لیے تو ان کے پیدا ہوتے ہی مائیں جہیز جمع کرنے کی تیاری کرنا شروع کردیتی ہیں۔" اماں مسکرائیں تو نصرت کا چہرہ کھل گیا۔

"واہ۔ یہ اچھی کہی۔ میں تو بھی کہیں یہ نہ ہو وہ اللہ ماری زمین زیور پیسہ لے اڑی ہو بھاگتے وقت۔" طمانیت سے کہا تو جہاں اماں کا کلیجہ کسی نے نوچ لیا وہیں دونوں بہنوں کے چہروں کی رنگت بھی بدل گئی۔

"دل پہ مت لینا۔ بس یونہی بات سے بات نکل آئی۔ کیا کروں یہ نگوڑ ماری زبان...... ورنہ سوچ لیا تھا زندگی بھر اس خبیث کا نام نہیں لوں گی اپنی زبان سے۔" ان تینوں کی یک دم خاموشی نے نصرت کو گڑبڑا دیا تو تنک کر بولیں۔

"اس نے صرف اپنی مرضی سے شادی کی ہے۔ باقی یہاں سے کچھ نہیں لے گئی۔" اماں نے بڑے حوصلے سے جواب دیا تھا۔

"ائے۔ باپ کی عزت تو پیچھے رہنے نہ دی اور کیا لے جاتی ساتھ۔ خیر دفع کرو۔ یہ بتاؤ سلامی کیا دے رہی ہو زلفی کو؟ ابھی کافی مہینے پڑے ہیں بیاہ میں۔ اس لیے سوچا بات پہلے ہی کھول دوں تاکہ اگر بیسی وغیرہ ڈالنی ہو اس مد میں تو ڈال لینا۔" نصرت بڑی بے تکلفی بھرے لاڈ سے بولیں۔

"سب حالات تمہارے سامنے ہیں نصرت! ایک اکیلے تمہارے بھائی صاحب کمانے والے ہیں۔ باقی جو بچت ہے اس سے بیٹیوں کے لیے ہر ماہ کچھ نہ کچھ خرید کے پیٹی میں رکھ دیتی ہوں۔"

"اے لو...... بھائی صاحب کی کمائی کیوں، میری بہو بھی تو کماتی ہے۔ بھئی میرا تو دل ہے بلکہ زلفی کا بھی خیال ہے کہ حریم کی تنخواہ سے کمیٹی ڈال کے سلامی میں اسے موٹر سائیکل دے دو نئی نکور...... کبھی آرام بھی تو حریم کا ہی ہوگا۔ زلفی کو تو بس اس کا ڈرائیور ہی سمجھو۔"

وہ اپنی بے تکی اور بیہودہ باتوں کے بعد بھونڈے انداز میں ہنسیں۔ حریم نے شکایتی نظروں سے ماں کو دیکھا اور چائے کے برتن لیے وہاں سے چلی گئی۔

"آ ہاں...... بات یہ ہے کہ حریم کے ابا اس کی نوکری چھڑوا رہے ہیں۔ ایسے میں موٹر سائیکل کہاں سے آئے گی۔"

''ائے ہئے۔ کیوں...... نوکری کیوں چھڑوا رہے ہیں؟'' نصرت اچھلیں۔
''بھئی میرے بیٹے کی تو خواہش ہے نوکری والی بیوی ہو۔ بھلا آج کے دور میں کہاں گزارا ہوتا ہے ایک کی کمائی سے۔ سمجھاؤ بھائی صاحب کو۔ یہ کون سا دور ہے بچی کو پڑھا لکھا کے گھر بند کر کے بٹھانے کا۔''
نصرت سخت بدمزہ ہوئیں جیسے اپنی بچی پتا نہیں پڑھ لکھ کر کتنے گریڈ کی آفیسر لگی ہوئی ہو۔
''اچھا اچھا، تم دل پہ مت لو۔ بات کروں گی اس کے ابا سے میں۔'' اماں نے گھبرا کر کہا۔
''ہم ایسے چھوٹے دماغ کے لوگ نہیں ہیں بھابھی! کہ ایک بہن کی کرنی کا الزام دوسری پہ لگا کر اسے گھر کے جیل خانے میں بند کر دیں۔ خیر سے ہم حریم کا نوکری کا شوق شادی کے بعد بھی پورا کروائیں گے۔''
نصرت اب بظاہر بڑی اپنائیت سے کہہ رہی تھیں۔ اماں سر ہلاتی سنتی رہیں۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ نین کی کرنی پہ شرمسار ہوں یا نند کی ''وسیع القلبی'' پہ خوشی کا اظہار کریں۔
''شرم تو نہیں آتی پھپھو کو...... لالچی کہیں کی۔ اتنا ہی شوق ہے نئی موٹر سائیکل کا تو اپنی کمائی سے لیں زلفی بھائی۔ اب آپ خرید کر دیں گی انہیں اپنی کمائی سے۔''
طوبیٰ نے اندر سب اچھی طرح سنا اور اب وہ بگڑ کر حریم سے بولی جو خود منجمد سی کیفیت میں بیٹھی پھپھو کے ارشادات سن رہی تھی۔
''اماں ابا کو چاہیے کہ ہمیں کنویں میں دھکا دے دیں۔ کم از کم وہ پھپھو جیسے لوگوں کے گھر سے تو بہتر ہوگا۔'' وہ دل برداشتہ تھی۔
''تم فکر مت کرو طوبیٰ! میں تمہارے ساتھ ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گی۔''
حریم نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے یقین دلایا۔ پھیکا پڑتا چہرہ، غم سے نم ہوتی آنکھیں لیکن ماں جائی کے لیے امڈتا پیار اور فکر۔ طوبیٰ تڑپی۔
''تو میں کیوں ہونے دوں آپ کے ساتھ یہ سب آپی! مجھے بھی آپ سے اتنی ہی محبت ہے۔''
حریم نے اسے بانہوں کے گھیرے میں لے کر ساتھ لگا لیا۔
''اللہ کی آزمائش بھی ہوتی ہے بعض لوگوں کے لیے۔ میرے لیے بھی یقیناً بہتر ہی ہوگا۔'' حریم نے اس کے ساتھ ساتھ یقیناً خود کو بھی تسلی دی تھی۔

☆☆☆

وہ بتائے بنا واپس پہنچا تو کیتھی کے لیے سرپرائز ہی تھا، وہ بھی تب جب کیفے بند ہوتے وقت اس کی ساتھی ویٹرس نے اس کی توجہ دلائی۔
''ہے کیتھ! وہ تمہارا اسپیشل کسٹمر لگ رہا ہے مجھے۔'' کیتھی نے ایپرن کی گرہ کھولتے ہوئے بے توجہی سے مڑ کر دیکھا۔
''وہ اسٹوپڈ تو پاکستان جا کر بیٹھ ہی گیا ہے، وہ یہاں کہاں۔''
اور پھر زیاد کی دلکش مسکراہٹ سے سجے چہرے کو دیکھ کر گویا وہیں جم گئی۔ زیاد نے ہاتھ ہلایا تو وہ ہوش میں آئی، ایپرن کاؤنٹر پہ پٹخا اور تقریباً بھاگتی ہوئی اس کی ٹیبل کی طرف آئی۔
''یو اسٹوپڈ۔ بتایا کیوں نہیں، کب سے آئے ہوئے ہو واپس؟'' اس کا چہرہ جگمگا اٹھا تھا۔ زیاد ہنستے ہوئے اٹھا۔
''لکنگ ہینڈسم۔'' کیتھی نے اس کی نکھری صحت پہ نظر ڈالتے ہوئے محبت سے کہا تو زیاد نے ابرو اچکایا۔
''جسٹ لکنگ...... (صرف دکھائی دے رہا ہوں؟)''

کیتھی نے ہنستے ہوئے اس کے شانے پر ہاتھ مارا اور اس کے ساتھ ہی باہر نکل آئی۔
"واقعی ہینڈسم ہو بھئی۔ اس قدر خوشی ہو رہی ہے مجھے تمہارے واپس آنے کی کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔"
اس کا بازو دونوں ہاتھوں سے تھام کر بھینچتے ہوئے کیتھی نے جذب سے کہا۔
"سوچ سکتا ہوں...... کیونکہ مجھے بھی اتنی ہی خوشی ہو رہی ہے تمہیں دیکھ کر۔" وہ کھل کر مسکرایا۔
"وہاں سب ٹھیک ہے؟"
"ہم...... بھائی نے پسند کی شادی کر لی۔ مما اور ڈیڈ نے اسے گھر سے نکال دیا۔ وہ اب الگ فلیٹ میں رہتا ہے۔ بھائی کی منگنی ٹوٹنے سے ماموں کی فیملی ناراض ہے۔ بھائی کی منگیتر کو میرے سر منڈھنے کی کوشش کی جا رہی تھی، باقی سب ٹھیک ہے۔" وہ گہری سانس بھرتے ہوئے بولا۔ کیتھی نے آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھا۔
"ہائے رہ کیا گیا ہے؟"
"ہاں...... یہ تمہارا بندہ بچا ہے مشکل سے۔" وہ سینے پہ ہاتھ رکھ کر اس کے سامنے ذرا سا خم ہوا۔
"انگیجڈ ہو کر تو نہیں آئے ہو؟"
کیتھی نے اس کا ہاتھ تھام کر الٹ پلٹ کرتے گویا کوئی رنگ کوئی چھلا ڈھونڈنے کی سعی کی۔ زیاد نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور معنی خیز انداز میں اسے دیکھتے ہوئے بولا۔
"یہاں جو ہو چکا تھا وہاں کیسے انگیجڈ ہوتا۔" کیتھی کے چہرے پہ ہنسی کھل اٹھی۔
"ویری گڈ...... بچ جا رہے ہو۔"
"تم بتاؤ۔ اسٹڈیز کیسی جا رہی ہیں؟" زیاد نے پوچھا۔
"بہت کچھ سیکھ لیا ہے، جان لیا ہے۔ لیکن طلب ہے کہ اور بڑھتی ہے۔ مزید جاننے کی، مزید گہرائی میں جانے کی۔ مجھے لگتا ہے زیڈ! اس گہرائی کی تہ میں میرا اپنا آپ ہے۔ ایک بار میں اس گہرائی میں پورا اتر گئی تو خود کو پالوں گی۔" وہ اپنی بات کے اختتام پہ مسکرائی تھی۔
"ان شاء اللہ۔ ایسا ہی ہوگا۔"
"ان شاء اللہ۔"
کیتھی نے جواباً برجستہ کہا تو زیاد کھل کر مسکرایا۔ اس کے دل میں سکون کی لہر اترتی چلی گئی۔ زندگی کا حساب کتاب بالکل کلیئر ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔
مگر کیا زندگی اتنی ہی آسان ہوا کرتی ہے ہر کسی کے واسطے؟ تو پھر یہ امتحان اور آزمائشیں کیا ہیں اور کن لوگوں کے لیے اتاری جاتی ہیں؟
یہاں دونوں میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔

☆☆☆

"اب کافی وقت گزر چکا ہے کیتھ! گزری باتوں پہ دھول پڑ چکی۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم اور مارک ایک بار پھر اپنے مستقبل کے بارے میں سوچو۔"
پال اور ڈورتھ کے ساتھ ابھی وہ مہینے بھر کی گروسری کے بعد گھر لوٹی تھی، ڈورتھ چیزوں کو کچن میں ٹھکانے پر رکھ رہی تھی تب ہی پال نے نرم خو انداز میں بات شروع کی۔
"میں تو اچھی طرح جانتی ہوں کہ مجھے مستقبل میں کیا کرنا ہے ڈیڈ! آپ مارک کو مشورہ دیں۔ وہ اپنے ذہن کو کسی اور طرف لگائے۔" کیتھی نے روکھے لہجے میں کہا۔
"تم ابھی تک اس کی بچکانہ حرکت کو دل پہ لیے ہوئے ہو جبکہ وہ اس پہ شرمندہ بھی ہے اور کئی مرتبہ معافی بھی

مانگ چکا ہے۔"

"مجھے ایسے مرد بالکل بھی پسند نہیں ہیں ڈیڈ! اور بار بار غلطیاں کر کے معافی مانگنے والے تو مجھے مرد ہی نہیں لگتے۔" کیتھی نے سرد لہجے میں کہا وہ باپ کو تھی سی امید کا سرا ابھی نہیں تھمانا چاہتی تھی۔

"کیتھی! تم اسے بچپن سے جانتی ہو۔ وہ صرف بے وقوف ہے۔"

"اور آپ کیا سمجھتے ہیں آپ کی بیٹی زندگی گزارنے کے لیے ایک بے وقوف شخص کو چنے گی؟"

"نن...... نہیں۔" پال گڑبڑایا۔

"کم آن ڈیڈ! موو آن۔ مجھے مارک سے شادی کرنے میں ایک فیصد بھی دلچسپی ہوتی تو میں انگوٹھی واپس نہ کرتی۔ اب اس موضوع کو ہمیشہ کے لیے بند کر دیں۔" وہ اکتا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"لیکن مجھے امید ہے میری بچی! کہ تم نے جب بھی شادی کی یقیناً ہمارے مذہب کا نام روشن کرنے کا باعث بنوگی۔"

ڈورتھی نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بڑی خوب صورتی سے بات بدل کر اسے گویا پابند کیا تھا۔ کیتھی نے چہرہ موڑ کر ماں کو دیکھا۔ اس کے تیکھے نقوش والے چہرے پر عام سی مسکراہٹ تھی لیکن کیتھی جانتی تھی اس کے الفاظ عام نہیں تھے۔ یہودیوں کی کمیونٹی میں ان کی فیملی ایک خاص مقام رکھتی تھی۔ اس کا باپ تبلیغ کی حد تک اپنے مذہب کا پرچار کرتا تھا اور اسے کمیونٹی کی طرف سے اس مد میں پیسہ بھی ملتا تھا ایسے میں وہ اپنی بیٹی کی شادی کرتے وقت احتیاط سے کام لینا چاہتے تھے۔

"آئی ہوپ سو مما! (مجھے امید ہے)۔" کیتھی مدھم سا مسکرائی۔ ڈورتھی کی دوررس نگاہوں میں فکرمندی کی جھلک تھی۔

☆☆☆

"کیتھ! لسن...... میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" وہ کچھ کتابیں خریدنے آئی تو واپسی پر مارک نے اسے روک لیا۔

"میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا کہ مجھ سے اب کبھی بات مت کرنا۔" کیتھی نے اسے گھورا۔

"کم آن کیتھی! ہم کزنز ہیں۔ بچپن کے اچھے دوست ہیں۔" مارک کا لب و لہجہ گزشتہ سے بہت بدلا ہوا تھا۔

"وہ سب ختم ہو گیا مارک! تمہارے میرے راستے الگ ہیں اب۔" وہ رکھائی سے کہتی اپنی کتابوں کا لفافہ سنبھالتی بس اسٹاپ کی طرف بڑھی۔ مارک لمبے ڈگ بھرتا اس کا ہم قدم ہوا۔

"آئم سوری۔ تمہیں میری وجہ سے تکلیف ہوئی۔"

"وہ تو اب ہو گئی نا۔" کیتھی جھنجلائی۔ "گزرا وقت واپس نہیں آسکتا۔"

"تم چاہو تو میں تمہارے دوست سے بھی سوری کہہ سکتا ہوں۔" مارک کی بات پر کیتھی کی آنکھیں پھٹنے والی ہو گئیں۔

"تم پی کر تو نہیں آئے؟ اتنے اچھے خیالات بنا نشے کے کبھی نہیں ہو سکتے تمہارے۔"

"نہیں، میں نشے میں نہیں ہوں۔ ڈیڈی کا خیال ہے کہ ہم دونوں کو آپس میں صلح کر لینی چاہیے۔" مارک کے منہ سے پھسلا اور ساتھ ہی اس نے دانتوں تلے زبان دبائی لیکن بے فائدہ۔

"اوہ۔" کیتھی نے گہری سانس کھینچی۔ "تو یہ ڈیڈی کے الفاظ بول رہے ہو تم۔"

"نہیں نہیں...... سچ میں، میں چاہتا ہوں کہ ہم دوبارہ ایک ہو جائیں۔"

"یہ سب باتیں ہم پہلے بھی کر چکے ہیں مارک! اور یقین جانو، ان کو بار بار دہرانے سے کچھ بھی حاصل نہیں

ہوگا۔ ہمارے درمیان جتنی دوری ہے اتنی ہی رہے گی، دوسرے یہ کہ میں نے ڈیڈ کو صاف لفظوں میں بتا دیا ہے کہ اب یہ رشتہ دوبارہ کبھی نہیں جڑ سکتا۔" وہ خشک لہجے میں کہتی سامنے رکنے والی بس کا آٹومیٹک دروازہ کھلتے ہی جلدی سے بس میں سوار ہوگئی۔ مارک نے دانت پیستے ہوئے جاتی ہوئی بس کو کینہ توز نظروں سے دور تک دیکھا۔

"اچھی طرح جانتا ہوں میں کن ہواؤں میں اڑ رہی ہو۔ بس ذرا ثبوت آ لینے دو میرے ہاتھ...... منہ کے بل گراؤں گا تمہیں۔"

☆☆☆

"کب تک ایسے گھر والوں سے دور رہو گے۔ معافی مانگو اور زرمین اور بچی کو لے جاؤ گھر۔ ماؤں کا دل تو ویسے بھی بہت نرم ہوتا ہے دیکھنا فوراً معاف کر دیں گی۔" رانا سے بڑے عرصے کے بعد نجل کی شادی کے دوران عباد اور زرمین کی ملاقات ہوئی تھی۔

"وہ اور مائیں ہوتی ہیں...... میری مما کو اپنی بھتیجی کا دکھ میری خوشی سے زیادہ ہے۔" عباد کھل کے مسکرایا۔

"یہ تو تم سوچتے ہو نا۔ ایک ماں کے لیے سب سے مشکل کام اولاد سے دور رہنا ہے عباد! وہ صرف زرمین کی وجہ سے اس دوری کو برداشت کر رہی ہیں اگر تم اکیلے ہوتے تو دوسرے ہی دن جا کر منالاتیں تمہیں۔"

"اس کی اپنی لاپروائی بھی ہے بھائی!" زرمین نے ان کی گفتگو میں حصہ لیا اور شکایتی انداز میں عباد کو دیکھ کر رانا کو بتانے لگی۔

"اب تو میں بھی اسے کہتی ہوں کہ دونوں میرب کو لے کر ان کے سامنے چلے جاتے ہیں، زیادہ سے زیادہ ڈانٹ پڑ جائے گی۔ گھر سے تو نہیں نکالیں گی نا۔ لیکن اس کے سر پہ اپنا فلیٹ ہونے کا نشہ ہے۔ اگر بے گھر ہوتے تو شاید جلدی لوٹ جاتے واپس۔"

"میں پرسکون چلتی زندگی میں کوئی انتشار نہیں چاہتا یار۔ اچھی بھلی زندگی میں کبھی بیوی کے گلے تو کبھی ماں کے شکوے شامل ہو جائیں گے۔ دور ہیں تو اس میں بھی اللہ کی بہتری ہے۔"

عباد مطمئن تھا لیکن زرمین کے بے سکون دل کو کوئی کیسے سکون دیتا۔ اتنی جائداد اور شاندار کوٹھی ہونے کے باوجود وہ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں محدود سی زندگی گزارنے پر مجبور تھی جبکہ کیملی ہاؤس جا کر بڑی بڑی پارٹیز اٹینڈ کرنا اور بیگم تیمور کی حسین بہو کے طور پہ مشہور ہونا اس کا خواب تھا جو حقیقت بن کر ہی نہیں دے رہا تھا۔ اوپر سے عباد کے خیالات۔

"سن لیں آپ۔" زرمین نے رانا سے کہا۔

"یعنی تمہارا ساری عمر اسی فلیٹ میں زندگی گزارنے کا پلان ہے؟" رانا نے زرمین کا مطلب سمجھتے ہوئے عباد کو گھورا۔

"نہیں خیر...... ایسا بھی نہیں۔ بس مائرہ کی کسی اچھی جگہ شادی ہو جائے تو پھر مما کا دھیان بٹ جائے گا۔ اسی چکر میں بے چارہ زیادہ پھنس رہا ہے مما کے ہاتھوں۔" وہ ہنسا۔

"میں ذرا نجل کے پاس جا رہی ہوں برائیڈل روم میں۔ کہیں میرب جاگ نہ گئی ہو۔" زرمین نے کہا وہ آرام میں سکون سے سوئی میرب کو شور ہنگامے سے پرے نجل کے پاس چھوڑ آئی تھی تاکہ اس کی نیند پوری ہو جائے، باقی فنکشن میں پھر اس کے تنگ کرنے کے چانسز کم ہوتے۔

جبکہ رانا نے اچھی طرح عباد کی برین واشنگ کی تھی۔ تب ہی شادی سے واپسی پر نا جانے کس ترنگ میں اس نے راستے میں زرمین سے پوچھا۔

"کیا خیال ہے پھر...... اپنی سسرال کا چکر لگانا ہے؟" زرمین اس قدر غیر متوقع آفر پہ دنگ رہ گئی۔

''اس وقت۔ دس بجنے والے ہیں۔''
کجل کی شادی میں دوپہر کا فنکشن تھا پھر بھی رخصتی ہوتے اور مہمانوں کے نکلتے نکلتے واپسی پہ کافی وقت ہو گیا تھا۔
''وہاں ابھی ٹاک شو دیکھا جا رہا ہوگا۔''
''نہیں...... ابھی نہیں۔ پھر کسی وقت۔ فی الحال میرا مائنڈ سیٹ نہیں بنا ہوا۔'' زمین کنفیوز ہوئی۔ عباد ہنسنے لگا۔
''بس...... یہی بہادری ہے۔ ساس کا سامنا نہیں کر سکتیں تم۔''
''شٹ اپ۔'' زمین نے اسٹیئرنگ تھامے اس کی کلائی پہ ناخن چبھوئے۔
''اُف! ظالم۔'' وہ جلبلایا۔
''ڈرائیو کرتے ہوئے یوں ڈسٹرب کرو گی تو کہیں ٹھونک دوں گا گاڑی۔''
''ہونہہ۔'' وہ ناراض ہو کر بیٹھ گئی۔ ''ایسے منہ اٹھا کر کیسے جا سکتے ہیں ہم کوئی طریقہ ہوتا ہے۔''
''اپنے گھر جانے کا کون سا طریقہ ہوتا ہے بھلا۔'' وہ سی ڈی پلیئر آن کرتے ہوئے اسے چھیڑ رہا تھا۔
''ہاں نا۔ میں گفٹس لے کر جاؤں گی مما اور ڈیڈ کے لیے......
اور ایسے تھکی ہوئی شکل لے کر نہیں بلکہ فریش۔'' وہ مسکراتے ہوئے اپنا پروگرام بتا رہی تھی۔ گاڑی میں مترنم سی آواز گونجنے لگی۔

تم حقیقت نہیں ہو حسرت ہو
جو ملے خواب میں وہ دولت ہو
کس لیے دیکھتی ہو آئینہ
تم تو خود سے بھی خوب صورت ہو
داستاں ختم ہونے والی ہے
تم میری آخری محبت ہو

گاڑی میں معنی خیز سی خاموشی چھا گئی۔ غزل مکمل ہو چکی تھی۔
''آ ہم...... میں آخری...... تو پہلے والیوں کے بارے میں کیا خیال ہے جناب کا؟''
زمین نے کھنکھارتے ہوئے تیکھا سا سوال کر کے اس غزل کے بولوں کے فسوں کو توڑا تو عباد بے اختیار قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔
''جو موجود ہو وہی حقیقت ہوا کرتی ہے سویٹ ہارٹ!''
''تم خوش ہو اس زندگی سے عباد!'' زمین کو جانے کیا خیال آیا تھا پھر اضافہ کیا۔
''مطلب...... میرے ساتھ۔ یوں سب سے الگ تھلگ۔''
''بہت۔'' عباد کا جواب فوراً سے پہلے آیا۔ ''بلکہ کبھی کبھار تو مجھے ڈر لگتا ہے کہ بنا کسی آزمائش اور امتحان کے اتنی خوش گوار زندگی جس میں سب کچھ حاصل ہو، اسے نظر ہی نہ لگ جائے۔''
''اللہ نہ کرے۔'' زمین نے دہل کر کہا۔ عباد نے ہنستے ہوئے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔

☆☆☆

''نصرت باتوں باتوں میں جہیز کے لیے کافی سنا گئی ہے۔ ذرا دھیان کریں اب اس طرف، شاید موٹر سائیکل کی بھی خواہش ہے زکی کو سلامی کے طور پہ۔'' اماں نے مصطفیٰ صاحب کے پیروں کا مساج کرتے ہوئے

پر تشویش مگر دھیمے لہجے میں کہا تو انہیں دھچکا لگا۔
"اسے پتا بھی ہے ہمارے حالات پھر بھی...... اپنوں میں رشتے کا تو یہی مقصد ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کا پردہ رکھ لیا جائے۔"
"بلکہ وہ تو کہہ رہی تھی کہ حریم کی نوکری بھی نہ چھڑوائی جائے، کیونکہ زلفی کو پسند ہے کہ اس کی بیوی نوکری کرتی ہو۔" اماں نے ڈرتے ڈرتے بتایا تو ابا کا چہرہ لال ہو گیا۔ اپنے پاؤں ان کے سامنے سے ہٹاتے ہوئے وہ اٹھ بیٹھے۔
"دماغ تو خراب نہیں ہو گیا اس کا۔ پتا بھی ہے اسے کہ حالات و واقعات کیا ہیں پھر بھی۔"
"حریم کے ابا! ٹھنڈے دماغ سے سوچیں، جب ہماری بیٹی ان کی بہو بن جائے گی تو وہ چاہے اس سے نوکری کروائیں یا نہیں یہ تو پھر ان کی مرضی ہو گی نا۔ ہمارا کیا اختیار رہ جائے گا بیاہی بیٹی پر۔" اماں نے انہیں سمجھایا۔
"وہ الگ بات ہوتی، لیکن یوں شادی سے پہلے ہی اپنے منہ سے اس طرح کی مانگ کرنا کوئی اچھی بات ہے۔ لولا لنگڑا ہے زلفی کہ کما کر بیوی کو نہیں کھلا سکتا، اور یہ موٹر سائیکل......" انہوں نے تپے ہوئے لہجے میں کہہ کر دانت پیسے۔
"اسے تو میں خوب اچھی طرح سے سلامی دوں گا...... دیکھنا تم۔"
"بات مت بگاڑیے گا میاں! ہم تو پہلے ہی داغ دار چادر لیے بیٹھے ہیں سر پر۔" اماں نے انہیں سہولت اور نرمی سے ٹوکا۔
"بس...... یہی بات مار جاتی ہے مجھے۔ ورنہ کسی کی کیا مجال تھی کہ مصطفیٰ احمد کی بیٹیوں کے رشتے مانگتے وقت بھاؤ تاؤ کرتا۔" وہ بجھ سے گئے۔
"اللہ خیر کرے گا۔ کرنے دیں حریم کو نوکری۔ جب ان لوگوں کو اعتراض نہیں تو ہمیں کیوں ہو۔ ابھی چھوڑی تو بعد میں شاید ہی ایسی اچھی نوکری ملے۔" اماں نے انہیں نئی سوچ تھمائی تھی۔
"خیر...... یہ بات تو میں ضرور ہی کروں گا کہ جو بھی دینا ہوا ہم نے اپنی بیٹی کو اس کی قسمت کا لکھا ضرور دیں گے مگر اپنی حیثیت کے مطابق۔ ایسے لسٹ نہ بنا کر دے کوئی مجھے۔"
انہیں بہن سے یہ امید نہیں تھی تب ہی ان کے لب و لہجے سے وہ گھن گرج مفقود تھی جس کا انتظار حریم کر رہی تھی۔
"بنی بات بگاڑ مت دیجیے گا۔ بیٹی والوں کو تو یوں بھی بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے، اور یہ کون سا نیا رواج ہے، پشتوں سے دینے دلانے کی رسمیں چلی آ رہی ہیں۔" اماں نے دھیمے لہجے میں کہا تو انہوں نے تھکے ہوئے انداز میں لیٹ کر آنکھیں موند لیں اماں نرمی سے ان کے پاؤں دبانے لگیں۔

☆☆☆

"میں مسلمان ہونے کا سوچ رہی ہوں۔" کیتھی نے سمندر کنارے ریسٹورنٹ کے اوپن ایئر روف پر لنچ کے دوران سرسری انداز میں کہا تو زیاد نے خوش گوار حیرت میں گھرتے ہوئے کھانے سے ہاتھ روک کر اسے دیکھا۔
"کیا تم پر یقین ہو؟"
"بالکل۔" کیتھی طمانیت سے مسکرائی۔
"تم مسلمان ہونا چاہتی ہو تاکہ مجھ سے شادی کر سکو، کیونکہ تمہیں علم ہے میں کسی غیر مذہب کی عورت سے

شادی نہیں کروں گا۔" زیر لب مسکراتے ہوئے زیاد نے اسے چھیڑا تو وہ سنجیدہ ہوگئی۔
"قطعاً نہیں...... تمہیں دیکھ کر، مل کر، دوستی کر کے تمہاری چاہت میں تمہارے مذہب کو جاننے کا تجسس ضرور ہوا تھا زیڈ! لیکن اب تم مجھے اپناؤ یا نہ اپناؤ وہ بعد کا معاملہ ہے۔ میرا اسلام قبول کرنا میری اپنی زندگی کے لیے میری پہلی ترجیح ہے۔"
وہ کھل کے مسکرایا۔ "تم خوش نصیب ہو، جس کا دل نور سے روشن کر دیا ہے اللہ نے۔"
"بے شک۔" وہ ڈوبتے سورج کو چمکتی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔
"گھر والوں کے بارے میں کیا سوچا ہے تم نے؟"
"کچھ نہیں۔"
"ایسے ہی کوئی قدم مت اٹھانا کہ تمہیں نقصان پہنچ جائے۔"
"وہ تو جب بھی انہیں پتا چلے گا ۔ یہی ہوگا۔ اس لیے پہلے ۔ سوچ رہی ہوں کہ کینٹے کی جاب چھوڑ کر عائشہ نے جو جاب بتائی تھی، وہ شروع کرلوں اور اسی کے روم میں شفٹ ہو جاؤں۔" وہ مطمئن تھی۔
"اور تمہارے پیرنٹس؟" زیاد نے پوچھا تو اس کی آسمان کے سے رنگ جیسی آنکھوں کی چمک قدرے ماند پڑی۔
"ہمارے معاشرے میں اولاد کا خودمختارانہ زندگی گزارنا ایک عام سی بات ہے۔ میں کوشش کروں گی کہ اپنے پیرنٹس سے اچھے روابط رکھ سکوں۔ اپنے بھائی سے دور ہونا مجھے بہت چبھ رہا ہے۔" اس نے رک کر جیسے لہجے کی کپکپاہٹ پر قابو پانے کی سعی کی۔
"لیکن...... دین کامل کو جان لینے کی خوشی اور اپنے اصل کی طرف لوٹ جانے کا احساس زیادہ خوش کن ہے میرے لیے۔" وہ بات کے آخر میں مسکرائی، زیاد نے متاثر ہونے والے انداز میں سر ہلایا۔
"تم بہت بہادر ہو۔"
"بس تم میرا ساتھ کبھی مت چھوڑنا زیڈ!" اس نے جذباتی ہو کر زیاد کو دیکھا۔
"کبھی نہیں...... ان شاء اللہ۔" اس کا لہجہ پر یقین تھا۔ بات اللہ کے چاہنے نہ چاہنے پہ چھوڑ دی گئی تھی تو پھر جو اللہ چاہے۔
"ڈیڈ کا خیال ہے کہ مجھے مارک کے بارے میں پھر سے سوچنا چاہیے۔ ان کے خیال میں وہ بہت بدل چکا ہے۔" کیسی بات بدلتے ہوئے شرارت سے بولی تو وہ اسے گھور کر رہ گیا۔

☆☆☆

"عباد نے معافی مانگ لی ہے۔ اب وہ گھر واپس آنا چاہتا ہے۔ لیکن مجھے مائرہ کی فکر ہے۔ بھائی صاحب کیا سوچیں گے میرے بارے میں۔" نزہت کا فون آیا تو وہ بہت پریشان اور الجھی ہوئی تھیں، زیاد نے گہری سانس بھری۔
"آپ دوسروں کی اولاد اور گھر کی فکر چھوڑیں مما! اپنے گھر اور اس کے سکون کی طرف دھیان دیں۔ مائرہ کوئی اپاہج نہیں ہے خدانخواستہ کہ اب اس کی شادی کہیں اور نہیں ہو سکتی۔"
"تم جانتے ہو مائرہ میرے لیے بالکل بیٹی جیسی ہے زیاد!"
"اور ہم بیٹے نہیں ہیں کیا؟ ہم سے زیادہ آپ کو اس کی خوشیوں کی فکر ہے۔" زیاد خفا ہوا لمحہ بھر کو وہ چپ رہ گئیں۔
"جو تکلیف میں ہو اس کی فکر زیادہ ہوا کرتی ہے۔ بہر حال...... تم سے مائرہ کی شادی کے بعد سب ٹھیک ہو

جائے گا۔ گھر کا ماحول بھی اور رشتے بھی۔" قدرے توقف کے بعد وہ بولیں تو زیاد بھک سے اڑا۔
"مام پلیز! پھر وہی بات شروع مت کیجیے گا۔"
"بات شروع نہیں۔ ختم کرنے کے لیے فون کیا ہے زیاد!" وہ سرد مہری سے بولیں تو زیاد سننے پر مجبور ہوا۔
"عباد گھر واپس آنا چاہتا ہے۔ میں اس کی بیوی کو مالکن بنے اس گھر میں چلتے پھرتے نہیں دیکھ سکتی۔ وہ بھی اس صورت میں کہ میری بیٹی وہاں زندگی کی خوشیوں سے محروم ہو لیکن تم وجہ بن سکتے ہو عباد کی واپسی کی اگر تم مائرہ سے شادی کر لو۔"
"اولاد کی خوشیوں پہ شرطیں مت لگائیں مما!" وہ تلملا پڑا۔
"شرط ہی سمجھ لو..... مجھے اپنا بھائی بہت عزیز ہے اور بیٹی اس سے زیادہ۔ اگر میں اپنے بھائی کی محبت میں اتنا کچھ سوچ سکتی ہوں تو تم بھی اپنے بھائی سے محبت کا ثبوت دو۔"
نزہت نے صاف گوئی سے کہا تو وہ موبائل کو دیکھ کر رہ گیا۔ ان ماؤں کے پاس بھی اولاد کو بلیک میل کرنے کے سو طریقے ہوتے ہیں۔ اس نے سوچا۔ اور حقیقت تو یہ تھی کہ اگر کیتھی اس کی زندگی میں نہ ہوتی تو وہ مائرہ سے اب تک شادی کر چکا ہوتا۔ لیکن اب یہ کمٹمنٹ توڑنا اسے قیامت لگتا تھا۔
"آپ یہ کیوں نہیں کرتیں کہ مائرہ کا کسی بہت اچھی جگہ رشتہ کروا دیں۔ بجائے اپنے گھر کے سکون کو برباد کرنے کے۔" زیاد نے مشورہ دیا۔
"شٹ اپ۔" وہ بھڑکیں۔
"خود تو کسی قابل ہو نہیں..... مشورے دینے آتے ہیں بس۔"
انہیں ٹھنڈا کرنے کی خاطر وہ خلوص دل سے بولا۔
"سچ کہہ رہا ہوں مما! ہم سے اچھے لوگوں سے دنیا بھری پڑی ہے۔"
"ہاں بس..... تم دونوں بھائیوں کی ہی ناک بجتی ہے باقی ساری دنیا ہی اچھی ہے۔" وہ اس قدر چڑ کر بولیں اور زیاد بے ساختہ ہنستا ہی چلا گیا۔

☆☆☆

وہ میرب کو ساتھ لیے آؤٹ لیٹ پہ چلی آئی۔ گلاس ڈور سے اندر داخل ہوتے ہوئے اسے یاد آیا جب وہ پہلی بار عباد کو زمین سے ملنے کے لیے منع کرنے یہاں آئی تھی اور عباد نے اسے چور سمجھ کر کیسے دھمکایا تھا اس کے لبوں پہ پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی تو وہ آزردہ کر دینے والی سوچوں کو دھکیلتی اپنی بانہوں سے نیچے اترنے کو مچلتی میرب کی طرف متوجہ ہو گئی اسے نیچے اتار کر اس کا ہاتھ تھاما اور بچوں کے کپڑوں والے سیکشن میں آ گئی۔ آؤٹ لیٹ پہ عورتوں اور لڑکیوں کا رش لگا ہوا تھا۔ وہ میرب کے لیے کپڑے دیکھتے ہوئے ساتھ ساتھ کاؤنٹر پہ بھی نظر ڈال لیتی جہاں اس وقت وہ موجود نہیں تھا صرف کاؤنٹر گرل ثمینہ اور کیشیئر پہ فرحان کھڑے کسٹمرز کو خوش مزاجی اور پھرتی کے ساتھ ڈیل کر رہے تھے پھر اس نے مائرہ کو آفس سے نکل کر کاؤنٹر کی طرف آتے دیکھا تو حریم کا دل عجیب سا ہونے لگا۔ اس کی نظروں کے سامنے وہ لڑکی اس کے شوہر کو اس سے چھیننے کا کھیل کھیل رہی تھی اور وہ دیکھتے رہنے پر مجبور تھی۔
"میرو..... پاپا سے ملنا ہے؟"
اس نے جھک کر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ میرب سے پوچھا تو میرب نے چمکتی آنکھوں کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا حریم نے اس کا رخسار چومتے ہوئے اسے اٹھایا اور نظر بچا کر آفس کی طرف آئی اور ہلکا سا دروازے پہ دستک دے کر اندر سے اجازت ملے بنا ہی اندر داخل ہو گئی وہ اپنے لیپ ٹاپ میں مگن تھا دستک اور اب دروازہ

کھلنے کی آہٹ پہ سر اٹھایا تو اسے میرب کے ساتھ دیکھ کر بے ساختہ مسکرا دیا۔
"گڈ ٹو سی یو۔"
"پاپا۔" میرب نے خوشی سے بانہیں پھیلائیں تو وہ اٹھا اور آگے بڑھ کر میرب کو حریم سے لے لیا۔
"چائے، کافی، جوس چلے گا کچھ؟" وہ حریم سے پوچھ رہا تھا۔
"ابھی تو فی الحال کچھ بھی نہیں۔"
"ہم ...... کچھ پسند کیا میرب کے لیے؟" وہ پوچھ رہا تھا۔
"ابھی تو بس نظر ہی ڈالی ہے۔ سوچا تمہارے ساتھ مل کر میرو کے لیے کچھ پسند کروں تو شاید آسانی ہو۔"
حریم نے زندگی آسان کرنے والی راہ پہ پہلا قدم رکھا اس نے چونک کر حریم کو دیکھا تو وہ خفیف سی ہو کر بولی۔
"ویسے بھی ...... میرے پاس پیسے تو تھے ہی نہیں۔ پے منٹ کہاں سے کرتی۔"
اسے دھیان آیا۔ اس نے کبھی حریم کو جیب خرچ کی مد میں کچھ دیا ہی کہاں تھا، اب تک شاید وہ سلامیوں کے پیسے خرچ کرتی رہی تھی۔
"اچھا ...... چلو پھر ...... مل کر شاپنگ کرتے ہیں میرب کی وہ بھی فری میں۔" وہ مسکرایا تھا۔
"یہ فرکیمی نیشن دیکھو، ذرا ونٹر شال کے لیے۔" مائرہ اپنی دھن میں اندر آئی تو کیٹلاگ اس کے ہاتھ میں تھی لیکن اسے میرب کو بانہوں میں اٹھائے حریم کے ساتھ دیکھ کر مائرہ کے اندر تک کڑواہٹ اتر گئی۔
"بھئی اب کام تو بعد میں ہوگا۔ میں ذرا اپنی بیگم اور پرنسس کو شاپنگ کروا دوں پہلے۔" وہ خوش گوار موڈ میں بولا، مائرہ کا تاریک پڑتا چہرہ ان دونوں کی نظر سے اوجھل نہیں تھا۔
"آج سب کلرز اور ڈیزائن فائنل ہونے ہیں ...... اور تمہیں ان محترمہ کے چونچلوں کی پڑی ہے۔" مائرہ نے کیٹلاگ ٹیبل کی سطح پر پٹختے ہوئے تلخی سے کہا۔
"میں جا کر کچھ کپڑے سلیکٹ کرتی ہوں، تم آجانا کام ختم کر کے۔" حریم نے بمشکل مائرہ کا انداز گفتگو ہضم کیا تھا۔
"تم ہو نا ...... مجھے تمہاری پسند پہ پورا اعتبار ہے۔ اس بار شالوں کی ڈیزائن سلیکشن تمہاری ہوگی۔ کپڑوں کے کلرز میں نے ڈیسائیڈ کر لیے تھے ان کی ڈیٹیل فرحان سے لے لینا۔ میں تھوڑا وقت فیملی کو دینا چاہتا ہوں۔"
وہ مائرہ کی بات نظر انداز کرتے ہوئے مسکرا کر بولا اور حریم کے ساتھ ہی باہر کی طرف بڑھا۔ پھر رک کر مائرہ کو آفر کی۔
"ویسے شاپنگ کے بعد ہمارا لنچ کا بھی پروگرام ہے ...... تم چلو گی؟"
(بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہاری فیملی) مائرہ نے اسے گھور کر دیکھا اور چبا کر بولی۔
"بہت شکریہ۔ شاید باہر کا کھانا صحت کے لیے بہتر نہیں ہوتا۔ تم ہی نے بتایا تھا مجھے۔"
وہ خفیف سا ہوا۔
"خیر ...... کبھی کبھار کی بد پرہیزی تو جائز ہی ہوتی ہے۔"
"جاؤ ...... بس دھیان رکھنا کہیں بدہضمی نہ ہو جائے۔" مائرہ نے کرسی میں دھنستے ہوئے جل کر کہا تو وہ مسکراہٹ چھپاتا آفس سے نکل گیا۔
"یا اللہ۔ کیا میں ہی سراب کے پیچھے بھاگ رہی ہوں بے وقوفوں کی طرح؟" مائرہ نے سر ہاتھوں میں تھام لیا۔
اس نے حریم کے ساتھ مل کر میرب کے لیے کپڑے سلیکٹ کیے پھر فرحان اور ثمینہ کو کچھ ہدایات دے کر

حریم اور میرب کو لیے باہر نکل آیا۔ پارکنگ میں آ کر گاڑی میں بیٹھنے تک حریم کا دل عجیب سی متضاد کیفیات کا شکار تھا۔

"چائنیز فوڈ یا پاکستانی؟" وہ گاڑی سیدھی سڑک پہ ڈالتے ہوئے حریم سے پوچھ رہا تھا۔

"پاکستانی۔ چائنیز تو صرف سوپ اور نوڈلز کھائی ہیں میں نے۔" وہ چونکی۔

میرب کو سائڈ پہ لگے جھولے میں بٹھا کر وہ کھانے کے لیے آرڈر پلیس کرنے ابھی ٹیبل پہ آیا تھا ایک ہاتھ حریم کی کرسی کی پشت پہ دوسرا ٹیبل کی سمت۔ بجائے وہ حریم کے آگے کھلے مینو کارڈ ہی پہ جھک گیا۔

"ہمم...... کیا پسند ہے تمہیں۔ چکن کڑاہی، ملائی بوٹی، قورمہ، بریانی، چائنیز چاول۔"

"تمہارے لیے بھی یہ ان چاہی زندگی گزارنا مشکل ہوگا...... ہے نا؟" حریم کے منہ سے وہی پھسلا جو وہ سوچ رہی تھی۔ اس نے بہت حیرت سے چہرہ موڑ کر حریم کو دیکھا۔

"تم مائرہ کو پسند کرتے ہو لیکن تمہیں مجھ سے زبردستی شادی کرنا پڑی۔ کیونکہ مائرہ میرو کو پسند نہیں کرتی اور تم میرب کے لیے کوئی رسک نہیں لینا چاہتے تھے۔"

وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سارا جوڑ توڑ کرتے ہوئے کہہ رہی تھی وہ ساری خوش گواری بھول کر سنجیدہ تاثرات لیے اس کے مقابل آبیٹھا۔

"ہم یہاں کھانا کھانے آئے ہیں۔" وہ نارمل سے انداز میں بولا۔

"یہ مذاق نہیں ہے میں واقعی بہت آکورڈ فیل کر رہی ہوں۔ کسی کی زندگی میں زبردستی جگہ بنانا، کسی کے ساتھ محض سمجھوتے کا رشتہ رکھنا آسان نہیں ہوتا۔"

حریم کو احساس ہو رہا تھا کہ اگر وہ مشکل زندگی گزار رہی تھی تو پھولوں کی سیج پر وہ بھی نہیں تھا۔

"تم بھی تو ان ہی حالات کا شکار ہو۔"

"لیکن میں کسی کو پسند نہیں کرتی تھی۔"

"میں بھی مائرہ کو پسند نہیں کرتا تھا۔" وہ مدھم سا مسکرایا تو حریم نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ مدھم سی کیفیت میں ہر دم سلگتی آنکھیں...... ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ مبتلائے غم نہ ہوتا۔

"تو کسی اور سے......؟" بے ساختہ ہی حریم کے منہ سے نکلا تو چند لمحے وہ یونہی اسے دیکھتا رہا۔ حریم خجل سی ہو کر مینیو پر جھک گئی۔

"تم کیا یہاں میری لائف کی مسٹری سولو کرنے آئی ہو؟" وہ مدھم سا مسکرایا۔

"مجھے دوسروں کے دکھ بھی دکھی کرتے ہیں۔" حریم نے سنجیدگی سے کہا۔ "ان چاہی زندگی کا دکھ دنیا کا سب سے بڑا دکھ ہوتا ہے۔"

"یعنی تم اس وقت دنیا کے سب سے بڑے دکھ میں مبتلا ہو۔" وہ تاسف سے بولا۔

"نہیں۔" حریم نے فی الفور نفی میں سر ہلایا پھر اس کی آنکھوں میں اترتے تحیر کو دیکھ کر بات بدل گئی۔

"کھانا منگوالیں، بھوک لگ گئی ہے اب تو۔"

کھانے کا آرڈر دے کر وہ حریم کی طرف متوجہ ہوا۔

"مجھے بہت زیادہ دیر ایک ہی فیز (کیفیت) میں رہنا پسند نہیں۔ میں خوشی کی سیلیبریشن کرنے اور غم سے فوراً نکل کر آگے بڑھنے کو ترجیح دیتا ہوں۔ اس لیے تم میری فکر مت کرو۔"

"مجھے کوئی فکر نہیں ہے تمہاری۔ بس احساس ہوا تھا کہ تم بھی آسان اور پسندیدہ زندگی نہیں گزار رہے۔" حریم نے نظریں چرائیں۔

"مجھے اچھا لگا یہ جان کر کہ تم میرے متعلق ہمدردی سے سوچتی ہو۔ حالانکہ میں نے تمہاری زندگی کو مشکل بنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔"

وہ متاسف تھا۔ حریم اس سے کہنا چاہتی تھی۔ وہ سب جو اسے تحمل نے سمجھایا تھا..... ورنہ یہ بھی کہ انجانے میں ہی سہی وہ اسے کتنی مشکل زندگی سے بچا گیا تھا۔ زلفی نامی اس گھن سے..... جو اس کی پوری زندگی سیاہ کر دیتا اور آج بھی وہ کما کما کر نکھٹو شوہر کو پال رہی ہوتی۔

"میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ میرب کو ماں کا پیار ملے۔ اس کی طرف سے کوتاہی مت کرنا، میں پچھلی ساری باتیں بھلا دوں گا۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"میں نے ہمیشہ میرب سے ویسی ہی محبت کی ہے جیسی اپنی بہن سے کرتی تھی۔ تم سوچ نہیں سکتے کہ وہ میرے لیے کیا ہے۔ میں اپنی بے گناہی کی قسمیں نہیں کھاؤں گی لیکن میرو کے ساتھ ہونے والے حادثے میں میرا کوئی قصور نہیں۔"

حریم کے لہجے کی سچائی اسے کچھ سوچنے پر مجبور کر رہی تھی۔ لیکن ابھی وہ یقین اور بے یقینی کے درمیان جھول رہا تھا۔

☆☆☆

"تم کہاں گئی تھیں بنا میری اجازت کے، اور میرب کو ساتھ لے جانے کی جرات کیسے ہوئی تمہاری۔"

واپسی پہ نزہت نے اسے آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ ثریا کو آواز دے کر نیند کے جھکولے لیتی میرب کو اس کے حوالے کیا تو وہ اسے ساتھ لے گئی حریم اطمینان سے نزہت کی طرف پلٹی۔

"میں میرب کے لیے شاپنگ کرنے گئی تھی اپنے ہسبینڈ کے ساتھ، ان کی اجازت سے۔" صوفے پہ پڑے شاپنگ بیگز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حریم نے انہیں بتایا حالانکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ مائرہ فون کر کے سارا قصہ انہیں بتا چکی ہوگی۔

"تم میرے بیٹے کے سر پہ سوار ہونے کی کوشش مت کرو۔ آفس وہ کام کرنے کے لیے جاتا ہے گلچھرے اڑانے نہیں۔"

نزہت بھڑکیں تو حریم کو ان کے الفاظ و انداز پہ افسوس ہوا، اپنی بھتیجی کی اندھی محبت میں وہ صحیح اور غلط کی پہچان بھی بھول گئی تھیں۔

"میرا ارادہ تو بازار جانے کا تھا لیکن انہوں نے خود ہی کہا تھا کہ آؤٹ لٹ پہ آ جانا پھر وہاں سے لنچ کا پروگرام بن گیا۔"

حریم نے نرمی سے وضاحت کی، اس کا مزید اب نزہت سے ڈرنے اور اپنی زندگی کو ٹینشن زدہ بنانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

"وہ مائرہ کو پسند کرتا ہے۔ شادی بھی اسی سے کرے گا۔"

"جب وہ مائرہ سے شادی کرے گا میں اسی روز اسے چھوڑ جاؤں گی۔" حریم تحمل سے بولی۔ تو وہ اندر ہی اندر تلملا کر رہ گئیں۔

☆☆☆

اس نے طوبیٰ کے انٹر میں بہت اچھے مارکس لینے کی خبر سنی تو دل جھوم ہی اٹھا۔ ابا کی مہربانی کہ انہوں نے حریم کی دگرگوں حالات میں شادی کے بعد طوبیٰ کو کالج سے نہیں اٹھایا تھا۔ طوبیٰ بھی بہت احتیاط کے ساتھ حریم کے ساتھ موبائل پہ رابطے میں تھی۔ وہ میرب کے ساتھ بلاکس کی گاڑی بنانے میں مصروف تھا، جب اس نے حریم کی بے چینی محسوس کی۔

"کیا پرابلم ہے؟"
"میری چھوٹی بہن طوبیٰ نے انٹر میں بہت اچھے مارکس لیے ہیں۔ میں اسے مبارک دینے گھر جانا چاہتی ہوں۔" اسے پچھلی بار بتاتے جانے پر نزہت کی گفتگو یاد تھی۔
"میں نے تمہاری پاکٹ منی تمہاری سائیڈ ٹیبل کی دراز میں ڈال دی ہے۔ تم اس کے لیے اچھا سا گفٹ بھی لے جا سکتی ہو، جو تمہارا دل کرے۔" وہ مسکرایا۔
"تھینکس۔ اس کی ضرورت نہیں تھی۔" حریم مدھم پڑی۔
"تحفے ضرورت سے نہیں چاہت سے دیے جاتے ہیں۔" وہ میرب کے ساتھ مصروف تھا لیکن اس کی توجہ کو حریم نے پوری شدت سے محسوس کیا، وہ ان مردوں میں سے تھا جو خود سے منسلک رشتوں کو پوری دیانت داری سے نبھاتے ہیں۔
"کیا میں میرو کو ساتھ لے جا سکتی ہوں؟"
اس نے اٹک کر پوچھا تو وہ بلاکس سے بنائی گاڑی کا آخری پیس جوڑ کر میرب کے آگے رکھتے ہوئے قصداً مسکرایا۔
"ہاں۔ لے جا سکتی ہو۔ تم پر اعتبار کرنے کے لیے یہ امتحان لینا بھی ضروری ہے۔"
اس نے کہا تو حریم سن رہ گئی۔

☆☆☆

وہ ڈرتے دل کے ساتھ دروازے پہ دستک دے کر کھڑی تھی۔ دروازہ طوبیٰ نے ہی کھولا اور چیخ مار کر اس سے لپٹ گئی۔
پھر اس کے شانے سے لگی خوب صورت سی بچی کو دیکھ کر حیران ہوگئی۔
"یہ کون ہے؟"
"تم یہ شاپنگ بیگز اٹھاؤ۔ اماں کہاں ہیں؟"
اس کا سوال نظر انداز کرتی وہ طوبیٰ سے پہلے اندر چلی آئی۔ اماں اس بار بہت محبت سے ملیں۔ وہ شعوری طور پہ اپنی سرد مہری کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھیں۔
"یہ..... یہ کون ہے؟" اماں کے حواس میرب کو دیکھ کر ٹھٹھرے۔
"یہ....." حریم کے اعصاب تنے۔ اس گھر میں ابھی صرف اسے خوش آمدید کہا گیا تھا۔ نرمین کا تو نام بھی نہیں لیا جاتا تھا۔ کجا اس کی بیٹی..... اور پھر اس دھوکے کی شادی کی تفصیل..... حریم نے جھرجھری لی اور بمشکل مسکرا کر بولی۔
"یہ..... میری بیٹی ہے....."
"یہ تو..... بالکل مینو ہے۔ نئی بنائی نرمین..... جب گڑیا سی تھی تو بالکل ایسی ہی تھی۔ نازک حسین گڑیا۔"
اماں نے اس کے جواب پہ غور کیے بنا خواب آلود لہجے میں کہا تو حریم کو کرنٹ سا لگا لیکن وہ ساکت سی اماں کو دیکھ رہی تھی جو میرب کو گود میں لیے بے ساختہ پیار کر رہی تھیں۔
"کیا کہا تھا تم نے..... یہ تمہاری بیٹی ہے؟" اماں کو اب دھیان آیا۔ حریم نے گہری سانس لی اور لب بھینچ کر مسکرا کر بولی۔
"میرے شوہر کی بیٹی..... میری ہی ہوئی نا۔" اماں کو دھچکا لگا تھا۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

سائرہ رضا

رنگ، خوشبو، روشنی اور ہنسی کے بیچ سب سے کھلکھلاتی ہنسی اور روشن چہرہ فرحان کا تھا۔ یہ دعوت اس کے اور اس کی بیوی کے اعزاز میں مہ پارہ کے گھر منعقد کی گئی تھی۔

فرحان مہ پارہ کے شوہر کا پیارا دوست تھا۔

بس اس کی شادی ذرا لیٹ اب جا کر ہوئی۔ اس کی شوخیوں کی حد نہ تھی، دوستوں کی گولہ باری کا جواب دینے کے ساتھ ساتھ اس کی پوری توجہ بیوی پر بھی تھی۔

جو شوہر کی بے باکی پر جھینپ رہی تھی۔ فرحان کی بھی تو حد تھی ناں۔ کہاں تو اسے اتنے عرصے من پسند لڑکی نہ ملی...... ماں بہنیں ہانپ گئیں...... اور کہاں اب وہ پہلی نظر کے اعتراف سے...... آخری نظر کی خواہش تک سنا سنا کر تھکتا نہ تھا۔

''بس کر دیں اب...... کچھ رہنے بھی دیں...... سب دیکھ رہے ہیں، کیا سوچیں گے۔''

''ارے کیا سوچیں گے...... اپنی جائز بیوی سے محبت کے اظہار میں کیسی شرم...... ہاہاہا۔''

''جی جی بھابھی! شرم اور فرحان دو الگ چیزیں ہیں۔'' کسی نے ہانک لگائی تو بیوی نے مصنوعی خفگی سے اسے گھورا۔

''او کے او کے!'' فرحان نے ہاتھ اٹھا دیے۔ مگر ایک آخری بات بس۔ اگر کبھی زندگی میں دوبارہ محبت کی......'' اس نے جان بوجھ کر ڈرامائی وقفہ دیا...... ''تو بھی میں اپنی اس بیوی سے کروں گا۔'' اس نے بیوی کا ہاتھ ہوا میں اٹھا کر اعلان کیا۔

''دوسری بار محبت...... کیا...... نہیں...... دوسری بار محبت کیسے ہو گی محبت تو بس ایک بار ہوتی ہے۔''

''ایک......'' مہ پارہ کی نظریں بلا ارادہ اپنے شوہر کی طرف اٹھ گئیں۔ کسی کا دھیان نہ تھا۔ عدنان کو غش آنے لگے تھے۔

''ارے دوسری بار میں پہلی والی بیوی......'' مگر جب بیوی کے باہم ابرو دیکھے۔ فوراً پلٹ گیا۔

''ہاں بالکل...... دوسری بار بھی پہلی بیوی...... اسی میں بچت ہے یار۔''

اس کی خوف زدہ نظر آنے کی اداکاری نے سب کو قہقہہ لگانے پر مجبور کر دیا۔

''ارے یار یہ پیرو مرشد...... میرا مطلب مرشد و مرید کی جوڑی آج کچھ چپ سی ہے خیریت......؟''

عدنان کے کہنے پر سب ہی متوجہ ہو گئے۔ مہ پارہ کے شوہر کے نام کی مناسبت سے کچھ بے تکلف دوست انہیں مرشد و مرید کی جوڑی کہتے تھے۔

''مرشد خاموش ہو تو مرید کی کیا مجال کہ لب کشائی کی گستاخی کرے۔'' مرید نے سینے پر ہاتھ رکھ کر فدویانہ لہجہ اختیار کر کے گویا ایک لوہار کی کر دی۔ محفل زعفران زار ہو گئی۔

مرید نے سب سے نظر چرا کر مہ پارہ کو دیکھا۔ وہ قصداً نگاہیں چرائے ہوئے تھی۔ ارتکاز پر نگاہ ملی تو مہ پارہ کے نگلے جانے والے تھوک میں زہر سی کڑواہٹ تھی۔ چہرے کے تاثرات بھی کمال مہارت سے چھپائے۔ فرحان ہاتھ کا مائیک بنائے اس سے استفسار کر رہا تھا۔

''کیوں بھابھی! ایسا کیا......؟''

مہ پارہ ہنس دی۔ ''آج تمہارے بولنے کا دن

ہے۔ ہم صرف سنیں گے۔ میں نے ہی حکم دیا تھا اپنے مرید کو......"

اس نے شوخی کی حد کردی لفظ اپنے مرید پر طوفان مچ گیا مانو۔

مہ پارہ نے پوری کوشش کی کہ وہ مرید کو نہ دیکھے۔ مگر مرید کی مسلسل خود پر جمی نظریں اس کی کوشش کو ناکام بنا رہی تھیں۔

منہ پھیرنا کتنا مشکل کام ہوتا ہے۔

☆☆☆

مہمانوں کے جانے کے بعد کا پھیلاوا سمیٹتے جب وہ کمرے میں آئی...... مرید لباس بدل کر دوسری جانب کروٹ لیے سوچکا تھا۔ گہری پرسکون نیند...... وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ ایسے کہ مرید کا چہرہ سامنے تھا۔

چوڑی پیشانی پر ایک لٹ پڑی تھی۔
اس کی اٹھی ناک اسے دوسروں میں ممتاز کرتی تھی۔ اس کی کمان ابرو...... اور آنکھیں...... جب کھلی ہوئی تھیں تو ان کی گہرائی میں ڈوب جانے کا اندیشہ لاحق ہوتا تھا۔
مرید کے خوابیدہ چہرے پر مدھم سی مسکراہٹ کا شائبہ ہوا۔
نہیں...... وہ شائبہ نہیں تھا۔ حقیقت تھی۔ مسکراہٹ کا مدھم رنگ گہرا ہونے لگا۔ ایسا گہرا کہ لگے ابھی وہ قہقہہ لگا کر ہنس دے گا۔ مہ پارہ کے اعصاب تن گئے۔ اسے خبر تھی۔ اس مسکراہٹ کی وجہ...... ان آنکھوں میں کس کا خیال خواب بن کر سرسرا رہا تھا۔
علم الیقین...... حق الیقین اور عین الیقین......
مہ پارہ علم کے تینوں مرحلے پار کر چکی تھی۔ اس نے اپنے دل سے اٹھتی شکوک کی صداؤں کو ایسے جھڑکا تھا۔ جیسے بے ادب کو مجلس سے پھٹکارا جاتا ہے۔ اس نے سنی سنائی پر بھی کان نہ دھرے تھے۔ اس کا مرید...... بھلا کیسے......
لیکن پھر ایک آنکھوں دیکھی بھی ہوتی ہے۔ عین الیقین...... اس سے جھٹلائی نہ گئی چاہ کر بھی...... غضب ہو گیا تھا...... اس کے مرید نے مرشد بدل لیا تھا۔
اس نے اس یقین سے پوچھا کہ وہ اسے جھٹلائے گا۔ ''نہیں تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔''
''کیسی بات کرتی ہو...... وہ جو تم نے میرے ساتھ دیکھی...... گلابی رنگت والی...... سیاہ بالوں والی بونے سے قد کی حشر ساماں لڑکی...... وہ کوئی نہیں ہے۔'' اور سچ اگر وہ کہتا تو وہ مان جاتی۔ اپنے کان ایسے بند کرتی کہ اپنی سانسوں کی آواز سنائی نہ دیتی۔ مگر مرید نے نظر جھکالی...... وہ نظر جو ایک مجرم کی نظر تھی۔
اور پھر اس کا سر بھی جھک گیا۔
''مرید......'' مہ پارہ کے منہ سے شوہر کا نام ایسے نکلا۔ جیسے پہاڑ کی چوٹی سے گرنے والے کی آخری پکار ہوتی ہے۔
''مجھے محبت ہو گئی ہے......'' شوہر کا لہجہ مجرم سا تھا۔ مہ پارہ کے بجلی کی سی تیزی سے گردن موڑنے پر اس نے نظر چرائی تھی۔
''ایسا کیوں......؟'' مہ پارہ اس کے سامنے آبیٹھی۔ اور اس کا چہرہ کھوجنا چاہا...... ایسا جملہ تو وہ اکثر کہا کرتا تھا۔ (ہاں مگر...... کتنا عرصہ ہوا اب نہیں کہا...... تھا۔ کمال ہے مہ پارہ کا ہی دھیان نہیں گیا)
''کس سے ہو گئی جناب کو محبت......؟'' وہ ادائے دلبری سے پوچھتی۔ ''تم سے یار......'' وہ اسے خود سے قریب کر لیتا ''مجھ سے اوہ...... یہ تو پرانی خبر ہے۔''
''پرانی خبر......'' مرید کو جھٹکا لگتا ہے۔ ''تو کیا اس خبر کی مٹھاس ختم ہو گئی؟''
''میں اس مٹھاس کو اپنے اندر اتار چکی میرے مرید......''
''یہ نہیں ہو سکتا...... تمہاری محبت میرے اندر ہر روز ابل پڑتی ہے۔ جیسے چشمہ پھوٹتا ہے۔ تم ساری عمر بھی پتھر لگا کر بند باندھو تب بھی اس بہاؤ کو روک نہیں سکتیں۔ میری مہ پارہ......'' اور وہ سرشار ہو جاتی۔ گردن اکڑ سی جاتی۔ دیکھنے والوں کو وہ مغرور دکھائی دیتی۔ جیسی کوئی شہزادی...... ملکہ...... یا بے نیاز پری...... اور مرید لیکن آج مرید کے اعتراف میں یہ کیسی اٹک تھی۔ کہ اسے منہ پھیرنا پڑا۔ اور ہونٹوں پر زبان پھیر کر پہلو بھی بدلا۔
''کس سے ہوئی محبت......؟؟'' اس کے منہ سے لاشعوری طور پر پھسلا تھا۔ (ہائے کاش وہ خود پر قابو رکھ پاتی)۔
''زائرہ سے''...... ''کون زائرہ......؟'' اس نے ٹھوڑی سے پکڑ کر اس کا چہرہ اپنے سامنے سیدھا کیا۔ اور کاش وہ یہ نہ کرتی۔
کیونکہ زائرہ کا عکس تو اس کے شوہر کی آنکھوں میں ہلکورے لے رہا تھا۔
''اگر یہ مذاق ہے مرید! تو بہت برا ہے۔'' اس

کے لہجے میں دھمکی سے زیادہ خود کے لیے تسلی کا عنصر تھا۔ مگر یہ مذاق نہیں تھا۔

"اگر میں بھی تمہیں بتاؤں کہ مجھے بھی تمہاری طرح کسی زائر سے محبت ہو گئی ہے تو؟" وہ جیسے آستینیں چڑھا کر میدان میں آ گئی تھی۔ مرید کے چہرے نے رنگ بدلا۔

"نہیں، ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں۔ محبت ہے ناں ہو بھی سکتی ہے۔ آپ کو بھی تو ہوئی۔"

منہ کیوں پھیر لیا...... اس لیے ناں کہ جانتے ہیں۔ عورت کو دوسری بار محبت نہیں ہوتی۔ خاص طور پر شادی شدہ شریف عورت کو...... اور میں بہت شریف عورت ہوں۔ اور آپ میری اسی شرافت سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں۔"

"میرا خود پر اختیار نہیں رہا۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔" مہ پارہ کا تو خیال تھا۔ دونوں مباحثہ کریں گے اور وہ اسے پچھاڑ دے گی۔ مرید نے لڑے بغیر فقط ایک جملہ کہہ کر ہتھیار ڈال دیے۔ مباحثہ شاید وہ جیت جاتی۔ مرید کے اعتراف نے اسے مٹی چاٹنے پر مجبور کر دیا۔

"اس کے بغیر نہیں رہ سکتے۔" اس نے زیر لب دہرایا۔ "اس بات کا کیا مطلب ہے؟ اس کے بغیر نہیں رہ پاؤ گے تو کیا مرنے لگے ہو۔ نہیں کیا کرو گے؟ مجھے بھی تو پتا لگے۔" اس نے پورے استحقاق سے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر جارحیت سے پوچھا تھا۔

مرید نے اتنی دیر میں پہلی بار اس کی آنکھوں میں جھانکا جہاں مر جانے یا مار دینے کی کیفیت تھی۔

"شادی...... مجھے اس سے شادی کرنی ہے ماہی......"

"شادی......!" مہ پارہ کے ہاتھ سے اس کے ہاتھ چھوٹ گئے۔ وہ جب بہت پیار میں اسے پکارتا تھا تب ہی ماہی کہتا تھا۔ اس نے یہ سب اسے بہت پیار میں بتایا تھا......؟

اس کے گرد ساتوں آسمان گھوم گئے۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے مرید......" اسے نہیں پتا تھا۔ اس نے کیا پوچھا ہے۔

ہوش میں ہوتی تو پوچھتی۔ "یہ کیسے کر سکتے ہو...... تم جو ہو وہی رہو گی۔" اب مرید نے اس کے ہاتھ تھامے۔

وہ...... وہ کب رہی...... جو وہ تھی۔ اس کے اندر سے آواز ابھری۔ تمہارا نام مقام برتر سے برتر ہی رہے گا۔ ہاں نام...... جو اس کے باپ نے رکھا تھا مہ پارہ اور مقام...... جس سے اسے پیروں کے بل گھسیٹ کر گرا دیا تھا اس نے۔

اور برتر...... کیسی برتری...... ہاں اس کا درجہ اول ہو گیا تھا۔ پہلی بیوی ہے...... یہ اس سے کوئی نہیں چھین سکتا تھا۔ واہ اس کا سنگھاسن...... اتنا بلند و ارفع پہلی بیوی...... دل کی تسلی کے لیے خود کو نمبر ون بھی کہہ سکتی تھی۔

"ایک ہوتی ہے ڈگری...... جو سالوں کی محنت سے حاصل ہوتی ہے اور ایک ہوتی ہے اعزازی ڈگری...... یہ وہی تھی جس سے اسے اس کے شوہر نے نواز دیا تھا۔

"مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"اجازت ماہ......!"

"ماہی مت کہو۔" وہ تڑپ کر بولی۔ "میرا نام مہ پارہ ہے میری اجازت کی ضرورت ہے کیا۔ اتنے تابعدار تھے تو محبت کرنے سے پہلے مانگتے۔"

"مانگتا...... ضرور مانگتا ماہی...... اگر سوچ سمجھ کر کرتا قسم سے وہ تو بس ہو گئی ایک دم...... کب نجانے...... پتا نہیں چلا۔"

مرید کا انداز و جملے الجھے ہوئے تھے۔ مگر ان میں جو سرشاری تھی۔ اور بے اختیار وہ جو آنکھوں میں دیے جل اٹھے تھے۔

"اور اگر میں نہ دوں تو......؟" اس کا لہجہ کٹھور اور کھوجتا ہوا ہو گیا۔ "انکار کر دوں تو......"

"تم کر سکتی ہو ماہی...... مگر میں منت کرتا ہوں دے دو اجازت مجھے ورنہ...... ورنہ میں گناہ کا مرتکب

ہو جاؤں گا۔ میں...... میں" اس نے کسی مخبوط الحواس شخص کی طرح سر کو جھٹکا دیا۔ جبکہ وہ اس کی حالت سے پرے اس کے جملے پر اٹک گئی تھی۔

"گناہ...... کیسا گناہ...... اوہ...... یعنی گناہ......" اس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے چہرے کے گرد رکھ لیے...... وہ پھٹی آنکھوں سے مرید کو دیکھ رہی تھی۔

مرید...... مریدی کی مسند سے نیچے گر گیا تھا۔ بالکل...... جیسے پیری کا ایک مقام ہوتا ہے۔

مریدی کا بھی ہوتا ہے۔ اس کے بھی درجے پاس کرنے ہوتے ہیں۔ ہر کسی کو کہاں ملتا ہے فیض۔ قدم بوسی کا۔

مہ پارہ نے بھی اپنے پر سمیٹ لیے...... وہ دور کھسک گئی۔

"اب کہنے کو کچھ نہیں بچا تھا۔ مگر ایک آخری جملہ...... وہ کہہ دیتی اگر...... تو کھیل بدل سکتا تھا۔

"کیسی عورت چنی ہے مرید محبت کے لیے...... جو تمہارے اس متوقع گناہ کا حصہ بننے کو تیار ہے جو منتظر ہے لاؤ اجازت...... ورنہ ہم کرنے لگے ہیں گناہ۔"

"نہیں ماہی...... نہیں...... وہ ایسی نہیں ہے...... وہ نہیں...... میں تو اپنی بات کر رہا ہوں اپنی مجبوری بتا رہا ہوں۔"

"اور اگر میرے ساتھ بھی ایسی کوئی مجبوری لگ جائے؟ نہ...... ناں میرا ارادہ نہیں ہے۔ مگر انسان ہوں ناں، کبھی ہو جائے ایسا...... تو؟"

"ایسی بات مت کرو مہ پارہ...... عورت بہت حیادار ہوتی ہے۔"

"اور تم یہ کہہ رہے ہو مرد بے حیا ہوتا ہے۔" اس نے تیز ہو کر کہا۔

مرید کے پاس جواب نہیں تھا۔ "بات یہ ہے مرید حسین...... مرد کے لاشعور میں اجازت ہوتی ہے۔ جو اسے اللہ نے دی ہوتی ہے۔ نماز میں چار سنتوں کو چھوڑ دینے والے مرد کو چار شادیوں کی سنت خوب یاد رہتی ہے۔ ہاں چلے جاؤ یہاں سے میرے پاس تمہارے لیے کچھ نہیں ہے۔" یہاں تک آ کر اس کا چیخنا بنتا تھا۔

"ماہی! میں اجازت مانگ رہا ہوں۔ ورنہ تمہیں خبر بھی تو مل سکتی تھی۔"

مرید بن کر بہت دیر پاؤں پکڑ لیے...... وہ مرید سے مرد بن گیا۔ مرد سے شوہر...... اور شوہر بھی وہ جو ذلالت پر اتر آیا تھا۔

"ہاں، ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اگر خبر ملتی تو پھر ہم دونوں اس طرح ایک چھت کے نیچے نہ ہوتے۔"

"کیا مطلب......؟" وہ کھڑا ہو گیا۔

"مطلب یہ کہ......" وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر مقابل آ گئی۔ "میں تمہاری طرح کسی دوسرے کو سامنے لا کر تو کھڑا نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی اجازت نہ مجھے مذہب دیتا ہے، نہ معاشرہ اور نہ میرا پندار کہ ایسا گھٹیا پن کرتی۔ مگر میں تم پر لعنت بھیج کر جا تو سکتی تھی ناں۔"

"جا......" مرد کو واقعی دھچکا لگا۔ "کہاں جا سکتی تھیں؟"

"اگر اس طرح جاتی تو کیا بتا دے کر جاتی۔" اس کی آنکھوں میں چیلنج تھا۔

"اور اکیلی بھی نہ جاتی۔ تینوں بچے بھی میرے ساتھ جاتے۔ پتا ان کا بھی نہ ہوتا اور جاتی تو صفایا کر کے جاتی۔ جیسے چور جھاڑو پھیر دیتے ہیں۔ یہ گھر...... گاڑی...... کاروبار...... سب۔ بڑی محبت سے میرے نام کیا گیا تھا بھی۔"

"ماہی تم......؟" مرید بھونچکا رہ گیا۔ اس نے تو ایسا کوئی سود و زیاں کا گوشوارہ ترتیب نہیں دیا تھا۔ جسے مہ پارہ نے پلک جھپکتے بیان کر دیا تھا۔ مانو مرید حسین کو زمین پر پٹخی دے دی۔

"مجھے تم سے بہت محبت ہے ماہی!" وہ بہت دیر بعد بدقت بولا تھا۔

"تھی......" اس نے زہر خند لہجے میں تسلیم کیا۔

"اور بچوں سے تو...... تم سے بھی زیادہ......"

"اور زائرہ سے......؟" اس نے اسے ٹوک کر کہا۔ ماتو بولتی بند کر دی۔
"ایک بٹا چار......" چار بٹا ایک کا ہندسہ برتری رکھتا ہے، آج ثابت ہوا۔

☆☆☆

اتنے سخت احتجاج اور حساب کتاب کے بعد اس نے مرید حسین کو دوسری شادی کی اجازت دے دی۔ جس نے سنا دانتوں تلے انگلیاں داب لیں۔ کیا دوست کیا دشمن...... گھر خاندان...... ماسی...... چوکیدار...... دکان دار...... جب وہ بری بنانے پہنچی۔ کس کے لیے......میڈم...... بھابھی کے لیے...... بہن کے لیے۔"
"سوکن کے لیے......"
"جی؟" دکان دار کی جی گویا سیٹی تھی، نقارہ۔ سارے شاپنگ مال کی نظریں اور انگلیاں اس کی سمت اٹھ آئیں۔
جس کے ہاتھوں میں شاپنگ بیگز تھے اور ان سے جھانکتے جھلمل کپڑے۔
"کیا ہوا ہے، ہوش میں ہو تم؟" ایک سفید بالوں والی آنٹی نے اسے روک لیا۔ "جھوٹ بول رہی ہو۔" ان کی آنکھوں اور گرفت میں سختی تھی۔
"آپ کو کیوں لگا، میں جھوٹ بول رہی ہوں۔" آنٹی کا بزرگانہ مشفق کسی حد تک خفا، استحقاق بھرا انداز اسے مسکرانے پر مجبور کر گیا۔
"ارے تو اور کیا لگے گا۔ کس چیز کی کمی ہے تم میں۔ جیتی جاگتی گڑیا جیسی ہو۔"
"گڑیا سے دل بھر جایا کرتا ہے آنٹی۔"
"بچے نہیں ہیں کیا؟" آنٹی نے اس کے جملے پر ذرا دھیان نہ دیا۔ محتاط اور پریقین انداز سے آہستہ سے پوچھا۔
وہ چوکس ہوئی۔
"کیوں نہیں ہیں آنٹی، ماشاء اللہ تین...... دو بیٹے ایک بیٹی۔"
"ہائیں......" آنٹی کو ایسا جھٹکا لگا کہ پیچھے کو لہرا گئیں۔ مہ پارہ نے بدقت سنبھالا۔
"تو پھر مان لو...... کسی نے سفلی کروائی ہے۔"
"ہو سکتا ہے آنٹی۔"
"اس پر نہیں تم پر، ارے کون عورت سوکن کی بری بناتی ہے۔ ارے تم نے اجازت ہی کیوں دی بولو، تمہیں کسی نے عقل نہ دی۔ ہیں...... ہائیں...... ارے کوئی تو ہوتا جو اس موئے کو روکتا۔"
اس کا سارا اعتماد و بے نیازی ہوا ہو گئی۔ اس نے آہستہ سے آنٹی کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور نکل آئی۔
آنٹی کے تینوں سوالوں کے جواب تھے اس کے پاس۔
اس کے ابا نے گولی مار دینے کی نا صرف خواہش و اعلان کیا بلکہ ٹھان بھی لی۔ مہ پارہ ہی ڈھال بن گئی۔
"نہیں ابا! میں نے دی ہے اجازت۔"
"تو اس نے مانگی ہی کیوں؟"
ابا کے ایک ہاتھ میں پستول تھی، دوسرے ہاتھ سے اسے پرے کرنا چاہا۔ وہ قسم کھا کر آئے تھے، مرید کی جان لے کر ہی لوٹیں گے۔ مہ پارہ نے ابا کے دونوں ہاتھ تھام لیے اور آنکھوں میں اتنی منت سمو لی کہ ایسی منت پر عام معافی کا اعلان ہو جائے۔ ابا کی گن بھی نیچے جھک گئی۔
اور جو عقل دینے کی کوشش تھی، بحث یہاں تک آ گئی کہ اس کی امی کا بس نہ چلتا تھا پیر سے چپل نکال کر بیٹی کے سر پر اتنی ماریں کہ اس کے دماغ سے خناس نکل جائے۔
"ارے تو بس مجھے یہ بتا دے، تو نے دی کیوں اجازت۔ بول...... بول مہ پارہ بول......"
"ہاں، اس نے کیوں دی اجازت۔"
مہ پارہ نے ماں کو تو جواب سے نہ نوازا...... مگر جب خود اس سے اس کے دل نے پوچھا تو دل کا کہا کب ٹالا جا سکتا ہے۔
دل...... وہ جو دماغ کے تابع ہوا تھا۔
"اس نے کیوں دی اجازت؟"
"قسم سے کبھی نہ دیتی۔ مگر تم کو تو یاد ہے ناں من

دشمن......" وہ دل سے ہم کلام تھی۔

اس کے سخت اعتراض و احتجاج اور دھمکی نے مرید کی سانسیں روک لیں۔ یہ بات مرید اور اس کا اندر جانتا تھا۔ اسے مہ پارہ سے کتنی محبت تھی اور بچوں سے...... لیکن اس کا کیا کرتا، اسے زائرہ سے بھی اتنی محبت تھی۔

سب کو لگا وہ تائب ہو گیا ہے۔ سب کچھ نارمل نظر آنے لگا۔ وہی روزمرہ کے معمولات، وہی ذمہ داریاں اور ان کو پورا کرنے میں جتا مرید...... لیکن مہ پارہ کو لگتا وہ مرید نہیں ہے۔ مرید کا ہم شکل روبوٹ ہے۔ کارگزار...... فرماں بردار مگر بے دل۔

مگر اس رات...... خلوت کے لمحات میں بہت عرصے بعد مرید کی طرف سے بے ساختگی و خودسپردگی تھی۔ اسے اپنی کوششوں (دھمکیوں) اور دعاؤں...... (ہاں اس نے بہت دعائیں بھی کی تھیں، مرید لوٹ آئے) کے پورا ہونے کا یقین ہونے لگا۔ مرید بہت دنوں بعد مرید محسوس ہوا تھا۔ والا و شیدا......

"دھوکا کھا رہا تھا مجھے لگا، تم نہیں ہو...... میرے ساتھ زائرہ ہے۔" اس کے وجود کے پرخچے اڑا کر پھر وہ بیٹھا نہیں۔ کمرے سے چلا گیا۔

اور وہ...... ایسی تذلیل...... اس نے اپنے چہرے پر انگلیاں پھیریں۔ اپنے ہاتھوں اور بازوؤں کو ایسے چھوا، جیسے ٹٹول رہی ہو۔ آہ......

مرید نے اپنے دبے زخموں کا کھرنڈ نوچ دیا تھا۔ مرید نے نمک مرچ چھڑک دیا تھا۔

اس کے پورے وجود میں بھانبڑ اٹھنے لگے۔ اس کا جی چاہا وہ ناخنوں سے اپنا پورا جسم نوچ ڈالے۔ اپنی کھال اتار دے...... مگر یہ سب سوچنے سمجھنے، سننے پڑھنے تک میں آسان تھا۔ عملاً...... عملاً......

وہ اس کے پیچھے چلی آئی۔ گھپ اندھیرے کمرے میں ہونٹوں میں دبے سگریٹ کے مدھم سے شعلے نے اس کی سمت کا تعین کیا۔ اسے آگہی کی عذاب ناک روشنی میں دھکیل کر وہ اس تاریکی میں اس دوسری عورت کی یاد کی شمع جلائے بیٹھا تھا۔

"وہ تمہیں کہاں ملی مرید؟" وہ صوفے پر پاؤں اوپر کر کے بیٹھ گئی۔ اس کی آواز صاف تھی۔ مرید کو اس کے اعصاب کی مضبوطی پر حیرت ہوئی۔

"سفر میں......"

"ہا...... ہائے یہ سفر۔" نئے جہانوں کو دریافت کرنے کے شوق۔

"وہ فلائٹ میں میرے ساتھ والی سیٹ پر تھی۔" مہ پارہ نے جہاز کا تصور کیا۔ سیٹ سے جڑی سیٹ...... لمبا سفر...... جب جب نیند سے ڈولتے سر دوسرے کندھے پر جھک جاتے ہیں۔

کاش اس کا شوہر مزدا بس میں سفر کرتا۔ جہاں مردوں عورتوں کے پورشن بنے ہوتے ہیں اور اب تو اکثر میں درمیانی جنگلا بھی لگا دیا گیا ہے۔ کاش جہاز میں بھی جنگلا ہوتا بلکہ لوہے کی دیوار ہوتی تو...... اس کی بچگانہ سوچوں سے پرے اس کا شوہر اپنی ہی دھن میں تھا۔ بتایا ناں وہ اندھیرے میں اسے دل کی روشنی سے دیکھ رہا تھا۔

"یقین کرو مہ پارہ! پہلی نظر میں وہ مجھے بالکل عام سی لگی لیکن دوسری نظر میں وہ میرے دل کے اندر جا گھسی۔"

"ہائے ہائے......" مہ پارہ مچلی۔ اسی لیے دوسری نظر کو حرام کہا گیا تھا۔ "ہائے...... اور اس کی آواز...... جیسے جھرنا گرتا ہے۔ جیسے گھنٹی بجتی ہے...... جیسے......"

مرید کے پاس تشبیہات کی کمی نہ تھی۔ وہ مانو زبان دان ہو گیا تھا۔ شاعر...... جو نت نئے استعارے ترتیب دیتے ہیں اور داد پاتے ہیں مگر یہاں مہ پارہ اس کی سامع...... داد کب دے رہی تھی۔ وہ ہاتھ مسل رہی تھی۔

آواز...... غیر مرد سے بات کرنے میں لہجے کو سخت رکھنے کا حکم یونہی تو نہیں دیا گیا تھا۔

"اور اس کے وجود سے اٹھتی خوشبو...... مجھے لگا میں پیرس کے کسی باغ میں کھڑا ہوں، جہاں بہار اپنی جوبن پر ہے اور جہاں......"

اور عورت کا کوئی کام نہیں ہے کہ وہ خوشبو لگا کر باہر نکلے۔" اور اس کی ہنسی......

"سفر تو دو چار گھنٹے میں ختم ہو جاتا ہے مرید!" اسے اپنی آواز کنویں سے آتی محسوس ہوئی۔

"ہاں، مگر اس سفر کے خاتمے سے پہلے ایک نیا آغاز ہو گیا تھا۔" مرید نے سگریٹ بجھا دی اور اس کی سمت گھوما۔ لیکن اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ رخ تو وہ موڑ ہی چکا تھا۔ کمرے میں ہنوز اندھیرا تھا۔ وہ اندازے سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

مگر دیکھ نہیں پاتے تھے۔

"ٹھیک ہے، تمہیں اجازت ہے۔" اب اس کے سوا اس کے پاس کہنے کو کیس بچا تھا کچھ......

☆☆☆

"تم پاگل ہو گئی ہو مہ پارہ! اپنے شوہر کی شادی کروا رہی ہو۔ ایسے تو کوئی بھائیوں، بیٹوں کے لیے نہیں کرتا۔" اس کی بہنوں نے اسے جھنجوڑ ڈالا۔ منع تو اسے مرید نے بھی کیا تھا۔

"مت تکلیف کرو تم۔ زائرہ دیکھ لے گی خود ہی۔" (جب وہ بری وغیرہ بنانے لگی)۔

"اگر زائرہ نے کہا ہے تو میں مان جاتی ہوں۔ لیکن اگر یہ تمہاری خواہش ہے تو میں کہوں گی، کرنے دو مجھے۔"

مرید چپ ہو گیا۔ لیکن اس کی بہنیں کسی دلیل و جواز سے بہلنے والی نہ تھیں۔

"عورت کا فرض ہے آپی! اپنے شوہر کے آرام و آسائش کا خیال رکھے۔ میرے شوہر کو یہی آسائش درکار ہے، کیا کروں۔"

"دوسری شادی عیاشی کے سوا کچھ نہیں۔" بھابھی نے بلا لحاظ کہا۔

"تو ٹھیک ہے ناں۔" وہ ہنسی۔ "کرنے دو اسے عیش۔"

"اچھا...... وہ عیش کرے گا اور تم؟"

"میں داد دوں گی۔ جیسے "واہ" دیتے ہیں۔"

اس کے ساتھ ہی سیدھے ہاتھ کی انگلیوں کی پشت کو الٹے ہاتھ کی ہتھیلی پر تیز تیز باہر کی جانب جھلایا۔ جیسے تماش بین داد دینے کے لیے نوٹ وارتے ہیں۔

اور تو کوئی نہیں ہنسا...... البتہ اسے اپنے اس بے ساختہ ایکٹ پر بہت ہنسی آئی۔ بہت سے بھی زیادہ۔

☆☆☆

اس کے بچے سٹیج دیکھ کر متحیر رہ گئے۔

"یہاں کس کی دلہن نے بیٹھنا ہے ماما؟" بڑے بیٹے نے سوال کیا۔ اس نے اپنے ہوش میں باقاعدہ مشاہدے کے ساتھ کچھ عرصہ پہلے ماموں کی شادی میں شرکت کی تھی۔ جہاں وہ شہ بالا تھا۔ اسے سب پتا تھا سٹیج پر دلہن بیٹھتی ہے۔

"بتائیں ناں ماما! کس کی دلہن کے لیے بنایا ہے یہ؟" چھوٹے بیٹے نے اس کا ہاتھ ہلایا۔

"پاپا کی دلہن کے لیے؟" تحیر سے بھرپور کورس میں تینوں بچے بولے تھے۔ "واہ!"

چھوٹے بیٹے نے اپنے کھلے منہ پر ہاتھ رکھا۔

"پاپا کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی۔ وہ تو اتنے بڑے ہیں۔"

"ہاں بیٹا! نہیں ہوئی تھی۔" وہ سٹیج کی لڑی کو باندھنے لگی۔

"آپ کی شادی ہوئی ماما؟" بیٹی نے اس امید پر سوال کیا کہ جواب میں "ناں" ملے۔ "نہیں ہوئی ناں؟"

"ہاں، پاپا کی شادی بھی نہیں ہوئی۔" چھوٹے بیٹے نے بہن کو تسلی دی۔ "ہوئی ہوتی تو ہم کیسے ہوتے ناں۔ ہے ناں ماما۔ ہم ہوتے ناں...... کوئی ماما اپنے بچوں کے بغیر شادی تھوڑی کرتی ہے۔ ہیں ناں ماما؟" بچے کے پریقین لہجے و انداز پر اسے ہنسی آ گئی۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"یاہو...... تو یعنی کہ پاپا کے بعد پھر آپ کی شادی ہو گی۔ ہے ناں؟ ہیں ماما؟" ناخنوں سے چھلی بچی نے معصوم چہرہ اوپر اٹھا رکھا تھا۔ اسے جواب میں

ہر صورت ہاں درکار تھی۔

"بے وقوف! ماما کی شادی ہو گئی ہے۔" بیچ کو بہت تکنیکی انداز سے جج کرتے بڑے بیٹے نے سر پیٹ لینے والے انداز میں مداخلت کی۔ "پاپا کے ساتھ...... میں نے خود البم دیکھا ہے۔ ہے ناں ماما؟" اس کے انداز میں رعب و قطعیت تھی۔

اس کے بچے دو دھڑوں میں تقسیم ہو گئے۔ چھوٹا بیٹا، بچی......اور دوسری طرف بڑا بیٹا۔

"نہیں ہوئی ہے جی۔" چھوٹے بیٹے کو برا لگا۔

"پاپا کے بعد ماما کی بھی ہوگی۔ ہوگی ناں ماما۔"

"نہیں بیٹا! میری نہیں ہوگی۔" اسے پتا بھی نہ چلا اور لہجہ میں شکست در آئی۔

"کیوں ماما؟" دونوں چھوٹوں نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

"آپ کی کیوں نہیں ہوگی۔ آپ بھی کر لینا۔ کریں گی ناں؟"

"میں نہیں کر سکتی بیٹا۔ میں یہی تو کر نہیں سکتی۔"

مہ پارہ کو خود پتا نہیں چلا، وہ کن معنوں میں کہہ رہی ہے۔ اسے مذہبی و معاشرتی حد بندی کا خیال آ گیا تھا۔ یا اس محبت کا جو اسے مرید حسین سے تھی۔

"محبت...... جس میں محبوب کی خوشی کے لیے اس نے اپنے ہاتھوں اپنی جھولی میں انگارے بھر لیے تھے۔ پتا نہیں وہ کس تناظر میں بولی تھی...... پتا نہیں۔

☆☆☆

اور شادی کی تقریب...... عام شادی کی تقریب جیسی نہیں تھی۔ یہ دراصل ایک تماشا گاہ تھی۔ جہاں دنیا صرف مہ پارہ کو دیکھنے کے لیے اکٹھی ہوئی تھی حالانکہ مرید حسین سخت جز بز ہوا تھا۔

شادی ہال میں پہنچ کر انسانوں کے جم غفیر کو دیکھ کر وہ ششدر رہ گیا۔ اسے لگا وہ غلطی سے کسی اور ہال میں گھس آیا ہے۔ مگر بے حد خوب صورت لباس میں سولہ سنگھار کیے مہمانوں کو خوش آمدید کہتی مہ پارہ نے غلط فہمی دور کر دی۔

"یہ سب کیا ہے مہ پارہ؟" وہ جتاتے لہجے میں بمشکل پوچھ سکا۔

"عاشق کا جنازہ ہے...اوہ میرا مطلب...... عاشق کا ولیمہ ہے ذرا دھوم سے نکلے۔"

مرید کی سوالیہ سرگوشی، چور کی سانسوں جیسی تھی۔ وہیں ماہ پارہ کا جواب اعلانیہ تھا۔ جیسے شاعر اپنے سب سے خوب صورت مصرعے پر داد چاہتا ہے۔

اس کے بعد پھر مرید حسین کے منہ سے کچھ نہ نکلا۔ موقع بھی نہ ملا۔ ملتا بھی کیسے، لوگوں سے گلے مل مل کر اس کے کندھے ڈھلک گئے۔ مبارک باد کا شکریہ کہتے کہتے وہ ایسا نڈھال ہوا جیسے گدھا پانی بھر روئی کی بوری کو اتار کے ہوا ہوگا۔

(ایک منٹ...... یہ ہنسنے کا نہیں رونے کا مقام ہے ویسے)

اوپر سے مبارک باد کے ساتھ دوستوں بلکہ تمام مردوں...... جن میں عمر کی تفریق نہیں تھی کہ ذو معنی جملے و مسکراہٹ و ہنسی...... مانو سارا نشہ ہرن ہو گیا۔

دوسری طرف خواتین مہمان...... فیصلہ نہیں کر پا رہی تھیں۔ وہ مہ پارہ کو کیا کہیں...... مبارک دیں یا پرسہ...... لیکن سیدھی بات ہے، عورتوں میں کوئی ایک بھی مبارک باد دینے والی نہیں تھی۔ سب پہلے ہی اپنے شوہروں کے ہاتھوں ناک تک عاجز آ گئی تھیں، جو انہیں سناتے تھے۔

"بیوی ہو تو مہ پارہ جیسی...... ظرف ہو تو مہ پارہ جیسا...... شوہر کی خوشی سے خوش ہونے والی عورت جنتی ہوتی ہے۔" (مہ پارہ نے سن لی یہ مدح سرائی...... جنتی ہونے کے لیے اس نے اپنی زندگی جہنم کر لی تھی)

مہمانوں سے فرداً فرداً سوکن کو متعارف کرواتی مہ پارہ کو اس کی کچھ کزنز نے گھیر لیا۔

"تمہاری جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو منہ نوچ لیتی اس حرافہ کا، جس نے تین بچوں کے باپ کو پھانس لیا۔"

"منہ نوچنے پر آؤں تو پہلے اپنے شوہر کا منہ

سوچوں کہ وہ تین بچوں کا باپ ہوتے کیوں پھنسا۔"
اس کے مسکراتے لبوں سے نکلنے والے یہ الفاظ زہر میں بجھے تیر جیسے تھے مگر ایسا تیر جو پلٹ کر اپنے مارنے والے کے سینے میں گڑ جاتا ہے۔ ظاہری زخم پر تو مرہم رکھا جاسکتا ہے۔ رستے دل پر کون ہاتھ رکھے۔

☆☆☆

شادی ہوئی...... ولیمہ...... ہنی مون پر یورپ کا دورہ بھی ہو گیا۔
"شمالی علاقہ جات بھی چلے جاتے۔ خاص طور پر کاغان ناران۔" اس نے سرسری لہجہ اپنایا۔ سوکن کی نظریں مرید حسین پر اٹھ گئیں۔ وہ مہ پارہ سے مخاطب ہونا پسند نہیں کرتی تھی حالانکہ مہ پارہ کا رویہ اس کے ساتھ ایسا تھا جیسے گھر میں آنے والی نئی دیورانی کے ساتھ ہوتا ہے۔
دھیرے دھیرے انوالو کرنے کی کوشش۔
"زائرہ کو پسند نہیں تھا۔"
"ہاں، ہزار بار کی دیکھی جگہ......" زائرہ بی بی نے نخوت سے کہا۔
"پھر بھی چلے جاتے۔" مہ پارہ نے مکھن لگا کر سلائس مرید کی سمت بڑھایا۔
"خیریت؟" مرید حسین مسکرایا۔
مہ پارہ کی نظریں اس کے چہرے پر جم گئیں۔ شادی کے بعد سے وہ ایسے ہی بات بات مسکرانے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک اور جملوں کی شوخی...... سرخ رنگ کو پیچ کرتی تھی اور لہجے کی برجستگی پوری طاقت سے دیوار پر لگ کر پلٹ کر آنے والی گیند جیسی ہو گئی تھی۔ مرید حسین ایسے نکھر، نکھر گیا تھا جیسے سادھو نے دو سو سال کا جوگ چھوڑا ہو۔ دنیا دیکھی ہو، اسی پیاری اسی رنگین۔
مہ پارہ نے اپنے اندر اٹھتی شدید تکلیف کی لہر پر ضبط کا بند باندھا۔ مرید حسین اور زوجہ مرید حسین کی نگاہیں اس پر جمی تھیں۔
"خیریت"، کا اچنبھا آمیز سوال ہنوز جواب کا منتظر تھا۔
زائرہ کی آنکھوں میں چبھن سی تھی۔ وہ ہوتی کون ہے ان کے لیے جگہ سلیکٹ کرنے والی۔ کیوں جائیں وہ شمالی علاقہ جات؟ ہاں کیوں بھلا...... خواہ مخواہ۔
"ویسے ہی...... وہاں تمہارا اور میرا نام جنگل میں درختوں پر ابھی لکھا ہوا ہے۔ تم گئے ہاتھوں اسے مٹا آئے۔"
اس نے مرید کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔
اور چائے کا کپ لبوں سے لگا لیا۔ اسے اپنے اس انداز پر بے ساختہ ہنسی آ گئی تھی۔ جبکہ دوسری طرف زائرہ کے ہاتھ سے کانٹا گرا اور مرید حسین لقمہ چبانا بھول گیا۔
"ماہی!" بہت دیر بعد وہ بدقت بول سکا۔ ساتھ ہی اس نے میز پر دھرے مہ پارہ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھنا چاہا۔ مگر اس سے پہلے زائرہ جارحانہ پن سے ناشتے کی پلیٹ کھسکا کر کھڑی ہو گئی۔ مرید کا ہاتھ معلق رہ گیا۔
اگلے پل مہ پارہ نے اسے دھڑ دھڑ کر کے اوپر سیڑھیاں چڑھتی زائرہ کے پیچھے بھاگتا دیکھا۔ مہ پارہ کو ہنسی آ گئی۔ اس نے جس طرح نظم کو نثر کیا تھا اور جن معنوں میں استعمال کیا تھا۔ گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔ اپنی زندگی کی اجڑی بجڑی کہانی کو ایک جملے سے بیان کر دیا تھا۔ رکی ہنسی پھر سے چھوٹی مگر ایسے کہ آنکھوں میں پانی بھر آیا۔

☆☆☆

"کیا قبر میں اس سے بڑھ کر خاموشی ہوگی۔" بیٹوں کو سلا کر ان کے کمرے سے اپنے کمرے کی سمت جاتے مہ پارہ نے ایک پل کو رک کر اپنے چاروں طرف پھیلے سناٹے کو بری طرح محسوس کیا۔
سرما کی سرد ترین رات میں سر شام ہونے والی بارش اب کہیں جا کر تھمی تھی۔ سختی سے بند کھڑکیوں دروازوں نے الگ ہیبت اور افسردگی پھیلا دی۔

اسے عجیب وحشت نے آن گھیرا۔ وہ تقریباً بھاگتی اپنے کمرے میں آ گئی۔ باہر کی نسبت اندر ہیٹر کی گرمائش بھی تھی۔ اس نے بیڈ پر سوئی بچی کے گرد کمبل کو مزید کسا۔ اب اور کیا کرے، کیا کیا جا سکتا ہے؟ نیند کی روٹھی دیوی کو کیا بھینٹ دے کہ وہ مہربان ہو۔

پتا نہیں کس نے اڑائی ہے کتاب بہترین دوست ہوتی ہے، تنہائی کی ساتھی...... اس نے اپنی شکوہ بھری نگاہ کتابوں کے ڈھیر سے پھیر لی۔

اور موبائل اور فیس بک کے فرینڈز...... دنیا کا سب سے کچا رشتہ...... اس نے موبائل بھی رکھ دیا اور بستر میں جا کر سختی سے آنکھیں میچ لیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ نیند کو روٹھے زمانے گزر رہے، اس کے بے شکن بستر کی ہر سلوٹ اس کے اندرونی خلفشار اور تنہائی کی گواہ بننے لگی اور یہ تو ہر رات کی کہانی تھی......

اس میں نیا کیا۔

اس نے اپنا رنہیں کیا تھا، وان کیا تھا۔ تو پھر یہ آنسو کیسے...... اس نے سختی سے اپنی آنکھیں رگڑیں۔ پھر یک دم دھیان آنے پر بستر سے نکل کر دیوار پر لگے کیلنڈر کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ کیل کے سہارے ڈورے سے لٹکے پین کو تھام لیا اور یہ کیلنڈر کوئی عام کیلنڈر نہیں تھا۔ یہ حاضری رجسٹر تھا گویا جس پر مرید حسین کی غیر حاضری پر سرخ رنگ سے دائرے بنے تھے۔ اس نے غیر ارادی طور پر پیچھے کو صفحے پلٹے۔

ایک صفحہ...... ایک مہینہ...... دو صفحے یعنی دو مہینے...... تین صفحے یعنی تین مہینے......

تو جتنے صفحے اتنے مہینے......اور پھر کتنے دن......اور کتنی راتیں......ان گنت راتیں۔

اور ان کو گننا کیسا محال ہے مگر مہ پارہ نے یہ ناممکن کام کر رکھا تھا۔

اس کے ٹھٹھرے وجود اور ٹھٹھرے اعصاب کو بیرونی کھڑکی پر پڑتی روشنی نے چونکایا۔ وہ تیزی سے اٹھ کر کھڑکی تک چلی آئی۔ مرید حسین اکیلا تھا۔ اس کا مطلب...... زائرہ کے والد کی طبیعت ابھی تک نہیں سنبھلی تھی۔

ان کے پھیپھڑوں میں پانی بھر گیا تھا۔ انہیں سانس لینے میں تکلیف کے ساتھ بڑھاپے کے اور بہت سارے امراض لاحق تھے۔ مرید حسین ایک اچھے داماد کی حیثیت سے سارے فرائض ادا کر رہا تھا۔ اس نے زائرہ کی دل دہی کے لیے اسے ان کے پاس چھوڑ رکھا تھا۔

ہاں بھئی محبوب پیارا، محبوب کے کوچے کی باس بھی پیاری۔ یہ تو پھر محبوب کے باپ کی بات تھی۔

مہ پارہ کھڑکی سے ہٹ کر بستر میں گھس گئی۔ خود کو کمبل میں گول مول کیا۔ بعض دفعہ ڈوبتے مچلتے دل کو ایسے بھی سنبھالا جاتا ہے۔

مرید اب سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ سناٹا چغلی کھانے لگا۔ ایک سیڑھی، دو...... تین...... آخری۔ وہ اب کاریڈور سے گزر رہا تھا۔ اب اس نے دروازہ کھولا۔ اب اس نے بند کر دیا۔ وہ اس کے کمرے کے پاس سے گزر گیا۔ مہ پارہ نے اتنی طاقت سے کمبل کو دبوچا کہ اس کی رگیں بل کھا گئیں۔ ایسی ناقدری...... ایسی بے توجہی...... نہیں ایسی ذلت۔ اس کا بیڈ بہت مضبوط تھا۔ اگر چارپائی ہوتی تو اس کی چیخیں چار محلوں تک جاتیں۔

مہ پارہ کو بہت دیر بعد اپنے بھیگے گالوں کا احساس ہوا اور بھیگی چپکتی پلکیں......

وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ وہ کیوں رو رہی تھی۔ اس نے خود کو نہ رونے کی سخت وارننگ دے رکھی تھی۔ اس نے خود کو ڈپٹنا شروع کر دیا۔ اور دل اس کے تابع تھا۔ اس کا حکم جبر بھینے کے باوجود سر جھکا کر آئندہ محتاط رہنے کا وعدہ کرنے لگا۔ جب یک دم چونکا۔ مہ پارہ نہیں، اس کا دل چونکا۔

جی ہاں، جن لوگوں کو ہم دل میں رکھتے ہیں۔ ان کی دستک کانوں سے پہلے دل خود سنتا ہے۔ مہ پارہ نے اچنبھے سے دروازے کو دیکھا۔ اس کے دل نے درست اطلاع دی تھی۔ دروازے پر مرید ہی تھا۔ بہت مدہم...... محتاط...... ٹھک ٹھک......

"کون؟" (اس کے بیٹے آجاتے تھے، اپنے کمرے سے اکثر اس کے ساتھ سونے کے لیے)
"میں......" مرید کی آواز مدھم تھی۔ مگر اس کی گونج مہ پارہ کے کمرے میں ایسے پھیلی جیسے غلام گردشوں میں آوازیں پلٹ پلٹ کر منہ پر پڑتی ہے۔
مہ پارہ کو پتا نہیں چلا، وہ کب دروازے تک چلی گئی۔
سامنے مرید حسین تھا۔ اس کا مرید...... جس کی زیارت اب کوئی اور کرتا تھا۔
مرید...... جس نے اپنا مرشد بدل لیا تھا (اور جو لوگ مرشد بدل لیتے ہیں، وہ قبلہ بھی بدل سکتے ہیں۔ ان پر کیا بھروسا کرنا)
مہ پارہ کی سوالیہ آنکھوں میں حیرت کا عنصر تھا۔ جسے اس نے چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ مرید مسکرایا۔ کھسیانی سی مسکراہٹ...... مگر مہ پارہ کے چہرے کا رنگ نہ بدلا۔
"کیا ہے...... کیوں...... کس لیے...... کیا چاہتے ہو؟" اس کی آنکھیں پوچھنے لگیں۔
مرید...... مرید سے مرد بن گیا۔ مرد سے شوہر......
شوہر بھی وہ جو چل کر آیا تھا...... سرتاج......
"نہیں......؟" مہ پارہ نے اپنے دل پر پیر رکھا۔ وہ دروازے میں حائل تھی ایسے کہ مرید حسین رینگ کر بھی جانا چاہے تو نہ جا سکے۔
"کیا نہیں؟" مرید واقعی نہیں کا مطلب نہیں سمجھا تھا یا تجاہل برت رہا تھا۔
"نہیں کا مطلب...... نہیں مرید حسین۔" مہ پارہ کی آواز صاف اور واضح تھی۔ جیسے انصاف پسند قاضی کی ہوتی ہوگی۔
"تم جانتی ہو کیا کہہ رہی ہو؟" مرید حسین مجازی خدا ہو گیا۔ وہ مہ پارہ کی طرف جھکتے ہوئے غرایا تھا۔
"ہاں......" مہ پارہ نے گردن سیدھی کی۔ "تم میرے کمرے میں نہیں آسکتے مرید۔"
"میں شوہر ہوں تمہارا۔"
"ایک اور عورت کے بھی شوہر ہو۔ جس دن اس کے ہوئے تھے، میرے نہیں رہے۔"
"ایسے نہیں ہوتا مہ پارہ!"
"دنیا میں بہت کچھ ایسے نہیں ہوتا مرید! جیسا تم نے کیا...... جیسا میں نے کیا۔ ہماری زندگیوں میں ہر چیز دنیا سے بہت ہٹ کر ہے۔ میرا انکار بھی اسی کا ایک حصہ ہے۔"
"تم اب بھی میری بیوی ہو۔" اس نے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا۔
"کاغذوں میں...... وہ بھی صرف بچوں کی خاطر۔" اس نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑوایا تھا۔ مرید کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔
"میں خود چل کر آیا ہوں۔"
"ہاں تو میں نے کب یہ سوچا کہ وہ عورت تمہیں پلیٹ میں رکھ کر میری طرف بھیجے گی۔ سمجھتے کیا ہو مجھے تم۔ اسٹینڈ بائی جنریٹر ہوں۔ تم میرے کمرے میں نہیں آسکتے مرید! مجھے چھو بھی نہیں سکتے۔"
وہ ہیر تھی جو رانجھا رانجھا کرتی رانجھن ہو گئی تھی۔ مٹ گئی، مر گئی......
"مگر محبت اور حمیت میں سے میرے لیے حمیت اہم ہے۔ میری اپنی عزت...... سیلف ریسپیکٹ...... سمجھتے ہو۔"
"ماہی میں......"
"ناں...... نہیں...... کوئی صفائی نہیں۔ محبت میں نے ہیر سے بڑھ کر کی تھی مگر افسوس، تم رانجھا نہیں نکلے۔"
اس نے مرید کے منہ پر دروازہ بند کر دیا اور خود دروازے سے کمر لگاتے زمین پر بیٹھتی چلی گئی اور باہر مرید......
ہونہہ...... کیا سمجھتا تھا...... ایک ہی پیر سے دوسری بار بیعت کرے گا، ہونہہ......
☆

ثانیہ مرتضیٰ

اندھوں میں کانی رانی

"اور کتنی دیر ہے آپی! قسم سے بھوک کے مارے برا حال ہے۔" اقصیٰ بھوک سے بلبلائی۔

"بس یہ ادرک ڈال کر نکالتی ہوں۔ تم اتنی دیر میں دسترخوان لگاؤ۔"

"ویسے آپی! جتنی دیر میں تم کھانا بناتی ہو، اتنی دیر میں انڈے سے چوزہ نکل کر بڑا بھی ہو جائے۔" اقصیٰ سے بھوک برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ اس لیے مبالغہ آرائی سے کام لے رہی تھی۔

"ہاں تو خوب محنت کر کے بناتی ہوں۔ وقت تو لگے گا نا۔ اچھا چھوڑو، یہ بتاؤ کھانے کی خوشبو کیسی آ رہی ہے؟" رانیہ عرف رانی نے قورمہ کی خوشبو اپنے اندر اتارتے ہوئے اقصیٰ سے پوچھا۔

"خوشبو...... ابھی تک تو نہیں آ رہی۔ کھاؤں گی تو بتاؤں گی کہ کیسا بنا ہے۔" اقصیٰ نے خوشبو سونگھنے کی ناکام کوشش کی۔

"ایک تو میں تمہاری ناک سے تنگ ہوں۔ ہر وقت بند رہتی ہے۔ جو شاندہ پیا کرو تاکہ تمہیں میرے بنائے ہوئے لذیذ کھانوں کی خوشبو آیا کرے۔ ہمیشہ محروم رہ جاتی ہو۔" رانی نے میاں مٹھو بنتے ہوئے اقصیٰ کو مفت اور مفید مشورہ دیا تھا اور اقصیٰ بے چاری دل میں یہ سوچ رہی تھی کہ جو شاندہ تو پھر سب گھر والوں کو پینا پڑے گا کیونکہ رانی آپی کے بنائے ہوئے کھانوں کی خوشبو اکثر و بیشتر کسی کو نہیں آتی تھی۔

☆☆☆

"کیسا بنا ہے قورمہ؟" کافی دیر انتظار کے بعد جب کسی کے منہ سے تعریف کا ایک بول بھی نہ نکلا تو رانی نے خود ہی ڈھیٹ بن کر پوچھ لیا۔

"ٹھیک ہے...... صحیح ہے......" بس سب نے اتنا ہی جواب دیا تھا۔ مجال ہے جو کسی نے اچھی طرح بے چاری رانی کی تعریف کی ہو۔ جس نے اتنی محنت سے اتنا اچھا قورمہ (بقول رانی کے) بنایا تھا۔ لیکن وہ کہتے ہیں نا "دل کے ارماں آنسوؤں میں بہہ گئے" تو اس سے پہلے کہ رانی کے ارماں بھی آنکھوں کے رستے بہتے وہ اٹھ کر کمرے میں چلی گئی۔

ایسا نہیں تھا کہ رانی کے بنائے ہوئے کھانے بالکل کھانے کے قابل نہ ہوتے مگر ان میں ایسا ذائقہ نہ ہوتا جو امی اور چچی کے ہاتھوں میں تھا۔ جو کوئی بھی ان کا بنایا ہوا کھانا کھاتا، تعریف کیے بنا رہ نہ پاتا۔ تو ان دونوں کو دیکھ دیکھ کر رانی کو بھی اچھا کھانا بنانے کا شوق ہوا تھا۔

یوں تو وہ اپنی طرف سے پوری محنت اور لگن سے کھانا بناتی۔ امی سے بھی مدد لیتی اور رسالوں میں چھپنے والی ترکیبوں کو بھی پڑھتی۔ یوٹیوب پر کئی کوکنگ شوز بھی دیکھتی۔ مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ ایسے میں وہ تین چار دن افسردہ رہتی اور پھر دوبارہ سے نئے مشن (نیا کھانا) پر ڈٹ جاتی۔ آخر کو جہد مسلسل بھی کوئی چیز ہے...... ہے نا۔

☆☆☆

"منزہ! ارے او منزہ......! کہاں ہو؟ کب سے آوازیں لگا رہی ہوں۔" خالہ رشیدہ دیوار سے سر نکالے اپنی پڑوسن کو بلائے جا رہی تھیں۔

"آ رہی ہوں بہن! کیوں اتنا شور ڈالا ہوا ہے۔" منزہ بہن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے

لگیں۔

"وہ میں کہہ رہی تھی۔ کچھ نئی تصویریں لائی ہوں۔ کہو تو دکھاؤں تمہیں۔" منزہ کو پاس آتا دیکھ کر خالہ رشیدہ آہستہ آواز میں بولیں۔

"ادھر میری طرف ہی آ جاؤ۔ دیکھ لیتی ہوں میں ـــــ تھوڑے سے برتن رہ گئے ہیں، وہ دھولوں۔" رشیدہ کو بلا کر منزہ واپس کچن میں چلی گئیں۔

تھوڑی دیر بعد چائے کے ساتھ بسکٹ کھاتے ہوئے خالہ رشیدہ منزہ کو پیاری پیاری لڑکیوں کی تصویریں دکھا رہی تھیں۔

"دیکھو بہن! تم تو جانتی ہو، مجھے دولت سے کوئی دلچسپی نہیں اور صورت سے بھی زیادہ سیرت اچھی ہو لڑکی کی۔ بس مجھے ایسی بہو چاہیے جو ہمارے ساتھ گھل مل کر رہے اور میرا گھر سنبھال لے۔ اب مجھ میں پہلے جیسی ہمت نہیں رہی۔"

منزہ تصویریں واپس رکھ کر رشیدہ سے گویا ہوئیں۔

"اچھا یہ تصویر دیکھو۔ بالکل ایسی لڑکی ہے، جیسی تمہیں چاہیے۔ رانیہ نام ہے۔ گھر داری میں طاق ہے۔ اس کی ماں بھی بہت سلیقے والی ہے۔ بالکل اپنی ماں پر گئی ہے۔ تم کہو تو بات آگے چلاؤں۔"

"ٹھیک ہے بہن! پھر ملاقات کرادو ان سے۔" منزہ نے بھی رضامندی ظاہر کی۔

☆☆☆

"چلو، کینٹین سے نان لے کر گراؤنڈ میں بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ میں قورمہ لائی ہوں۔"

کیمسٹری لیب سے پریشان حال چہرہ لیے نکلتی، دوستوں کو رانیہ نے قورمے کی خوش خبری سنائی تو ان کے چہروں پر خوشی دوڑ گئی۔ (بھئی فری میں کھانا ملنے کی خوشی)۔

دسمبر کے دنوں میں دھوپ ذرا کم ہی نکلتی تھی۔

آج ان چاروں کی قسمت اچھی تھی جو فری پیریڈ کے ساتھ ساتھ گرم دھوپ اور قورمہ دونوں میسر آگئے تھے۔

"کس نے بنایا ہے سالن۔" ارم نے نوالہ نگلتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے بنایا ہے، کیسا بنا ہے؟" رانیہ نے جواب دیتے ہوئے سوال بھی پوچھا تھا۔

"بہت مزے کا ہے۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آرہا۔ تم تو بڑا اچھا کھانا بنا لیتی ہو۔" ارم نے کھل کر رانیہ کی تعریف کی اور پھر ایسی ہی تعریف دوسری دونوں دوستوں حوریہ اور ندا نے بھی کی۔

"شکر ہے، تم ندیدیوں کو تو پسند آیا، ورنہ میرے گھر والے ناقدرے، کچھ بھی بنا کر کھلا دو، کبھی خوش ہی نہیں ہوتے۔"

"او بہن۔ یہ ندیدی کس کو کہا ہے۔ ایسے شکل

وقت میں (بھئی کیمسٹری کے پیریڈ کے بعد) اگر تم ہمیں خنڈے بھی کھلاتیں تاہم اسے بھی کڑاہی سمجھ کر کھالیتے۔ زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں۔" ثما تو حمیدی کا لقمہ سن کر رانیہ کو کاٹ کھانے کو دوڑی۔

"اچھا رانیہ! ایسا کرو نا تم روز گھر سے کچھ اچھا اچھا بنا کر لایا کرو۔ ہم تمہاری اچھی اچھی تعریفیں کریں گے۔ تمہاری بھی پریکٹس ہو جائے گی۔ تم بھی خوش اور ہم بھی۔"

حوریہ قورمہ پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولی۔ اسے معلوم تھا کہ رانیہ کے گھر والوں کو اس کا بنایا کھانا پسند نہ آتا تھا۔

"تم ہی لوگ کوئی مشورہ دو۔ میں تو ہمیشہ کوشش کرتی ہوں اچھا کھانا بناؤں مگر گھر میں کسی کو پسند ہی نہیں آتا۔" رانیہ اداسی سے بولی۔

"کوئی بات نہیں یار! کوشش کرتی رہو، آہستہ آہستہ اچھا بنانا سیکھ لوگی۔ اتنی جلدی تو کوئی کام نہیں ہوتا۔ ایسا کرو ڈبے والے مسالے استعمال کرو۔ اس میں تو آرٹیفیشل فلیور ہوتا ہے۔ بڑے مزے کا کھانا بنتا ہے۔" ارم نے رانیہ کو تسلی اور مشورہ دونوں بیک وقت دیے۔

"نہیں یار! امی تو سخت مخالف ہیں ڈبے والے مسالوں کے۔ وہ تو سارے مسالے ثابت لا کر خود پیس کر رکھتی ہیں اور ویسے میں خود بھی اپنی محنت سے ہی کروں گی۔ یوں آدھی ادھوری محنت اور تعریف اچھی نہیں لگتی۔" رانیہ نے وضاحت کی۔

"او چھوڑو بھئی، ذائقہ تو کھانے والی زبان میں ہوتا ہے۔ دیکھو ہمیں تو بڑا اچھا لگا قورمہ۔ کیا خیال ہے تم دونوں کا۔" ثما نے باقی دونوں کی طرف تائیدی نظروں سے دیکھا۔

"ہاں، پتا نہیں میری دفعہ یہ سب کے منہ کے ذائقے کیوں بدل جاتے ہیں۔" رانیہ نے بری سی شکل بنا کر کہا تو باقی تینوں ہنس دیں۔

"اچھا، چھوڑو ان باتوں۔ تم لوگوں کو ایک مزے کی بات سناتی ہوں۔" حوریہ نے دوستوں کی توجہ اپنی طرف کرائی۔

"کل پڑوسن آنٹی امی سے اپنے کسی رشتہ دار کا ذکر کر رہی تھیں۔ کہتی ہیں، کیا بتاؤں باجی! اتنا خوب صورت نوجوان میری دیورانی کا بھائی...... "دل کا ہارٹ اٹیک" ہوا تو ہسپتال میں پڑا ہے۔ قسم سے بڑا دکھ ہوا مجھے تو۔" حوریہ کہتے ہوئے ہنسنے لگی۔

"پھر کہنے لگیں "ہارٹ اٹیک تو ہوتا ہی برا ہے پر دل کا ہارٹ اٹیک تو اللہ کسی کو نہ کرائے۔"

بس پھر کیا تھا، اس افسردہ ماحول میں سب کی ہنسی چھوٹ گئی۔

☆☆☆

"بات سنیں ذرا۔ آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔" رفعت ہاتھوں پر لوشن لگاتے ہوئے شوہر سے مخاطب ہوئیں۔

"ہاں...... کہو۔" شکور نے کتاب پر سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

"پہلے آپ یہ کتاب تو بند کریں۔ پھر توجہ سے میری بات سنیں۔"

"چلو، کردی بند۔ اب بتاؤ۔" شکور نے عینک اتار کر کتاب بند کی اور چہرہ بیوی کی طرف گھمایا۔

"وہ رشیدہ نے اپنی رانیہ کے لیے ایک رشتہ بتایا ہے۔ اچھے خاندانی لوگ ہیں اور لڑکا پڑھا لکھا، برسر روزگار ہے۔ فیملی بھی چھوٹی سی ہی ہے۔ اگلے ہفتے وہ لوگ آنا چاہ رہے ہیں۔ آپ کہیں تو ان کو بلا لوں۔" رفعت نے ایک ہی سانس میں مدعا بیان کیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔ پر آپ پہلے رانیہ کی توجہ گھر داری کی طرف کریں۔ ہم تو جیسا بھی الابلا پکاتی ہے، چپ کر کے کھالیتے ہیں۔ اگلے گھر جائے گی تو کیا کرے گی۔" شکور نے بیوی سے خدشہ کا اظہار کیا۔

"اللہ کا شکر ہے، باقی تمام کاموں میں ماہر ہے میری بیٹی۔ بس کھانا بنانے میں تھوڑی کمی رہ جاتی ہے۔ آہستہ آہستہ وہ بھی سیکھ ہی جائے گی۔" رفعت نے بیٹی کی طرف داری کی۔

"ٹھیک ہے۔ پھر بلالیں ان کو۔ مل کر دیکھ لیتے ہیں۔ اللہ میری بچی کے نصیب اچھے کرے۔" شکور نے بیٹی کو دعا دیتے ہوئے پھر سے کتاب کھول لی تھی۔

☆☆☆

لڑکے والوں کو رانیہ بہت پسند آئی تھی۔ منگنی کر کے رانیہ کے پیپرز کے بعد شادی کی تاریخ بھی رکھ دی گئی تھی۔ اس سلسلے میں رفعت کا تقریباً روز ہی بازار کا چکر لگتا تھا۔

"رانیہ بیٹا! مجھے شاید بازار میں دیر ہو جائے تو تم رات کے کھانے کا انتظام کر لینا۔" رفعت نے جاتے ہوئے بیٹی کو تاکید کی۔

"آج بریانی بناتی ہوں۔" فریج میں چکن دیکھ کر رانیہ نے یہی سوچا۔

"اتنی کم مرچیں لکھی ہیں ترکیب میں۔ یہ تو بالکل پھیکی بریانی بنے گی۔" رانیہ نے رسالے میں سے ترکیب پڑھ کر دل میں سوچا اور پھر چار چمچے بھر بھر کر مرچ ڈالی تھی مسالے میں۔

پھر جب بریانی تیار ہوئی تو ذائقہ کہیں گم ہی ہو چکا تھا۔ بس مرچیں ہی محسوس ہو رہی تھیں۔ رانیہ کو آج پھر ناکامی ہوئی تھی حالانکہ محنت تو بہت کی تھی بے چاری نے۔

☆☆☆

اور پھر وہ دن بھی آیا تھا جب رانیہ سسرال میں پہلی دفعہ کھانا بناتے ہوئے نروس ہو رہی تھی۔ ایسے میں اسے اقصیٰ کا خیال تھا جس نے اسے شادی پہلے بتایا تھا۔

"ویسے آپی! مجھے لگتا ہے، سسرال میں تمہاری دال گل جائے گی کیونکہ ان لوگوں کے کھانا کا ذائقہ بھی واجبی سا ہی تھا۔"

اور رانیہ کو بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ واقعی اس کی دال گل جائے گی۔ کیونکہ عالیہ (نند) اور آنٹی (ساس) بھی اتنا خاص کھانا نہ بناتی تھیں۔ آنٹی تو بیمار رہتی تھیں۔ زیادہ دیر کچن میں کھڑی نہ ہو سکتی تھیں اور عالیہ پڑھائی میں مصروف رہتی تھی۔ اس لیے کھانا زیادہ توجہ سے نہ بنا سکتی تھی۔ پھر بھی احتیاطاً رانیہ نے موبائل اپنے ساتھ ہی رکھ لیا تھا اور ویڈیو دیکھ کر اتنی ہی مقدار میں مرچ مسالوں کا استعمال کر رہی تھی، جتنا ویڈیو میں دکھایا جا رہا تھا۔ پھر جب کھانا بنا تو سب نے خوب تعریف کی تھی۔

"ارے واہ بہو۔ تم نے تو کمال کر دیا۔ بڑے دنوں بعد اتنا اچھا کھانا کھایا ہے۔ جیتی رہو۔" سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھتے ہوئے سسر نے دعا دی تھی۔

"واقعی بھابھی! آپ تو کمال کا کھانا بناتی ہیں۔ میں جب فری ہوئی تو آپ سے سیکھوں گی۔" عالیہ نے بھی کھلے دل سے تعریف کی۔

"ہاں بھابھی! سکھا دیجیے گا اس کو بھی۔ ہم تو صبر شکر کر کے کھا لیتے ہیں۔ سسرال میں گئی تو ہماری ناک کٹوائے گی۔" احمد نے بہن کو چھیڑا۔

"ناشکرے انسان۔ میں اپنی مصروفیت میں سے وقت نکال کر کھانا بنا کر دیتی تھی۔ بجائے میرا احسان ماننے کے میری برائیاں کر رہے ہو۔" عالیہ نے تیکھی نظروں سے احمد کو گھورتے ہوئے کہا۔

"ہاہاہا...... مصروفیت کا تو ایسے رونا روتی ہے جیسے پری میڈیکل کی اسٹوڈنٹ نہ ہوئی ٹرمپ کی مشیر ہو گئی۔" احمد بھی کہاں چپ رہنے والا تھا۔

"اچھا۔ اب چپ کر کے کھانا کھاؤ۔" بڑے بھائی نے دونوں کو ڈانٹا تو وہ خاموش ہو گئے۔

رانیہ تو سب کی تعریفیں سن کر ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ ارادہ تو اس کا اڑتے اڑتے چاند تک جانے کا تھا مگر پھر یہ سوچ کر زمین پر ہی بیٹھ گئی کہ کیا پتا آج کوئی معجزہ ہوا ہو۔

اور پھر یہ معجزے تقریباً روز ہی ہونے لگے تھے۔

☆☆☆

"اور سناؤ آپی! اب بھی تعریف ہوتی ہے سسرال میں کھانے کی یا صرف پہلی دفعہ ہی خوش کیا تھا انہوں نے۔" اقصیٰ نے ویڈیو کال پر رانیہ سے

مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں...... ہاں کیوں نہیں۔ روز تعریفیں سنتی ہوں۔ ان سب لوگوں کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے اب تو میں اچھا کھانا بنانا سیکھ ہی چکی ہوں۔" رانیہ نے جواب دیا۔

"آپی! لگتا ہے تمہارے سسرال والوں کا ٹیسٹ کچھ زیادہ ہی خراب ہے۔" اقصیٰ نے بہن کو چڑایا۔

"اوہو۔ اب ایسی بھی بات نہیں۔ بتایا تو ہے اب اچھا بنالیتی ہوں۔ پہلے میں بغیر سوچے سمجھے مسالوں کا استعمال کرتی تھی تو ذائقہ بدل جاتا تھا۔ اب صحیح تناسب سے استعمال کرنا آ گیا ہے اور دوسرا میرے سسرال والے حوصلہ افزائی بھی تو اتنی کرتے ہیں کہ جب کھانا بناؤ تو محنت کے ساتھ ساتھ خوشی بھی شامل ہوتی ہے۔ اس لیے ذائقہ دوبالا ہو جاتا ہے۔" رانیہ نے اقصیٰ کی بات کی تردید کی۔

"ویسے آپی! تم نے بتایا تھا کہ تمہاری نند اور آنٹی اتنا اچھا کھانا نہیں بناتی تھیں تو تمہاری صورت حال پر ایک محاورہ ذہن میں آیا ہے، سناؤ" اقصیٰ نے پوچھا۔

"ہاں، بتاؤ۔"

"تمہاری صورت حال بالکل "اندھوں میں کانی رانی" کی ہے۔" اقصیٰ نے ہنستے ہوئے بتایا۔

"بدتمیز...... تم نے تو محاورہ ہی بدل دیا۔" رانیہ نے مصنوعی خفگی کا اظہار کیا۔

"اچھا، پھر بعد میں بات کروں گی۔ ابھی شام کی چائے کا وقت ہو گیا ہے۔" رانیہ نے کال کاٹ دی تھی۔

☆☆☆

"وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا۔ چھ ماہ ہو گئے ہیں رانیہ کو ہمارے گھر آئے ہوئے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کل کی بات ہو۔ بڑی پیاری بچی ہے۔ کتنا خیال رکھتی ہے ہم سب کا۔ تمہیں بھی کتنا آرام مل گیا ہے اس کے ہونے سے۔" امجد صاحب نے منزہ سے کہا۔

"ہاں، اللہ کا شکر ہے۔ ہمیں اچھی بہو مل گئی۔ آخر کو پسند بھی تو میں نے کیا تھا رانیہ کو۔" منزہ اپنی پسند پر اترا آئیں۔

اپنا نام سن کر چائے لاتی رانیہ دروازے پر ہی رک گئی۔

"سنوں تو سہی، کیا کہہ رہے ہیں میرے بارے میں۔"

"تمہاری یہ کن سوئیاں لینے والی عادت نہ گئی رانیہ! ہزار بار کہا ہے بری بات ہے۔" ضمیر کی آواز نے رانیہ کو جھنجوڑا۔

"کوئی نہیں، آخری بار سن رہی ہوں۔ دوبارہ نہیں سنوں گی۔" رانیہ نے "ایک بار" پھر ضمیر کو تھپک کر سلا دیا تھا۔

"ویسے میں نوٹ کرتا ہوں بیگم! آپ بچی کی تعریف میں بہت کنجوسی کرتی ہیں۔ اس کے اچھے کاموں پر خوشی کا اظہار کریں گی تو بچی کا حوصلہ بڑھے گا۔" امجد صاحب (سسر) کی آواز سنائی دی تھی۔

"آپ سب لوگ کرتے ہیں نا اس کی تعریفیں۔ میں منہ پر تعریف کرنے کی قائل نہیں ہوں۔ میرے تو دل سے اس کے لیے دعا نکلتی ہے۔ اپنی جاننے والیوں کو بتایا ہے میں نے کہ میری بہو ایسا کھانا بناتی ہے کہ انگلیاں چاٹتے رہو۔ پورے خاندان میں اس جیسا کھانا کوئی نہ بناتا ہو گا۔" اب کی بار ساس کی آواز سنائی دی تھی۔

ان دونوں کی باتیں سن کر باہر کھڑی رانیہ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے تھے۔ اس کی محنت کا پھل رنگ لایا تھا۔ محنت کا پھل اگرچہ پکنے میں تھوڑا وقت لیتا ہے مگر ہوتا بہت میٹھا ہے۔ آپ بھی ٹرائی کیجیے گا۔

انتباہ

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی جانب سے تنبیہہ کی جاتی ہے کہ جو ویب سائٹس ہمارے ادارے کا نام لے کر "آفیشل پیج" کی اصطلاح استعمال کررہی ہیں ان سائٹس سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں، اسے فوری ترک کیا جائے تاکہ ہمارے معزز قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ایسی تمام ویب سائٹس اور سوشل میڈیا گروپس کو مرتب کرنے والے منتظمین جو اپنے سطحی مفادات کی خاطر ادارے سے شائع ہونے والے ماہناموں کے مضامین، افسانے اور کہانیاں بلا اختیار اور غیر قانونی طور پر اَپ لوڈ کرکے ادارے کو سنگین مالی نقصان پہنچانے کے ساتھ ادارے کی ساکھ متاثر کررہے ہیں، انہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ اس قبیح فعل کو فوری ترک کردیں، بصورت دیگر ادارہ، سائبر کرائمز کے قانون

Prevention of Electronic Crimes Act 2016

اور

Copyright Ordinance 1962 / 2000

کے تحت کسی بھی قسم کی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ایف آئی اے اور دیگر متعلقہ اداروں میں بھی ان افراد/ اداروں کے خلاف شکایات درج کرائی جائیں گی۔

خواتین ڈائجسٹ — ماہنامہ شعاع

ماہنامہ کرن — عمران ڈائجسٹ

ادارہ خواتین ڈائجسٹ

نگہت سیما

میں اسے کبھی بھی نہیں بھول پائی۔ وہ مجھے ہمیشہ یاد رہی ہے۔ اٹھیں سال گزرنے کے باوجود ایسا لگتا ہے جیسے ابھی کل کی بات ہو۔ جب ہم پہلی بار ملے تھے۔

وہ فاطمہ عمر تھی۔ سانولی سلونی، عام سی شکل و صورت کی بے حد عام سی لڑکی۔ اسکن کلر کا گاؤن اور اسکن کلر کا ہی اسکارف اوڑھے جس پر سیاہ پولکا ڈاٹس تھے۔ وہ عام سے بھی زیادہ عام لگ رہی تھی۔ وہ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے داخلی گیٹ کے پاس کچھ پریشان سی کھڑی تھی۔ میں غیر ارادی طور پر اس کے پاس رک گئی۔ اس کا یہ پولکا ڈاٹس والا اسکن کلر کا اسکارف اور گاؤن مجھے کچھ مانوس لگے تھے یا اس کی وہ عام شکل و صورت جانی پہچانی سی تھی۔ بہر حال میں اس کے پاس رک گئی تھی۔

''نیو کمر؟''

اس نے سر ہلایا۔

''میں بھی۔'' میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا جسے اس نے تھام لیا لیکن کچھ مشکوک سی مجھے دیکھ رہی تھی۔

''میں مدیحہ سلیم پراچہ اور آپ؟''

''فاطمہ عمر۔'' اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہو گئی۔

''فاطمہ عمر۔'' میں نے زیر لب دہرایا اور میرے اندر کہیں کچھ کلک ہوا تھا۔

''فاطمہ عمر...... پوزیشن ہولڈر......''

اس نے سر ہلایا۔

مکمل ناول

"او ہ مائی گوڈ۔ تب ہی تو تم مجھے جانی پہچانی لگ رہی تھیں۔ میں نے اخبار میں تمہاری تصویر دیکھی تھی۔ اسی گاؤن اور اسکارف کے ساتھ، اخبار کے رنگین صفحے پر۔ وہاں سب بورڈز کے پوزیشن ہولڈرز کی تصاویر تھیں اور میرے ذہن میں تمہارا یہ اسکارف تھا یا کچھ اور......" میں نے سر ہلایا اور ہاتھ ایک بار پھر اس کی طرف بڑھایا۔

"کیا میرے ساتھ دوستی کرو گی فاطمہ؟" اس کے ساتھ چلتے ہوئے میں نے پوچھا۔

"دوستی......" وہ اب ذرا کھل کر مسکرائی تھی اور میں نے دیکھا اس کے دائیں رخسار میں ننھا سا بھنور بن کر غائب ہو گیا تھا۔

"تم کچھ لیٹ آئی ہو فاطمہ! میرا آج یہاں چوتھا دن ہے۔"

"ہاں۔" اس کی مسکراہٹ سمٹی تھی۔

"کچھ لیٹ ہو گئی ہوں۔ سنا ہے یہاں سینئر اسٹوڈنٹ نئے آنے والوں کو بہت تنگ کرتے ہیں۔"

وہ میرے ساتھ چلتے چلتے لمحہ بھر کے لیے ٹھہر گئی تھی۔ اس کی نظریں اردگرد سے گزرتے طلبا پر تھیں۔

"تو تم اس ڈر سے لیٹ آئی ہو لیکن یہ سینئرز بھی بڑے کائیاں ہیں۔ وہ دیکھو سامنے اور پھر دائیں طرف، سینئرز کے گروپ کھڑے نئے آنے والوں کو تاڑ رہے ہیں اور غضب کی نظر رکھتے ہیں یہ۔" میں ہولے سے ہنسی۔

"لیکن تم گھبراؤ نہیں، یہاں چند سینئرز لڑکے لڑکیوں سے جان پہچان ہے میری۔ میرے دو کزن یہاں پڑھتے ہیں۔ ان ہی کی وجہ سے بچت ہو گئی۔ ہاں تھوڑا بہت تنگ کرنا تو ان کا حق تھا۔ سو کیا، اب دوبارہ وہ مجھے تنگ نہیں کریں گے اور تم میرے ساتھ ہو۔"

"کون سے ایئر میں ہیں تمہارے کزنز؟" وہ اب مطمئن سی تھی اور قدرے اعتماد سے ادھر اُدھر کا جائزہ لیتی میرے ساتھ چل رہی تھی۔

"میرا کزن جواد تھرڈ ایئر میں ہے اور میری کزن نوید و سیکنڈ ایئر میں۔" میں نے بتایا تو وہ خوش ہو گئی۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ ہمیں اگر کبھی کوئی مسئلہ ہوا یا ضرورت پڑی تو ہم ان سے مدد لے سکتے ہیں۔"

"کیوں نہیں...... دونوں میرے بہت پیارے ماموں جان کی اولاد ہیں۔"

اس نے میری بات سن کر سر ہلایا تھا۔ کچھ دیر تک ہمارے درمیان خاموشی رہی۔ پھر میں نے ہی پوچھا۔

"کیا سوچ رہی ہو؟"

"میں سوچ رہی تھی کہ یہ نئے آنے والوں کو فول بنانے کی روایت ختم نہیں ہو سکتی۔"

اس کی سوالیہ نظریں میری طرف اٹھی ہوئی تھیں اور میں نے دیکھا کہ اس عام شکل وصورت والی عام سی لڑکی کی سیاہ آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ میں نے اتنی روشن آنکھیں اس سے قبل کسی کی نہیں دیکھی تھیں، جیسے ان سیاہ پتلیوں میں دو دیے جلتے ہوں۔ حالانکہ وہ کوئی بڑی بڑی غلافی ہرنی جیسی، خمار آلود آنکھیں نہیں تھیں پھر بھی ان آنکھوں کا سحر اسیر کرتا تھا۔ ان عام سی آنکھوں کے گرد گھنی مڑی ہوئی پلکوں کی باڑھ تھی اور فاطمہ عمر اس عام سی شکل وصورت والی لڑکی کو اس کے دائیں گال میں پڑنے والے ڈمپل اور اس کی یہ لمبی گھنی مڑی ہوئی پلکوں والی بے حد روشن آنکھیں بہت خاص بنا رہی تھیں اور اس پر اس کی ذہانت و لیاقت اس نے سرگودھا بورڈ میں پہلی پوزیشن لی تھی۔ وہ بہت عام ہوتے ہوئے بھی عام نہیں تھی۔

"نہیں یار!" میں نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں۔ "کوئی بھی اس کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ ہر سینئر یہ کہتا ہے کہ جب ہمیں فول بنایا گیا تو ہم کیوں نہ بنائیں۔ کچھ عرصے پہلے تو ریگنگ کافی خطرناک حد تک تکلیف دہ ہو گئی تھی لیکن اب بہتر ہے۔"

پھر میں نے چلتے چلتے ایک لڑکی کی طرف اشارہ کیا، جسے چند سینئر لڑکیاں گھیرے ہوئے تھیں اور وہ بے سری آواز میں گا رہی تھی۔

"یہ بے چاری بھی تمہاری طرح چند دن گزار کر آئی ہے کہ اب تک یہ فول وغیرہ بنانے کا سلسلہ ختم ہو گیا ہو گا لیکن تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں، تاڑ

لیتے ہیں کہ دنیا پیچھی ہے۔ ذرا ادھر دیکھو......"

میں نے ایک طرف اشارہ کیا جہاں لڑکوں کے گروپ میں ایک لڑکا ٹھمک ٹھمک کر ناچ رہا تھا اور قہقہے لگاتے لڑکے تالیاں بجا رہے تھے۔

"لیکن میں چار دن بعد اس لیے نہیں آئی کہ مجھے فول بننے کا ڈر تھا بلکہ......" اس نے گہری سانس لی۔ "میری آپا اچانک بیمار ہو گئی تھیں اور میں پریقین بھی نہیں تھی کہ مجھے ایڈمیشن ملے گا بھی یا نہیں۔"

"تم نے... یہ کیا ہے، پھر تم کیوں بے یقین تھیں۔ یہ کیا بات کی تم نے؟" میں حیران ہوئی۔

"نہیں، میرا مطلب ہے لسٹ میں تو نام آ گیا تھا میرا کے۔ ای کے لیے لیکن میں نے بالکل آخری دن اپنی فیس وغیرہ جمع کروائی تھی تو جب تک میری ایڈمیشن فیس وغیرہ جمع نہیں ہو سکی تھی۔ میں یہی سوچتی تھی کہ شاید اس سال ایڈمیشن نہ لے سکوں۔"

"لیکن تم نے آخری دن ایڈمیشن فیس کیوں جمع کروائی۔ کچھ مسئلہ ہو جاتا، تم نہ جمع کروا پاتیں تو سال ضائع ہو جاتا۔ میرے پاپا کہتے ہیں کہ رسک نہیں لینا چاہیے۔ ہمیشہ وقت سے پہلے ہی کام کر لینا چاہیے۔ ہم نے تو ایڈمیشن فیس جمع کروانے کی ڈیٹ اناؤنس ہوتے ہی فیس جمع کروا دی تھی۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" اس نے بڑے تحمل سے میری بات سنی تھی۔ "لیکن ہمارے پاس ایڈمیشن فیس کے لیے پوری رقم نہ تھی۔ مجھے ہوسٹل کی بھی ساتھ ہی فیس جمع کروانی تھی حالانکہ میری آپا پچھلے دو سال سے قالین بن رہی تھیں۔ قالین تو میرے رزلٹ تک تیار ہو گیا تھا لیکن رقم یک مشت نہیں مل سکی تھی اور ابا کو بقایا رقم کے لیے لاہور کے کئی چکر لگانا پڑے تھے۔ جس دن آخری تاریخ تھی، اس دن ابا کو بقایا پیسے ملے تھے اور میرے کزن عبدالرافع نے جمع کروائے تھے۔"

میں حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی۔

"تمہاری بہن قالین بنتی ہے۔"

"ہاں، ہمارے گاؤں میں اکثر لڑکیاں قالین بنتی ہیں۔ یہاں لاہور کے دکان دار قالین بافی کا سب سامان دے جاتے ہیں اور ایک قالین کی تیاری میں دو دو تین تین سال لگ جاتے ہیں اور بعض اوقات اس سے بھی زیادہ۔"

"تمہارا مطلب ہے ہینڈ میڈ قالین...... یہ تو بہت مہنگے ہوتے ہیں۔ لاکھوں میں فروخت ہوتے ہیں۔"

میں ابھی بھی حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"لیکن یہ لاہور کے تاجر ہمارے گاؤں کی لڑکیوں کو بہت کم اجرت دیتے ہیں۔ جتنی محنت وہ کرتی ہیں اس سے بہت کم۔"

وہ افسردہ ہوئی تھی اور چند لمحوں کے لیے اس کی روشن آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی تھی۔

"خیر، ابا جب فیس کی رقم عبدالرافع کو دے کر واپس گاؤں آیا تو آپا بیمار تھیں۔ دراصل انہوں نے اس بات کی بہت ٹینشن لی تھی کہ اگر فیس نہ جمع ہو سکی تو...... دراصل......" وہ مدھم سا مسکرائی۔ "مجھ سے زیادہ یہ آپا کی خواہش تھی کہ میں ڈاکٹر بنوں۔ وہ بہت نازک دل رکھتی ہیں۔ ذرا سی ٹینشن لیں تو بیمار ہو جاتی ہیں۔ سو دو دن سیالکوٹ ہاسپٹل میں ایڈمٹ رہیں۔"

اس کی یہ سادگی اور صاف گوئی مجھے اچھی لگی تھی۔ میں اس کے متعلق سب کچھ جان لینا چاہتی تھی، سو اسے لے کر ایک تنہا گوشے میں بیٹھ گئی۔

"تمہارے فادر کیا کرتے ہیں فاطمہ!"

"وہ گاؤں کے پرائمری اسکول میں پڑھاتے تھے لیکن گردوں کی تکلیف کی وجہ سے انہیں قبل از وقت ریٹائرمنٹ لینی پڑی لیکن ان کی پنشن اتنی زیادہ نہیں ہے کہ وہ میری میڈیکل کی تعلیم کا خرچ برداشت کر سکیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد جو پیسا ملا تھا، وہ سب اماں کی بیماری پر لگ گیا۔"

(آج سے اڑتیس سال پہلے نہ تو ٹیچرز کی تنخواہیں آج کی طرح لاکھوں میں تھیں اور نہ ہی لاکھوں میں جی پی فنڈ وغیرہ ملتا تھا)

"اور تمہاری اماں کا کیا ہوا، اب کیسی ہیں وہ؟"

مجھے پتا نہیں کیوں اس اجنبی لڑکی سے پہلی ہی

ملاقات میں ہمدردی ہوگئی تھی یا انس ہو گیا تھا۔

"وہ نہیں ہیں۔ چند سال پہلے ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ آپا نے بہت کم عمری میں ہی میری تعلیم کے اخراجات کی ذمہ داری اٹھالی تھی۔ وہ کہتی تھیں کہ مجھے ڈاکٹر بننا ہے۔ اماں کے دماغ میں ٹیومر تھا لیکن دیر سے پتا چلا اور جب ڈائیگنوز ہوا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔"

اس کی روشن آنکھوں میں بادل سے لہرائے تھے۔

"ابھی تو سب ہو گیا فاطمہ! لیکن کیا بعد میں بھی تمہاری آپا قالین بن کر تمہارے تعلیمی اخراجات پورے کریں گی؟"

"قالین تو خیر وہ بنیں گی لیکن جہاں تک میرے تعلیمی اخراجات کی بات ہے تو مشکل صرف ابتدائی اخراجات کی تھی۔ بعد میں تو اسکالرشپ مل جاتا ہے۔ ہماری پرنسپل نے بتایا تھا کہ گورنمنٹ اسکالرشپ کے علاوہ مخیر حضرات کی طرف سے بھی اسکالرشپ کی آفرز آتی رہتی ہیں۔ انہوں نے مجھے کہا تھا کہ تم نوٹس بورڈ دیکھتی رہنا، جب کوئی اچھی آفر آئے تو اپلائی کر دینا۔ ویسے میں نے اپنے کزن کے کہنے پر ایک دو جگہ اپلائی کر رکھا ہے۔ میرے کزن علامہ اقبال میڈیکل کالج کے چوتھے سال میں ہیں اور اسکالرشپ ہولڈر ہیں۔ انہوں نے مجھے گائیڈ کیا تھا کہ یہاں یہاں اپلائی کروں۔ پتا ہے عبدالرافع کیا کرتا ہے؟"

وہ ہولے سے ہنسی اور اس کے دائیں گال میں بھنور سا بن کر معدوم ہوا تھا۔

"وہ نوٹس بورڈ چیک کرتا رہتا ہے اور جو زیادہ اسکالرشپ کی آفر کرتا ہے، وہاں اپلائی کر دیتا ہے اور پچھلا ڈراپ کر دیتا ہے۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ ایک وقت میں آپ دو جگہ سے اسکالرشپ نہیں لے سکتے۔ پہلے سال کے آخر میں اس نے گورنمنٹ کا اسکالرشپ ڈراپ کر کے سہگل فاؤنڈیشن کا لے لیا تھا کہ اس کی اماؤنٹ زیادہ تھی اور پھر دوسرے سال اس نے سہگل فاؤنڈیشن کا ڈراپ کر کے ستارہ فاؤنڈیشن کا لے لیا تھا اور اب اس نے پھر کسی بسم اللہ فاؤنڈیشن میں اپلائی کیا ہوا ہے۔"

اس کے ہونٹوں پر اب بھی مدھم سی مسکراہٹ تھی اور یہ مسکراہٹ جیسے اس کی روشن آنکھوں سے بھی جھلک رہی تھی۔

"تو مستقبل میں تم بھی ایسا ہی ارادہ رکھتی ہو کیا؟"

میں ہولے سے ہنسی۔ وہ مجھے بہت انوکھی اور منفرد سی لگی تھی۔ لوگ تو اپنے آپ کو چھپاتے ہیں اور وہ بغیر کسی احساس کمتری کے بتا رہی تھی کہ وہ عام سے گھرانے کی، عام سی لڑکی ہے جس کے معاشی حالات بھی اچھے نہیں ہیں۔

"بالکل......!" اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

"مجھے اپنے متعلق کچھ اور بتاؤ، اپنی فیملی کے متعلق پھر میں بھی تمہیں بتاتی ہوں۔"

"میرے پاس بتانے کو کچھ زیادہ نہیں ہے مدیحہ! جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا میرے ابا ٹیچر تھے۔ آج کل گاؤں میں چھوٹی سی دکان کھول رکھی ہے۔ شام کو دکان بند کرنے کے بعد بچوں کو پڑھاتے ہیں۔"

"ٹیوشن پڑھانے والے تو بہت مزے میں ہوتے ہیں یار! اتنی زیادہ ٹیوشن فیس لیتے ہیں۔ یہ بڑی بڑی گاڑیاں اور شاندار گھر بنا رکھے ہیں۔" مجھے اپنے ٹیوٹر کا خیال آیا تھا۔

"ہمارے گاؤں میں بہت غربت ہے مدیحہ! ابا کسی سے ٹیوشن فیس نہیں لیتے۔ ان کے لیے یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ان کے گاؤں کے بچے پڑھ لکھ کر باشعور ہو جائیں۔ ان کے اختیار میں ہو تو وہ گاؤں کے ہر بچے کو علم کی دولت سے مالا مال کر دیں۔" وہ اپنے گاؤں کی غربت کا ذکر کرتے ہوئے افسردہ سی ہو گئی۔

"میری اماں کا انتقال ہو چکا ہے۔ ہم دو بہنیں ہیں۔ آمنہ آپا مجھ سے پانچ سال بڑی ہیں۔ میں چھ سال کی تھی اور آپا گیارہ کی، جب اماں کا انتقال ہوا۔ ایک طرح سے ہماری تائی نے ہی ہمیں پالا۔ دراصل تایا اور ابا ایک ہی گھر میں رہتے تھے بلکہ اب بھی ہم ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔ تایا اپنی تھوڑی سی زمین پر کام کرتے تھے اور ابا بی ٹی کر کے اسکول میں ٹیچر لگ گئے

تھے۔ میرے تایا کا ایک بیٹا اور تین بیٹیاں ہیں۔ ایک آپا سے بڑی، ایک تقریباً ان کی ہم عمر، ایک مجھ سے چھوٹی۔ ابھی عبدالرافع تایا کا بیٹا آٹھویں جماعت میں تھا کہ تایا کا انتقال ہو گیا۔ یوں سب ذمہ داری ابا کے کندھوں پر آ پڑی لیکن سب مل جل کر ہی کام کرتے ہیں۔ ناصرہ آپا میری آپا کے ساتھ مل کر قالین بنتی ہیں۔ تائی کڑھائی کرتی ہیں۔ اچھرے کا ایک دکان دار دھاگے، کپڑے اور شیشے، ستارے وغیرہ دے جاتا ہے۔ اجرت کم دیتا ہے لیکن اللہ کا شکر ہے اچھی گزر بسر ہو جاتی ہے۔ بدر آپا تایا کی بڑی بیٹی کی پچھلے سال شادی ہوئی ہے۔ جو تھوڑی بہت زمین تھی، ابا اور تایا کی مشترکہ ہی تھی۔ وہ آدھی بدر آپا کی شادی پر فروخت ہوئی اور آدھی جب عبدالرافع میٹرک کے بعد گوجرانوالہ گیا تھا پڑھنے تب باقی کی آدھی زمین بھی فروخت کر دی گئی۔ تایا تو تھے نہیں، زمین کون کاشت کرتا۔" اس نے تفصیل سے بتایا۔

"تمہاری آپا اور تایا زاد بہنوں نے پڑھا نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"گاؤں میں لڑکیوں کا اسکول صرف مڈل تک ہے آپا اور ناصرہ آپا نے مڈل تک ہی پڑھا ہے۔ چھوٹی ابھی پڑھ رہی ہے۔ ساتویں میں ہے۔" اس نے اسکارف درست کیا۔

"تمہارے گاؤں میں صرف مڈل تک اسکول ہے تو پھر تم نے کہاں سے میٹرک اور ایف ایس سی کیا؟" پتا نہیں کیوں میں اس کے متعلق سب کچھ جان لینا چاہتی تھی۔

"میری خالہ کی شادی سرگودھا میں ہوئی تھی، خالو ایک کالج میں لیکچرار ہیں تو ابا نے خالہ سے بات کی تھی ان کی بڑی خواہش تھی کہ میں اعلا تعلیم حاصل کروں۔ آپا کے بھی نہ پڑھنے کا انہیں دکھ تھا۔ مالی حالات ایسے نہ تھے کہ وہ مجھے گوجرانوالہ یا سیالکوٹ کسی ہوسٹل میں بھیجتے سو میں نے خالہ کے پاس ہی رہ کر پڑھا۔ میٹرک میں بھی سرگودھا بورڈ میں پہلی پوزیشن تھی۔"

"اور تمہاری آپا وہ بھی تو تمہاری خالہ کے پاس رہ کر پڑھ سکتی تھیں۔"

مجھے اس کی آپا سے ہمدردی ہو رہی تھی جو فاطمہ کو پڑھانے کے لیے محنت کرتی تھی اور خود صرف آٹھ جماعتیں ہی پڑھ سکی تھی۔

"ہاں پڑھ تو سکتی تھیں۔" اس کی آنکھوں میں ایک شریری چمک کوندی۔

"پر ہمارے ہاں لڑکیاں شادی سے پہلے سسرال جا کر نہیں رہتیں، بھلے وہ ان کی سگی خالہ کا گھر ہی کیوں نہ ہو۔ آپا کی نسبت بچپن ہی سے میرے خالہ زاد بھائی سے ہو چکی ہے۔ خالد بھائی..... یو ای ٹی سے سول انجینئرنگ کر رہے ہیں۔ آخری سال ہے ان کا۔ بس یا اور کچھ....."

وہ پھر ہنسی اور میں ایک بار پھر اس کے دائیں رخسار کے بھنور اور آنکھوں میں دمکتے روشن چراغوں میں کھو گئی۔ یا اللہ یہ اتنی عام سی سانولے رنگ کی لڑکی میں اتنی کشش ہو سکتی ہے یا مجھے ہی محسوس ہو رہی ہے۔

"نہیں بس۔ اب میں تمہیں اپنے متعلق بتاتی ہوں۔ میرے پپا بزنس مین ہیں اور مما ڈاکٹر ہیں۔ اگرچہ مما اور پپا دونوں فرسٹ کزن ہیں لیکن میرے ددھیال میں سب بزنس کرتے ہیں۔ گو سب ہی اعلا تعلیم یافتہ ہیں اور ننھیال میں سب ڈاکٹرز ہیں۔ میرے نانا بھی ڈاکٹرز ہیں اور مما کے نانا بھی ڈاکٹر تھے۔ مما کا اپنا ہاسپٹل ہے۔ میرے تینوں ماموں اور ممانیاں بھی ڈاکٹرز ہیں۔ ان کے بچے بھی میڈیکل میں ہی ہیں۔ میرے دو بھائی ہیں اور بہن کوئی نہیں ہے۔ میرے بڑے بھائی سلیمان چند ماہ پہلے ہی یو کے سے ایم بی اے کی ڈگری لے کر آئے ہیں اور پپا کے بزنس میں ان کا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ ان کی منگنی میرے بڑے ماموں کی بیٹی زہرہ سے ہو چکی ہے جو ان دنوں ماسٹرز کر رہی ہے۔ میں اور میرا جڑواں بھائی عثمان ہم دونوں نے ہی میڈیکل کا شعبہ منتخب کیا ہے۔ عثمان نے بھی تمہاری طرح لاہور بورڈ میں ٹاپ کیا ہے۔"

"عثمان پراچہ!" اس کے لبوں سے نکلا۔ یقیناً اس نے بھی اخبار میں دیکھا ہوگا۔

"یس، ہی از مائی برادر۔" (ہاں وہ میرا بھائی

ہے)

تب ہی عثمان مجھے سامنے سے آتا دکھائی دیا۔

''ہے مدحو! تم یہاں چھپی بیٹھی ہو اور میں کب سے تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں۔ پپا کا پیغام آیا ہے ڈرائیور کے ساتھ کہ نانو کی طبیعت کچھ خراب ہے تو ہم یہاں سے سیدھے نانو کے گھر جائیں اور اگر ہو سکے تو مما کو بھی راستے میں پک کر لیں کیونکہ ان کی گاڑی ورک شاپ میں ہے۔''

اس کی عادت تھی کہ وہ بغیر اسٹاپ کے بولتا تھا۔ ہمیں کالج اور اب یہاں افضل بھائی (ڈرائیور) پک اینڈ ڈراپ کرتے تھے۔ جب سے سلیمان بھائی آئے تھے، پپا ان کے ساتھ ہی آفس جاتے تھے اور افضل بھائی گھر پر ہی ہوتے تھے۔ ان کا کام صرف ہمیں ہی لانا لے جانا تھا۔ اگرچہ عثمان کو اس کی شان دار کامیابی پر پپا نے گاڑی گفٹ کی تھی لیکن ابھی انہوں نے اسے کالج لانے کی اجازت نہیں دی تھی۔

''مجھے فاطمہ مل گئی تھی اور ہم باتیں کرنے لگے۔''

میں نے اس کے مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی بتایا تو اس کی سوالیہ نظریں میری طرف اٹھیں۔ ظاہر ہے وہ میری تمام دوستوں کو جانتا تھا سو اس کا حیران ہونا بنتا تھا۔

''یہ فاطمہ عمر ہے۔ ہماری طرح اس نے بھی اسی سال ایڈمیشن لیا ہے۔''

اس نے ایک سرسری سی نظر اس پر ڈالی تھی۔

''میں عزیز کو بتا کر آتا ہوں تم پارکنگ میں آجاؤ۔ ویسے بھی آج کل تعارفی سیشن ہی چل رہا ہے تو مزید رکنے کا فائدہ۔''

''ٹھیک ہے اور ہاں۔ یہ فاطمہ عمر ہے عثمان! تمہاری طرح اس نے بھی سرگودھا بورڈ میں ٹاپ کیا ہے اور فاطمہ! یہ میرا بھائی عثمان ہے۔''

میں نے تعارف کروایا۔ عثمان جو واپسی کے لیے قدم اٹھا چکا تھا، اب رک کر فاطمہ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی اور بے یقینی...... شاید وہ سادہ سی فاطمہ سے یہ توقع نہیں کر رہا تھا کہ اس نے بورڈ میں ٹاپ کیا ہوگا۔ اس کی آنکھوں کا دوسرا تاثر کچھ اچھا نہیں تھا ناپسندیدگی اور جیلسی کا تاثر۔

مجھے پتا تھا کہ اسے فاطمہ اچھی نہیں لگی تھی کیونکہ اس کے نمبر عثمان سے زیادہ تھے۔ مجھے اس کا تبصرہ یاد تھا جب وہ تمام بورڈز کے ٹاپر کے نمبر دیکھ رہا تھا۔ فاطمہ کے نمبر سب سے زیادہ تھے اور عثمان کے دوسرے نمبر پر تھے۔

''یہ لڑکیاں ان کو آتا جاتا کچھ نہیں ہے، بس رٹے لگا لگا کر نمبر لے لیتی ہیں اور پھر سرگودھا بورڈ والے نمبر بھی بے تحاشا دیتے ہیں۔''

میں اس کی سگی بہن تھی لیکن بچپن میں کسی ٹیسٹ میں میرے ایک دو نمبر اس سے زیادہ آجاتے تھے تو وہ جل بھن کر کباب ہو جاتا تھا حالانکہ زیادہ تر اس کے ہی نمبر زیادہ ہوتے تھے۔ مجھے یاد ہے ایک بار میتھس میں میرے نمبر زیادہ تھے تو اس نے غصے سے میری ٹیسٹ والی کاپی پھاڑ دی تھی۔

وہ ایسا ہی تھا خود پسند اور مغرور سا۔ وہ کسی کو اپنے سے آگے دیکھنے کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا لیکن وہ میرا بھائی تھا، مجھے اس سے محبت تھی۔ وہ ہر کلاس میں ٹاپ کرتا تھا اور اب بھی لاہور بورڈ میں اس نے پہلی پوزیشن لی تھی۔ میرے نمبر بھی اگرچہ اچھے تھے لیکن پہلی تین پوزیشنوں میں سے میری کوئی پوزیشن نہ تھی۔ میں اسی میں بہت خوش تھی۔ جاتے جاتے اس نے مڑ کر پھر اسے دیکھا اور پھر کندھے جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔ یہ اس کا مخصوص انداز تھا لیتی سو واٹ......

تب ہی فاطمہ نے میری طرف دیکھا اور پھر اپنی طرف آتی ایک لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

''وہ ناز یہ ہے سرگودھا کالج میں میرے ساتھ ہی پڑھتی تھی۔ میں دراصل اس وقت گیٹ پر اسی کا انتظار کر رہی تھی۔''

''او کے، پھر کل ملاقات ہوتی ہے۔''

میں نے جلدی سے فاطمہ اور اس کی فرینڈ کو خدا حافظ کہا اور پارکنگ کی طرف بھاگی کہ عثمان سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ مجھے چھوڑ کر ہی چلا جاتا۔ غصے میں اسے خود پر کنٹرول نہیں رہتا تھا۔ میری فرینڈز میں

سے کسی کو یہاں داخلہ نہیں ملا تھا۔ صدف میری بیسٹ فرینڈ فاطمہ جناح میں گئی تھی جبکہ ہمارے گروپ کی مونا اور عاشی کو راولپنڈی میڈیکل کالج میں داخلہ ملا تھا۔ سو اگر وہ چلا جاتا تو مجھے اکیلے ہی جانا پڑتا۔ میرا اندازہ صحیح تھا، وہ کافی غصے میں لگتا تھا۔

میں نے بھی خاموشی میں عافیت سمجھی تھی۔

☆☆☆

"ممّا کو نانو کے گھر چھوڑ کر اور تھوڑی دیر وہاں بیٹھ کر ہم گھر آ گئے تو اس نے میرا اچھا خاصا مذاق اڑایا تھا۔

"اور تم اب اس پینڈو لڑکی سے دوستی کرو گی۔ تم نے غور نہیں کیا اس کی شکل پر کتنی حماقت برس رہی تھی۔"

"یہ تمہاری نظر کا قصور ہے عثمان! ورنہ اس کی اتنی روشن آنکھیں تو اس کی ذہانت کا پتا دیتی ہیں اور تم ذرا اپنا دل کشادہ کرو اور اپنے اندر دوسروں کی خوبیوں اور صلاحیتوں کو تسلیم کرنے کا حوصلہ پیدا کرو عثمان! اب تم کوئی ٹین ایجر نہیں ہو۔ ایک چھوٹا سا کالج نہیں ہے، یہاں ملک بھر سے اسٹوڈنٹ آئے ہوئے ہیں بلکہ غیر ممالک سے بھی۔ تو کئی ایسے ہوں گے جو تم سے کہیں زیادہ ذہین ہوں گے۔"

مجھے فاطمہ کے متعلق اس کا تبصرہ برا لگا تھا یا میں فاطمہ سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہوئی تھی۔

"کیا پہلی ملاقات میں ہی اس پینڈو لڑکی سے اتنی دوستی ہو گئی ہے کہ تم مجھے، اپنے جڑواں بھائی کو دل کشادہ کرنے کا مشورہ دے رہی ہو۔"

وہ جیسے میری بات سن کر شاکڈ ہوا تھا کہ میں نے پہلے کبھی اسے اس طرح کا مشورہ نہیں دیا تھا۔

"کچھ لوگ ہوتے ہیں جو پہلی ملاقات میں ہی اسیر کر لیتے ہیں عثمان! اور فاطمہ بھی ایسی ہی ہے۔ سادہ اور باوقاری اور......"

میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی عثمان نے قہقہہ لگایا تھا۔

"وہ اتنی عام سی لڑکی جسے ایک بار دیکھنے کے بعد دوسری بار دیکھنے کی تمنا نہ ہو، اس نے میری اس ذہین بہن کو اسیر کر لیا ہے۔ یہ اس صدی کا سب سے بڑا مذاق ہے مدحو ڈیر!"

اس بار میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس سے بحث کرنے کا فائدہ نہ تھا لیکن میں دل میں فاطمہ کو دوست بنانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ یقیناً مستقبل میں ہم دونوں کے درمیان ایسی ہی دوستی قائم ہونے والی تھی جیسے میرے اور صدف کے درمیان تھی۔ گو میں جانتی تھی کہ عثمان کو اس پر اعتراضات ہوں گے۔ وہ میرا بھائی تھا۔ مجھے اس سے محبت تھی۔ ایسی ہی محبت جیسی ہر بہن کو اپنے بھائی سے ہوتی ہے بلکہ جڑواں ہونے کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی میری اس سے بہت بنتی تھی لیکن اس کی کچھ باتوں سے مجھے ہمیشہ اختلاف رہا۔ جیسے اس کا اپنی ذات پر غرور، تکبر سا لگتا تھا۔

بچپن سے ہی وہ خود کو سب سے افضل سمجھتا تھا۔ ایک اس کی ظاہری خوب صورتی، دوسری ذہانت۔ وہ میرے اور سلیمان بھائی کے مقابلے میں زیادہ خوبرو تھا۔ خاندان اور خاندان سے باہر سب ہی اس کی تعریف کرتے تھے لیکن اس میں ایک خامی یہ تھی کہ وہ کسی دوسرے کی تعریف برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ پتا نہیں وہ ایسا کیوں تھا حالانکہ ممّا، پپا، سلیمان بھائی اور میں...... ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا۔

☆☆☆

ہر گزرتے دن کے ساتھ میری فاطمہ سے دوستی گہری ہوتی گئی اور میں، بہت جلد صدف وغیرہ کی جدائی کا غم بھول گئی تھی۔ وہ تھی ہی ایسی نرم مزاج، دھیمے دھیمے بولنے والی اور پڑھائی میں تو خیر وہ تھی ہی اچھی۔ ہمارا سیکشن ایک ہی تھا۔ نازیہ، میں اور فاطمہ۔ ہم تینوں کے درمیان ایک بہت گہرا سا تعلق بن گیا تھا۔

عثمان نے اسے کبھی اہمیت نہیں دی تھی تاہم اس نے میری اس سے دوستی پر اعتراض کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ جب پہلے سال کا رزلٹ آیا تو فاطمہ کی سب مضامین میں ڈسٹنکشن تھی جبکہ عثمان چند نمبروں کے فرق سے دوسرے نمبر پر رہا تھا اور وہ جل کر کوئلہ ہو رہا تھا۔

"یہ پڑھاکو، رٹو طوطا۔ چھوٹے علاقوں سے آنے والی لڑکیاں عملی زندگی میں بالکل زیرو ہوتی

ہیں۔ دیکھا نہیں تھا تم نے، انگلش میں بات کرتے
ہوئے کیسے ہکلا جاتی تھی۔"

وہ گھر آ کر مسلسل بول رہا تھا۔ وہ انگریزی میں بات کرتے ہوئے تھوڑا ہچکچاتی تھی۔ لیکن بہت جلد اس نے اپنی اس کمزوری پر قابو پالیا تھا لیکن اس کی نالج اور مطالعہ بہت تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے خالو کو انگلش لٹریچر سے بہت دلچسپی تھی اور ان کے گھر رہ کر اس نے بے شمار انگلش ناولز پڑھے تھے اور چونکہ ان کے گھر پاکستان ٹائمز آتا تھا اور خالو کا حکم تھا کہ سب بچے اپنی انگلش بہتر بنانے کے لیے پاکستان ٹائمز ہی پڑھا کریں۔

"اور تم نے اس کا ایکسنٹ (لہجہ) دیکھا تھا۔ کیسے اردو لہجے میں انگریزی بولتی ہے۔" وہ ادھر سے اُدھر ٹہلتے ہوئے اپنا غصہ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے نکال رہا تھا تو میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"تو کیا ہوا انگریزی کون سی اس کی مادری زبان ہے۔ وقت کے ساتھ اس کا لہجہ بھی بہتر ہو جائے گا حالانکہ اب بھی ٹھیک ہی ہے اور تم اب بڑے ہو جاؤ عثمان! اس طرح کی باتیں تمہارے منہ سے اب اچھی نہیں لگتیں۔ چند نمبر اگر اس نے تم سے زیادہ لے لیے ہیں تو اس سے تمہاری ذہانت اور لیاقت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سر فیاض تمہاری کتنی تعریف کرتے ہیں جبکہ انہوں نے فاطمہ کی بھی اتنی تعریف نہیں کی۔"

"ہاں تو وہ جانتے ہیں نا رٹا اصل ذہانت نہیں ہوتی۔"

اس کا غصہ تھوڑا سا کم ہوا اور میں نے شکر کیا۔

☆☆☆

ہمارے گروپ کے سب لڑکے اور لڑکیاں فاطمہ سے ٹریٹ مانگ رہے تھے۔ سوائے میرے اور عثمان کے...... عثمان تو اپنی جیلسی کی وجہ سے چپ بیٹھا تھا لیکن میں اس کے مالی حالات کی وجہ سے۔ لیکن اس نے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ جب اور جہاں کہیں ٹریٹ دینے کے لیے تیار ہے۔

"اور اس کے بعد عثمان ٹریٹ دے گا، آخر اس نے بھی تو اتنے شاندار نمبر لیے ہیں۔"

خاور نے کہا تھا اور باقی سب نے بھی اس کی تائید کی تھی۔

"اس طرح تو تم سب کو بھی ٹریٹ دینا چاہیے۔ سب نے ہی کلیئر کر لیا ہے، کسی کی سپلی نہیں آئی۔"

میں جانتی تھی عثمان کبھی ٹریٹ نہیں دے گا۔ وہ اندر ہی اندر جل بھن کر کباب ہو رہا ہوگا۔

"تم اتنے کنجوس تو نہیں تھے یار!"

خاور حیران ہوا تھا لیکن عثمان کندھے اچکاتا یک دم ہی اٹھ کر چلا گیا تھا کیونکہ اب سب ہی فاطمہ کو مشورے دے رہے تھے کہ کیا منگوایا جائے۔

"یہ عثمان کو کیا ہوا ہے؟" خاور پھر حیران ہوا۔

"تم نہیں سمجھ سکتے۔" یہ عزیز تھا عثمان کا گہرا دوست۔ وہ میرے جتنا تو نہیں لیکن بہرحال وہ عثمان کو جانتا تھا۔ سو وہ بھی اٹھ کر اس کے پیچھے چلا گیا تھا۔

سب اپنی اپنی پسند بتا رہے تھے، کسی کو فرائی مچھلی کھانی تھی اور کسی کو چرغہ۔ ہمارے گروپ میں مجھ سمیت بارہ لڑکے لڑکیاں تھے اور میں پریشان ہو رہی تھی کہ وہ کیسے مینیج کرے گی۔

"کیوں نہ ہم سب مل کر فاطمہ کی کامیابی کی خوشی میں ٹریٹ دیں۔"

"ہاں، یہ ٹھیک ہے۔"

نازیہ نے تائید کی اور فاطمہ نے مسکرا کر مجھے دیکھا۔ یقیناً وہ سمجھ گئی تھی کہ میں نے ایسا کیوں کہا ہے۔

"یہ ٹریٹ تو میری طرف سے ہی ہوگی۔ فرائی مچھلی، چرغہ، کڑاہی نان جو کچھ بھی منگوانا ہے، نازیہ لسٹ بنا سکتی ہے۔"

"اوکے، جب تم ڈیسائیڈ کر لو تو نازیہ کو بتا دینا۔ ابھی مجھے اور فاطمہ کو اردو بازار جانا ہے، کچھ کتابیں لینے۔"

میں فاطمہ کا ہاتھ پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔

"تم کیسے کرو گی یہ سب۔ اچھا خاصا خرچ ہوگا، منع کر دیتیں۔"

"وہ سب اتنے خلوص اور محبت سے ٹریٹ مانگ

رہے تھے، بھلا کیسے منع کرتی۔ یوں بھی عبدالرافع جب مجھے چھوڑنے آ رہا تھا تو اس نے مجھے کافی سارے پیسے دیے تھے اور کہا تھا تمہارے گروپ والے ٹریٹ مانگیں گے تو دے دینا۔ آخر اسے تجربہ ہے، ہر سال وہ بھی تو اپنے دوستوں کو ٹریٹ دیتا ہے۔

اس کے لبوں پر مسکراہٹ چمکی تھی اور آنکھیں بھی مسکرا اٹھیں۔ پتا نہیں یہ عام سی لڑکی مجھے اتنی خاص کیوں لگتی تھی کہ اس کے لیے میں اپنے سگے بھائی سے الجھ پڑتی تھی۔ اردو بازار سے اپنی مطلوبہ کتابیں خریدنے کے بعد جب میں گھر آئی تو عثمان گھر آ چکا تھا۔ اس نے کالج میں ہی مجھے بتا دیا تھا کہ وہ عزیز کے ساتھ جا رہا ہے، میں افضل بھائی کے ساتھ گھر چلی جاؤں۔

"یہ تم افضل بھائی کو لے کر کہاں گھومتی پھر رہی تھیں۔ مما کا دو بار فون آ چکا ہے کہ افضل بھائی کو ہاسپٹل بھیج دوں، کہیں کام سے بھجوانا ہے اسے۔"

وہ یوں ہی غیر متعلق باتیں کر کے اپنا غصہ نکالتا تھا۔

"اور سنو، تمہیں فاطمہ سے ٹریٹ لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"کیوں ضرورت نہیں، وہ میری دوست ہے اور مجھے اس کی خوشی میں شریک ہونا ہے۔"

میں جو پہلے عثمان کی ہر بات مان لیتی تھی، اب فاطمہ کے معاملے میں اس سے بحث کرنے لگی تھی۔

"بے چاری پتا نہیں کیسے ٹریٹ دے گی۔ کہاں سے آئیں گے اتنے پیسے۔" مجھ سے غلطی ہوئی تھی کہ ایک روز میں نے عثمان کو جانے کس موڈ میں آ کر اس کے حالات بتا دیے تھے۔

"میں، عزیز اور تم شریک نہیں ہوں گے تو بے چاری کی کچھ بچت ہو جائے گی۔" اس کی آنکھوں میں تمسخر تھا اور لہجہ مذاق اڑاتا ہوا سا۔

"یہ تمہارا سر درد نہیں ہے عثمان! کہ وہ پیسے کہاں سے لے گی۔ تمہیں شامل نہیں ہونا تو نہ ہو۔ میں تو سب کے ساتھ ہوں، گروپ میں دوسروں کی رائے کا احترام کرنا پڑتا ہے میرے بھائی! ممکن ہے اگلے سال سب تم سے ٹریٹ لیں تو کیا فاطمہ اس وجہ سے انکار کر دے گی کہ تم اسے پسند نہیں کرتے۔"

شاید میری بات نے اس کی انا کو تسکین پہنچائی تھی کہ وہ مزید کوئی بات کیے بغیر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا اور پھر اس نے فاطمہ کی ٹریٹ میں شامل ہو کر مجھے حیران کر دیا۔

فاطمہ کی آنکھوں میں بھی حیرت نظر آئی تھی لیکن جلد ہی اس نے اپنی حیرت پر قابو پا لیا تھا اور بہت خوش دلی سے اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔ بعد میں ایک روز میں نے اس سے پوچھا تھا کہ اس نے صرف عثمان کا ہی شکریہ کیوں ادا کیا۔

"اس لیے کہ مجھے یقین تھا کہ عثمان ہمارے ساتھ شامل نہیں ہو گا۔" وہ مدھم سا مسکرائی لیکن پھر فوراً ہی سنجیدہ ہو گئی۔

"پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ عثمان مجھے پسند نہیں کرتا بلکہ پسند تو عام سا لفظ ہے۔ وہ مجھ سے نفرت کرتا ہے۔"

وہ بے حد ذہین تھی اور کیسے ممکن تھا کہ وہ عثمان کی ناپسندیدگی اور اپنے لیے اس کی نفرت محسوس نہ کرتی۔

"دراصل......" میں نے عثمان کا دفاع کیا تھا یا وضاحت کی تھی۔

"وہ تم سے تھوڑا جیلس ہے۔ تمہاری ذہانت سے متاثر ہے لیکن تسلیم نہیں کر رہا۔ ایک دن تسلیم کر لے گا۔ پتا نہیں کیوں وہ بچپن سے ایسا ہی ہے۔ مجھ سے بھی جیلس ہو جاتا تھا اگر میرے نمبرز زیادہ آتے تھے تو......"

"لیکن یہ تو بہت منفی رویہ ہے مدحو! تم اسے سمجھاتی کیوں نہیں ہو۔" وہ پریشان ہو گئی۔

"سمجھاتی تو ہوں یار! پر ابھی اثر نہیں ہوتا اس پر۔ وقت کے ساتھ یقیناً وہ بھی بدل جائے گا۔ ابھی تک تو وہ گھر میں بچہ ہی بنا رہتا ہے۔"

"تو کیا وہ ہمیشہ بچہ ہی بنا رہے گا۔" وہ ہنسی تھی اور میں بھی ہنس دی تھی اور جب میں نے فاطمہ کی گفتگو عثمان کو بتائی تھی تو اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے تھے۔

"تو کرتا ہوں میں اس سے نفرت، زہر لگتی ہے

وہ مجھے۔ پتا نہیں خود کو کیا سمجھتی ہے۔ بڑی آئی افلاطون کی شاگرد۔"

"تم ایسے — کیوں ہو عثمان!" مجھے دکھ ہوا۔

"دنیا میں فاطمہ عمر کے علاوہ بھی بے شمار ذہین لوگ ہوں گے۔ تم سے کہیں بہت زیادہ ذہین...... پھر تمہیں فاطمہ سے ہی اتنی چڑ کیوں ہے۔"

"اس لیے کہ میرا مقابلہ فاطمہ عمر سے ہے دنیا کے باقی ذہین لوگوں سے نہیں اور تم دیکھنا مدحو! اس سال ہر مضمون میں ڈسٹنکشن لینے والا عثمان پراچہ ہوگا، فاطمہ عمر نہیں۔"

"میں تمہارے لیے دعا کروں گی عثمان اور مجھے یقین ہے کہ تمہاری کامیابی پر فاطمہ عمر تم سے جیلس نہیں ہوگی۔"

☆☆☆

اب پتا نہیں وجہ اس کا غرور تھا تکبر یا اس کا حد سے زیادہ بڑھا ہوا اعتماد کہ اگلے سال بھی ٹاپ فاطمہ ہی تھی وہ صرف ایک مضمون میں ڈسٹنکشن لے سکا تھا جبکہ باقی مضامین میں فاطمہ کے نمبر ہی سب سے زیادہ تھے اور تیسرے سال پھر ہر مضمون میں ڈسٹنکشن فاطمہ کی ہی تھی اور عثمان جیسے جل جل کر کوئلہ ہو رہا تھا اور میرے سامنے بول بول کر دل کی بھڑاس نکالتا تھا۔ وہ اسے رٹو طوطا کہتا تھا لیکن فاطمہ صرف پڑھائی میں ہی نہیں، ہر غیر نصابی سرگرمی میں حصہ لیتی تھی اور نمایاں کامیابی حاصل کرتی تھی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ عثمان نے فاطمہ کے خیال کو جیسے سر پر سوار کر لیا تھا ورنہ وہ بے حد ذہین بلکہ جینئس تھا اور فاطمہ بھی اس کی ذہانت کو تسلیم کرتی تھی۔

"تمہارا بھائی بہت ذہین ہے لیکن یہ حسد کی بیماری اس کی ذہانت کو کھا رہی ہے۔"

اس کا تجزیہ صحیح تھا اور جب میں نے عثمان کو بتایا تو اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا گلاس فرش پر دے مارا۔ میرا خیال تھا کہ وہ خوش ہوگا کہ فاطمہ اس کی ذہانت کو تسلیم کرتی ہے لیکن وہ تو غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔

"اسے کہو اپنے تجزیے اپنے پاس ہی رکھے، زیادہ ماہر نفسیات بننے کی ضرورت نہیں ہے۔"

اور اس روز میں نے سوچا تھا کہ میں اس سے کبھی فاطمہ کی بات نہیں کروں گی۔ شاید یہ میری غلطی ہے کہ میں اس کی تعریف کرتی ہوں تو وہ اس کی تعریف سن کر بھڑک جاتا ہے۔ اب تک وہ صرف اپنی ہی تعریف سنتا رہا ہے اور اس سے کسی اور کی تعریف برداشت نہیں ہوتی۔ فاطمہ ٹھیک کہتی ہے کہ یہ منفی رویہ ہے اور ایسے منفی رویے بعض اوقات انسان کی اپنی ذات کو ہی نقصان پہنچاتے ہیں اور تب اس روز میں نے مما سے بات کی تھی اور مما نے کہا تھا کہ وہ اسے سمجھائیں گی اور شاید یہ مما کے سمجھانے کا ہی اثر تھا کہ چوتھے سال کے آغاز سے ہی اس کا رویہ فاطمہ کے ساتھ بدل گیا تھا۔ جب بھی ہمارا گروپ اکٹھا ہوتا تو فاطمہ کے ساتھ اس کا رویہ نارمل ہوتا۔

وہ دوسرے ساتھیوں کی طرح اس کے ساتھ بھی ہلکی مذاق کرتا۔ کبھی کبھار کسی موضوع پر اس سے ڈسکس کرتا۔ اس نے پہلے کی طرح طنزیہ گفتگو کرنا چھوڑ دی تھی بلکہ میں نے تو کئی بار محسوس کیا تھا کہ وہ بہت دھیان سے اسے دیکھتا اور اس کی آنکھوں میں اس کے لیے ایک وارفتگی سی دکھائی دیتی تھی۔

تو کیا عثمان پراچہ فاطمہ عمر سے متاثر ہو رہا ہے اور اس کی محبت میں مبتلا ہو رہا ہے۔ میں نے خوش دلی سے سوچا تھا اگر ایسا ہو جائے تو کیا بات ہے۔

حیرت انگیز طور پر چوتھے سال سب مضامین میں ڈسٹنکشن عثمان کی ہی تھی۔ گو فرق دو تین نمبروں کا ہی تھا۔ سب نے اس سے ٹریٹ مانگی تھی۔

"اب تو ٹریٹ بنتی ہے یار!"

خاور کھانے پینے کا بہت شوقین تھا۔ سو ایسا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا تھا۔ فاطمہ نے بھی اسے مبارک باد دی تھی۔ میں نے بغور اسے دیکھا تھا اس کی بے ریا آنکھیں ہمیشہ کی طرح بہت روشن اور چمک دار لگ رہی تھیں۔ ان میں کوئی منفی جذبہ نہیں تھا۔ وہ بہت خلوص سے اپنی خوشی کا اظہار کر رہی تھی اور عثمان بھی ہنس ہنس کر اس سے باتیں کر رہا تھا۔

"عثمان! ہم تم سے زبردست قسم کی ٹریٹ لیں گے، آخر تم نے فاطمہ عمر کو بیٹ کیا ہے۔" خاور کو بلا سوچے سمجھے بولنے کی عادت تھی۔

"ہمارے درمیان کوئی مقابلہ تو نہیں تھا۔" فاطمہ مسکرائی۔

"ایک جیسی ذہانت کے لوگوں میں سے بھی کوئی آگے نکل جاتا ہے، کبھی کوئی۔ ہوسکتا ہے اگلے سال پھر فاطمہ آگے نکل جائے۔"

میرے لبوں سے غیر ارادی طور پر نکلا اور میں نے فوراً ہی عثمان کی ناگواری بھی محسوس کرلی تھی لیکن اس نے فوراً ہی اپنے تاثرات چھپالیے تھے۔

"ٹریٹ تمہاری مرضی کی، بولو کہاں؟"

"پی سی میں ڈنر...... نہیں تائیوان میں۔"

سب کی مختلف آرا تھی۔

"جہاں تک ڈنر کی بات ہے تو ہم لڑکیوں کے لیے مشکل ہے۔" ہمارے گروپ کی عاصمہ نے کہا تو سب نے ہی تائید کی۔

"تو ٹھیک ہے سنڈے کو لنچ میری طرف سے میرے گھر پر۔" عثمان نے بات ختم کی اور خاور کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

"تم بے فکر ہو جاؤ یار! تمہاری پسند کی سب ڈشز ہوں گی۔" اور خاور کا چہرہ کھل اٹھا۔ فاطمہ کچھ ہچکچائی۔

"مجھے ہوسٹل سے کہیں، کسی کے گھر جانے کی اجازت نہیں ہے۔"

"لیکن میں کسی نہیں تمہاری دوست ہوں اور عثمان میرا بھائی ہے۔ سمجھو، دعوت میری طرف سے۔ میں گاڑی بھیج دوں گی۔ تم اور نازیہ آجانا اور پھر واپس میں خود تم دونوں کو چھوڑ جاؤں گی اور جہاں تک اجازت کی بات ہے تم مجھے اپنے بابا یا عبدالرافع کا نمبر دو، میں اجازت لے لیتی ہوں۔"

"ہمارے گاؤں میں صرف ڈاکٹر صاحب اور ہیڈ ماسٹر صاحب کے گھر فون ہے، وہاں کوئی ضروری پیغام ہو تو دیا جاسکتا ہے۔ ہاں عبدالرافع کا فون نمبر ہے میرے پاس۔ ہاسپٹل کا بھی اور اس کے فلیٹ کا بھی۔"

☆☆☆

ایک ماہ پہلے ہی عبدالرافع نے جاب اسٹارٹ کی تھی۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ ہاؤس جاب ختم ہوتے ہی اسے سروسز ہاسپٹل میں جاب مل گئی تھی اور اس نے شادمان میں ایک فلیٹ کرائے پر لے لیا تھا۔ میں نے فاطمہ سے نمبر لے کر عبدالرافع کو فون کیا تو اس نے بہت خوشی سے اجازت دے دی تھی۔

مما نے اپنے چند جاننے والوں کو بھی انوائٹ کرلیا تھا۔ یوں بھی سنڈے تھا اور مما کو شوق بھی بہت تھا دعوتیں دینے کا۔ عثمان نے بھی اپنے گروپ کے علاوہ چند دوسرے دوستوں اور پروفیسرز کو بھی مدعو کیا تھا۔ سو کافی رونق ہوگئی تھی۔

ہمارے گروپ کی لڑکیوں نے اس دعوت میں شرکت کے لیے شاپنگ کا پروگرام بنایا تو میں بھی فاطمہ اور نازیہ کو زبردستی ساتھ لے گئی تھی اور پھر ہم نے خوب صورت ریڈی میڈ سوٹ خریدے تھے۔ نازیہ اور فاطمہ کے لیے میں نے خریداری کی تھی، اگرچہ فاطمہ کسی صورت یہ گفٹ نہیں لے رہی تھی لیکن جب میں نے ناراض ہونے کی دھمکی دی تو اس نے سوٹ لیا۔

وہ میری دوست تھی اور میری فیملی سے پہلی بار مل رہی تھی اور میں نے گھر میں اس کی اتنی تعریفیں کر رکھی تھیں کہ میں چاہتی تھی کہ وہ سب کو اتنی ہی اچھی لگے، جتنی مجھے اچھی لگتی ہے۔ ہم تینوں کے سوٹ تقریباً ایک جیسے ہی تھے، بس رنگوں کا اور ڈیزائن کا معمولی فرق تھا۔

"سنو، اچھی طرح سے تیار ہونا۔ ہلکا پھلکا میک اپ۔" میں نے اسے تاکید کی۔

"لیکن میں نے کبھی میک اپ نہیں کیا مدحو!" اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔

"تو کیا عبدالرافع کے لیے بھی میک اپ نہیں کرو گی؟"

میں نے اسے چھیڑا اور اس کے چہرے پر ایک نرم سا تاثر ابھرا اور لبوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ آٹھہری

ٹھہر گئی۔
"تم بے فکر رہو مدیحہ! ہم تمہارے بھائی کی پارٹی میں بہت اچھے سے تیار ہو کر آئیں گے۔"
نازیہ کو تو یوں بھی بننے سنورنے کا شوق تھا۔ وہ یونی میں بھی لائٹ سا میک اپ کر کے آتی تھی۔ سو اس روز بھی اس نے فاطمہ کے منع کرنے کے باوجود اس کا ہلکا سا میک اپ کر دیا تھا اور وہ عام سی نظر آنے والی فاطمہ عمر اس روز بے حد دلکش لگ رہی تھی۔ اس کے دائیں رخسار میں پڑنے والا ڈمپل، اس کی مڑی ہوئی پلکوں والی روشن آنکھیں، اس کا متناسب قد اور سراپا اور اس کی کمر سے نیچے آتی اس کی موٹی سی چٹیا، جسے میں نے بھی پہلی بار دیکھا تھا کہ میرے بے حد اصرار پر اس نے گاؤن میرے کمرے میں رکھ دیا تھا۔
"اتنا بڑا دوپٹا ہے، تو اسے اچھی طرح لپیٹ لو۔ یار! سب کو پتا تو چلے کہ ہم تینوں نے ایک جیسے کپڑے بنوائے ہیں۔"
"ہاں بھئی، لوگوں کو جلائیں گے، جو ہم تینوں کی دوستی سے جلتے ہیں۔" نازیہ نے بھی میری تائید کی تھی اور جب میں تیار ہو کر ان کے ساتھ لاؤنج میں آئی تو مما بھی اس سے متاثر ہوئیں۔
"ماشاء اللہ، تمہاری فرینڈز بہت پیاری ہیں مدحو!"
بوٹے سے قد کی بے حد سفید رنگت والی گول مٹول سی نازیہ بھی انہیں اچھی لگی تھی پھر پروفیسر فیاض کی فراخ دلانہ تعریف۔
"فاطمہ اور عثمان ہماری یونیورسٹی کا مان ہیں۔ ہمیں ان دونوں پر فخر ہے۔ مجھے یقین ہے یہ دونوں طب کے شعبے میں کمال حاصل کر کے اپنے وطن کا نام روشن کریں گے۔"
مما نے فاطمہ کو اپنے پاس ہی بٹھا لیا تھا اور میں عثمان کے ساتھ گھوم پھر کر سب کو ویلکم کہنے لگی۔ جب سب سے سلام دعا کر کے واپس آئی تو مما اس سے پوچھ رہی تھیں۔
"تمہارا فیوچر میں کیا پروگرام ہے۔ کون سا شعبہ چنو گی؟"
"میں نیورو سرجن بننا چاہتی ہوں اور نیورو سرجن بننا میرا خواب ہے اور یہ خواب میں تب سے دیکھ رہی ہوں جب سے مجھے پتا چلا کہ میری اماں کے دماغ میں ٹیومر تھا لیکن آخری دنوں میں ڈائیگنوس ہوا اور انسانی دماغ کے متعلق تحقیق کرنا بھی میرا ایک خواب ہے۔ آپ جانتی ہیں نا کہ انسانی دماغ کتنا پیچیدہ اور کتنا حیرت انگیز ہے اور......" وہ مسکرائی۔
"میری خواہش ہے کہ میں ایک دن پاکستان میں ہی دنیا کی سب سے بہترین نیورو سرجن بنوں۔"
"ان شاء اللہ۔ ایک دن تم دنیا کی بہترین سرجن بن کر ملک کا نام روشن کرو گی۔"
اس وقت اس کی آنکھیں اتنی روشن تھیں اور ان میں اتنی چمک تھی کہ میں مبہوت سی اسے دیکھ رہی تھی اور میں نے بے حد خلوص سے دعا دی تھی۔
"ہمارا عثمان بھی نیورو سرجن بننا چاہتا ہے جبکہ مدیحہ کو کائی میں دلچسپی ہے۔"
مما نے مسکرا کر عثمان کی طرف دیکھا جو کندھے اچکا کر دوسری طرف متوجہ ہو گیا۔ مما نے ہمیشہ کی طرح بہت اہتمام کیا تھا، سب نے ہی تعریف کی۔ ہمارے دوستوں اور پروفیسرز کے علاوہ مما کی دو تین کولیگز تھیں۔ ظاہر ہے یہ عثمان کی پارٹی تھی سو مما نے کسی عزیز رشتہ دار کو مدعو نہیں کیا تھا۔

☆☆☆

اور یہ اسی رات کی بات تھی، ہم سب ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ یہ سلیمان بھائی کی عادت تھی، ڈنر کے بعد کافی پیتے اور جب سے وہ پاکستان آئے تھے، ہم نے بھی ان کا ساتھ دینے کے لیے یہ عادت اپنالی تھی۔ موضوع گفتگو عثمان کی شاندار کامیابی تھی۔ سب خوش تھے لیکن میں جانتی تھی کہ پیپرز سے پہلے اور پیپرز کے دوران بھی فاطمہ اپنے والد کی بیماری کی وجہ سے کافی پریشان رہی تھی۔ اس لیے وہ اس طرح تیاری نہیں کر سکی تھی، جیسے ہمیشہ کرتی تھی پھر بھی میں عثمان کی کامیابی سے خوش تھی۔

"آپ فاطمہ سے ملے تھے، اپنی مدحو کی دوست ہے۔ ماشاء اللہ بہت ذہین ہے۔ اپنے عثمان کی طرح اس نے بھی میٹرک اور ایف ایس سی میں اپنے بورڈ میں پوزیشن لی تھی۔"

مما نے اچانک ہی پپا سے پوچھ لیا تھا جو بیک وقت ٹی وی اخبار اور کافی سے نبرد آزما تھے۔

"ہاں، مدحو نے اپنی فرینڈز سے تعارف تو کروایا تھا لیکن بطور خاص یاد نہیں کہ فاطمہ کون سی تھی۔ ویسے آپ کے ذہن میں کیا بات ہے، کھل کر کہیں۔ ضروری ہوا تو ہم پھر فاطمہ سے بطور خاص مل لیں گے۔"

پپا مسکرائے۔ دراصل ان دنوں مما اکثر کہتی تھیں کہ عثمان کے لیے اس کے جیسی ہی کوئی بہت ذہین لڑکی ہو، ابھی سے تلاش کریں گے تو وقت آنے پر پریشانی نہیں ہوگی۔

اور مما کے کچھ کہنے سے پہلے ہی سلیمان بھائی بول پڑے۔

"کیا خیال ہے، عثمان اور فاطمہ کا کپل کیسا رہے گا۔ مستقبل میں آپ کے ہاسپٹل کے لیے دو ذہین ڈاکٹرز مل جائیں گے۔ مجھے تو عثمان کے لیے وہ بہت موزوں لگی ہے۔"

"اوہ...... نو......" مما کے اور میرے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

"کیوں؟" سلیمان بھائی کو حیرت ہوئی تھی۔

"تم نہیں جانتے سلیمان! اس کے اور ہمارے اسٹیٹس میں بہت فرق ہے۔ مدحو نے مجھے بتایا تھا کہ وہ کسی گاؤں سے آئی ہے اور بہت غریب ہیں۔ اسکالرشپ سے اپنے تعلیمی اخراجات پورے کر رہی ہے۔ اس کی ذہانت سے متاثر ہونا اور بات ہے، اور اسے اپنے خاندان کا حصہ بنانا اور بات ہے۔"

"لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے مما!"

سلمان بھائی نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ یورپ میں گزارا تھا۔ بارہ تیرہ سال کی عمر میں ہی بڑے ماموں انہیں اپنے ساتھ یو۔ کے لے گئے تھے۔ اس لیے طبقاتی اونچ نیچ ان کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔

"فرق پڑتا ہے میری جان!" مما کا انداز سمجھانے والا تھا۔

"زندگی تو عثمان نے گزارنی ہے مما! اگر وہ اسے پسند کرتا ہے تو اس میں کیا حرج ہے کہ وہ غریب ہیں۔"

"لیکن میں اسے پسند نہیں کرتا سلیمان بھائی!"

عثمان کی پیشانی پر شکنیں تھیں اور آنکھوں سے ناگواری جھلکتی تھی۔ "کیا میں اس پینڈو لڑکی سے شادی کروں گا۔ میں......" اس نے انگلی سے اپنی طرف اشارہ کیا تو سلیمان بھائی نے سوری کر لیا۔

"سوری یار! میں سمجھا شاید تم اس میں انٹرسٹڈ ہو۔ دیکھ تو ایسے ہی رہے تھے اسے۔" سلیمان بھائی ہنسے تو وہ جیسے غصے میں پھنکارا۔

"فاطمہ عمر اگر دنیا کی آخری لڑکی بھی ہو تو عثمان پراچہ اس سے شادی نہیں کرے گا۔"

"بے فکر رہو، وہ بھی تم سے شادی نہیں کرے گی۔" مجھے اس کا لہجہ اچھا نہیں لگا اور میں نے دھما کا کیا۔ "کیونکہ اس کا نکاح ہو چکا ہے۔"

جب سلیمان بھائی نے بات کی تھی تب میں بتانا چاہتی تھی کہ وہ نکاح شدہ ہے لیکن مما پہلے ہی بول پڑیں اور پھر سلیمان بھائی اور عثمان کے درمیان گفتگو ہونے لگی تھی۔ میں نے دیکھا، میری بات سن کر جہاں مما کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا تھا، وہاں عثمان کا چہرہ سپاٹ ہو گیا تھا البتہ سلیمان بھائی نے تاسف سے ہونٹ سکیڑے تھے اور شرارت سے عثمان کی طرف دیکھا۔

"لو یار! ایک اچھی لڑکی ہاتھ سے نکل گئی۔ دو ذہین لوگوں کا ملن ہوتے ہوتے رہ گیا۔ ویری سیڈ۔"

سلیمان بھائی کا انداز سراسر شرارتی تھا لیکن عثمان چڑ گیا۔

"بے فکر رہیں، میرے نصیب میں یقیناً ذہین لڑکی لکھی ہوگی ورنہ زہرا بھابھی جیسی تو مل ہی جائے گی۔ آپ کی طرح گزارا کر لوں گا۔"

سلیمان بھائی کا قہقہہ بہت بلند تھا۔

"اپنی بھابھی کے متعلق تمہیں شدید غلطی فہمی

ہوئی ہے۔ وہ بہت ذہین ہے انٹیلیجنٹ ۔ یہ الگ بات ہے کہ اس نے اپنے والدین کی طرح ڈاکٹری کا شعبہ پسند نہیں کیا اور لٹریچر کو پسند کیا۔" انہوں نے زہرا بھابھی کا دفاع کیا۔

"ہاں ہاں۔ سلیمان صحیح کہہ رہا ہے۔ لٹریچر پسند کرنے والے لوگ ذہین ہی نہیں ہوتے، بہت حساس اور سمجھ دار ہوتے ہیں۔ دوسروں کا خیال کرنے والے۔"

"ظاہر ہے آپ نے تو اپنی ہونے والی بہو کا ہی ساتھ دینا ہے کہ وہ آپ کی طرح ہی ادب کی دلدادہ ہے۔"

عثمان ہنسا۔ اس کا موڈ یک دم اچھا ہو گیا۔

"ویسے تم نے فاطمہ کے نکاح کے متعلق پہلے نہیں بتایا تھا حالانکہ ہر روز تمہارے پاس اس کے متعلق بتانے کو ڈھیروں باتیں ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر عارفہ آج کل اپنے بیٹے کے لیے کسی ڈاکٹر لڑکی کا رشتہ دیکھ رہی تھیں تو میں نے بطور خاص فاطمہ اور نازیہ اور تمہاری دوسری فرینڈز سے ملوایا تھا۔"

مما کو ایک دم خیال آیا، وہ پرسکون سی بیٹھی سلیمان بھائی اور عثمان کی نوک جھونک سن رہی تھیں۔

"اس نے کبھی ذکر ہی نہیں کیا تھا۔ مجھے بھی ہفتہ ۔ پہلے ہی نازیہ سے پتا چلا تھا کہ اس کا نکاح سال بھر پہلے اپنے کزن سے ہو گیا تھا۔ دونوں بہنوں کا نکاح ہوا تھا۔ بڑی بہن کا اپنے خالہ زاد بھائی سے جو انجینئر ہے اور سعودیہ میں جاب کر رہا ہے۔ اس سال کے آخر میں آئے گا تو شادی ہو گی اور میں ابھی سے بتا رہی ہوں کہ میں اس کی آپا کی شادی پر اس کے گاؤں ضرور جاؤں گی۔"

"چلی جانا، اگر اس نے دعوت دی۔"

مما نے کبھی بھی مجھے اپنی دوستوں کے ہاں جانے سے نہیں روکا تھا۔ ہاں وہ یہ اطمینان ضرور کر لیتی تھیں کہ اچھے لوگ ہیں۔ اس معاملے میں انہوں نے امیر غریب کی تفریق کبھی نہیں کی تھی۔

"اور فاطمہ کا جس سے نکاح ہوا ہے۔ وہ کیا کرتا ہے؟"

مما نے یوں ہی پوچھ لیا تھا۔

"ڈاکٹر ہے۔ اس کا تایا زاد بھائی ہے۔ ابھی ہاؤس جاب مکمل کر کے اس نے سروسز ہاسپٹل میں جاب اسٹارٹ کی ہے۔ وہ بھی فاطمہ کی طرح بہت لائق اور ذہین ہے۔"

میں نے کن انکھیوں سے عثمان کی طرف دیکھا۔ فاطمہ کے ذکر پر جس کا موڈ خراب ہو رہا تھا۔

"گڈ...... گاؤں میں رہنے کے باوجود ایجوکیٹڈ فیملی ہے۔" سلیمان بھائی نے بے اختیار سراہا۔ کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد سب سونے کے لیے چلے گئے۔

☆☆☆

صبح جب میں نے فاطمہ کو بتایا کہ سلیمان بھائی نے تمہیں عثمان کے لیے پسند کر لیا تھا لیکن یہ جان کر کہ تم نکاح شدہ ہو انہیں افسوس ہوا۔

پتا نہیں اسے میری بات کا یقین آیا تھا یا نہیں لیکن وہ ہنس دی۔

"اگر میں نکاح شدہ نہ ہوتی تو تمہارے خیال میں کیا عثمان مجھ سے شادی کر لیتا؟"

"شاید نہیں۔" میں نے پوری ایمان داری سے کہا۔

بے شک فاطمہ کے ساتھ اس کا رویہ بہت اچھا ہو گیا تھا لیکن اس کے لیے اپنے دل میں وہ جو بغض رکھتا تھا۔ میں اس سے لاعلم تو نہ تھی۔ وہ کبھی بھی فاطمہ کو پسند نہیں کر سکتا تھا۔

لیکن میری سوچ کے برعکس اس کا رویہ فاطمہ کے ساتھ پہلے سے بھی زیادہ اچھا ہو گیا تھا۔ دوستانہ سا اپنائیت بھرا۔ جب وہ اس کی تعریف کرتا، اس کو سراہتا تو مجھے یقین نہ آتا۔ میں سوچ رہی تھی اس کی سگی بہن اس سے اتنی کشادہ دلی کی توقع نہیں کر سکتی تھی کہ وہ سب کے سامنے بڑی فراخ دلی سے تسلیم کرے کہ فاطمہ ہر لحاظ سے اس سے بہتر ہے۔ لیکن اس نے نہ صرف تسلیم کیا تھا بلکہ اس بات کا اعتراف بھی کیا تھا کہ شروع میں وہ اس سے جیلس ہوتا تھا۔

"تمہارا بھائی کچھ زیادہ ہی اچھا نہیں بن رہا۔"
ایک روز نہ جانے کس بات پر اس نے کہا تھا۔

"مجھ سے اس کی اتنی اچھائی ہضم نہیں ہو رہی مدحو! جیسے اس نے چہرے پر کوئی نقاب اوڑھ رکھا ہو اور مجھے نقاب اوڑھے لوگوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔"

"وہ سچ میں بدل گیا ہے فاطمہ! دراصل مما اور سلیمان بھائی نے اسے بہت سمجھایا ہے کہ وہ اپنے یہ منفی رویے تبدیل کرلے۔ میں نے تمہیں بتایا تو تھا۔"

میں نے عثمان کا دفاع کیا۔

"ہاں، لیکن پہلے اس کی آنکھوں میں میرے لیے جو نفرت اور ناگواری نظر آتی تھی، وہ سچ لگتا تھا لیکن اب اس کی آنکھیں جھوٹ بولتی ہیں۔ وہ اب بھی مجھے ناپسند کرتا ہے لیکن اب اس نے اپنی ناپسندیدگی کو چھپانا سیکھ لیا ہے۔"

وہ فاطمہ تھی۔ بہت ذہین بلکہ جینئس۔ ہوسکتا ہے اس کا تجزیہ ٹھیک ہو لیکن وہ میرا بھائی تھا اور میری نظر ایک بہن کی نظر تھی جو اس میں مثبت تبدیلی دیکھ کر خوش تھی سو میں نے فاطمہ کو جھٹلا دیا تھا۔

"تمہارا وہم ہے فاطمہ! وہ سچ میں بالکل بدل گیا ہے اور تمہارے سامنے ہی نہیں گھر میں بھی کئی بار اس نے تمہاری ذہانت کا اعتراف کیا ہے۔"

فاطمہ نے اب میری بات کا جواب نہیں دیا تھا اور مسکرا کر خاموش ہوگئی تھی۔

☆☆☆

اس سے اگلے روز کی بات تھی فاطمہ اور نازیہ ہوسٹل جا رہی تھیں کہ سڑک کراس کرتے ہوئے نہ جانے کس سمت سے ایک موٹر سائیکل سوار آیا اور فاطمہ کو ٹکر مارتا ہوا تیزی سے نکل گیا۔ فاطمہ کافی زخمی ہوگئی تھی لیکن شکر ہے کہ ہڈیاں وغیرہ بچ گئی تھیں۔ آس پاس سے گزرنے والے طلبا میں سے کسی نے موٹر سائیکل سوار کو نہیں دیکھا اور نہ ہی نمبر نوٹ کیا تھا بلکہ وہ سب فاطمہ کی طرف دوڑے تھے جہاں نازیہ حواس باختہ کھڑی تھی۔

اسے بس ایک رات ہی ہاسپٹل میں رکھا گیا تھا۔

عثمان اور میں اسے دیکھنے ہاسپٹل گئے تھے اور عثمان نے راستے سے ڈھیروں فروٹ خریدا تھا اور گیٹ ویل سون کے خوب صورت سے کارڈ کے ساتھ بڑا سا بکے بھی۔

نازیہ اور عبدالرافع وہاں پہلے سے ہی تھے۔

میں پہلی بار عبدالرافع سے ملی تھی۔ گزرے چار سالوں میں کبھی اس سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ وہ عموماً اسے لینے اور چھوڑنے ہاسٹل ہی آتا تھا۔ بے حد اسمارٹ اور شان دار شخصیت کا مالک تھا۔ عینک کے شیشوں سے جھانکتی اس کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔ کشادہ پیشانی، تھوڑے سے گھنگھریالے بال، اس کے چہرے پر گلاسز اور مونچھیں بہت سج رہی تھیں۔ اس کا رنگ بھی کافی فیئر تھا۔ بلاشبہ وہ ایک پرکشش اور شان دار شخصیت کا مالک تھا۔

"کیا اب عبدالرافع بھائی کو نظر لگاؤ گی؟"
نازیہ نے میرے کان میں سرگوشی کی اور میں نے گھبرا کر نظریں اس کے چہرے سے ہٹالی تھیں۔ وہ عثمان سے بہت خوش دلی سے ملا اور اس سے باتیں کررہا تھا۔

"یار! تم بہت لکی ہو۔" میں نے فاطمہ کے کان میں سرگوشی کی تو میرا مطلب سمجھ کر اس کے رخساروں پر سرخی دوڑ گئی۔

"معمولی چوٹیں ہیں لیکن عبدالرافع نے زبردستی یہاں روک لیا ہے کہ وہاں ہوسٹل میں کون خیال رکھے گا۔"

"اسی بہانے ڈاکٹر صاحب سے تیمارداری کروالو۔"

میں اسے مسلسل چھیڑتی رہی اور وہ ہر بار سرخ ہوجاتی۔ واپسی پر عثمان بالکل خاموش تھا جبکہ میں مسلسل بولتی رہی تھی۔

☆☆☆

ابھی فائنل ایئر کا آغاز ہی تھا اور عثمان ابھی سے سنجیدہ ہوگیا تھا بلکہ وہ مجھے کبھی کبھی الجھا الجھا سا لگتا تھا۔ سرفراز نے بھی محسوس کیا تھا۔

"کیا بات ہے عثمان! آج کل کچھ الجھے الجھے

سے لگتے ہو اور بہت لاپروا بھی ہو گئے ہو۔ اگر اسی طرح لاپروائی کرتے رہے تو دیکھنا فاطمہ پوزیشن لے لے گی۔"

"جی سر! مجھے یقین ہے... تو فاطمہ ہی لے گی۔"

میں نے حیرت سے اسے دیکھا، فاطمہ بھی حیران سی تھی۔

"نہیں عثمان برادر! یہ کیا بغیر مقابلے کے ہی ہتھیار ڈال رہے ہو۔" سر فیاض مسکرائے۔

"نہیں سر! محنت تو کر رہا ہوں لیکن فاطمہ سے جیتنا مشکل ہے۔" وہ بھی مسکرایا۔

"تمہارا بھائی واقعی بدل گیا ہے مدحو!" فاطمہ نے میرے کان میں سرگوشی کی اور میں مسکرا دی۔

☆☆☆

یہ آخری سال تھا اور بے حد مصروفیت تھی۔ فنکشن، فیرویل، ٹرپ وارڈز...... لڑکے تو نارمل تھے لیکن ہم لڑکیوں کی آنکھوں میں بچھڑ جانے کے خیال سے اکثر نمی پھیل جاتی تھی۔ ایسے میں فاطمہ کے ساتھ ہونے والے پے در پے دو تین حادثات نے ہمارے گروپ کی سب لڑکیوں کو ہی خوف زدہ کر دیا تھا۔ ضرور فاطمہ کو کسی کی نظر لگ گئی ہے۔

یہ نازیہ کا خیال تھا اور سب نے اس کی تائید کی تھی۔

مری میں ہوٹل کی سیڑھیاں اترتے ہوئے جانے کیسے اس کا پاؤں پھسل گیا تھا اور وہ گرتے گرتے بچی۔ اور پھر لان میں جب وہ اور نازیہ بیٹھی کچھ نوٹس تیار کر رہی تھیں تو جانے کیسے اس کے دوپٹے میں آگ لگ گئی تھی شاید پیچھے سے گزرتے ہوئے کسی لڑکے یا پروفیسر کے سگریٹ کی چنگاری اس کے دوپٹے پر گری ہو اور اس کے دوپٹے نے آگ پکڑ لی تھی۔ وہ تو نازیہ کی اچانک ہی نظر پڑ گئی تھی۔ اس کے پیچھے کی طرف گرے دوپٹے پر آگ بھڑک اٹھی۔ دوپٹا اور اسکارف اتارتے اتارتے اس کی انگلیاں بھی جھلس گئی تھیں۔ حالانکہ اسٹوڈنٹ کو یوں یونی کے اندر سگریٹ پینے کی اجازت نہ تھی۔

"تمہیں ضرور صدقہ دینا چاہیے فاطمہ!" زینب نے مشورہ دیا تھا۔

"وہاں گاؤں میں آپا نے صدقہ دے دیا تھا۔"

"نظر بھی اتروا لینا۔" زینب نے پھر کہا تو وہ ہنس دی۔

"یار! مجھے کس کی نظر لگتی ہے۔ عام سی سانولی سی معمولی سی لڑکی۔"

"یہ تمہارا ذاتی خیال ہے اور ہم اس سے ہرگز متفق نہیں ہیں۔" نازیہ کو برا لگا۔

"تم نکاح شدہ نہ ہوتیں تو دیکھنا کتنے پرپوزل آ چکے ہوتے۔" اور وہ پھر ہنس دی۔

لیکن شاید نظر تو اسے لگ ہی چکی تھی۔ اس روز ہم سب وارڈ بھگتا کر کیفے ٹیریا میں چائے پینے بیٹھے تھے۔ میری، نازیہ، زینب، عزیز اور عثمان وغیرہ کی ڈیوٹی چلڈرن وارڈ میں تھی۔ نازیہ دو دن پہلے چار دن کی چھٹی لے کر اپنی بہن کی شادی میں شرکت کے لیے سرگودھا گئی تھی۔ اس نے سارے گروپ کو دعوت دی تھی لیکن ان دنوں سب کا جانا بہت مشکل تھا۔ حفیظ سر وارڈز کے معاملے میں بہت سخت تھے۔ پہلے فاطمہ کا جانے کا پروگرام تھا کہ وہ عبدالرافع کے ساتھ اتوار کی صبح جائے گی اور شام کو واپس آ جائے گی لیکن پھر اس کے ابا کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ ان کے گردوں میں انفیکشن زیادہ ہو گیا تھا اور عبدالرافع کا پروگرام آج شام ڈیوٹی کے بعد گاؤں جانے کا بن گیا تھا تاکہ وہ انہیں لے آئے اور چیک اپ کروا لے۔

"عبدالرافع تمہارے ابا کو لے کر کل ہی آ جائے گا یا ایک روز رہے گا وہاں۔"

میں نے چائے کا ایک گھونٹ بھرا

"نہیں، عبدالرافع کل ہی آ جائے گا۔ آپا بھی ساتھ آئیں گی، کیا خبر ابا کو یہاں ایڈمٹ کر لیں تو آپا رہیں گی ان کے پاس۔" اس نے بتایا تو میں نے بے اختیار کہا۔

"مجھے تمہاری آپا سے ملنے کا بہت شوق ہے فاطمہ! جب تم ان سے ملنے جاؤ تو مجھے بھی ساتھ لے جانا۔"

"عبدالرافع نے کہا تھا۔ وہ اتوار کو صبح آ کر مجھے لے جائے گا۔ کل تو پتا نہیں کب فارغ ہوں گے۔ اس نے ڈاکٹر سے آٹھ بجے رات کا ٹائم لیا ہے۔"

وہ اپنے ابا کی بیماری کے خیال سے اداس اور پریشان سی تھی۔

"وہ لوگ عبدالرافع کے پاس ہی ٹھہریں گے نا۔ شادمان میں ہے نا اس کا فلیٹ۔"

میں نے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تو عثمان! تم مجھے لے جانا عبدالرافع کے گھر۔ مجھے بہت شوق ہے فاطمہ کے ابا اور آپا سے ملنے کا۔"

میں نے عثمان سے کہا تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"مجھے تو کل عزیز کے ساتھ فیصل آباد جانا ہے۔ وہ اپنے دادا سے ملنے جا رہا ہے نا تو مجھے بھی ساتھ لے جا رہا ہے۔ پتا ہے نا تمہیں اس کے دادا جان اور دادی جی عزیز کی طرح ہی مجھے چاہتے ہیں۔ اتوار کی شام کو واپسی ہو گی اس لیے تم سلیمان بھائی یا افضل کے ساتھ چلی جانا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا اور چکن سینڈوچ کھانے لگی تھی جبکہ فاطمہ نے صرف چائے ہی پی تھی۔ عثمان اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"آپ پریشان نہ ہوں فاطمہ! ان شاء اللہ آپ کے ابا ٹھیک ہو جائیں گے اور اگر عبدالرافع نے پسند کیا تو ڈاکٹر منیر کو بھی دکھا لیں گے۔ پپا کے دوست ہیں۔ بہت ماہر ہیں۔"

"عبدالرافع بھی ڈاکٹر منیر کی تعریف کر رہے تھے لیکن شاید کل کی اپائنٹمنٹ نہیں مل سکی انہیں۔"

فاطمہ نے بتایا تو عثمان نے تسلی دی۔

"اپائنٹمنٹ کا کوئی مسئلہ نہیں ہے، مل جائے گی۔"

"تھینک یو۔" فاطمہ کھڑی ہوئی تو ہم سب بھی کھڑے ہو گئے تھے کہ ابھی ہمیں ایک گھنٹہ اور ڈیوٹی دینی تھی۔

"تمہارے بھائی میں واقعی بہت مثبت تبدیلیاں آئی ہیں۔" ایک بچے کی فائل دیکھتے ہوئے اس نے اعتراف کیا تو میں ہنس دی۔

"ابھی اس کے رویے مزید بدلیں گے ان شاءاللہ۔" میں ہنس دی۔

"اور دیکھنا ہم تینوں بلکہ عبدالرافع بھی اگر اس نے چاہا تو مستقبل میں بہترین دوست ہوں گے۔ بلکہ میں ابھی سے تمہیں اور عبدالرافع کو مما کے ہاسپٹل میں جاب کی آفر کرتی ہوں۔"

اور وہ بے اختیار ہنس دی۔

"تم بھی نا مدحو! ابھی فائنل کا پہاڑ سر کرنا ہے، پھر ہاؤس جاب پھر پارٹ ون، پارٹ ٹو پھر امریکہ یا یو کے میں۔ یہ تو سات آٹھ سال کا پراسس ہے۔ نہ جانے تم کہاں ہو گی اور میں کہاں۔"

"میرا ایمان ہے انسان اگر کچھ ارادہ کر لے تو وہ ضرور ہوتا ہے۔ بس زندگی ہونا شرط ہے۔"

میں سنجیدہ ہو گئی۔

"اور اگر زندگی ہی دغا دے گئی تو؟"

وہ ہنسی اور تب مجھے کیا خبر تھی کہ زندگی واقعی ہی دغا دے جائے گی۔ وہ جسے ایک مشہور نیورو سرجن بننا تھا، وہ صرف تین دن بعد سفید کفن اوڑھے تہ خاک سو جائے گی۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ فاطمہ عمر یوں زندگی ہار جائے گی۔

وہ تو مجھے ہمیشہ ہی بہت پیاری لگتی تھی۔ اتنی کہ زندگی کی ہر مشکل، ہر امتحان سے گزر سکتی ہے لیکن وہ تو ذرا سی بات پر ہی ہمت ہار بیٹھی تھی۔

لیکن نہیں، یہ ذرا سی بات تو نہیں تھی۔ یہ تو......

ہاں یہ تو سوچا جائے تو ایک حساس لڑکی کے لیے بہت بڑی بات تھی۔ نازیہ نہیں تھی اور ہمارے گروپ کی باقی دونوں لڑکیاں ڈے اسکالر تھیں۔ اس لیے میں نے اور عثمان نے اسے ہوسٹل ڈراپ کیا تھا۔ وہ ابھی تک کہیں اکیلے جاتے ہوئے گھبراتی تھی اور ہماری ڈیوٹی شام پانچ بجے تک ہوتی تھی۔

اب عثمان اپنی گاڑی خود ہی ڈرائیو کرتا تھا، اس

لیے افضل بھائی کے بجائے میں عثمان کے ساتھ ہی یونی آتی جاتی تھی۔ اس نے گاڑی سے اتر کر شکریہ ادا کیا تو عثمان نے میری طرف دیکھا۔

"کیوں بھئی، تمہاری دوست کو تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔"

"نہیں...... بالکل نہیں۔"

میں نے کہا تو وہ ہنس دی۔

"اوکے، میرا شکریہ واپس کرو۔"

اور تب مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں آخری بار اسے ڈراپ کر رہی ہوں۔ یہ خوب صورت ہنسی پھر کبھی نہیں سنوں گی اور یہ اس کے دائیں رخسار کا بھنور پھر کبھی نہیں دیکھ سکوں گی۔

وہ ہاتھ ہلاتی ہوئی ہوسٹل کے گیٹ میں داخل ہو گئی اور عثمان نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ اس کی مدھم ہنسی اب بھی میرے کانوں میں گونج رہی تھی اور اب یہ ہنسی میں کبھی نہیں سن سکتی تھی۔ اب جو فاطمہ عمر میں دیکھوں گی وہ اس فاطمہ سے بالکل مختلف، ایک ہاری ہوئی، ٹوٹی ہوئی، شکست خوردہ فاطمہ ہو گی۔

☆☆☆

عثمان مجھے گھر ڈراپ کر کے کہیں چلا گیا تھا۔ سلیمان بھائی اور پپا ابھی نہیں آئے تھے۔ مما اپنے کمرے میں آرام کر رہی تھیں۔ سارا دن وارڈ کے چکر لگاتے اور کمر سے دہرا کر تا تھکیں دکھنے لگی تھیں۔ میں بھی کمرے میں آ کر لیٹ گئی اور لیٹتے ہی سو گئی پھر ڈنر کے وقت ہی آنکھ کھلی۔

امینہ مجھے جگانے آئی تھی۔ میں فریش ہو کر آئی تو سوائے عثمان کے سب ہی ڈنر ٹیبل پر میرے منتظر تھے۔

مما نے بتایا تھا کہ عثمان کسی دوست کے ساتھ کھانا باہر ہی کھا کر آئے گا۔ ڈنر کے بعد حسب معمول کچھ دیر ہم ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ آج سلیمان بھائی نے خود کافی بنائی تھی لیکن میں جلدی ہی اٹھ گئی تھی۔

پتا نہیں کیوں سر بھاری ہو رہا تھا۔ شاید شام کو بے وقت سو جانے کی وجہ سے طبیعت بوجھل ہو رہی تھی۔

رات بھی بہت بے چین سی نیند آئی تھی۔ بار بار آنکھ کھل جاتی تھی۔ فجر کے بعد کہیں جا کر میں گہری نیند سوئی تھی۔ آنکھ کھلتے ہی میری نظر سامنے کلاک پر پڑی۔ نو بج چکے تھے۔

میں اچھل کر بیٹھ گئی۔ مجھے تو ساڑھے نو بجے تک ہاسپٹل پہنچنا تھا۔ لیٹ آنے والوں کی تو سر حفیظ اچھی خاصی بے عزتی کر دیتے تھے۔ میں جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو کر باہر آئی تو ناشتے کی ٹیبل پر صرف عثمان بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ مما، پپا اور سلیمان بھائی جا چکے تھے۔

"تم مجھے جگا نہیں سکتے تھے عثمان کے بچے! پتا تو ہے سر حفیظ کا۔" اسے اطمینان سے بیٹھے دیکھ کر مجھے بے حد غصہ آیا۔

"مجھے عزیز کے ساتھ جانا ہے فیصل آباد اور ہوسٹل کی کسی لڑکی نے فون کر کے تمہاری بیسٹ فرینڈ فاطمہ کا میسج دیا تھا کہ وہ اپنے کزن کے ساتھ گاؤں جا رہی ہے۔ اپنے ابا اور آپا سے ملنے۔"

"لیکن عبدالرافع نے تو اکیلے جانا تھا انہیں لینے، یہاں چیک اپ کروانا تھا۔" میں نے الجھ کر اسے دیکھا۔

"ہو سکتا ہے ارادہ بدل گیا ہو۔" عثمان نے خالی کپ ٹیبل پر رکھا۔ "میں اور عزیز بھی نہیں ہوں گے۔ فاطمہ اور نازیہ بھی نہیں ہیں تو تم کیا کرو گی جا کر۔ اور یہاں گھر میں اکیلے رہ کر بھی بور ہی ہو گی۔ ناشتہ کر کے جلدی سے تیار ہو جاؤ تو میں تمہیں نانو کے گھر چھوڑ دیتا ہوں۔ اتنا یاد کرتی ہیں تمہیں اور کل تو اچھی خاصی ناراض ہو رہی تھیں کہ تم تو شاید ان کے مرنے کے بعد ہی آؤ گی۔"

عثمان سچ کہہ رہا تھا۔ میں ان کی اکلوتی نواسی تھی۔ وہ مجھ سے بہت پیار بھی کرتی تھیں لیکن اپنی ٹف پڑھائی کی وجہ سے میں بہت کم ان کے ہاں جایا کرتی تھی اور وہ ناراض ہوتی تھیں۔ مجھے عثمان کا مشورہ پسند آیا تھا۔

"اور سر حفیظ؟"

"کہہ دینا کہ نانو بیمار تھیں۔" وہ کھڑا ہو گیا۔

"میں نے اور عزیز نے تو کل ہی اپنے فیصل آباد جانے کا بتادیا تھا۔ دس پندرہ منٹ میں تیار ہوجاؤ، ورنہ پھر اکیلی بور ہوتی رہنا۔ مما تو آج لیٹ جائیں گی شاید۔"

"میں افضل بھائی کے ساتھ چلی جاؤں گی۔"

"وہ تو چھٹی لے کر گھر گئے ہوئے ہیں۔ ان کا بیٹا بیمار ہے۔"

میں نے افراتفری میں اپنی کتابیں اور کپڑے ایک بیگ میں ٹھونسے کہ نانو کے گھر جا کر ہی نہالوں گی اور جلدی سے بیگ اٹھا کر باہر نکل آئی۔

"کیا نام بتایا تھا فون کرنے والی لڑکی نے؟" میں نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے عثمان کی طرف دیکھا۔

"نام تو اس نے نہیں بتایا اور میں نے پوچھا بھی نہیں۔" عثمان ونڈ اسکرین سے باہر دیکھ رہا تھا۔

"پتا نہیں کون تمہیں عقل مند اور ذہین سمجھتا ہے۔" میں جھنجلائی۔

"کیا خبر کوئی ایمرجنسی ہوگئی ہو۔ ابا کی طبیعت زیادہ خراب ہو، ورنہ عبدالرافع نے ڈاکٹر سے ٹائم لیا ہوا تھا۔ اب نام پتا ہوتا تو میں منڈے (پیر) کو یونی جا کر پوچھ لیتی کہ فاطمہ اچانک کیوں گئی ہے۔ اب ہوسٹل میں سینکڑوں لڑکیوں سے باری باری تو نہیں پوچھ سکتی کہ فاطمہ نے کسے پیغام دیا تھا۔"

میری جھنجلاہٹ پر وہ مسکرایا۔

"سوری۔ مجھے خیال نہیں رہا۔ واپس آکر عبدالرافع کے ہاسٹل سے پتا کردوں گا۔" وہ واقعی بدل گیا تھا ورنہ وہ اتنا اچھا ہرگز نہیں تھا۔

"تھینک یو۔" میں بھی مسکرادی۔

"ویلکم۔"

اس نے ذرا سا میری طرف رخ موڑتے ہوئے سرخم کیا تو میں ہنس دی۔ لیکن پھر نانو کے گھر جا کر تو میں سب کچھ بھول گئی تھی۔ وہاں سب مجھے اتنا پروٹوکول دیتے، اتنی محبت اور اپنائیت کا اظہار کرتے تھے کہ اکثر میرا وہاں جا کر پھر جلدی آنے کا جی ہی نہیں چاہتا تھا۔ بڑے ماموں تو یو۔کے میں ہوتے تھے جبکہ دونوں چھوٹے ماموں، ان کے بچے، ممانیاں سب ہی مجھ سے بہت پیار کرتی تھیں اور نانو کی تو بات ہی کیا تھی۔ کتنی ہی دیر مجھے گلے سے لگائے روتی رہیں اور گلے کرتی رہیں۔

"او کے نانو! ریلیکس۔ پر اس ایگزام کے بعد بہت سارے دن آپ کے پاس رہوں گی۔"

میں نے ان کے بارہا سمجھانے تھے لیکن یہ طے ہوگیا تھا کہ کل سنڈے ہے تو کل تک میں یہاں ہی رہوں گی۔ ہاسپٹل سے مما بھی سیدھی نانو کے گھر آگئی تھیں اور ڈنر کے بعد مما کو اس وعدے پر جانے دیا تھا کہ وہ اتوار کو پورا دن ادھر ہی گزاریں گی اور سلیمان بھائی اور پپا بھی ادھر ہی کھانا کھائیں گے۔

یوں اتوار کو ایک پرمسرت دن گزار کر مما، پپا اور سلیمان بھائی رات کو چلے گئے کہ انہیں پپا کے بزنس پارٹنر انکل جنید کے ہاں ڈنر پر جانا تھا۔ جبکہ ماموں نے وعدہ کیا کہ وہ مجھے صبح یونیورسٹی ڈراپ کردیں گے کیونکہ پیر کو وارڈ نہیں بلکہ ہماری کلاس تھی۔

مما میرے کپڑے اور مطلوبہ بکس اتوار کو ساتھ لے آئی تھیں اور جب ماموں نے مجھے کے۔ای کے گیٹ پر ڈراپ کیا تو دو دن بعد مجھے فاطمہ کا خیال آیا۔

نانو کے گھر کے ہنگاموں اور مصروفیت میں مجھے ایک لمحے کے لیے بھی فاطمہ کا خیال نہیں آیا تھا۔ نازیہ نے بھی کل آنا تھا ورنہ اس سے ہی پتا چل جاتا کہ کیا ایمرجنسی تھی۔ خیر عثمان نے وعدہ کیا تھا کہ وہ عبدالرافع کے ہاسپٹل جا کر پتا کر آئے گا۔

میں فاطمہ کے متعلق ہی سوچتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی کہ یک دم میری نظر فاطمہ پر پڑی۔ وہ بلاشبہ فاطمہ ہی تھی۔ ستا ہوا چہرہ، سرخ آنکھیں۔

"یا اللہ خیر......" ہم دونوں ہی تیزی سے ایک دوسرے کی طرف لپکیں اور قریب آتے ہی وہ مجھ سے لپٹ گئی۔

"تم...... تم کہاں چلی گئی تھیں مدحوا مجھ پر قیامت گزر گئی۔"

"کیا ہوا فاطمہ! تمہارے ابا تو ٹھیک ہیں۔"
"ہاں، لیکن ابا کی بچی مرگئی...... فاطمہ مرگئی مدحو!" وہ زاروقطار رو رہی تھی۔ میں نے نرمی سے اسے الگ کیا۔
"کیا ہوا...... خدا کے لیے کچھ تو بتاؤ...... کیا ہوا ہے۔"
اس نے شکوہ کرتی نظروں سے مجھے دیکھا۔
"تم پرسوں کیوں نہیں آئیں ہاسٹل...... تم ہوتیں تو میرے ساتھ یہ نہ ہوتا۔"
میں نے الجھ کر اسے دیکھا۔ میں اسے بتانا چاہتی تھی کہ مجھے اس کا میسج ملا تھا کہ وہ گاؤں جا رہی ہے ورنہ میرا تو چھٹی کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن اس سے پہلے ہی ایک لڑکی اخبار لہراتی ہوئی ہمارے قریب آئی۔
"میں بتاتی ہوں کیا ہوا...... یہ دیکھو تمہاری بیسٹ فرینڈ کی تصویر...... ہفتے کی رات کو دو لڑکوں کے ساتھ ایک فلیٹ میں پکڑی گئی ہے۔"
"یہ جھوٹ ہے...... جھوٹ ہے مدحو......!"
وہ اتنے زور سے چیخی تھی کہ اس کی آواز پھٹ گئی تھی۔
"او کے، ریلیکس فاطمہ!" میں نے اس کے گرد اپنا بازو حمائل کر کے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔
"دیکھو غور سے۔" اس نے اخبار میرے سامنے پھیلا۔
"یہ تمہاری فاطمہ عمر ہی ہے نا۔"
تصویر بہت واضح تھی۔ وہ فاطمہ کی ہی تصویر تھی اس کی آنکھوں میں خوف اور وحشت تھی۔ اس کا اسکارف پیچھے گردن کی طرف ڈھلک گیا تھا اور اس کا دوپٹا دائیں کندھے پر جھولتا ہوا اس کے پاؤں تک آ رہا تھا۔ اور ایک خرانٹ سے پولیس والے نے اس کا بازو پکڑا ہوا تھا۔ نیچے سرخی لگی ہوئی تھی۔
"میڈیکل کالج کی طالبہ ایک فلیٹ میں رنگ رلیاں مناتی ہوئی پکڑی گئی۔ وہاں موجود لڑکے بھاگ گئے۔"

میں نے بے یقینی سے پہلے اخبار اور پھر فاطمہ کی طرف دیکھا۔
"یہ جھوٹ ہے مدحو! وہ لڑکا جھوٹ بول کر مجھے ساتھ لے گیا تھا۔ اس نے کہا تھا ابا...... میرے ابا......"
اس کی آواز بند ہوگئی اور وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔
"یہ سچ کہہ رہی ہے اور تمہیں شرم آنی چاہیے فرحت۔"
زینب نے اس کے ہاتھ سے اخبار لے کر ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دیا تھا لیکن ادھر ادھر کھڑے طلبا کے گروپ میں کسی نہ کسی کے پاس کوئی اخبار تھا۔
"ہفتے والے دن صرف میں اور فاطمہ ہی تھے۔ میرا ابھی نہیں آئی تھی۔ ہمارے گروپ کے لڑکوں میں سے بھی صرف دو ہی آئے تھے اور وہ پتا نہیں کب نکل گئے تھے۔ مجھے گن آباد جانا تھا اور اسے ہوسٹل۔ ہم روڈ پر اپنے روٹ کی وین کا انتظار کر رہے تھے۔ ہاسپٹل سے نکلتے نکلتے چھ بج گئے تھے۔
مجھے اپنی وین دور سے آتی نظر آئی تو میں اس کے پاس سے ہٹ کر آگے روڈ کے قریب کھڑی ہوگئی۔ جب ایک گاڑی آ کر فاطمہ کے پاس رکی اور اس میں سے کوئی اتر کر فاطمہ کے پاس آیا۔ میں غیر ارادی طور پر مڑ کر فاطمہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ لڑکے نے کچھ کہا، فاطمہ یک دم چیخی۔
"نہیں...... میرے ابا کو کچھ نہیں ہو سکتا۔"
میں پلٹ کر اس کے پاس آئی۔ وہ بری طرح رو رہی تھی اور وہ لڑکا کہہ رہا تھا کہ ڈاکٹر رافع صاحب کہہ رہے تھے کہ آپ کو لے آؤں۔ ایمبولینس وغیرہ کا انتظام ہوتے ہی وہ ڈیڈ باڈی لے کر گاؤں کے لیے نکل جائیں گے۔"
"کیا ہوا...... کس کی ڈیڈ باڈی؟" میں نے فاطمہ سے پوچھا تو اس نے روتے ہوئے بتایا کہ اس کے ابا یہاں چیک اپ کے لیے آئے تھے اور یہاں

آتے ہی ان کی ڈیتھ ہو گئی۔ اس کے کزن نے انہیں لینے کے لیے بھیجا ہے۔ میں نے اس لڑکے کی طرف دھیان سے دیکھا ہی نہیں۔ یوں بھی اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ میری وین آ گئی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ اس موقع پر مجھے ساتھ جانا چاہیے لیکن ان لوگوں کو تو گاؤں چلے جانا تھا پھر میں اکیلی......"

وہ چپ کر گئی۔ مجھے احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ کئی لڑکے لڑکیاں ہمارے اردگرد اکٹھے ہو گئے تھے۔ فاطمہ ابھی میرے ساتھ لگی کھڑی تھی کہ کسی لڑکے نے پوچھا۔

"پھر کیا ہوا؟ وہ لڑکا اسے کہاں لے گیا؟ پولیس وہاں کیسے پہنچی؟"

"بتایا تو ہے اس نے، سب' پھر کیا دس دفعہ بتائے۔"

زینب کو غصہ آ گیا۔ وہ ہماری بہت گہری دوست نہیں تھی، لیکن ہمارے ہی گروپ کی تھی۔ بہرحال سارے گروپ والے ایک دوسرے سے مخلص ہوتے ہیں۔

"تم نے گاڑی کا نمبر دیکھا تھا زینب؟" یہ عثمان تھا جو جانے کب وہاں آیا تھا۔ زینب نے نفی میں سر ہلایا۔

"اگر تم نے نمبر دیکھا ہوتا تو پتا لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کس کی گاڑی تھی اور ان کا مقصد کیا تھا کہ انہوں نے اغوا کرنے کے بعد خود ہی چھوڑ دیا۔"

"خود نہیں چھوڑا، تصاویر نہیں دیکھیں۔ پولیس نے برآمد کیا تھا۔" کوئی بولا تھا۔

"فاطمہ پلیز۔" میں اسے بازو کے حلقے میں لیے طلبا کے دائرے سے نکل کر قریب ہی موجود بنچ پر بیٹھ گئی۔

"تم ٹھیک ہو نا، تمہیں کوئی نقصان تو نہیں پہنچا۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"لیکن یہ تصویر...... میں بدنام ہو گئی ساری یونی میں۔ یہ نقصان کیا کم ہے۔ کون یقین کرے گا مدحو! میری بات پر......" وہ پھر رونے لگی۔

"سب تمہیں جانتے ہیں فاطمہ! سب تمہارا یقین کریں گے۔" میں نے اسے تسلی دی۔

"تم بتاؤ نا پھر......؟"

"کیا بتاؤں مدحو! سب کچھ ختم ہو گیا۔"

"کچھ بھی ختم نہیں ہوا۔ پلیز...... تم حوصلہ کرو۔" میرا دل خود رونے کو چاہ رہا تھا لیکن میں اسے تسلی دے رہی تھی۔

"مجھے تو کچھ ہوش نہیں تھا میں تو مسلسل رو رہی تھی۔ پھر اس نے گاڑی ایک جگہ کھڑی کی۔ وہاں کچھ اندھیرا سا ہی تھا۔ اس نے کہا کہ یہ ڈاکٹر صاحب کا فلیٹ ہے، آپ اندر چلی جائیں۔ میں یہاں باہر ہی ان کا انتظار کروں گا۔ وہ ایمبولینس لے کر آتے ہی ہوں گے۔ میں دروازے کو کھولتی تیزی سے اندر داخل ہوئی تھی اور روتے ہوئے آپا کو پکار رہی تھی کہ کسی نے میرے منہ پر ہاتھ رکھا۔ میں نے خود کو چھڑانا چاہا لیکن مجھے لگا جیسے میری ٹانگوں میں جان ہی نہیں رہی۔ یقیناً جو رومال اس نے میری ناک اور منہ پر رکھا تھا، وہ کلوروفام میں بھیگا ہوا تھا۔ میں نے بے ہوش ہونے سے پہلے سنا تھا۔

"لو بھئی یہ تو گئی......"

پھر کسی کی ہلکی سی ہنسی، وہاں یقیناً دو افراد تھے۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں وہاں ہی لاؤنج میں کارپٹ پر لیٹی ہوئی تھی۔ میں اٹھتے ہی دروازے کی طرف بھاگی لیکن دروازہ باہر سے بند تھے۔ یہ یقیناً لاؤنج تھا کچن اور دو کمروں کے دروازے لاؤنج میں ہی کھل رہے تھے۔ کارپٹ کافی پرانا تھا۔ لگتا تھا کافی عرصہ سے وہاں کوئی نہیں رہ رہا تھا۔ میں نے اپنی رسٹ واچ میں ٹائم دیکھا، آٹھ بج رہے تھے۔ یعنی میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ بے ہوش رہی تھی۔

میرے ابا...... پتا نہیں...... یہ عبدالرافع نے کس کو مجھے لینے کے لیے بھیج دیا تھا جو نہ جانے کیوں مجھے یہاں بند کر گیا ہے۔ ابا کا خیال آتے ہی میں پھر رونے لگی۔ تب ہی دروازہ ایک ٹھوکر سے کھلا اور دو

تین پولیس والے اندر گھس آئے۔ ایک نے میرا بازو پکڑلیا۔ دوسرا ایک کمرے کی طرف گیا، اسے کھول کر سے کھولا اور مڑ کر دوسرے سے کہا۔
"سر جی! یہ ادھر ایک دروازہ ہے جو باہر گیراج میں کھل رہا ہے۔ وہ لڑکے ادھر سے نکل گئے ہیں۔"
"تو کھڑا منہ کیا دیکھ رہا ہے، باہر جا کر دیکھ۔"
اس نے اسے ڈانٹا۔
وہ پھر رونے لگی۔
"مدحو! انہوں نے میری کوئی بات نہیں سنی۔ میں نے انہیں ساری بات بتائی لیکن وہ مجھے تھانے میں لے آئے۔ ایس ایچ او اچھا تھا۔ اس نے میری بات سن کر عبدالرافع سے میری بات کروادی۔ وہ اسی وقت ابا کو چیک اپ کروا کے گھر آیا تھا۔ پھر وہ تھانے سے مجھے لے گیا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ کسی نے میرے خلاف سازش کی ہے۔ کوئی ایسا ہے جو سب جانتا تھا، جسے پتا تھا کہ میرے ابا یہاں آرہے ہیں اور......"
بات ادھوری چھوڑ کر وہ یک دم مجھے دیکھنے لگی۔
"مدحو!"
اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی ایک لڑکے نے ہمارے قریب آکر کہا کہ "ڈی سی صاحب فاطمہ کو اپنے آفس بلارہے ہیں۔"
فاطمہ کا رنگ یک دم زرد پڑ گیا۔ اس نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑلیا یقیناً ڈی سی صاحب کو بھی خبر مل گئی ہوگی۔
"تم بغیر ڈرے سب سچ بتادینا۔"
زینب جو پاس ہی کھڑی تھی، اس نے اسے حوصلہ دیا تو وہ کھڑی ہوگئی۔ میں اور زینب اس کے ساتھ ہی آفس تک آئے تھے۔ اس نے اندر جانے سے پہلے آنسو بھری آنکھوں سے مجھے دیکھا۔
"مجھے تو پتا ہی نہیں چلا کہ کب کسی نے میری تصویر بنائی۔ اگر پتا ہوتا تو کبھی آج یونی نہ آتی۔ ابا سے کہتی مجھے گاؤں لے جائیں اور وہاں مار کر کہیں دفن کردیں۔"
میں نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر اسے گویا تسلی دی۔
"اور اتوار کو میں نے تمہیں کتنی بار فون کیا۔ مجھے تمہاری کتنی ضرورت تھی۔ میں تمہیں بتانا چاہتی تھی کہ میرے ساتھ کیا دھوکا ہوا۔"
"ہم گھر پر نہیں تھے فاطمہ! نانو کے گھر تھے۔"
میں نے نرمی سے کہا۔
"اور آپا نے مجھے منع کیا تھا کہ آج یونی نہ جاؤں لیکن میرا دل تو جیسے غم سے پھٹتا تھا۔ میں تمہیں بتانا چاہتی تھی سب۔"
اور پھر وہ تیزی سے اجازت لے کر اندر چلی گئی۔
اس کے آفس میں جانے کے بعد ہم کچھ فاصلے پر کھڑے ہو کر اس کا انتظار کرنے لگے۔ پہلے عثمان اور عزیز ہمارے ساتھ آکر کھڑے ہوگئے پھر ہمارے گروپ کے وہاں موجود سب لڑکے لڑکیاں ہمارے پاس آکر کھڑے ہوگئے۔ سب فاطمہ کے لیے پریشان ہورہے تھے۔ اب کیا ہوگا۔ کیا ڈی سی صاحب فاطمہ کو نکال دیں گے، میری طرح شاید سب یہی سوچ رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ باہر آئی تو اس کا رنگ خطرناک حد تک زرد ہورہا تھا۔
"مدحو......!" وہ لڑکھڑائی تو میں نے اسے سہارا دیا۔
"ڈی سی صاحب میری بات کا یقین نہیں کررہے ہیں۔ میں مرجاؤں گی...... میں کیسے......"
اور باقی الفاظ اس کے ہونٹوں پر ہی رہ گئے۔ وہ بے جان سی ہو کر میرے بازوؤں میں جھول گئی۔ زینب اور میرا نے اسے سنبھالا تھا لیکن وہ بے ہوش ہوگئی۔
ہم اسے عثمان کی گاڑی میں ہاسپٹل لے آئے تھے۔ ہمارے گروپ کے علاوہ کچھ دوسرے کلاس فیلو بھی کچھ دیر بعد پیدل ہی ہسپتال پہنچ گئے۔ ڈاکٹر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کررہے تھے کہ مجھے عبدالرافع کا خیال آیا تو میں نے عثمان سے کہا کہ وہ سروسز ہسپتال میں فون کرکے عبدالرافع کو اطلاع

دے دے اور عثمان نے باہر جا کر کسی پی سی او سے اسے فون کر دیا تھا۔

اتفاق سے فوراً ہی اس سے بات ہو گئی کہ وہ اس وقت ریسپشن پر ہی موجود تھا۔ کچھ دیر بعد ہی عبد الرافع، فاطمہ کے ابا اور آپا وہاں آ گئے تھے۔

''میں نے منع کیا تھا کہ آج یونی نہ جاؤ، لیکن یہ پھر بھی چلی آئی۔''

آپا رو رہی تھیں۔ وہ ایسی ہی تھیں جیسا فاطمہ نے بتایا تھا۔ بے حد خوب صورت، نازک سی، پریوں کے دیس سے آئی لگتی تھیں۔

''عبد الرافع اسے چھوڑنے چلا گیا تو بعد میں ہم نے اخبار دیکھا۔''

اس کے ابا نے تاسف سے ہاتھ ملے تھے۔ اس کے ابا ملک عمر اعوان بھی بہت باوقار سے تھے اور مجھے اچھے لگے تھے۔

''آپ پریشان نہ ہوں انکل! ان شاء اللہ فاطمہ ہوش میں آ جائے گی۔''

''آپ مدیحہ ہو نا؟''

میں نے سر ہلایا۔

''وہ جب بھی گاؤں آتی، تمہاری بہت باتیں کرتی تھی۔''

ان کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ آپا بھی اب میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ میں نے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے اپنی بات دہرائی تھی کہ وہ ان شاء اللہ ہوش میں آ جائے گی۔

لیکن مجھے کیا خبر تھی کہ وہ اب کبھی ہوش میں نہیں آئے گی۔ یہ بے حد روشن آنکھیں اب کبھی نہیں کھلیں گی۔ عبد الرافع ڈاکٹر کے ساتھ ہی ایمرجنسی میں تھا۔ اسے شدید قسم کا نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد سب طلبا واپس چلے۔

صرف میں، عثمان اور عزیز رہ گئے۔ عثمان کینٹین سے سب کے لیے چائے اور کچھ کھانے کو لایا تھا لیکن کسی نے کچھ نہیں کھایا۔ بہت اصرار سے انکل نے چائے پی تھی۔ آمنہ آپا نے تو چائے بھی نہیں پی تھی۔

''ماما ہاسٹل سے آ گئی ہوں گی اور اب پریشان ہو رہی ہوں گی۔ گھر چلتے ہیں۔ رات کو پھر چکر لگا لیں گے۔''

''ہاں بیٹا! آپ جائیں۔ میری فاطمہ کے لیے بہت دعائیں کرنا۔''

فاطمہ کے ابا نے رندھی آواز میں کہا۔

''عصر تو ہو گئی ہے۔ اب دوبارہ مت آنا' بس گھر میں دعا کرنا۔ اللہ میری بچی کو لمبی حیاتی دے۔''

اس سے ان کے لیے میرا دل بے حد دکھا تھا۔

وہ تو خود اپنے علاج کے لیے یہاں آئے تھے اور...... میرے سر پر رکھا ان کا ہاتھ لرز رہا تھا۔ میں آپا سے مل کر انہیں اللہ حافظ کہہ رہی تھی، جب ایک ڈاکٹر کے ساتھ عبد الرافع وہاں آیا تھا۔

''چچا جان...... آپ اور آمنہ ڈاکٹر حماد کے ساتھ گھر چلے جائیں۔ یہاں بیٹھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ آپ پہلے ہی بیمار ہیں۔ میں یہاں ہوں نا۔ وہ ہوش میں نہیں ہے...... پتا نہیں کب......'' اس کی آواز بھرا گئی۔

''رافع بھائی! ان شاء اللہ وہ ہوش میں آ جائے گی۔''

''ان شاء اللہ۔''

عبد الرافع نے آہستہ سے کہا تھا اور پھر میں اور عثمان ان کو اللہ حافظ کہہ کر گھر آ گئے۔ اس امید کے ساتھ کہ اسے ہوش آ جائے گا، وہ ٹھیک ہو جائے گی۔ جب وہ ٹھیک ہو جائے گی تو ہم یقیناً کھوج لگا لیں گے کہ کس نے اسے بدنام کرنے کی کوشش کی اور کیوں......

اس نے تو کبھی کسی کے ساتھ برا نہیں کیا تھا۔ ان چار ساڑھے چار سالوں میں اس نے تو کبھی کسی سے اونچی آواز میں بات تک نہیں کی تھی۔ پھر...... پھر اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟

گھر آ کر میں اپنے کمرے میں لیٹے کتنی ہی دیر تک سوچتی رہی۔ کھانا کھانے کو جی ہی نہیں چاہا تھا۔

چائے بھی اپنے کمرے میں ہی منگوائی تھی لیکن ڈنر کے لیے مما کے بلانے پر جانا پڑا۔ ڈنر خاموشی سے کیا گیا تھا لیکن ڈنر کے بعد ٹی وی لاؤنج میں موضوعِ گفتگو فاطمہ اور اس کے ساتھ ہونے والا واقعہ تھا۔

"اس حادثے میں یقیناً وہ شخص ملوث ہے جو جانتا تھا کہ اس روز اس کے والد چیک اپ کے لیے لاہور آئے ہوئے ہیں نیز یہ کہ وہ اس کے کزن کا نام بھی جانتا تھا۔"

یہ سلیمان بھائی کا خیال تھا اور پپا کو بھی اس سے اتفاق تھا۔

"لیکن اس نے اپنے ابا کے آنے کی بات صرف ہم سے کی تھی۔ میں شان اور عزیز ہی تھے تب......" بے اختیار میرے لبوں سے نکلا۔

"تمہیں کیا خبر ہے کہ اس نے اور ڈاکٹر رافع نے کس کس سے ذکر کیا ہوگا۔ کون کون ہمارے علاوہ بھی جانتا ہوگا۔"

میرا جملہ مکمل ہوتے ہی شان نے اونچی آواز میں کہا۔ تو مجھے اس کے اس طرح اونچا بولنے پر حیرت ہوئی تھی اور میں اس کی بات کا جواب دیے بنا اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں آج بہت تھک گئی ہوں، اس لیے سونے جا رہی ہوں۔"

"سنو مدیحہ! آئندہ تم فاطمہ سے کوئی تعلق نہیں رکھو گی۔"

"لیکن کیوں مما؟" میں نے مڑ کر مما کی طرف دیکھا۔

"وہ بدنام ہو چکی ہے۔ اخبار میں چھپی تصویر نہ جانے کس کس نے دیکھی ہوگی اور ایک بدنام ہو جانے والی لڑکی کے ساتھ تعلق تمہیں بھی بدنام کر دے گا۔"

"مما......!" میں نے احتجاج کیا۔ "میں اس کے کردار کی پاکیزگی کی قسم کھا سکتی ہوں، وہ ایسی نہیں ہے۔"

"ہاں، تم کھا سکتی ہو قسم، لیکن دنیا والے نہیں۔ کل کو تمہاری شادی بھی کرنی ہے اور رشتے کے لیے آنے والے ہر بات کا کھوج کرتے ہیں۔ اللہ اسے صحت و زندگی دے مدیحہ! لیکن تم بھول جاؤ۔ کہ وہ تمہاری دوست تھی۔"

مما کا انداز حتمی تھا۔ میں شاکی نظروں سے انہیں دیکھتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔

کیا میں اسے بھول کر اس سے تعلق ختم کر سکتی تھی۔ ہرگز نہیں، مجھے تو اس کے ساتھ کھڑے ہو کر اس کا ساتھ دینا تھا۔ ایسے ہی لمحوں میں سچے دوست کی پہچان ہوتی ہے کہ جب ساری دنیا چھوڑ دے، وہ آپ کے ساتھ کھڑا ہو۔ آپ کا ہاتھ تھامے۔ آپ کا دفاع کرے لیکن میں نے اس وقت مما سے بحث نہیں کی۔

☆☆☆

صبح ناشتے کی میز پر بھی خاموشی رہی۔ ہاں سلیمان بھائی نے کہا تھا کہ وہ آج کسی وقت فاطمہ کو دیکھنے کے لیے ہاسپٹل آئیں گے۔

"وہ مدیحہ کی دوست ہے اور اس شہر میں ان کا اپنا کوئی عزیز رشتہ دار نہیں ہے۔ ایسے مشکل وقت میں ہمیں اس کے والد کو یہ احساس دلانا چاہیے کہ وہ یہاں تنہا نہیں ہیں۔"

وہ مجھ سے بات کرنے کے بعد مما کو دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے میرے دل کی بات کی تھی۔ میں نے ممنون نظروں سے انہیں دیکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ مما نے انہیں کیا کہا تھا، میں نے نہیں سنا تھا کہ شان پہلے ہی اٹھ کر جا چکا تھا اور تیار ہونے کے بعد اسے انتظار بہت گراں گزرتا تھا۔ سلیمان بھائی کی عادت تھی، وہ جو صحیح سمجھتے، اسے کہتے ہوئے جھجکتے نہ تھے۔

"میرے خیال میں تو آپ کو بھی فاطمہ کی مزاج پرسی کے لیے ہاسپٹل جانا چاہیے......"

میں جب تیار ہو کر اپنے کمرے سے باہر آئی تو وہ مما سے کہہ رہے تھے لیکن نہ مما نہ سلیمان بھائی کسی کو

بھی ہاسپٹل نہیں جانا پڑا تھا۔ وہ تو پہلے ہی چلی گئی تھی۔

کے۔ ای میں داخل ہوتے ہی میری پہلی نظر نازیہ پر پڑی تھی، جو رو رہی تھی اور کچھ لڑکیاں اس کے پاس کھڑی تھیں۔

"نازیہ......" میں دوڑ کر اس کے قریب آئی تو وہ میرے گلے لگ گئی۔

"وہ چلی گئی مدحو...... ! ہماری فاطمہ چلی گئی...... وہ روشن آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں جو تمہیں حیران کرتی تھیں۔"

"نہیں......" مجھے یقین نہیں آیا۔ اسے تو ابھی زندہ رہنا تھا، نیورو سرجن بننا تھا۔ کیا کیا کرنا تھا لیکن سچ تھا۔

کل نازیہ کو واپس آنا تھا۔ لیکن شادی والے گھر کی مصروفیات اور پھر بہن بہنوئی کی آمد سو وہ رات دیر سے ہوسٹل پہنچی تھی۔

فاطمہ کمرے میں نہیں تھی۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد اس نے ساتھ والے روم کی کنول سے پوچھا تو اسے پتا چلا تھا لیکن دیر ہو گئی تھی اور بھائی بھی اسے چھوڑ کر واپس چلا گیا تھا۔ اس لیے صبح یونی آنے سے پہلے وہ ہاسپٹل گئی تھی اور کوریڈور میں کھڑے عبدالرافع نے اسے روتے ہوئے بتایا تھا کہ وہ چلی گئی۔

وہ ایمبولینس لینے جا رہا تھا۔

"مدحو......!" وہ مسلسل رو رہی تھی۔

"میں تو اس سے ناراض تھی۔ میں نے تو سوچا تھا اس سے جا کر خوب لڑوں گی۔ بات نہیں کروں گی۔ وہ میری بیسٹ فرینڈ تھی، اسے تو آنا چاہیے تھا...... اور اس نے کہا تھا، وہ عبدالرافع کے ساتھ آئے گی لیکن...... وہ تو...... اسے تو کہیں اور جانا تھا پھر وہ سرگودھا کیوں آئی۔ وہ تو کسی اور سفر کی تیاری میں تھی مدحو!"

وہ روتے ہوئے مسلسل بول رہی تھی۔ زینب نے اسے مجھ سے الگ کر کے دلاسا دیا۔ اس کا تو برسوں کا ساتھ تھا۔ اسے کیسے صبر آتا۔

کچھ ہی دیر میں پوری یونی میں اس کی موت کی خبر پھیل گئی۔ ہماری کلاس کے بہت سے طلبا اور ہمارے گروپ کے لوگ اس کے جنازے میں شرکت کا پروگرام بنا رہے تھے۔ کچھ اساتذہ بھی جانا چاہتے تھے۔ وہ تھی ہی اتنی ہر دل عزیز۔ جونیئر سینئر سب ہی افسردہ تھے۔

سر فیاض نے گاڑی کا انتظام کر دیا تھا۔ وہ خود، سر حفیظ، میڈم سب ہی جا رہے تھے۔ نازیہ نے سب کو اس کے گاؤں کے متعلق گائیڈ کیا تھا۔ عثمان، عزیز، میں، نازیہ اور زینب عثمان کی گاڑی میں تھے۔

عثمان نے سلیمان بھائی کو فون کر کے بتا دیا تھا کہ وہ مما کو بتا دیں۔ نازیہ تو پورے راستے روتی ہی رہی۔ میری آنکھوں میں بھی بار بار آنسو آ جاتے تھے۔ زینب کبھی مجھے تسلی دیتی، کبھی اسے اور نازیہ تھوڑی دیر بعد کہتی گئی۔

"وہ تو اتنی اچھی تھی۔ اتنی نرم دل، اتنی خوش اخلاق پھر اس کے ساتھ کوئی کیسے دشمنی کر سکتا ہے۔"

میرے پاس اس کی بات کا کوئی جواب نہ تھا۔

"کوئی بہت ہی شقی القلب ہو گا، بہت پتھر دل اور ظالم۔"

زینب نے کہا۔ اور نازیہ کے آنسوؤں میں روانی آ گئی۔

جب ہم گاؤں پہنچے تو جیسے پورا گاؤں ہی اس کے گھر کے باہر موجود تھا۔ دریاں بچھی تھیں، لوگ بیٹھے ہوئے تھے، مرد دریوں کی طرف چلے گئے۔ سب ہی بہت احترام دے رہے تھے۔

"فاطمہ کے استاد آئے ہیں، اس کے ساتھی طالب علم بھی۔" یہاں سے وہاں تک سب کو پتا چل گیا تھا۔ موڑھے، کرسیاں، پیڑھے، نہ نہ کرنے کے باوجود منگوا لیے گئے تھے۔ سب لڑکیوں کو عبدالرزاق اندر گھر میں لے گیا تھا۔ بڑا سا صحن عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔

میں زینب کا ہاتھ پکڑے سیدھی آپا کے پاس آئی تھی، جو چارپائی کی پٹی پر ہاتھ رکھے خالی خالی آنکھوں سے فاطمہ کو دیکھ رہی تھیں۔ اس کی لانبی

پلکوں والی روشن آنکھیں بند تھیں۔

"فاطمہ۔" میرے آنسو بے اختیار ہوئے۔ اور آپا کے پاس بیٹھتے ہوئے میں نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔ لیکن آپا تو یوں ہی ساکت نظروں سے دیکھے جاتی تھیں۔

تب ہی سرگودھا سے فاطمہ کی خالہ اور اس کی خالہ زاد بہنیں بھائی پہنچے اور آنگن میں کہرام مچ گیا لیکن آپا اب بھی یوں ساکت بیٹھی تھیں۔

"یا اللہ۔ آپا کو ہمت دے، حوصلہ دے۔ وہ فاطمہ کے بغیر کیا کریں گی۔" فاطمہ کہتی تھی۔

"آپا کہتی ہیں تم میرا خواب ہو۔"

اور ان کا خواب بکھر گیا تھا۔ شاید سرگودھا والوں کا ہی انتظار تھا کہ کچھ دیر بعد ہی فاطمہ کو نہلانے کے لیے لے گئے تھے۔

"تمہیں تو فاطمہ کی شادی میں آنا تھا نا مدحو!"

نازیہ سب سے پہلے میرے پاس آکر بیٹھ گئی۔

آنسو اس کی آنکھوں سے چھلک رہے تھے۔

میں فاطمہ سے کہتی تھی، میں تو ایک ہفتہ پہلے ہی تمہارے گاؤں آجاؤں گی۔ چاول کے کھیت دیکھوں گی۔ اس نہر پر دونوں جائیں گے جو تمہارے گاؤں میں سے گزرتی...... " میری آواز گھٹ گئی۔ میں اور نازیہ ایک دوسرے کے گلے سے لگے پھر رو رہے تھے۔

"میری فاطمہ کو نظر لگ گئی۔ کاش وہ اتنی ذہین نہ ہوتی بس عام سی ذہانت کی ہوتی تو اسے کچھ نہ ہوتا۔ مجھے اس کی ذہانت سے ڈر لگتا تھا۔ اور اسے کھا گئی کسی کی نظر۔"

یہ اس کی تائی تھیں جو کسی سے کہہ رہی تھیں۔

پھر وہ اسے لے آئے۔ سفید کفن میں لپٹا اس کا وجود میں نے جھک کر دیکھا۔ اس کا چہرا کسی پھول کی طرح کھلا ہوا تھا۔ پھر میں نے عبدالرافع کو دیکھا اور اس کے پیچھے سر جھکائے اس کے ابا اور ان کے ساتھ شاید اس کے ماموں اور خالو تھے۔ کلمہ شہادت کی صدا بلند ہوئی اور عبدالرافع نے جھک کر چارپائی کا پایا تھاما۔

میری چیخ نکل گئی اور میں۔ زینب کا ہاتھ تھامے پیچھے ہٹتی چلی گئی۔ جنازے کے بعد سرفاض نے سب کو چلنے کے لیے کہا لیکن گاؤں کے لوگ راستہ روک کر اور ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوگئے۔

"آپ ہماری فاطمہ کے استاد اور ساتھی طالب علم ہو۔ ایسے کھانا کھائے بغیر کیسے جانے دیں۔"

اور پھر کسی نے کچھ کھایا، کسی نے نہیں۔ لیکن ان کے اصرار پر بہرحال رک گئے۔

واپسی میں ہم میں سے کسی نے کوئی بات نہیں کی، نازیہ میرے کندھے پر سر رکھے، آنکھیں بند کیے بیٹھی رہی۔ فاطمہ چلی گئی تھی۔

☆☆☆

بہت سارے دن یونیورسٹی میں اس کا ذکر ہوتا رہا۔ کبھی کوئی پروفیسر، کبھی کوئی اسٹوڈنٹ اس کی ذہانت کو یاد کرتا تو ساری کلاس میں اداسی پھیل جاتی۔

مجھے آپا کا اور اس کے ابا کا خیال آتا تو دل بھنچنے لگتا لیکن آپا تو اس کے جانے کے دس دن بعد ہی اس کے پیچھے چلی گئی تھیں۔ نازیہ نے بتایا کہ ان کا دل بہت کمزور تھا۔ اتنا بڑا صدمہ سہہ نہیں سکا اور بند ہوگیا۔ اور اس کے ابا بھی اس کے بعد صرف دو ماہ ہی جی پائے تھے۔

میں نے کئی بار سوچا کہ کسی روز عبدالرافع کو فون کروں۔ آپا اور ابا کا افسوس کروں یا کسی روز عثمان کے ساتھ اس کے گھر جاؤں، لیکن نہیں جاسکی۔

وارڈز، امتحان، ہاؤس جاب، شادی...... بچے...... زندگی کا سفر رکتا نہیں چلتا ہی رہتا ہے۔ لیکن میں فاطمہ کو کبھی بھول نہیں سکی۔ آج جب میرے تینوں بچوں کی شادیاں بھی ہوچکی ہیں۔ آج بھی جب میں فارغ ہوکر اپنے بستر پر لیٹتی ہوں تو اڑتیس سال پہلے کا وہ دن آنکھوں کے سامنے آجاتا جب اسکن کلر کا اسکارف اوڑھے جس پر سیاہ پولکا ڈاٹس تھے۔ وہ کچھ گھبرائی ہوئی سی کھڑی تھی...... اور جس نے مجھے مدیحہ پراچہ کو جو خود بھی کسی سے کم نہ تھی پہلے دن ہی متاثر کرلیا تھا۔

اس روز جس دوستی کی بنیاد پڑی تھی۔ اگلے چار ساڑھے چار سالوں میں اس کی جڑیں اتنی گہری ہوگئی تھیں کہ میں اپنے بے حد معروف شب و روز میں بھی کبھی اسے بھول نہیں پائی۔ اور شاید کبھی بھول نہیں پاؤں گی۔ اپنی آخری سانسوں تک نہیں۔

☆☆☆

اور میں عثمان سلیم پراچہ پاکستان کا ہی نہیں ایشیا کا سب سے معروف و مشہور نیورو سرجن۔ جو صرف ایشیا میں ہی نہیں یورپ میں بھی جانا پہچانا جاتا ہے۔ دماغ کے کئی پیچیدہ آپریشن جنہیں کرتے ہوئے یورپ کے ڈاکٹرز بھی گھبرا گئے تھے، وہ بہت کامیابی سے میں نے کیے تھے۔

ہاں میں عثمان پراچہ آج اس مقام پر ہوں جس کا خواب کبھی میں نے دیکھا تھا۔ اور اس مقام تک پہنچنے کے لیے میں نے بے حد محنت کی ہے...... اور...... ایک بڑی قیمت ادا کی ہے۔

مجھے ہوش سنبھالتے ہی یہ احساس ہوگیا تھا کہ میں آس پاس چلنے پھرنے والے ہم عمر بچوں میں سب سے افضل ہوں شکل و صورت میں، ذہانت میں کوئی میرے برابر نہیں ہے۔ مما اکثر کہتی تھیں۔

"میرا عثمان جتنا پیارا ہے اس سے کہیں زیادہ ذہین ہے اور ایک روز یہ اپنے والدین کا نام روشن کرے گا۔"

انہوں نے سلیمان بھائی اور مدیحہ کے متعلق اس طرح کی بات کبھی نہیں کی تھی حالانکہ وہ دونوں بھی کم ذہین نہ تھے۔ سو میں نے خود ہی یہ تصور کرلیا تھا کہ میں ان سے بھی زیادہ ذہین ہوں اور مجھے ہمیشہ سب سے افضل رہنا ہے۔ میں نرسری سے ہی اول آتا رہا تھا۔

مدیحہ تھوڑی لاپروا تھی اس لیے کبھی سیکنڈ اور کبھی تھرڈ آتی تھی لیکن اگر کبھی کسی ٹیسٹ میں اس کے دو تین نمبر زیادہ ہوجاتے تو میں جل بھن کر کباب ہوجاتا۔ مجھے لگتا جیسے اس نے میرا حق مجھ سے چھین لیا ہے۔

اول آنا میرا حق تھا۔ چاہے وہ کوئی ٹیسٹ ہی کیوں نہ ہو۔ مجھے ہمیشہ اول آنا ہے۔ ہر جگہ سب سے آگے رہنا ہے، چاہے وہ کھیل کا میدان ہو، چاہے پڑھائی کا۔ پتا نہیں یہ خناس کیسے میرے اندر سما گیا کہ میں بس میں ہی سب سے آگے رہوں۔ کوئی مجھ سے آگے نہ نکل سکے اور ایف ایس سی تک ایسا ہی ہوا۔

میٹرک میں بورڈ میں میری پہلی پوزیشن تھی۔ مما کے کہنے پر ہم نے اولیول چھوڑ کر میٹرک کیا تھا۔ تمام بورڈز میں میرے نمبر سب سے زیادہ تھے لیکن ایف ایس سی میں سرگودھا بورڈ کی ٹاپر لڑکی کے نمبر مجھ سے زیادہ تھے۔

تب میں نے خود کو یہ کہہ کر تسلی دے لی تھی کہ ہوں گے اس کے والدین کوئی لینڈ لارڈ یا بڑے لوگ۔ یقیناً بھاگ دوڑ کرکے پریکٹیکل کے نمبر زیادہ لگوائے ہوں گے۔ لیکن نہ تو اس طرح نمبر لگوانا میرے پاپا کو پسند تھا اور نہ مجھے یوں بھی میں جانتا تھا کہ پوزیشن تو میری ہی اول آئے گی اور یہ گمان مجھ غلط بھی نہ تھا۔

لیکن جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تو مجھے یقین ہی نہیں آیا تھا کہ یہ اتنی عام سی معمولی سی لڑکی عثمان پراچہ سے زیادہ نمبر لے گئی تھی۔ وہ مجھے پہلے روز سے ہی ناپسند تھی اور میں نے دل ہی دل میں عہد کیا تھا کہ اس لڑکی کو میں نے ہرانا ہے۔

یہ نہیں تھا کہ وہ وہاں اکیلی ٹاپر لڑکی تھی اور بھی کئی لڑکے لڑکیاں تھے جو اپنے اپنے بورڈ میں پوزیشن لے کے آئے تھے لیکن مجھے ان کی اتنی پروا نہیں تھی مجھے اس فاطمہ عمر کو اپنے سے آگے نہیں نکلنے دینا تھا۔

وہ مدیحہ کی دوست تھی اور مدیحہ پہلے ہی دن اس سے بے حد متاثر ہوگئی تھی وہ جتنا اس کی تعریفیں کرتی میرے دل میں ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کے لیے ناپسندیدگی اتنی ہی بڑھتی جارہی تھی۔

بہت جلد مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ اگر اس نے پوزیشن لی تھی تو وہ اسے ڈیزرو کرتی تھی۔

جلد ہی وہ اساتذہ کی نظر میں بھی آ گئی تھی اور وہ بھی اس سے متاثر ہو گئے تھے۔ میرا خیال بھی غلط ثابت ہوا تھا کہ وہ پڑھاکو اور رٹو طوطا قسم کی لڑکی ہو گی۔ ایسے طالب علم نمبر تو لے لیتے ہیں لیکن عملی طور پر وہ بالکل نس ہوتے ہیں۔ لیکن یہ فاطمہ عمر تو ہر غیر نصابی سرگرمی میں سب سے آگے ہی ہوتی تھی مدیحہ نے مجھے بتایا تھا کہ اسکول تک وہ کئی دوسرے اور تقریری مقابلے ڈسٹرکٹ لیول تک جیت چکی تھی۔

میری ناپسندگی اس وقت اور بڑھ گئی تھی جب پہلے سال اس نے سب مضامین میں ڈسٹنکشن لی تھی۔

دوسرے سال بھی اس نے اپنی پوزیشن برقرار رکھی تھی جبکہ تیسرے سال بھی وہ ہاری تھی صرف ایک مضمون میں خرم شہزاد کی ڈسٹنکشن تھی اور میرے اس سے دو نمبر کم تھے اور فاطمہ کے ساتھ۔

آج مجھے یہ اعتراف کرتے ہوئے ذرا سی بھی جھجک محسوس نہیں ہو رہی کہ وہ جینئس تھی اگر زندہ ہوتی تو آج ملک کی مشہور نیورو سرجن ہوتی۔

میری اس کے لیے ناپسندیدگی نفرت میں ڈھلتی جا رہی تھی۔ میں اسے زک پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کرتا لیکن کبھی بھی جیت نہ سکا۔ طنز کے تیر چلانا۔ مذاق اڑانا، نفرت کا اظہار کرنا۔

تین سال تک میرا یہی وتیرہ رہا لیکن چوتھے سال کے آغاز میں ہی عزیز نے مجھے سمجھایا کہ میں اپنی ساری انرجی جلنے بھننے میں ضائع کر رہا ہوں مجھے ہر وقت اسے ہرانے کا سوچنے کے بجائے اپنی پڑھائی پر توجہ دینا چاہیے۔ مدیحہ نے بھی مجھ سے کہا تھا۔

"عثمان تم ذہین ہو اس میں کوئی شک نہیں۔ لیکن حسد تمہاری خوبیوں کو کھا رہا ہے۔ اس سے حسد کرنا چھوڑ دو میرے بھائی۔"

"ایک طریقہ ہے یار اسے ہٹانے کا۔ ساری پڑھائیاں اور شواعیاں بھول جائے گی۔"

عزیز کو ہمیشہ نئی نئی سوجھتی تھی۔

وہ میرا بچپن کا دوست تھا اگرچہ جاگیردارانہ بیک گراؤنڈ تھا۔ لیکن اس کے والد ڈی سی تھے ان کی ٹرانسفر ہوتی رہتی تھی لیکن ان کی فیملی مستقل لاہور میں ہی رہتی تھی۔ بچوں کی پڑھائی کی وجہ سے گلبرگ میں ان کی کوٹھی کئی کنال پر مشتمل تھی۔

عزیزوں رشتہ داروں کے بچے بھی پڑھنے کے لیے آتے تو ان کے ہاں ہی قیام کرتے تھے عزیز کے تین بھائی اور بھی تھے بہن کوئی بھی نہیں تھی۔

عزیز میرا جگری یار تھا اس نے میڈیکل بھی میری وجہ سے لیا تھا ورنہ اسے ڈاکٹر بننے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے والد چاہتے تھے کہ وہ مقابلے کا امتحان دے کیونکہ وہ بھی بے حد ذہین تھا۔ عموماً تیسری یا چوتھی پوزیشن لیتا تھا اگر وہ لاپروا نہ ہوتا تو ممکن ہے پہلی پوزیشن بھی لے لیتا تھا۔

وہ ایسا دوست تھا کہ میرے پسینے کی جگہ اپنا خون بھی بہا سکتا تھا۔ سو میں نے بہت توجہ سے اس کی بات سنی تھی۔

"ایسا کرو یار محبت کا ڈول ڈال دو۔ ہولے ہولے اسے یقین دلاؤ کہ تم اس کی محبت میں پاگل ہو رہے ہو۔"

"کیا تمہارے خیال میں وہ لڑکی اس قابل ہے کہ اس سے محبت کی جائے۔"

میں بھلا فاطمہ عمر سے محبت کر سکتا تھا۔ تب میں نہیں جانتا تھا کہ میں صرف فاطمہ عمر سے ہی محبت کروں گا اور کسی سے محبت نہیں کر سکوں گا حتیٰ کہ ظل ہما سے بھی نہیں جو میری بیوی ہے اور میرے اکلوتے بچے کی ماں ہے اور جو مجھ سے بے حد حساب محبت کرتی ہے۔

"تو میں کون سا تمہیں سچ میں اس سے محبت کرنے کو کہہ رہا ہوں۔ بس محبت کا ڈراما کرنے کو کہہ رہا ہوں۔ یہ جو لڑکیاں ہوتی ہیں نا محبت کے نام پر یوں پگھل کر پانی ہوتی ہیں جیسے برف کا ننھا سا ٹکڑا ہتھیلی کی گرمی سے پگھل کر پانی ہو جائے۔ محبت کی حدت انہیں موم کر دیتی ہے یار اور پھر صبح شام دوپہر وہ تمہیں سوچے گی پڑھائی کو نہیں، مجھے یقین ہے وہ غریب سی لڑکی تمہارا التفات اور محبت پا کر پاگل

ہو جائے گی کہ عثمان پراچہ جیسا لڑکا اس کی محبت میں مبتلا ہو گیا۔ اسے پاگل کر دو یار۔"

اور مجھے عزیز کی بات ٹھیک لگی تھی کہ وہ کالج میں بھی لڑکیوں سے دوستی کرنے اور اپنی محبت کا یقین دلانے میں ماہر تھا اور اب بھی اس کا یہ مشغلہ جاری ہی تھا لیکن وہ فاطمہ عمر تھی۔ وہ پاگل تو نہ ہوئی لیکن میرے رویے کی تبدیلی نے اسے حیران ضرور کیا تھا۔ اور اس نے مدیحہ سے کہا تھا کہ میرا یہ رویہ۔ اسے ہضم نہیں ہو رہا۔ گو میں نے اس سے واضح لفظوں میں اظہار محبت نہیں کیا تھا لیکن میں نرمی سے بات کرتا اسے سراہتا کسی کامیابی پر خوش دلی سے مبارک باد دیتا۔ اس کی باتوں میں دلچسپی لیتا۔ کسی موضوع پر ڈسکس کرتا۔ آہستہ آہستہ اس نے حیران ہونا چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ نرمی سے مسکرا دیتی بھی تعریف کرتا تو تھینک یو کہہ دیتی۔

مجھے یقین تھا کہ ایک روز میں اسے پالوں گا لیکن اس سے پہلے ہی مدیحہ نے اس کے نکاح شدہ ہونے کا انکشاف کر دیا۔ ایک لمحے کو تو میں حیران رہ گیا تھا۔ میرا دل جیسے ڈوب سا گیا تھا شاید اپنے مشن کے ادھورا رہ جانے کے خیال سے لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ مجھے اب کچھ اور سوچنا تھا کوئی اور طریقہ اور جب یہ بات میں نے عزیز سے کی تو وہ ہنسا تھا۔

"یار! نکاح شدہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تم اپنی کہانی آگے بڑھاؤ۔ اس کا کزن تم سے اچھا تو نہیں ہو گا۔"

"سوائے دولت کے وہ مجھ سے کسی شعبے میں مات نہیں کھاتا۔ ڈاکٹر ہے اور اکثر ٹاپ کرتا رہا ہے اور جہاں تک میں نے اندازہ لگایا ہے وہ اپنے کزن کے لیے بہت گہرے جذبات رکھتی ہے اور وہ ایسی لڑکی نہیں ہے کہ میرے کھوکھلے لفظوں سے متاثر ہو کر اسے چھوڑ دے۔" میں پریشان تھا۔

"تو مٹی ڈالو یار......" عزیز تو ہمیشہ سے ہی لاپروا سا تھا۔ "اس سال تم نے ٹاپ کیا نا۔ فائنل میں بھی ان شاء اللہ تم ہی ٹاپر ہو گے۔"

"نہیں یار! تم جانتے ہو نا اس سال وہ اپنے والد کی بیماری کی وجہ سے بہت اپ سیٹ تھی۔ پیپرز کے دوران بھی وہ اپ سیٹ رہی تھی۔ سب ہی، سر حفیظ، میڈم، پروفیسر فیاض کہہ رہے ہیں کہ فائنل میں پوزیشن فاطمہ ہی لے گی۔" میں کچھ مایوس سا ہو رہا تھا۔

"تو چلو پھر دعا کرتے ہیں کہ فائنل کے پیپرز میں اس کے فادر (والد) پھر بیمار ہو جائیں۔"

عزیز ہنسا۔ اور میں نے سوچا کہ وہ کسی اور وجہ سے بھی تو پریشان ہو سکتی ہے۔

"عزیز! کچھ ایسا کرو کہ وہ لڑکی فاطمہ عمر مجھ سے آگے نہ نکل سکے۔" عزیز نے بغور مجھے دیکھتے ہوئے میرے بازو پر تھپکی دی تھی۔

"چلو دیکھتے ہیں، کیا کر سکتے ہیں، اپنے یار کی خوشی کے لیے۔"

"تھینک یو عزیز!"

مجھے یقین تھا کہ عزیز کچھ نہ کچھ کر ہی لے گا۔ اس کے ساتھ میں نے اپنے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔ اسی طرح گروپ میں سب کے ساتھ اس سے بھی ہر موضوع پر بات کرتا۔ نرمی سے بات کرنا، نہ کوئی طنزیہ بات، نہ کوئی ذومعنی جملہ بلکہ اکثر اوقات پچھلے سال کی طرح کسی بات پر خوش دلی سے تعریف کرنا۔ البتہ میں اسے دیکھنے سے گریز کرتا تھا کہ کہیں وہ میری آنکھوں میں چھپی نفرت اور ناپسندیدگی کو نہ پا لے۔

تب میں یہی سمجھتا تھا کہ میں اسے نفرت کی حد تک ناپسند کرتا ہوں۔ یہ تو مجھے بعد میں پتا چلا اس کی موت کے بعد کہ میں اس سے نفرت نہیں کرتا تھا بلکہ میں تو اس روز سے اس کی محبت میں مبتلا ہو چکا ہوں جب وہ ہمارے گھر آئی تھی۔ ہماری دعوت میں اس روز پہلی بار میں نے اسے بغیر گاؤن اور اسکارف کے دیکھا تو جو شاید مدیحہ کے اصرار پر اس نے اس کے کمرے میں اتار دیے تھے۔ اس کا سانچے میں ڈھلا

جسم، متناسب لانبا قد، وہ مدیحہ سے بھی تھوڑی لمبی تھی۔ اس کی روشن آنکھیں۔ لانبی گھنی مڑی ہوئی پلکیں۔ دائیں رخسار پر پڑتا ڈمپل، اس کی حیا، جانے کس نے مجھے اٹریکٹ کیا تھا۔ لائٹ سے میک اپ کے ساتھ وہ عام دنوں سے بہت مختلف لگ رہی تھی۔

وہ سانولی سی معمولی سی لڑکی جس کے متعلق میں نے کہا تھا کہ ایک بار دیکھنے کے بعد دوسری بار اسے دیکھنے کی خواہش پیدا نہیں ہوتی اس روز میں نے تین چار بار پہلی غیر ارادی نظر کے بعد اسے دیکھا تھا۔ وہ خواتین کے حصے میں مما کے پاس ہی بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے لبوں پر بڑی مدھم سی مسکراہٹ تھی۔

لاؤنج کے ایک حصے میں مرد اور دوسری طرف خواتین تھیں۔ تب اس طرح مکس گیدرنگ کا رواج نہیں تھا جو آج کل اکثر دکھائی دیتی ہے لیکن وہ ایک طرح کی فیملی دعوت تھی سو ایک ہی لاؤنج میں ایک طرف مرد اور دوسری طرف خواتین تھیں۔

اور جب مدیحہ نے بتایا تھا کہ اس کا نکاح ہو چکا ہے تو ایک لمحے کے لیے میرا دل جیسے ڈوب سا گیا تھا اور تب میں نے یہی سمجھا تھا کہ میرے دل کی یہ کیفیت اس لیے ہے کہ میں جس مشن پر کام کر رہا تھا وہ ادھورا رہ گیا تھا یعنی اسے پٹانے کا۔ اور مجھے بلاوجہ ہی غصہ آ گیا تھا اور یہ غصہ کئی دن تک رہا اور میں اپنی اسٹڈی پر ذرا سی بھی توجہ نہیں دے سکا تھا۔

ان دنوں مجھے لگتا تھا میں پس منظر میں چلا گیا ہوں۔ میں جو ہمیشہ نمایاں رہتا تھا۔ ہر کوئی فاطمہ کی تعریف کر رہا تھا۔ ساتھی طلبا ہی نہیں اساتذہ کا بھی خیال تھا کہ اس بار پوزیشن فاطمہ کی ہی ہوگی۔ پچھلے دنوں ہونے والے ایک فنکشن میں ون مین شو میں اس نے جس طرح مختلف آوازیں بدل بدل کر ایکٹنگ کی تھی اس کی گونج ابھی تک کے ای کی چار دیواری میں گونج رہی تھی۔

برنارڈ شاہ کا وہ ڈرامہ جس کا نام اس وقت میرے ذہن میں نہیں ہے۔ اس میں غالباً چار یا پانچ کردار تھے۔

"تم نے اس کا ایکسنٹ سنا۔ کیا عجیب سا تھا، لگتا تھا جیسے ہم تیرہویں صدی کے برطانیہ کے کسی کردار کو سن رہے ہیں۔" اور اس کے چہرے کے ایکسپریشنز کمال کے تھے۔"

جدھر جاتا اس طرح کی باتیں سننے میں آتی تھیں۔ میں بھاگتا ہوا عزیز کے گھر آیا۔

"تم اس وقت کچھ کرو جب میرے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی یا میں خودکشی کر لوں گی۔"

"میں نے تمہیں کہا تھا کہ ریلیکس رہو۔ اس کو ذہن پر سوار مت کرو۔ دو چار نمبر اگر وہ زیادہ لے جائے گی تو تمہاری ذہانت اور لیاقت میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" عزیز کا انداز سمجھانے والا تھا۔ لیکن میں سمجھ نہیں رہا تھا۔

"مجھے فرق پڑتا ہے عزیز!" میں ذرا ڈھیلا پڑا۔

"میں پڑھائی پر بالکل بھی توجہ نہیں دے پا رہا عزیز! میں سچ کہہ رہا ہوں کہ کسی روز میرے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی۔"

"کوشش تو کی تھی میں نے کہ وہ ٹانگیں بازو تڑوا کر دو تین ماہ کے لیے بیڈ پر پڑ جائے اور تم سکون سے امتحان دے لو لیکن اس کی لک، تم کیا سمجھتے ہو اس کے ساتھ ہونے والے حادثات اتفاقی تھے۔ میرے ہی بندے نے اسے ٹکر ماری تھی اور جلتا ہوا سگریٹ تو بذاتِ خود میں نے اس کے زمین پر پھیلے دوپٹے پر پھینکا تھا۔ کہو تو اب قصہ ہی ختم کروا دوں۔"

اس نے ہاتھ سے گردن اڑانے کا اشارہ کیا۔

"کیا میں تمہیں ایسا لگتا ہوں عزیز! کہ بلاوجہ کسی کی جان لوں گا۔ میں تو بس چاہتا ہوں کہ وہ......"

"جانتا ہوں یار کہ تو کیا چاہتا ہے؟" اس نے میری بات کاٹ دی۔

"سن عثمان! ایک ترکیب ذہن میں آئی ہے۔"

عزیز کا دماغ تو ہمیشہ سے ہی ایسے معاملات میں زرخیز تھا۔ اور جب اس نے بتایا تو لمحہ بھر کے لیے تو میں چپ کر گیا۔

"یار! ایک رات قید میں رہے گی، اخبار میں خبر لگوادیں گے تو یقیناً اس کے بعد وہ خود ہی نہیں آئے گی یونی۔"

"اور تمہارے بندے جو اسے اغوا کریں گے، وہ اسے کوئی نقصان تو نہیں پہنچائیں گے۔" میں جیسے نیم رضامند تھا۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھیں گے بھی نہیں۔"

"لیکن یہ اغوا کب اور کیسے ہوگا؟"

میں نے پوچھا تو عزیز مسکرایا۔

"یہ تم مجھ پر چھوڑو اور بے فکر ہو جاؤ۔"

ابھی عزیز کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا کہ یہ موقع قدرت نے خود ہی مہیا کر دیا۔

"سنو، یہ بہت سنہری موقع ہے۔"

مدیحہ اور فاطمہ کے ساتھ چائے پی کر ہم وارڈ میں جانے کے بجائے پارکنگ میں آ گئے۔

"ہم کل دادا جان سے ملنے نہیں جائیں گے لیکن ظاہر کریں گے کہ ہم یہاں نہیں ہیں۔ نازیہ نہیں ہے۔ تم کسی طرح مدیحہ کو بھی کل مت آنے دینا۔ میرا بندہ اسے جا کر اس کے والد کی نازک حالت کا بتائے گا۔ کیا نام بتایا تھا تم نے اس کے کزن کا...... ہاں ڈاکٹر عبدالرافع...... وہ ڈاکٹر عبدالرافع کا ہی پیغام دے گا کہ اس کے والد کی حالت نازک ہے یا ایسا ہی کچھ اور ظاہر ہے وہ اپنی مرضی سے ساتھ آئے گی۔ اغوا کرنے میں کچھ پرابلم ہو سکتی ہے۔ وہاں فلیٹ میں میرا بندہ اس کی تصویر بنائے گا اور بس اسے چھوڑ دیا جائے گا۔"

عزیز ایسے ہی فوری فیصلے کر سکتا تھا۔ اور پھر ایسا ہی ہوا۔ عزیز کے بندے نے چند روز پہلے ایک علاقے میں فلیٹ کرائے پر لیا تھا جو فرنشڈ ہی تھا۔ گو فرنیچر اور کارپٹ وغیرہ خاصے پرانے سے تھے۔ اسی علاقے کے تھانے کے دو پولیس والوں سے عزیز کے بندے نے پہلے ہی بات کر لی تھی۔

یہ ساری تفصیل عزیز نے مجھے بعد میں بتائی تھی۔ اس کا بندہ اس واقعے کے اگلے ہی روز فلیٹ کی چابی مالک کو دے کر واپس اپنے علاقے چلا گیا تھا کہ ایک ماہ کا ایڈوانس کرایہ اور سکیورٹی وہ دے چکا تھا۔ تاکہ اگر فاطمہ اس فلیٹ یا علاقے کی نشاندہی کر دے تو اصل بندہ نہ پکڑا جا سکے اگرچہ اس کا امکان نہیں تھا۔

عزیز نے چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی ذہن میں رکھا تھا۔ لیکن بڑے سے بڑا مجرم بھی کہیں نہ کوئی غلطی کر جاتا ہے۔ ہم سے بھی ایک غلطی ہوئی تھی کہ اس کے والد کی بیماری اور یہاں لاہور آنے کے متعلق اس نے صرف ہم سے ہی بات کی تھی تو اس جیسی ذہین لڑکی سے یہ بعید نہ تھا کہ وہ فوراً سمجھ جاتی کہ اس کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔

ڈاکٹر عبدالرافع اس کے کزن کے متعلق بھی شاید ہمارے علاوہ نازیہ ہی جانتی تھی۔ وہ اپنی ذاتی باتیں کلاس فیلوز سے ڈسکس نہیں کرتی تھی حتیٰ کہ اس نے اپنے نکاح کے متعلق بھی گروپ میں کسی سے بھی بطور خاص ذکر نہیں کیا تھا۔ اس کا احساس مجھے اس وقت ہوا تھا جب سلیمان بھائی نے یہ کہا تھا کہ اس کے والد کی بیماری اور یہاں آنے کے متعلق جو لوگ جانتے ہیں۔ ان میں سے ہی کوئی ہو سکتا ہے۔ اور اپنی پریشانی چھپانے کے لیے میں غصے میں آ گیا تھا لیکن سلیمان بھائی کی کھوجتی نظریں مجھے اپنے وجود میں اترتی محسوس ہوئی تھیں۔

میں گھبرا کر وہاں سے اٹھ آیا اور ہم سے ایک اور غلطی بھی ہوئی تھی کہ ہم عزیز کے دادا جان کے پاس نہیں گئے تھے اور میں عزیز کے گھر میں اس کے ساتھ رہا تھا اور فلیٹ میں پولیس کے آنے سے پہلے ہم بھی ایک کمرے میں موجود تھے جس کا ایک دروازہ باہر گیراج کی طرف کھلتا تھا۔ جب وہ بے ہوش ہو کر گری تھی تو عزیز نے جانے کیا کہا تھا کہ میری ہنسی نکل گئی۔

اور ساری رات میں سو نہیں سکا۔ اگر اس نے عزیز کی آواز پہچان لی ہو، اگر اسے خیال آ گیا کہ اس

نے اپنے والد کے آنے کا ذکر صرف ہم سے ہی کیا تھا
تو...... اور اس تو کے آگے ایک سوالیہ نشان تھا۔ اور
اب یہ ہماری خوش نصیبی تھی یا اس کی بدنصیبی کہ وہ ہوش
میں نہیں آئی تھی۔ نازیہ کو روتے دیکھ کر ایک لمحے کے
لیے میں نے اطمینان محسوس کیا تھا اور مجھے ایک کمینی
سی خوشی بھی ہوئی تھی کہ اب ہم محفوظ ہیں ہمیں کوئی ڈر
نہیں۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں بے چین سا ہو گیا
تھا۔

”میں نے ایسا تو نہیں چاہا تھا کہ وہ مر جائے۔
میں تو بس تھوڑی دیر کے لیے اسے منظر سے ہٹانا چاہتا
تھا۔ میں تو بس اتنا چاہتا تھا کہ کچھ ایسا ہو جائے کہ وہ
اچھی طرح سے فائنل کی تیاری نہ کر سکے اس کا دھیان
پڑھائی سے ہٹ جائے۔ تم جانتے ہو نا عزیز! تمہیں
پتا ہے نا کہ میں نے اس کی موت کی خواہش کبھی نہیں
کی تھی۔“

جب سب اس کے جنازے میں شامل ہونے
کے لیے اس کے گاؤں جانے کا پروگرام بنا رہے تھے
میں کینٹے ٹیریا میں بیٹھا عزیز سے کہہ رہا تھا۔

”یار! اب جو ہونا تھا ہو گیا۔ اس کی زندگی اتنی
ہی تھی۔ وہ اتنی ہی عمر لکھوا کر لائی تھی۔ تم ریلیکس رہو،
ڈپریس مت ہو یقیناً ہمارا ایک عمل اس کی موت کا
سبب بنا لیکن زندگی لینے اور دینے والا تو اللہ ہے نا۔
اگر اس کی زندگی اتنی ہی تھی تو ہم اگر یہ حرکت نہ کرتے
تو کسی اور سبب سے اس کی موت واقع ہو جاتی۔“

عزیز کو قائل کرنے کا فن آتا تھا۔ سو میں بھی
قائل ہو گیا کہ اس کی زندگی ہی مختصر تھی، اس میں میرا
کوئی قصور نہیں۔ عزیز زیادہ دیر تک کوئی بات سر پر
سوار نہیں رکھتا تھا سو چند دنوں بعد ہی بھول بھال
گیا۔ لیکن مجھے کچھ وقت لگا تھا۔ تاہم میں اپنی پڑھائی
میں مصروف ہو گیا۔

کبھی کبھی پڑھتے ہوئے مجھے یکدم خیال آتا کہ
میں نے فاطمہ کے ساتھ بہت زیادتی کی۔ دل میں
چبھن سی ہوتی لیکن دوسرے ہی لمحے میں اپنی پڑھائی
کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ میں نے اپنے ضمیر کو تھپک
تھپک کر سلا دیا کہ اس کی زندگی اتنی ہی تھی اور میں اس
کی موت کا ہرگز ذمہ دار نہیں ہوں۔

لیکن میری اس کبھی کبھی کی خلش کو بھی میری
شاندار کامیابی نے مٹا ڈالا تھا، میں نے پاکستان کے
سارے میڈیکل کالجز میں ٹاپ کیا تھا۔ میں نے
کے۔ای کا پچھلا کئی سالہ ریکارڈ بھی توڑ دیا تھا۔

اس روز ہمارے گھر کا ہر فرد بے حد خوش تھا۔
میری اور مدیحہ کی کامیابی کی خوشی میں ہونے والی
دعوت کا پروگرام بنایا جا رہا تھا کہ اچانک سلیمان بھائی
نے جو میرے پاس ہی صوفے پر بیٹھے تھے پوچھا۔

”اگر فاطمہ زندہ ہوتی تو کیا پھر بھی تم ہی ٹاپ
کرتے عثمان؟“

میرے ہنستے لب بھنچ گئے اندر جیسے کسی نے چٹکی
بھری تھی۔ سلیمان بھائی تو فاطمہ سے صرف ایک بار
ہی ملے تھے۔ ہاں مدیحہ کے حوالے سے وہ اسے ضرور
جانتے تھے کہ مدیحہ کی عادت تھی سب سے ہر بات
شیئر کرنے کی لیکن میں نے فوراً خود کو کمپوز کر لیا تھا۔

”کون؟ فاطمہ عمر...... ہاں ہو سکتا ہے وہ چند نمبر
مجھ سے زیادہ لے لیتی یا چند کم...... ہمارا برابر کا ہی
مقابلہ تھا۔“

میں بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مما کی
طرف متوجہ ہو گیا میرے ذہن میں کہیں تھا کہ اگر میں
فاطمہ کے ساتھ اپنے من میں ضد نہ باندھ لیتا تو بہت
ممکن ہے یہی رزلٹ آتا جواب آیا تھا۔

یہ کامیابی تو میری اگلی منزلوں کے لیے آغاز
تھی۔ اگلے چند سال میں بے حد مصروف رہا اور کامیابی
کی منزلیں طے کرتا ہوا بالآخر اس مقام تک پہنچ گیا
جس کا خواب دیکھا تھا۔

میری شہرت ملکی حدود سے نکل کر دوسرے
ممالک تک پہنچ گئی۔

میں نے جرمنی اور فرانس میں دماغ کے ایسے
نازک کامیاب آپریشن کیے جنہیں وہاں کے ڈاکٹر
کرتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔

مما نے اپنے ہاسپٹل کو بہت وسعت دی تھی۔

اس میں کئی شعبے تھے۔ اور بے شمار ڈاکٹرز ان کے ہاسپٹل سے منسلک تھے اور وہ لاہور کے بہترین پرائیویٹ اسپتالوں میں سے ایک تھا۔

میرے پاکستان آنے سے پہلے ہی مما نے میرے لیے ایک پورا پورشن تیار کروایا تھا۔

ہر طرح کے آلات اور مشینری وغیرہ باہر سے منگوائی گئی تھی۔ اب میرا ایک نام تھا۔ ڈاکٹر جعفر کے بعد لوگ میرا نام لیتے تھے۔ بقول مما کے اگرچہ میں کچھ لیٹ ہوگیا تھا تاہم اب مجھے شادی کرلینی چاہیے۔ دراصل میں اس قدر مصروف رہا تھا کہ مجھے شادی کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔

اس دوران سلیمان بھائی اور مدیحہ کی شادی ہوچکی تھی۔

اس روز مجھے پاکستان آئے چار دن ہوچکے تھے اور ہم سب لاؤنج میں بیٹھے باتیں کررہے تھے۔ مدیحہ بھی آئی ہوئی تھی کہ مما نے اچانک کہا کہ وہ چاہتی ہیں کہ اسی سال میری شادی کردیں۔ اگر مجھے کوئی لڑکی پسند ہو تو بتادوں ورنہ فیملی میں بھی لڑکیاں ہیں اور باہر بھی دو تین میری نظر میں ہیں۔

"میری پسند......"

میں نے اپنی کلاس فیلوز اور امریکا کے قیام کے دوران ملنے والی لڑکیوں کے متعلق سوچنا چاہا کہ ان میں سے کون؟ تو چھم سے وہ میرے تصور میں چلی آئی۔ نو سال پہلے لاؤنج کے اس کونے میں بیٹھی جہاں اس وقت زہرا بھابھی بیٹھی تھیں۔ لبوں پر شرمیلی مسکراہٹ سجائے نگاہیں جھکائے مما سے کچھ کہتی ہوئی۔

"میں...... مجھے تو......" اور میں کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ میرے اندر اندھیرا سا چھا گیا۔ احساس زیاں سے میرا دم گھٹنے لگا۔

"میری کوئی پسند نہیں ہے مما۔"

مما خوش ہوگئی تھیں۔ بھابھی، مدیحہ اور مما مختلف لڑکیوں کے نام لے رہی تھیں اور میرے اندر احساس ندامت اور احساس زیاں اتنا بڑھ گیا تھا کہ میں تھکن کا بہانا کرکے اٹھ کھڑا ہوا۔

اس رات...... ہاں اس رات میں سو نہیں سکا تھا۔ اس رات مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں...... ہاں میں فاطمہ کی وفات کے نو سالوں بعد خود سے اعتراف کررہا تھا کہ اس رات مجھے فاطمہ سے محبت ہوگئی تھی۔ لیکن اپنی حسد اور نفرت میں پہچان ہی نہ سکا تھا اور ہر گزرتے دن کے ساتھ یہ احساس زیاں بڑھتا ہی جارہا تھا تب میں نے خود کو سمجھایا تھا کہ وہ زندہ بھی ہوتی تو تب بھی میرا نصیب نہیں بن سکتی تھی۔ وہ تو کسی اور آسمان کا چاند تھی اسے تو کسی اور شبستان میں مہکنا تھا۔ لیکن میں نے اس کے ساتھ جو کچھ کیا تھا یہ خیال کبھی کبھی میری نیندیں اڑا دیتا تھا۔

میرا ضمیر مجھے کوڑے مارتا۔

ظل ہما میرے چچا کی بیٹی تھی۔ وہ آرتھوپیڈک سرجن تھی۔ مجھ سے عمر میں دو سال چھوٹی۔ سب کی رائے سے وہ میری زندگی میں شامل ہوگئی۔ شکل وصورت، فیملی ایجوکیشن کسی لحاظ سے بھی اس میں کوئی کمی نہ تھی۔ لیکن میں اس سے کبھی محبت نہ کرسکا۔

ہاں ہمارے درمیان اچھی ریلیشن شپ تھی۔ میں نے ہمیشہ کوشش کی کہ کبھی میری ذات سے اسے تکلیف نہ ہو لیکن محبت میں نے فاطمہ سے ہی کی۔

حسان میرا اکلوتا بیٹا تھا۔ حسان کے بعد میری کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ مجھے حسان بہت پیارا تھا۔ بہت محبت تھی مجھے اس سے لیکن اپنی بے تحاشا مصروفیات کی وجہ سے میں اسے بہت زیادہ وقت نہیں دے پاتا تھا۔

ہما بھی مصروف رہتی تھی اس کا زیادہ وقت زہرا بھابھی کے ساتھ گزرتا تھا اور پھر پپا اور سلیمان بھائی سے وہ زیادہ قریب تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ سب کا ہی لاڈلا تھا۔ بہت حساس اور ہمدرد نیچر کا تھا۔ اے لیول کے بعد جب اس نے کہا کہ اسے ڈاکٹر نہیں بننا تو میں اور ہما کچھ دیر کے لیے شاکڈ رہ گئے تھے۔ ہماری خواہش تھی کہ وہ ہماری طرح ہی طب کے شعبے میں نام بنائے لیکن پپا، سلیمان بھائی، بھابھی حتیٰ کہ

ہما نے بھی اس کی حمایت کی کہ اگر اس کا رجحان نہیں ہے میڈیکل کی طرف تو بھئی جو پڑھنا چاہتا ہے پڑھے۔

پپا کی خواہش تھی کہ وہ ایم بی اے کرکے بزنس میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

"میں اب تھک گیا ہوں اور سلیمان اکیلا ہے۔ اس کا کوئی بیٹا ہوتا تو میں تمہیں نہ کہتا۔ عثمان کی اپنی لائن ہے اور یہ بزنس تمہیں اور سلیمان کو ہی سنبھالنا ہے۔"

اور اس نے پپا کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ایم بی اے کرلیا تھا اور سلیمان بھائی کے ساتھ آفس بھی جانے لگا تھا۔ اگر کبھی اتفاق سے مجھے فراغت ہوتی تو میں دیکھتا کہ وہ، زہرا بھابھی اور سلیمان بھائی گھنٹوں بیٹھے دنیا بھر کے لٹریچر پر بات کررہے ہوتے۔

شاعری اور ادب سے اس کی یہ دلچسپی مجھے حیران کرتی کہ مجھے اور ہما کو ادب سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ شاید یہ فطری تھا یا سلیمان بھائی اور بھابھی کی صحبت کی وجہ سے۔

بہرحال میں نے خود کو مطمئن کرلیا تھا کہ میرا بیٹا اگر ڈاکٹر نہیں بنا تو کیا ہوا بزنس تو سنبھال رہا ہے اور پپا اس سے خوش ہیں۔ مدیحہ کے تینوں بچوں کی شادیاں ہوچکی تھیں۔ سلیمان بھائی کی دو بیٹیوں کی شادی ہوچکی تھی۔ تیسری بیٹی جو حسان سے تین سال بڑی تھی، اس کا رشتہ طے ہوا تو ہما کو حسان کی شادی کا خیال آیا۔

"ہمارا حسان بھی ماشاء اللہ پچیس سال کا ہوچکا ہے۔ ہمیں بھی اس کی شادی کردینا چاہیے۔ گھر میں رونق ہوجائے گی۔"

"ٹھیک ہے، کوئی لڑکی ہے تمہاری نظر میں! مدحو اور سلیمان بھائی کی بیٹیوں کی تو شادی ہوچکی۔"

میں جو لیپ ٹاپ پر انسانی دماغ کی پیچیدگی پر ایک آرٹیکل دیکھ رہا تھا اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"مجھے مدحو کی بیٹی فاطمہ بہت پسند تھی۔ چار ماہ ہی تو بڑی تھی۔ ہمارے حسان سے لیکن تب آپ نے کوئی توجہ ہی نہیں دی۔"

اس نے گلہ کیا تو میں نے نظریں چرالیں۔ کیا بتاتا اسے کہ فاطمہ نام سے میرے اندر کون سے زلزلے بپا ہوجاتے تھے۔ اسی لیے میں مدیحہ کے گھر بھی کم ہی جاتا تھا اور پھر بڑی ہوکر تو وہ اسکارف اور عبایا لینے لگی تھی تو اسے دیکھتے ہی میری آنکھوں کے سامنے فاطمہ عمر آجاتی حالانکہ شکل وصورت میں وہ فاطمہ سے بالکل مختلف تھی۔ بہت پیاری تھی وہ لیکن اسے ہر وقت دیکھنا۔ اپنے لیے اذیت کا ایک دروازہ کھول لینا تھا۔

"مدحو کی بیٹی سے بڑھ کر مجھے کون عزیز ہوسکتا تھا! لیکن تب حسان چھوٹا اور شادی کے لیے تیار نہ تھا۔ اس کا بہت اچھا رشتہ آیا ہوا تھا اگر میں اسے پابند کردیتا تو ہوسکتا ہے جب حسان شادی کے لیے تیار ہوتا تو اسے کوئی اور پسند آجاتی۔"

میں نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

"یہ بھی ٹھیک ہے، بھابھی کہہ رہی تھیں حسان کو کوئی لڑکی پسند ہے۔" ہما نے بتایا تو میرے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"گڈ تمہیں اب بہو کی تلاش کے لیے جوتیاں نہیں چٹخانی پڑیں گی۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" وہ مدھم سا مسکرائی تھی۔

"زندگی تو اس نے ہی گزارنی ہے تو پسند بھی اس کی ہی ہونا چاہیے ورنہ زندگی گزارنا مشکل ہوجاتا ہے۔ بے رنگ، بے مزا زندگی بوجھ لگتی ہے۔"

وہ نگاہیں جھکائے کہہ رہی تھی۔ لیکن اس کے لہجے سے جو کرب جھلکا تھا اس نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے تو کبھی کوتاہی نہیں کی ہمیشہ ہر طرح اس کا خیال رکھا لیکن یہ جو عورت ہوتی ہے نا اس کے اندر ایک خاص حس ہوتی ہے۔ جیسے اپنے مرد کے اندر تک جھانک آتی ہے دل کا چور پکڑ لیتی ہے۔

"کون ہے وہ لڑکی (کس خاندان کی ہے)؟"

میں نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹالیں۔

"آپ کو پتا تو ہے، وہ ہماری نسبت سلیمان

بھائی بھابھی اور پیا سے زیادہ قریب ہے۔ بھابی اور پیا سے بہت دوستی ہے اس کی۔ میں نے بھابی سے کہا ہے اس سے پوچھیں۔

"یہ ہماری کم نصیبی ہے ہما کہ ہم اپنے بیٹے کو اس طرح وقت نہیں دے سکے جیسے دینا چاہیے تھا۔ لیکن ہم خوش نصیب بھی ہیں کہ ہماری مصروفیات نے ہمارے بیٹے کو اکیلا نہیں کیا اور اس نے سب ہی رشتوں کو نبھائے گیا۔ بھابھی اور سلیمان نے ہم سے زیادہ خیال رکھا ہس کا پھر بھی عمر کے اس کے دور میں آکر سوچتا ہوں کہ اگر کوئی مجبوری نہ ہو تو میاں بیوی دونوں کو جاب نہیں کرنا چاہیے بچے نگلیکٹ ہو جاتے ہیں لیکن اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے حسان کو ہم سے زیادہ چاہنے والے ہیں۔ اور ہاں تم بھابھی سے کہنا ساری معلومات لے لیں۔ خاندان، برادری اور......"

"اس کا جو بھی خاندان ہوا۔ جو بھی برادری ہوئی لیکن وہ لڑکی میرے بیٹے کی پسند ہے تو میں اس کی شادی وہاں ہی کروں گی۔ میں نہیں چاہتی کہ ہمارا اکلوتا بیٹا آدھی ادھوری زندگی بسر کرے۔ سمجھوتے کی زندگی ایک بوجھ ہوتی ہے ایسا بوجھ جسے نہ چاہتے ہوئے بھی ڈھونا پڑتا ہے۔"

اس کے لہجے نے مجھے پھر چونکایا تھا برسوں پرانا دن آنکھوں کے سامنے آگیا تھا۔ جہاں مما کہہ رہی تھیں۔

"دوستی کرنا اور بات ہے اور کسی کو اپنے خاندان کا حصہ بنانا اور بات۔"

"اچھا ذرا بلاؤ تو صاحبزادے کو میں پوچھوں تو کون ہے کس خاندان کی ہے، مما کسی عام سے خاندان میں شادی کے لیے مشکل سے ہی مانیں گی۔"

"وہ کسی بھنگی کی اولاد بھی ہوئی اور میرے بیٹے کی چاہت ہوئی تو میں اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنوں گی رضتان بھلے مما پپا کچھ بھی کہیں۔" اس کی آواز میں آنسو گھل گئے تھے۔

"جب شادی میں دل کی خوشی شامل نہ ہو وہ محض ایک ضرورت اور سمجھوتا ہو تو جینا مشکل ہو جاتا ہے میں نہیں چاہتی کہ میرا بیٹا ایسے کسی کرب سے گزرے۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو چمکے تھے جنہیں اس نے نگاہیں جھکا کر چھپانے کی کوشش کی تھی۔ تو کیا وہ سمجھتی ہے کہ ہم نے ستائیس سال صرف سمجھوتہ کیا۔ اس میں دل کی خوشی شامل نہ تھی۔ اس نے یہ کیسے جانا جسے میں خود سے بھی چھپاتا آیا ہوں۔

"شگل ہما! کیا تم میرے ساتھ خوش نہیں ہو کیا مجھ سے بھی تمہارے حقوق میں کوئی کوتاہی ہوئی ہے اور کیا۔"

لیکن حسان کے آنے کی وجہ سے میری بات ادھوری رہ گئی تھی۔

"السلام علیکم بابا!"

وہ مسکراتا ہوا ہما کے پاس بیٹھ گیا تھا۔ وہ زندگی سے بھرپور ایک وجیہہ نوجوان تھا۔ میں تو اسے نظر لگ جانے کے ڈر سے جی بھر کر دیکھتا بھی نہ تھا۔

"آپ ناشتے کے فوراً بعد ہی چلے گئے تھے۔ میں سوچ رہا تھا آپ کو اپنی بائیک دکھاتا ہوں۔"

"ہاں یار میرے پیشنٹ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ کل میں نے اس کے دماغ کا آپریشن کیا تھا لیکن آج صبح ڈاکٹر فواد کا فون آیا کہ بلیڈنگ ہو رہی ہے تو جانا پڑا۔" میں نے وضاحت کی تھی

"یہ ڈاکٹروں کی لائف بھی بڑی لف ہوتی ہے بابا مجھے نہیں یاد کہ کبھی چھٹی کا کوئی پورا دن آپ نے گھر میں گزارا ہو۔" وہ ناراض سا لگا مجھے تو میں مسکرا دیا۔

"چلو ابھی تمہاری بائیک بھی دیکھ لیتے ہیں۔"

اسے بائیک کا بہت شوق تھا۔ ایک دو ہیوی بائیکس اور اسپورٹس بائیک ابھی بھی اس کے پاس تھیں لیکن اب اس کی خواہش پر میں نے B.M.W Motorrad بک کروائی تھی۔ "تمہیں پسند آئی۔"

"بہت بابا...... زبردست ہے۔" وہ یک دم

خوش ہوا تھا۔

"Moto Guzzi اور Aprilia میں سے ایک اپنے دوست کو دے رہا ہوں۔ اچھی قیمت دے رہا ہے۔"

اس نے اپنی پرانی بائیکس کے متعلق بتایا۔

"احتیاط کرنا۔" میں نے ہمیشہ کی طرح نصیحت کی۔

"تمہیں پتا ہے نا سلیمان بھائی اور پپا کو تمہارا یہ شوق پسند نہیں ہے۔ انہیں خوف آتا ہے۔"

"جی، میں بہت احتیاط کرتا ہوں بابا۔"

خوشی کے رنگ اس کی آنکھوں سے جھلک رہے تھے اور یہاں کیا چل رہا تھا۔

اس نے اپنے پاس بیٹھی ہما کی طرف دیکھا جو خاموشی سے ہماری گفتگو سن رہی تھی۔

"ضرور کسی Patient (پیشنٹ) کا کیس ڈسکس ہو رہا ہو گا۔ میرا خیال ہے میاں بیوی دونوں کو ڈاکٹر نہیں ہونا چاہیے ورنہ بیڈ روم کو بھی ہاسپٹل بنا لیتے ہیں۔"

یہ حقیقت تھی ہم اکثر گھر میں بھی اپنے اپنے مریضوں کے بارے میں بات کرتے رہتے تھے۔

"لیکن اس وقت کسی پیشنٹ کا نہیں تمہارا کیس زیر بحث تھا۔" میں ہنسا تھا اور ہما بھی مسکرا دی تھی۔

"ہم تمہاری شادی کی بات کر رہے تھے۔ کیا خیال ہے میاں بیوی میں سے اگر ڈاکٹر ایک ہو تو چل سکتا ہے نا۔"

"کسی حد تک۔" اس نے کچھ الجھ کر میری طرف دیکھا تو مجھے شرارت سوجھی۔

"تو ہم نے تمہارے لیے ایک ڈاکٹر پسند کی ہے۔"

"اوہ نو!" اس کے لبوں سے بے ساختہ نکلا تھا اور اس کی رنگت یک دم متغیر ہوئی تھی۔ مسکراتی آنکھیں بجھ سی گئی تھیں اور میں جان گیا تھا کہ وہ کس حد تک اس لڑکی میں انوالو ہے۔

"شادی میرے بیٹے نے کرنی ہے آپ نے نہیں۔"

ہما بھی میری شرارت سمجھ گئی تھی اور اس نے اپنا ایک بازو اس کے گرد حمائل کیا تھا۔

"اور میرے بیٹے نے اپنے لیے لڑکی پسند کر لی ہے۔"

"مما!" وہ جھینپ گیا۔ اور اس آنکھیں پھر سے مسکرانے لگی تھیں۔

"او کے تو پھر کب لے جا رہے ہو ہمیں اپنے ہونے والی سسرال۔"

"بابا......!" وہ لڑکیوں کی طرح شرما رہا تھا۔

"میں اس سے بات کر کے بتاؤں گا۔"

"اس کے فادر کیا کرتے ہیں اور وہ خود، کیا اس نے تمہارے ساتھ پڑھا ہے۔"

"اس کے والدین ڈاکٹر ہیں۔ دونوں بڑے بھائی بھی میڈیکل کے شعبے میں ہیں۔ ابھی اسپیشلائزیشن کر رہے ہیں۔ اور یہ پنجاب یونیورسٹی میں جرنلزم پڑھ رہی ہے۔ یہ لوگ پہلے شکاگو میں تھے تقریباً چار سال پہلے پاکستان آئے ہیں۔ سوی کے اے لیول کرنے کے بعد، مدیحہ نام ہے اس کا لیکن گھر میں سب سوی بلاتے ہیں۔ بھائی اس کے ابھی وہاں امریکا میں ہی ہیں۔ دو تین ہفتے پہلے میری اس کے فادر سے ملاقات ہوئی تھی بہت نائس آدمی ہیں۔ ڈی ایچ اے فیز فور میں ہے ان کا گھر۔" اس نے تفصیل سے بتایا۔

اس نے لحرے سے پڑھا۔ وہ پنجاب یونیورسٹی میں پڑھ رہی ہے پتا نہیں اس کی اس سے کہاں ملاقات ہوئی تھی۔

میں نے پوچھا نہیں تھا میری ایک ضروری کال آ گئی تھی میں فون لے کر باہر نکل آیا تھا۔ پھر ماں بیٹے میں کیا کیا باتیں ہوئی مجھے پوچھنے کا موقع نہیں ملا کہ مجھے اس وقت پھر ہاسپٹل جانا پڑا تھا کہ میرے مریض کی حالت بہت خراب تھی اور اگلی صبح ناشتے کے فوراً بعد میری کراچی کی فلائٹ تھی وہاں مجھے تین دن قیام کرنا تھا لیکن ایک دن بعد ہی سلیمان بھائی کا فون آ گیا تھا۔

"عثمان پہلی دستیاب فلائیٹ سے پہنچو حسان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔"

ان کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"کیسے کب"

"عثمان......"

اور ان سے بات ہی نہ ہو سکی تب ہی ہما نے ان سے فون لے لیا تھا۔

"عثمان ہمارا بیٹا" وہ بری طرح رو رہی تھی۔

"اس کے سر پر چوٹ لگی تھی، وہ بے ہوش ہے۔"

اور پھر مجھے خبر نہیں کہ میں کیسے ایئر پورٹ پہنچا، کیسے سیٹ کینسل کروا کے ایمرجنسی میں سیٹ لی۔ یا اللہ حسان کو کچھ نہ ہو وہ تو ہمارے خاندان کا اکلوتا بیٹا ہے۔ اسے کچھ ہو گیا تو......

لاہور ایئر پورٹ پہ ڈرائیور آیا ہوا تھا۔

"حسان کی بائیک ٹرک سے ٹکرا گئی تھی۔ ٹرک ڈرائیور کا کوئی قصور نہ تھا۔ حسان رانگ سائیڈ سے آیا تھا۔"

ڈرائیور نے بتایا تھا۔ وہ مجھے لے کر سیدھا ہاسپٹل آیا تھا۔ وہاں سب ہی تھے مما، پپا، سلیمان بھائی، مدیحہ، ہما، بھابھی اور سلیمان بھائی کی تینوں بیٹیاں مجھے دیکھتے ہی ان کے آنسو بہت زیادہ تیزی سے بہنے لگے تھے۔ وہ ان کا بہت لاڈلا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے کوئی سینے کے اندر میرے دل کو تیز دھار آلے سے چیرے جا رہا ہوں۔

"کہاں...... کہاں ہے حسان؟"

"آپریشن تھیٹر میں ہے۔ ڈاکٹر فواد ہیں اس کے پاس۔ ضروری ٹریٹ منٹ دے دی ہے انہوں نے۔ دماغ کے اور دوسرے ضروری ایکسرے وغیرہ ہو گئے ہیں۔ سٹی اسکین بھی ہو چکا ہے، تم تھوڑا ریلیکس ہو جاؤ۔ سنبھالو اپنے آپ کو...... ساری رپورٹس دیکھ لو۔ ڈاکٹر فواد کہہ رہے تھے کہ دماغ کا آپریشن ہو گا اور تمہارے علاوہ اور کوئی یہ آپریشن نہیں کر سکتا۔"

انہوں نے بمشکل اپنی بات مکمل کی تھی۔ اور پھر رو پڑے تھے۔ میں خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ مما، پپا، ہما، زہرا بھابھی وہاں موجود سب کی آنکھوں میں آنسو تھے اور سب کے لب ہل رہے تھے۔ پھر سلیمان بھائی نے ہی خود کو سنبھالا اور میرے گرد بازو حمائل کرتے ہوئے مجھے میرے روم میں لے گئے۔ ان کے کہنے پر سسٹر مونا میرے لیے پانی لائی۔ میں نے دو گھونٹ پی کر رکھ دیا۔

"میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں پہلے!"

تب ہی ڈاکٹر حماد فائل اٹھائے اندر آئے۔ ڈاکٹر حماد اور ڈاکٹر فواد دونوں مجھے اسسٹ کرتے تھے۔ ڈاکٹر حماد نے فائل میرے سامنے رکھی، یہ حسان کی ساری رپورٹس تھیں۔ میں نے فائل کھولی۔

"سر! آپ کو یاد ہو گا دو ماہ پہلے ایک ینگ لڑکی کار کے حادثے میں زخمی ہو کر آئی تھی۔ ہیڈ انجری تھی۔ بالکل اسی طرح، آپ نے آپریشن کیا اور وہ اب بالکل ٹھیک ہے۔"

حماد کہہ رہا تھا۔

"لیکن یہ میرا بیٹا ہے حماد! میں کیسے میری ذرا سی جذباتیت اور غلطی سے......"

اور میں نے سختی سے آنکھیں ہونٹ بھینچ کر اپنی سسکی اور آنسو روکے۔

"لیکن سر! یہ آپریشن تو آپ کو ہی کرنا ہو گا۔ یہاں پورے پاکستان میں آپ جیسا کوئی ماہر نیورو سرجن نہیں ہے۔ سر! پلیز حوصلہ کریں ہم آپ کے ساتھ ہوں گے۔"

میں نے بے بسی سے ڈاکٹر حماد کی طرف دیکھا اور اور اٹھ کھڑا ہوا۔ فائل میرے ہاتھ میں تھی اور میں ایک بار پھر کھڑے کھڑے رپورٹس دیکھنے لگا تھا۔ سلیمان بھائی کی اور ڈاکٹر حماد کی نظریں مجھ پر ہی لگی ہوئی تھیں۔ ایک گہری سانس لے کر میں نے فائل ڈاکٹر حماد کو پکڑائی۔ سلیمان بھائی نے نم آنکھوں کے ساتھ میرا بازو تھپتھپایا۔

"ان شاء اللہ حسان کو کچھ نہیں ہو گا۔ اتنے سارے لوگ اس کے لیے دعائیں کر رہے ہیں اللہ کسی کی تو سنے گا۔ عثمان! تم بس حوصلہ کرو۔

میں نے نم آنکھوں کے ساتھ انہیں دیکھا اور ڈاکٹر حماد کے ساتھ چلتا ہوا آپریشن تھیٹر سے ملحق کمرے میں آیا۔ اپنی اونی کٹ لی اور لرزتے قدموں سے آپریشن تھیٹر میں داخل ہوا۔

وہ میرے سامنے تھا۔ پٹیوں میں جکڑا بے سدھ۔ ڈاکٹر فواد اس کا بی پی چیک کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ ایک طرف ہو گئے۔ میں نے جھک کر اسے دیکھا، اس کی مسکراتی آنکھیں بند تھیں۔

''آپریشن کی تیاری کریں ڈاکٹر فواد۔''

میری آواز کانپ گئی۔

''سب تیار ہے سر! صرف آپ کا انتظار ہے۔''

ڈاکٹر فواد مستعد ہو گیا تھا۔ اس نے ڈاکٹر حماد کو اشارہ کیا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد حسان کو آپریشن ٹیبل پر منتقل کر دیا گیا۔ میں ایک طرف سر تھامے بیٹھا خود کو کمپوز کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''سر......''

ڈاکٹر فواد نے پکارا تو میں چونک اٹھا۔ اب میں آپریشن ٹیبل کے قریب کھڑا تھا اور اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کا رنگ خطرناک حد تک سفید ہو رہا تھا اور اس کی نبض ہولے ہولے چلتی تھی یکایک اس کا چہرا فاطمہ کے چہرے میں بدل گیا تھا۔

میو ہسپتال کے آئی سی یو میں آنکھیں موندے بے سدھ پڑی فاطمہ عمر...... کیا یہ مکافات عمل ہے۔ میرے اندر سے ایک آواز آئی اور میں کانپ اٹھا۔

میں نے جھک کر اس کی پیشانی چومی اور تیزی سے باہر نکل آیا۔

''پپا...... میں نہیں کر سکتا...... نہیں کر سکتا۔''

میں پپا کے گلے لگ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

''وہ میرا بیٹا ہے۔ میرے ہاتھ کانپ جائیں گے، میں......'' پپا بھی رو رہے تھے۔ سلیمان بھائی نے مجھے پپا سے الگ کیا اور ڈاکٹر حماد کی طرف دیکھا۔

''ڈاکٹر حماد! آپ اور ڈاکٹر فواد اتنے عرصے سے سلیمان کو اسسٹ کر رہے ہیں، کیا آپ دونوں مل کر آپریشن نہیں کر سکتے۔''

''ہم...... بہت نازک آپریشن ہے۔ لیکن ہاں ایک شخص کر سکتا ہے یہ آپریشن۔''

ڈاکٹر حماد کو اچانک خیال آیا تھا۔

''چند سال ہوئے ہیں امریکا سے آئے ہیں۔ بہت ماہر ہیں۔ ڈاکٹر عثمان کے بعد اب انہی کا نام لیا جا رہا ہے۔''

''تو پلیز کال کروا نہیں۔ بلاؤ جیسے بھی ممکن ہو۔ جتنی بھی فیس ہو جو بھی مانگیں۔'' میں نے ڈاکٹر حماد کی منت کی۔

''میں رابطہ کرتا ہوں۔ میرا ایک کزن ان کے ساتھ ہی کام کرتا ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں۔''

اور میں ایک بار پھر آپریشن تھیٹر میں آ گیا تھا۔ اور ٹیبل کے پاس کھڑا ہو کر اسے دیکھنے لگا تھا۔ قطرہ قطرہ بلڈ اس کی رگوں میں جا رہا تھا۔ اس کے پاس کھڑا سوچ رہا تھا۔ کیا میں اسے یوں ہی موت کے منہ میں جاتے دیکھتا رہوں گا۔

سر میں انٹرنل بلیڈنگ ہو رہی ہے۔''

میرے کانوں میں ڈاکٹر فواد کی آواز آئی تھی۔

''ڈاکٹر فواد!'' میں نے تھکی تھکی آواز میں کہا۔

''کم آن...... وہ نائف مجھے دو۔''

میں نے ٹرے میں پڑے سرجیکل آلات کی طرف دیکھا۔

''سر! ڈاکٹر ملک سے رابطہ ہو گیا ہے، وہ پندرہ منٹ میں پہنچ رہے ہیں۔''

ڈاکٹر حماد نے کہا تو میں نے جانے کب کی رکی ہوئی سانس بر آمد کی اور حسان کی نبض پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور پتا نہیں کتنی ہی دیر تک یوں ہی کھڑا رہا۔ مجھے وقت کا اندازہ نہیں تھا جب ڈاکٹر حماد کے ساتھ ڈاکٹر ملک اندر داخل ہوئے۔

وہ غور دیر جن تھے تو یقیناً میری ان سے کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں ملاقات ہوئی تو ہو گی لیکن Scrubs کی وجہ سے میں پہچان نہیں پایا تھا۔

"تھینک یو ڈاکٹر ملک، میں نے ہزاروں آپریشن کیے ہیں لیکن یہ میرا اکلوتا بیٹا ہے میں اس کا آپریشن کرنے سے قاصر ہوں۔"

"میں سب رپورٹس دیکھ چکا ہوں۔ مزید تاخیر سے پیشنٹ کی زندگی کو خطرہ ہے پلیز۔"

ڈاکٹر ملک کا لہجہ سپاٹ اور بے تاثر تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے مریضوں کے لواحقین کے ساتھ میرا ہوتا ہے۔

"ڈاکٹر فواد اور ڈاکٹر حماد آپ کو اسسٹ کریں گے۔" میں تیزی سے باہر نکل آیا تھا۔ سب ہی آپریشن تھیٹر کے باہر بیٹھے تھے۔

یہ ہما کا ہاسپٹل تھا یہاں اضافی کرسیاں رکھوا دی گئی تھیں۔ آپریشن تھیٹر کے باہر پیشنٹ (مریض) کے عزیز و اقارب کو دیکھ کر ہمیشہ مجھے غصہ آجاتا تھا لیکن آج اس وقت مجھے احساس ہو رہا تھا کہ وہ کون سا جذبہ تھا جس سے مجبور ہو کر وہ آپریشن تھیٹر کے باہر ہی کھڑے رہتے تھے۔

میں تھکا تھکا سا سلیمان بھائی کے پاس آکر بیٹھ گیا تھا۔ یہ کئی گھنٹوں پر مشتمل آپریشن تھا۔ ایک ایک لمحہ ایک ایک صدی کی طرح گزر رہا تھا۔ مما، ہما، بھابھی اور بچیاں نماز والے ہال میں چلی گئی تھیں اور نفل پڑھ کر، سجدے میں گر کر اس کی زندگی کے لیے دعا مانگ رہی تھیں۔ پپا اور سلیمان بھائی کے لب بھی مسلسل ہل رہے تھے۔ مدیحہ کبھی ہال میں چلی جاتی، کبھی بے چین سی ہو کر ہمارے پاس آکر بیٹھ جاتی تھی۔

پھر ایک طویل تھکا دینے والے انتظار کے بعد آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر ملک باہر آیا۔ میں اور سلیمان بھائی تیزی سے اس کی طرف بڑھے پپا بھی کھڑے ہو گئے تھے۔

"اللہ کا شکر ہے آپریشن کامیاب رہا ــــ مریض کو ابھی کچھ دیر تک آئی سی یو میں منتقل کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر حماد اور ڈاکٹر فواد اس کو آبزرو ــــ کر رہے ہیں۔"

"تھینک یو ڈاکٹر۔" میری آواز بھرا گئی تھی۔

"ڈاکٹر عبدالرافع!" اس نے سرجیکل ماسک اتارا، نام سن کر میں چونکا تھا اور پھر میں نے اسے پہچان لیا۔ ہاں وہ وہی تھا۔

"آپ کو شاید عبدالرافع یاد ہو گا۔ ایک لڑکی ہوتی تھی فاطمہ عمر...... آپ کی کلاس فیلو وہ میری کزن اور منکوحہ تھی۔"

"ہاں تھی۔"

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کہوں وہ کیا کہنا چاہتا تھا ظاہر ہے اسے کیا خبر۔ میرے اور عزیز کے علاوہ بھلا کسی کو کیا خبر لیکن دوسرے ہی لمحے میری خوش فہمی کا محل زمین بوس ہو گیا ہے۔

"بلکہ ضرور یاد ہو گا کوئی قاتل اپنے مقتول کو کیسے بھول سکتا ہے۔" میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"تم نے بہت ظلم کیا عثمان پراچہ! تم نے ہمارے گھرانے میں خزائیں بھر دیں۔ تم فاطمہ کے ہی نہیں پچا اور آپا کے بھی قاتل ہو۔ میں نے برسوں سوچا کہ تم سے اپنے خاندان کی تباہی کا کیسے انتقام لوں۔ میرے پچا نے مجھ سے کہا تھا۔

"جزا و سزا تو اللہ کے ہاتھ میں ہے ہم بندے کون ہوتے ہیں کسی کو اس کے گناہ کی سزا دینے والے۔ تم بھی اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دو۔ اور یقین رکھو اللہ سے بہتر انصاف کرنے والا کوئی نہیں ہے۔"

اور میں نے اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا اور مطمئن ہو گیا۔

"میرا بیٹا...... اوہ...... تم نے اسے مار ڈالا۔"

مجھے لگا تھا جیسے میرا دل پھٹ جائے گا۔

"بے فکر رہو عثمان پراچہ! میں تمہاری طرح شقی القلب نہیں ہوں۔ میں نے اپنا کام پوری ایمان داری سے کیا ہے۔ دوا میں نے کر دی ہے دعا تم کرو۔ تمہارا بیٹا بہت پیارا بچہ ہے۔ ایسے لوگوں کو زندہ رہنا چاہیے۔ کاش وہ تمہارا بیٹا نہ ہوتا۔"

میں نے اس ــ کی آخری بات سمجھنے کی کوشش کی لیکن

سمجھ نہ پایا۔ وہ سلیمان بھائی کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

"میں نے ڈاکٹر فواد کو سب کچھ سمجھا دیا ہے۔ وہ مجھے ہر گھنٹے بعد رپورٹ دیں گے۔ کسی ایمرجنسی کی صورت میں وہ مجھے کال کریں گے۔

میں کل صبح آکر پھر چیک کرلوں گا۔ بہر حال اگلے اڑتالیس گھنٹے مشکل ہیں۔"

اس نے سلیمان بھائی کا دیا ہوا چیک واپس کردیا تھا اور تیزی سے آگے بڑھا تھا۔ میں تو جیسے کھڑے کھڑے پتھر کے مجسمے میں ڈھل گیا تھا۔ مدیحہ روتی ہوئی اس کے پیچھے بھاگی تھی۔

"رافع بھائی...... رافع بھائی......"

مجھے لگا میں گر جاؤں گا۔ سلیمان بھائی نے سہارا دے کر مجھے بٹھایا۔ ان کی نظروں میں ملامت تھی لیکن انہوں نے زبان سے کچھ نہیں کہا تھا۔ بابا جیسے حیران سے تھے۔ اور میں ندامت سے زمین میں گڑا جاتا تھا۔

"وہ میں...... میں ذرا حسان کو دیکھ لوں پتا نہیں...... پتا نہیں وہ اس نے کیا کیا اس کے ساتھ۔"

میں کچھ بے ربط سا بولتا ہوا تیزی سے آپریشن تھیٹر کی طرف بڑھ گیا تھا۔ ابھی میں نے سرجیکل گاؤن اٹھایا ہی تھا کہ ڈاکٹر فواد آپریشن تھیٹر سے باہر آئے۔ اور اپنا سرجیکل ماسک، اور گاؤن اتار کر اپنے ہیلپر لڑکے کو پکڑایا۔

"مبارک ہو ڈاکٹر عثمان! آپریشن کامیاب رہا ہے۔ حیرت انگیز مہارت کے ساتھ ڈاکٹر رافع نے آپریٹ کیا۔ اگر مجھے علم نہ ہوتا کہ یہ ڈاکٹر رافع ہیں تو میں سمجھتا کہ آپ ہیں۔ وہی مہارت وہی پھرتی۔"

"میں حسان کو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

میں نے ڈاکٹر فواد کی طرف دیکھا۔

"اسے آئی سی یو میں شفٹ کیا جارہا ہے، آپ ادھر ہی چلیں۔" میں نے ایک اطمینان بھری سانس لی تھی۔

"وہ ڈاکٹر عبدالرافع تھا عثمان پراچہ نہیں جو وہ حسان کو نقصان پہنچاتا۔"

میرے ضمیر نے مجھے پھر کچوکا دیا تھا۔ ہاں وہ عبدالرافع ہی تھا عثمان پراچہ نہیں تھا۔ ورنہ اگلے دس دن مسلسل حسان کو دیکھنے نہ آتا۔ میں اس سے معافی مانگنا چاہتا تھا اور اسے بتانا چاہتا تھا کہ میں نے ایسا نہیں چاہا تھا کہ وہ یوں زندگی ہار جائے۔ لیکن جو میں نے چاہا تھا کیا وہ صحیح تھا۔ میرے ضمیر نے پھر مجھے کچوکا دیا تھا۔

اور میں عبدالرافع کا سامنا ہی نہ کرسکا۔ اور اگر کبھی اتفاق بھی ہوا کہ وہ میری موجودگی میں حسان کو دیکھنے آیا تو اس نے بس ایک اجنبی سی نظر مجھ پر ڈالی فائل دیکھی۔ حسان کو چیک کیا، کوئی دوائی لکھی کوئی تبدیل کی۔ ڈیوٹی پر موجود نرس کو ہدایات دیں اور نکل گیا۔ میرا سر جھکا ہی رہتا۔

اور اب میرا سر جھکا ہی رہتا تھا۔ عبدالرافع کے سامنے ہی نہیں بابا اور سلیمان بھائی کے سامنے بھی۔ ہاں مدیحہ بھی تو تھی وہاں میں ان سب سے نظر ملا کر بات نہیں کرسکوں گا۔ عبدالرافع نے اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا تھا اور اللہ بہتر انصاف کرنے والا ہے۔ عبدالرافع نے کہا تھا سزا و جزا کا اختیار تو اللہ کو ہے اور اللہ نے مجھے سزا دے دی تھی میں ہی نہیں سمجھا تھا۔

میں نے زندگی میں اتنی کامیابیاں حاصل کیں لیکن کبھی جی بھر کر خوش نہیں ہوسکا تھا۔ ہر کامیابی پر فاطمہ عمر کا چہرہ آنکھوں کے سامنے آجاتا اور میری کامیابی کی خوشی مرجاتی میرے کانوں میں بین کی آوازیں آنے لگتیں۔

میں عکس ہما کو خوش نہیں رکھ سکا۔ حالانکہ میں سمجھتا تھا کہ بھلا اس سے زیادہ خوش قسمت کون ہوسکتا ہے کہ وہ عثمان پراچہ کی بیوی ہے۔ لیکن وہ خود کو خوش قسمت نہیں سمجھتی تھی کہ سمجھوتے کی زندگی ایک بوجھ جیسی ہوتی ہے اور یہ بوجھ سزا ہی تو تھا میرے لیے۔"

☆☆☆

لیکن اس سے بڑی اذیت اس سے بڑی سزا حسان کی آنکھوں کی شکایت اجنبیت اور اذیت تھی۔ اس روز وہ گھر پر ہی تھا۔ میں نے دیکھا وہ ہما کی گود

میں سر رکھ کر لیٹا ہوا تھا اور ہما اس کے بالوں میں دھیرے دھیرے انگلیاں پھیر رہی تھی۔

"کیسا ہے میرا بیٹا!" میں خوش دلی سے کہتا ہوا اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔

"اب جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔ کمزور ہو گئے ہو۔ کھاؤ پیو، صحت بناؤ تو ہم تمہاری ہونے والی سسرال چلیں۔"

"وہ چیپٹر کلوز ہو گیا پاپا!" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

"ارے بھئی کیوں؟" "وہ ڈاکٹر عبدالرافع کی بیٹی ہے۔"

وہ یک دم اٹھا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

کیا خوب انصاف کیا تھا اللہ نے۔ مجھے ساری زندگی اپنے بیٹے کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت دیکھنی تھی۔

وہ بیٹا جو اکلوتا تھا۔

جس کے پاؤں میں کبھی کانٹا بھی چبھنے نہ دیا تھا اب ساری زندگی اسے نارسائی کا کرب سہتے دیکھنا تھا۔

یہ میری سزا تھی...... اور مجھے اسے برداشت کرنا تھا۔ آخری سانسوں تک۔

☆☆☆

میں اسے کبھی بھی بھول نہیں پایا۔ وہ مجھے ہمیشہ یاد رہتی ہے۔ میں اسے کبھی بھلا ہی نہیں سکتا۔ اڑتیس سال پہلے جب میں نے اسے کے ای کے گیٹ کے پاس چھوڑا تھا تو وہ کچھ گھبرائی ہوئی سی تھی لیکن اس کی آنکھیں ہمیشہ کی طرح بہت روشن اور چمک دار لگ رہی تھیں جیسے ان میں کسی نے ستارے کوٹ کوٹ کر بھر دیے ہوں۔ ان آنکھوں میں مستقبل کے خواب تھے۔ امیدیں تھیں یقین تھا۔

"پریشان مت ہونا کوئی مسئلہ ہو تو مجھے ہاسٹل کے نمبر پر کال کر لینا میں آجاؤں گا۔ نمبر ہے نا تمہارے پاس۔"

وہ سر ہلاتے ہوئے مدھم سا مسکرائی تھی اور میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے یقین دلایا تھا کہ میں ہوں نا اس کا محافظ لیکن میں اس کی حفاظت نہ کر سکا۔ مجھے کیا خبر تھی یہ شہر اس کی جان لے لے گا۔

مجھے خبر ہوتی کہ یہاں قاتل گھات لگائے بیٹھا ہے تو میں کبھی اسے یہاں چھوڑ کر نہ جاتا۔ لیکن میں اسے یہاں چھوڑ کر چلا گیا۔

اسے فاطمہ عمر کو...... وہ فاطمہ عمر تھی میرے چچا ملک عمر اعوان کی بیٹی اور جس سے بعد میں میرا نکاح ہوا تھا۔ وہ میرے نکاح میں تھی اور اس کی حفاظت کرنا اسے ہر ہواؤں سے بچانا میرا فرض تھا۔ نکاح تو بعد میں ہوا تھا لیکن میں بہت چھوٹی عمر سے ہی اس کا محافظ بن گیا تھا۔ اماں کہتیں۔

"دیکھو عبدالرافع! میں کام سے جا رہی ہوں تم فاطمہ کا خیال رکھنا۔ کہیں ادھر ادھر نہ نکل جائے۔"

اور میں کھیل چھوڑ کر اس کے پاس آ بیٹھتا۔

آمنہ آپا بھی اکثر مجھے یہی کہتیں کہ میں اس کا خیال رکھا کروں۔ آمنہ آپا مجھ سے صرف ایک سال بڑی تھیں لیکن میں انہیں آپا ہی کہتا تھا۔ اور تب مجھے احساس ہوتا تھا کہ باقی سب تو اپنا خیال رکھ سکتے ہیں لیکن فاطمہ نہیں۔ اس لیے مجھے ہمیشہ اس کا خیال رکھنا ہے اور اس کی حفاظت کرنی ہے۔

جب سے چاچی فوت ہوئی تھیں وہ اکثر چپکے سے گھر سے نکل کر قبرستان پہنچ جاتی تھی اور گھنٹوں قبر کے پاس بیٹھی رہتی تھی۔ پھر جب وہ بڑی ہوئی اور اس کی آنکھوں میں خوابوں نے رنگ بھرنے شروع کیے تو اماں آپا چاچا جی اور میں ہم سب ہی ان خوابوں کی تعبیر پانے کی دعائیں کرنے لگے تھے۔

وہ جب سگریٹ کی خالی ڈبیا میں جھاڑو کے تنکے اور روئی رکھ کر۔ چھوٹی چھوٹی خالی شیشیوں میں پانی ڈال کر اپنی سہیلیوں کو جھوٹ موٹ کے انجکشن لگاتی تو آپا کی آنکھیں چمکنے لگتی تھیں۔

"عبدالرافع! ہم اپنی فاطمہ کو ڈاکٹر بنائیں گے۔"

"تو میں بھی ڈاکٹر ہی بنوں گا۔" میں نے بھی دل میں فیصلہ کرلیا تھا کہ آخر مجھے اس کی حفاظت جو کرنی تھی لیکن مجھے کیا خبر تھی کہ اسے خود اپنے ہاتھوں مقتل میں چھوڑے جارہوں جہاں ایک درندہ چھپا بیٹھا تھا۔

وہ رات! میں اس رات کو کبھی بھول نہیں سکتا۔ وہ کیسی اذیت ناک رات تھی۔ میں چاچا جی کا چیک اپ کروا کے اسی وقت آیا تھا اور آپا سے کہہ رہا تھا کہ میں کھانا باہر سے لے کر آؤں گا آپ چائے بنالیں۔ چائے کا سامان میرے کچن میں تھا کھانا البتہ میں باہر سے ہی کھاتا تھا۔

میں آپا کے ساتھ کچن کی طرف ہی جارہا تھا کہ فون کی بیل ہوئی۔ میں نے مڑ کر لاؤنج میں پڑے فون کا ریسیور اٹھایا تھا۔ "یہ میں ہوں عبدالرافع!"

وہ فاطمہ تھی اور بری طرح رو رہی تھی۔

"میں ...... یہاں ہوں تھانے میں مجھے لے جائیں۔"

"کہاں تھانے؟"

مجھے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا تھا۔ کیا واقعی اس نے تھانے کہا تھا۔

"سنو تم یہ ایڈریس سمجھ کر فوراً تھانے آجاؤ، باقی تفصیل یہاں آکر جان لینا۔"

ریسیور کسی اور نے اس کے ہاتھ سے لیا تھا۔ میں نے ایڈریس سمجھا اور آپا کی طرف دیکھا۔

"آپا میں آرہا ہوں ابھی۔ آپ چائے بنا کر چاچا کو دے دیں۔" اور پھر مجھے نہیں یاد کہ میں کیسے وہاں پہنچا تھا۔ وہ ایک کرسی پر سہمی ہوئی بیٹھی تھی اور اس کی آنکھیں شدت گریہ سے سوجی ہوئی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی وہ تیزی سے میرے قریب آئی اور میرے بازو کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"عبدالرافع!"

اور پھر وہ رونے لگی۔ میں نے اس کا بازو تھپتھپایا اور ایس ایچ او کی طرف دیکھا جو مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔

"تم ملک عمر کے بھتیجے ہو نا بشر بھائی کے بیٹے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"میں شفیق احمد ہوں۔ تمہارے ہی گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ ملک صاحب میرے استاد تھے۔ انہیں میرا اسلام کہنا اور بچی کو لے جاؤ۔"

"لیکن یہ یہاں کیسے؟" میں الجھا ہوا تھا تب اس نے نرمی سے ساری بات بتائی تو میرا خون کھول اٹھا تھا۔

"کون لوگ ہیں وہ ...... وہ فلیٹ کہاں تھا؟ آپ کے بندے جو وہاں گئے تھے وہ جانتے ہوں گے، میں ان کے خلاف ایف آئی آر کٹواؤں گا۔ میں انہیں سزا دلواؤں گا ایسے کیسے۔"

شفیق احمد جو تھوڑی سی آنکھیں میچے مجھے دیکھ رہے تھے نرمی سے بولے۔

"اس بات کو یہاں ہی بھلا دو برخوردار! اللہ نے عزت بچالی۔ کیچڑ میں پتھر مارو گے تو اپنے ہی کپڑوں پر چھینٹے پڑیں گے۔ معاملہ بڑھے گا۔ اخباروں کی زینت بنے گا تو۔"

انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

"یاد رکھو، اللہ تعالیٰ ظالموں کو معاف نہیں کرتا۔ اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دو۔"

انہوں نے اٹھ کر فاطمہ کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔

"جب وہ اسے لائے تاکہ آج رات حوالات میں رکھ کر کل صبح اس کے عزیزوں کو بلا کر ان کے حوالے کیا جائے تو مجھے یہ لڑکی بہت معصوم لگی مجھے اپنی بیٹی یاد آگئی اور جب اس نے اپنے گاؤں اور والد کا نام بتایا تو میں نے ان دونوں کو ڈانٹ کر باہر بھیجا۔"

"یہ تو میرے استاد کی میرے گاؤں کی بیٹی تھی میری عزت تھی۔ بھول جانا سب اس رات کو اور اس واقعے کو اور کسی سے ذکر بھی نہ کرنا۔"

ایک بار پھر شفیق احمد نے تاکید کی تھی اور میں فاطمہ کو لے کر گھر آگیا تھا۔ وہ قیامت کی رات تھی۔ میرے اندر آگ لگی تھی۔ میں تڑپتا تھا کہ کیسے کس طرح ان ظالموں سے بدلہ لوں۔ پتا نہیں وہ کون تھے

جنہوں نے فاطمہ کو اغوا کیا تھا اور کیا مقصد تھا ان کا۔

مجھ سے فاطمہ کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی تھی۔ وہ آپا کی گود میں سر رکھے روئے جاتی تھی میں نے اپنی تب تک کی زندگی میں اسے اس طرح روتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بہت تکلیف میں تھی اور میں...... میں بھی بہت تکلیف میں تھا۔

"فاطمہ! یاد کرو ذہن پر زور دو۔"

میں آپا کے پاس ہی نیچے بیٹھ گیا تھا۔ لاؤنج کا کارپٹ اور بیڈ اور کرسیاں وغیرہ میں نیلام سے خرید کر لایا تھا۔ فی الحال یہاں اور کوئی فرنیچر نہیں تھا۔ آپا کارپٹ پر بیٹھی تھیں اور فاطمہ کا سر ان کی گود میں تھا۔

"کوئی بات یاد کرو جس سے اندازہ لگایا جا سکے کہ وہ کون تھا یا تھے میں انہیں چھوڑوں گا نہیں مار کر زمین میں گاڑ دوں گا۔"

فاطمہ اور شدت سے رونے لگی تھی اور چچا کرسی سے اٹھ کر میرے قریب آئے تھے۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

"عبدالرافع بس اٹھو اور شکرانے کے دو نفل پڑھو کہ اللہ نے کرم کیا۔ سوچو اگر وہاں شفیق نہ ہوتا، اگر اسے حوالات میں رہنا پڑتا تو اس سے بھی برا ہو سکتا تھا۔ یہ بدلہ لینے کا خیال دل سے نکال دو۔ اور بھول جاؤ جو ہوا۔"

میں خاموشی سے کھڑا ہو گیا تھا۔ لیکن میرے اندر تو آتش فشاں ابل رہا تھا۔ بمشکل میں نے خود کو سنبھالا اور باہر سے نان اور چکن پیس لے کر آیا کہ یہ میرے فلیٹ کے بالکل سامنے ہی ملتے تھے لیکن کسی سے کچھ نہیں کھایا گیا تھا۔

سب نے ایک ایک دو دو لقمے ہی لیے تھے۔ میں نے فاطمہ کو نیند کی گولی کھلا دی تھی۔ اور چاچی کو بھی سکون کی ٹیبلٹ دے دی تھی لیکن خود میری ساری رات بے سکون تھی۔ میں لاؤنج میں ہی کارپٹ پر تکیہ رکھ کر لیٹا رہا تھا۔ صبح کے وقت کہیں آنکھ لگی تھی۔ پھر آپا نے ہی مجھے جگایا تھا۔

"عبدالرافع! اٹھو، اندر جا کر بیڈ پر سو جاؤ۔ میں اتنے میں ناشتہ بناتی ہوں۔"

"نہیں، میں ناشتہ باہر سے لے آتا ہوں۔"

میں اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

"انڈے رکھے تھے۔ میں نے خاگینہ بنالیا ہے۔ رات کے نان ہیں، وہ گرم کر لیں گے اور چائے کا پانی رکھ دیا ہے۔" آپا کچن میں چلی گئیں۔

میں نے دیکھا۔ فاطمہ سامنے کرسی پر بیٹھی تھی اور رات کے مقابلے میں کچھ پرسکون اور پراعتماد لگ رہی تھی مجھے اطمینان ہوا تھا۔

"ڈاکٹر نے ابا کے متعلق کیا کہا؟"

مجھے اپنی طرف دیکھتا پا کر اس نے پوچھا تھا۔

"ابھی تو ٹیسٹ ہوئے ہیں۔ ان کی رپورٹ کل ملے گی۔ الٹرا ساؤنڈ بھی ہو گیا ہے۔ ہو سکتا ہے ایڈمٹ کروانا پڑے اور ہو سکتا ہے کچھ دوائیاں وغیرہ دے دیں۔ انفیکشن کافی ہے۔"

فاطمہ کو بتا کر۔ میں فریش ہونے چلا گیا۔ واپس آیا تو فاطمہ نے کرسیاں آمنے سامنے لگا کر سینٹر ٹیبل پر ناشتہ لگا دیا تھا۔

آپا بھی چائے لے کر آ گئیں تو میں ناشتہ کر کے میٹرس لینے نکل گیا تھا کہ میرے پاس دو سنگل بیڈ تھے اور پتا نہیں ابھی آپا اور چاچا نے کتنے دن رہنا تھا۔ پھر فاطمہ بھی تھی۔

میں نے سوچا تھا کہ فاطمہ جب تک یہاں ہے میں اسے خود چھوڑنے اور لینے جاؤں گا۔ بعد کے لیے بھی میں پلان بنا رہا تھا لیکن انسان کی پلاننگ دھری کی دھری رہ جاتی ہے اور وہ ہو جاتا ہے جس کے متعلق کبھی سوچا بھی نہیں ہوتا۔

میرے واپس آنے تک آپا نے فاطمہ کے ساتھ مل کر سارا گھر صاف کر دیا تھا میں آتے ہوئے کھانا بھی لے آیا تھا۔

میں میٹرس لاؤنج میں رکھوا کے اور کھانا آپا کے حوالے کر کے بیڈ روم میں آ کر لیٹ گیا تھا اور آپا سے میں نے کہہ دیا تھا کہ اگر میں سو گیا تو کھانے

کے لیے مت جگایے گا۔ آپ لوگ کھالینا۔"
میں بیڈروم میں لیٹا سوچتا رہا۔ کبھی سوچتا فاطمہ کی رخصتی کروا کے یہاں لے آؤں اس کے آنے جانے کی اور سب ذمہ داریاں سنبھال لوں۔ کبھی سوچتا کسی طرح اس شخص کا پتا مل جائے جو اس سارے قصے کا ماسٹر مائنڈ تھا تو اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دوں۔

پتا نہیں کیا ممکن تھا اور کیا نہیں لیکن میں سوچتا رہا۔ پلان بناتا اور رد کرتا رہا اور یوں ہی اتوار کا دن گزر گیا۔

رات کو فاطمہ صبح کے مقابلے میں کچھ اور بہتر ہوگئی تھی۔ اور اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے بے ہوش ہونے سے پہلے جو آواز سنی تھی وہ اسے مانوس سی لگی تھی لیکن وہ کس کی آواز تھی یہ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

"اس کا مطلب ہے وہ جو بھی تھا اس کا تعلق تمہاری یونی سے ہے۔" میں نے اندازہ لگایا تھا۔

"پتا نہیں۔" وہ الجھ گئی تھی۔ "بھلا وہاں کوئی میرے ساتھ ایسا کیوں کرے گا۔ ہوسکتا ہے مجھے غلط فہمی ہوئی ہو۔"

"او کے، پریشان مت کرو خود کو۔ سب کلیئر ہوجائے تو پھر دیکھتے ہیں۔ میرا ارادہ ہے کہ فارغ ہو کر میں ان دو پولیس والوں سے ملوں اور......"

"پلیز...... نہیں۔" فاطمہ نے بے اختیار میرے بازو پر ہاتھ رکھا تھا۔

"ابا نے رات کیا کہا تھا۔ بات بڑھے گی تو میں ہی بدنام ہوں گی اور بدنامی کے بعد میں جی نہیں پاؤں گی۔"

"او کے ریلیکس۔"

میں نے اس کا ہاتھ تھپتھپایا تھا۔

"بے فکر ہو جاؤ کچھ نہیں کروں گا میں۔"

"پرامس۔" اس کی روشن آنکھیں آنسوؤں سے دھندلی ہو رہی تھیں اور میں فاطمہ کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"او کے...... پرامس۔"

لیکن جس بدنامی سے وہ ڈر رہی تھی وہ اس کے نصیب میں لکھی تھی۔ آپا نے اسے یونی جانے سے منع کیا تھا۔

"نہ جاؤ فاطمہ! میرا دل گھبرا رہا ہے۔"

"مدیحہ کو بتا کر اور سر حفیظ سے چھٹی لے کر آجاؤں گی آپا۔ جب تک آپ اور ابا یہاں ہیں میں ادھر آپ کے پاس ہی رہوں گی۔"

اس نے آپا کا بازو تھپتھپایا تھا اور ان سے دعائیں لے کر میرے ساتھ یونیورسٹی آئی تھی۔ میں نے اسے کے ای کے گیٹ پر چھوڑا تھا۔ اور کہا تھا کہ میں اسے خود لینے آؤں گا اگر لیٹ ہو جاؤ تو مدیحہ کو کہنا ہوسٹل ڈراپ کردے پھر وہاں سے میں تمہیں لے جاؤں گا۔"

اسے چھوڑ کر میں سروسز ہاسپٹل آیا تھا۔ مجھے چاچا جی کی رپورٹس لینی تھیں اور پھر ڈاکٹر ہمدانی کو دکھانی تھیں۔ میں ریسیپشن کے نزدیک ہی ڈاکٹر حماد سے چاچا کی رپورٹس ڈسکس کر رہا تھا کہ مس ستارہ نے مجھے آواز دی تھی۔

"ڈاکٹر رافع آپ کی کال۔" اور وہ عثمان پراچہ کی کال تھی۔

مجھے نہیں پتا میں کیسے حماد کے ساتھ گھر پہنچا تھا اور پھر حماد ہی ہمیں اپنی گاڑی میں میو ہسپتال لایا تھا۔ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا۔ وہاں مجھے اپنے ایک سینئر ڈاکٹر اقبال مل گئے تھے۔ جس کی وجہ سے کچھ سہولت ہوگئی تھی۔ وہ ہمت ہارے آنکھیں بند کیے پڑی تھی۔ ڈاکٹر اقبال کے کہنے پر اسے ایمرجنسی سے آئی سی یو میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ میں اس کے پاس ہی تھا جب اس نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا تھا۔ وہ لمحہ بھر مجھے دیکھتی رہی تھی۔

"وہ آواز عزیز کی تھی عبدالرافع اور وہ عثمان پراچہ کی تھی محض اک پوزیشن کے لیے کوئی کیسے اتنا گر سکتا ہے۔"

اس کی روشن آنکھیں بجھی جا رہی تھیں۔ میں

نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔
"آپا...... آپا۔" اس کے لبوں سے نکلا تھا اور پھر ہولے ہولے اس کی آنکھیں بند ہوگئی تھیں۔ آنکھوں کے کونوں میں ایک ننھا سا آنسو کا قطرہ ٹھہرا ہوا تھا جسے میں نے بائیں ہاتھ کی انگلی کی پور سے پونچھا۔
"فاطمہ......!" میں نے بے قراری سے اسے پکارا تھا۔ "فاطمہ!"
لیکن میرے ہاتھ میں اس کا ہاتھ ٹھنڈا ہو گیا تھا۔
"شی از نو مور۔"
ڈاکٹر اقبال نے میرے ہاتھ سے اس کا ہاتھ الگ کیا تھا۔
میری چیخیں اندر ہی گھٹ گئی تھیں۔ فاطمہ چلی گئی تھی اس نے کہا تھا وہ بدنامی کے بعد جی نہیں پائے گی مر جائے گی اور وہ مر گئی تھی۔ ایک شخص کے حسد نے اس کی زندگی چھین لی تھی وہ روشن آنکھوں والی بے حد ذہین فاطمہ جس کی ذہانت سے اماں اور آپا کو ڈر لگتا تھا کہ کہیں اسے نظر نہ لگ جائے اور اسے ایک بدنظر کی نظر لگ گئی تھی۔
جب اماں اس پر نظر کا دم پڑھ کر پھونکتیں تو وہ ہنستی، بھلا مجھ کالی کلوٹی کو کس کی نظر لگ سکتی ہے چاچی آپا کو دم کریں نا۔ کہیں میری پریوں جیسی آپا کو کسی کی نظر نہ لگ جائے۔"
اور نظر تو آپا کو بھی لگ گئی تھی کہ فاطمہ کے جانے کے چند دن بعد انہوں نے بھی رخت سفر باندھ لیا تھا۔ فاطمہ کے بعد وہ بالکل چپ ہوگئی تھیں۔ اتنی چپ اور خاموش کہ ان کی چپ سے خوف آتا تھا۔ اماں روتیں۔
"آمنہ! روتی کیوں نہیں ہو۔ جی بھر کر رو لو۔"
لیکن وہ تو بس خالی خالی نظروں سے سب کو تکتی تھیں۔
"آپا!"
اس رات میں ان کی چارپائی کے پاس زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھا تھا۔

"میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں۔ جس نے ہماری فاطمہ کو ناحق تکلیف دی میں اسے تڑپا تڑپا کر ماردوں گا۔ میں فاطمہ کے ایک ایک آنسو کا بدلہ لوں گا۔ آپ میرا یقین کریں آپا۔"
"عبدالرافع!" آپا نے میری طرف دیکھا اور پھر رو دی تھیں۔
فاطمہ کے جانے کے اتنے دنوں بعد وہ تڑپ تڑپ کر رو دی تھیں۔ چاچا کے گلے لگ کر اماں کے کندھے پر سر رکھ کر نامرو سے لپٹ کر وہ جانے کتنی دیر روتی رہی تھیں پھر اماں نے ہی انہیں سنبھالا تھا اور اس وقت تک ان کی چارپائی پر بیٹھی ان کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی تھیں جب تک وہ سو نہیں گئی تھیں۔
انہیں پتا ہوتا کہ یہ نیند موت کی نیند میں بدل جائے گی تو وہ کبھی ان کے پاس سے اٹھ کر نہ آتیں۔ لیکن انہیں کیا خبر تھی کہ صبح جب وہ انہیں اٹھانے جائیں گی تو وہ جاچکی ہوں گی اپنی فاطمہ کے پاس۔
ان کا دل تو ہمیشہ سے ہی کمزور تھا پھر اتنا بڑا دکھ کیسے سہارتا، رات کے نہ جانے کس پہر ساتھ چھوڑ گیا تھا اور انہیں خاک کے سپرد کرتے ہوئے ایک بار پھر میں نے عہد کیا تھا کہ میں فاطمہ اور آپا کی موت کا بدلہ لوں گا۔
میرے اندر بھانبڑ جلتے تھے۔ میں انتقام کی آگ میں جلتا تھا لیکن مجھے کوئی راہ سجھائی نہ دیتی تھی۔ دن رات منصوبے بناتا رد کرتا تھا۔
حماد میرا اچھا دوست تھا مجھے سمجھتا تھا کہ میرے پیشے میں غفلت معاف نہیں ہوتی اگر میری یہی حالت رہی تو میں کوئی ایسی غلطی کر بیٹھوں گا کہ جس پر ساری عمر پچھتانا پڑے گا۔
حماد صحیح کہتا تھا میں خود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا لیکن رات کو بستر پر کانٹے اگ آتے تھے۔ فاطمہ کے آنسو مجھے بے چین کرتے اور آمنہ آپا کا تڑپنا مجھے اپنے عہد میں مضبوط کرتا تھا۔ میں نے عثمان اور عزیز پر نظر رکھنی شروع کردی تھی اور اس مقصد کے لیے میں کبھی کبھی چھٹی کر لیتا تھا۔ اور جب ایک اتوار

میں گاؤں گیا۔ تو اماں نے مجھ سے کہا تھا۔
"عبدالرافع! فاطمہ اور آمنہ چلی گئیں۔ ہم لاکھ روئیں، چیخیں، ماتم کریں بین ڈالیں۔ وہ واپس نہیں آئیں گی۔ تم مرنے والوں کا دکھ سینے سے لگائے بیٹھے ہو اور جو زندہ ہیں انہیں بھول گئے ہو۔ اپنے چاچا کو دیکھو کیسے پیلے ہو رہے ہیں ان کا خیال کرو عبدالرافع۔"

اور میں چاچا کو لے کر لاہور آ گیا تھا وہ بہت اذیت اور تکلیف میں تھے۔ ڈاکٹرز نے ڈائلیسس تجویز کیے تھے۔ لیکن چاچا نے انکار کر دیا تھا۔

"مجھے گاؤں چھوڑ آؤ عبدالرافع!" وہ مجھ سے ناراض سے لگے تھے۔

"لیکن کیوں چاچا؟"

"بس نہیں کروانے مجھے۔"

"لیکن چاچا یہ ضروری ہے اب!" میں نے سمجھایا تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے پہلے وعدہ کرو کہ یہ جو اپنے اندر آگ بھڑکائے پھرتا ہے، اسے بجھا دے گا۔ تم اب آخری سہارا ہو عبدالرافع! اپنی ماں اور بہنوں کا خیال کرو جن کا تمہارے سوا کوئی نہیں ہے۔ میں تو چراغ سحری ہوں بیٹا۔ تم یہ بدلہ لینے کا خیال دل سے نکال دو۔"

"لیکن چاچا وہ جنہوں نے اتنا ظلم کیا انہیں کوئی سزا نہ دوں۔"

"تم کون ہوتے ہو سزا دینے والے۔"

چاچا کو شاید غصہ آ گیا تھا یا مجھے لگا تھا۔

"سزا و جزا کا اختیار تو اللہ کے پاس ہے۔ تم اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دو۔ اللہ ناانصافی نہیں کرتا عبدالرافع! وہ ظالم کو اس کے کیے کی سزا ضرور دیتا ہے۔"

پہلے شفیق احمد نے یہ ہی بات کہی تھی اور آج چاچا کہہ رہے تھے کہ میں اللہ پر چھوڑ دوں سب کچھ۔

"لیکن میں...... میں کیسے فاطمہ کے قاتل کو بخش دوں۔"

"معاف کر دو میں ہاتھ جوڑتا ہوں عبدالرافع۔ انتقام اور سزا دینے کا خیال دل سے نکال دو۔ تم ہمارے خاندان کے واحد مرد ہو عبدالرافع تمہیں کچھ ہو گیا تو......"

انہوں نے ہاتھ باندھے تو میں تڑپ اٹھا تھا۔

"ایسا مت کریں چاچا!" میں ان کے ہاتھ تھام کر ان پر چہرہ رکھ کر رو پڑا تھا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں چاچا کچھ نہیں کروں گا اور میں نے اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کیا۔"

اور مجھ سے وعدہ لے کر مجھے پابند کر کے وہ بھی اپنی بیٹیوں کے پاس چلے گئے تھے۔ مجھے خود کو سنبھالنے میں وقت لگا تھا۔ لیکن پھر بھی مجھے لگتا تھا کہ اگر میں یہاں رہا تو وعدہ توڑ بیٹھوں گا۔

اور میں پارٹ ون کے بعد کوشش کر کے امریکا چلا گیا اور ہمیشہ کی طرح مختلف اسکالرشپ اپلائی کرتا اپنا تعلیمی سفر طے کرتا رہا۔ کچھ عرصہ بعد میں نے جاب بھی کر لی اور پڑھائی کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

اس دوران پاکستان بھی آتا جاتا رہا۔ پہلے ناصرہ کی شادی پر جو فاطمہ کی خالہ کے دوسرے بیٹے سے ہوئی تھی اور پھر چھوٹی فرح کی شادی پر۔ فرح کی شادی کے بعد میں اماں کو ساتھ ہی لے گیا تھا وہ چاہتی تھیں کہ میں بھی اب شادی کر لوں۔ جب ان کا اصرار بڑھا تو میں نے نازیہ کا نام لے دیا کہ اگر اب تک اس کی شادی نہ ہوئی ہو تو وہ ورنہ جہاں ان کا دل چاہے کر دیں کہ میں اماں کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا ورنہ میں ابھی تک فاطمہ کی محبت کے حصار سے نہیں نکلا تھا۔

نازیہ مجھے ناصرہ کی شادی پر ملی تھی اور فاطمہ کو یاد کر کے بہت دیر تک روتی رہی تھی۔ فاطمہ اس کی اسکول کے زمانے سے ہی دوست تھی۔ ہمارا غم سانجھا تھا اور وقت نے ثابت کر دیا تھا۔ کہ میرا فیصلہ غلط نہیں تھا۔ ہم نے کئی راتیں جاگ کر اسے یاد کیا۔ اس نے میرے اور میں نے اس کے آنسو پونچھے تھے۔

ہم اکثر ایک دوسرے سے اس کی باتیں کرتے

تھے۔اس کی چھوٹی چھوٹی باتیں جو ان کے درمیان ہوتی تھیں وہ مجھے بتاتی تھی اور میں اس کے بچپن کی باتیں اسے بتاتا تھا۔اللہ نے مجھے دو بیٹے اور ایک بیٹی دی تھی۔نازیہ نے اس کا نام مدیحہ رکھا تھا۔

مدیحہ نے ایک بار کہا تھا کہ اگر اس کی بیٹی ہوئی تو وہ اس کا نام فاطمہ رکھے گی اور فاطمہ ہنس پڑی تھی۔

"پر اس میری بیٹی ہوئی تو میں بھی اس کا نام مدیحہ رکھوں گی۔"

تو نازیہ نے بیٹی کا نام مدیحہ رکھا تھا اور جب سے مدیحہ پیدا ہوئی تھی اماں اصرار کرنے لگی تھیں کہ۔

"ہم اب پاکستان میں رہیں بھلے گاؤں میں نہ سہی لیکن پاکستان میں۔"

"یہ معاشرہ اور تہذیب ہماری نہیں ہے عبدالرافع! کیا بیٹی کو اس معاشرے میں پروان چڑھاؤ گے۔"

وہ شاید سچ کہتی تھیں۔گھر پر دینی تعلیم کا مکمل انتظام کرنے کے باوجود نازیہ بھی یہ ہی سمجھتی تھی کہ بیٹی کی پیدائش کے بعد ہمیں پاکستان چلے جانا چاہیے لیکن مجھے لگتا تھا میں پاکستان آیا تو پاگل ہو جاؤں گا۔ میں خود کو روک نہیں پاؤں گا اور چاچا سے کیا وعدہ ٹوٹ جائے گا۔

عثمان کا اور میرا شعبہ ایک ہی تھا۔سو مجھ تک اس کی کامیابی کی خبریں اخبارات سے نیٹ سے کہیں نہ کہیں سے پہنچ ہی جاتی تھی اور میرا خون کھولتا تھا۔ لیکن پرسکون تو میں یہاں بھی نہیں تھا راتوں کو اٹھ کر بیٹھ جاتا تھا اور میری آنکھوں کے سامنے فاطمہ آ جاتی، کبھی آنسو بھری آنکھوں سے مجھے دیکھتی کبھی آپا کی گود میں سر رکھے روتی ہوئی اور کبھی آئی سی یو میں بے بسی سے مجھے تکتی ہوئی۔اور میں رو پڑتا۔

"نازیہ میں شاید آخری سانس تک یوں ہی بے سکون رہوں گا جب تک فاطمہ کے مجرموں کو سزا نہیں مل جاتی تب تک، کاش چاچا مجھے یوں وعدے کی زنجیر میں نہ باندھتے۔"

"اللہ پر بھروسہ رکھیں عبدالرافع!"

نازیہ میرے آنسو پونچھتی مجھے تسلی دیتی لیکن شاید اللہ پر میرے ایمان اور یقین میں وہ پختگی نہیں تھی جو مجھے بے فکر کر دیتی۔

لیکن اس روز... جب میں نے نیو یارک کے ایک ہاسپٹل کے کارڈیالوجی وارڈ کے باہر عزیز کو دیکھا تو اسے پہچاننے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی تھی میں وہاں اپنے ایک ساتھی ڈاکٹر کے والد کی مزاج پرسی کے لیے آیا تھا۔

میں نے محض عثمان اور عزیز کی ریکی کی تھی تو اتنے سال گزرنے کے بعد بھی اسے پہچان گیا تھا پھر بھی میں نے اپنے ساتھ موجود اپنے ساتھی پاکستانی ڈاکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے عزیز کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"یہ ڈاکٹر عزیز چوہدری ہیں۔یہاں علاج کے لیے آئے ہوئے ہیں ویسے ان کے ہارٹ کی اوپن سرجری ہو چکی ہے لیکن شاید کوئی پرابلم ہے انہیں دراصل۔"

اس کی آواز مدھم ہوئی تھی۔

"میں پاکستان میں ہی تھا جب اور میرا تعلق اس کے علاقے سے ہی ہے۔ان کی اکلوتی بیٹی کو ان کے دشمن ملکوں نے اغوا کر لیا تھا کچھ زمین کا جھگڑا تھا۔ اگرچہ چند گھنٹوں بعد چھوڑ دیا تھا کہ عزیز کے والد نے جھگڑے والی زمین انہیں دے کر بچی کو واپس لے لیا تھا۔لیکن آپ جانتے ہیں نا ہمارے شہروں اور گاؤں کا ماحول اس کی بھابیوں اور عزیزوں نے اس کا جینا دشوار کر دیا تھا اور ان کے رویے سے تنگ آ کر اس نے خودکشی کر لی تھی تب انہیں ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔"

اس نے تفصیل بتائی تھی اور میں ساکت کھڑا تھا۔بے شک اللہ اپنے بندوں کو مایوس نہیں کرتا جب وہ سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیتے ہیں۔اور میں نے وہاں کھڑے کھڑے ہی پاکستان آنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"دیر سے ہی سہی لیکن تم نے صحیح فیصلہ کیا۔"

اماں خوش تھیں اور میں اتنے سالوں بعد سکون سے سویا تھا۔بیٹوں کو ان کی پڑھائی کی وجہ سے وہاں

ہی چھوڑ کر میں اماں، نازیہ اور مدیحہ کو لے کر پاکستان آگیا تھا۔

مدیحہ اپنا اے لیول کر چکی تھی۔ اور اس نے اپنے لیے جرنلزم کو پسند کیا تھا۔ وہ جب وہاں تھی تو تب بھی چھوٹے چھوٹے آرٹیکل لکھتی رہتی تھی اور اسے شاعری کا بھی شوق تھا۔ مجھے پاکستان آئے تقریباً چار سال ہو گئے تھے میں اب مطمئن اور پرسکون رہتا تھا۔

مجھے ایک اچھے پرائیویٹ ہاسپٹل میں جاب مل گئی تھی۔ چند بار کسی کانفرنس کسی سیمینار میں عثمان مجھے نظر آیا تو میں نے اسے نظر انداز کر دیا تھا اب اللہ پر میرا یقین پختہ تھا۔ مدیحہ پنجاب یونیورسٹی میں پڑھتی تھی میں اور نازیہ لاہور میں جاب کرتے تھے سو ہمارا مستقل قیام یہاں ہی تھا۔ البتہ ہر ماہ ہم دو تین دن کے لیے گاؤں جاتے تھے۔

ناصرہ نے اپنے بیٹے کے لیے مدیحہ کا رشتہ مانگا تھا اس کا بیٹا ہر لحاظ سے اچھا تھا۔ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن میں نے نازیہ سے کہا کہ وہ مدیحہ سے بھی پوچھ لے کیا خبر کوئی پسند ہو تو ہمیں اس پر اپنی مرضی مسلط نہیں کرنا چاہیے۔

تب نازیہ کے پوچھنے پر اس نے حسان کے متعلق بتایا تھا جس سے اس کی ملاقات ایک ادبی پروگرام میں ہوئی تھی۔ اور میں نے ملاقات کے لیے حسان کو بلا لیا تھا۔ مدیحہ کے ساتھ آتا وہ مجھے بہت جچا تھا ہینڈسم تو وہ تھا ہی لیکن اس کی گفتگو اس کے خیالات سب نے ہی مجھے متاثر کیا تھا۔ لیکن ہمیشہ سب پرفیکٹ نہیں ہوتا۔

وہ عثمان پراچہ کا بیٹا تھا۔ اپنے والد کے متعلق بتاتے ہوئے اس نے فخر سے مجھے دیکھا تھا۔ عثمان پراچہ کا جو نام اور مقام تھا بلاشبہ اس پر فخر کرنا بنتا تھا۔ میں نے اس کی چمکتی آنکھوں اور مسکراتے چہرے کو دیکھا اگر میں اسے بتا دوں کہ اس کا باپ قاتل ہے تو لیکن میں نے اسے کچھ نہیں کہا تھا اور بہت خوش دلی سے اسے رخصت کیا تھا لیکن میں تکلیف محسوس کر رہا تھا یہ تکلیف مدیحہ اور حسان کے لیے تھی۔

اس رات کھانے کی ٹیبل پر میں نے مدیحہ کی نظروں کو کئی بار اپنی طرف اٹھتے دیکھا تھا جیسے وہ جاننا چاہتی ہو کہ مجھے حسان کیسا لگا۔ اور دل ہی دل میں ایک فیصلہ کر کے میں نے مدیحہ سے کہا کہ وہ کھانے کے بعد میرے کمرے میں آئے۔ وہ آئی تو کچھ مضطرب سی تھی۔

"حسان اچھا لڑکا ہے۔ اس کی سوچ بہت اچھی ہے۔"

میں مسکرایا تو اس نے جیسے کب کا رکا ہوا سانس بحال کیا تھا۔ اور اس کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

اور پھر میرے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر دبایا تھا میں نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں۔

"مدحو! آج میں تمہیں ایک کہانی سناتا ہوں۔ تم نے بہت سی سچی کہانیاں لکھی ہیں۔ ایسی کہانی شاید ہی لکھی ہو۔"

وہ ایک اخبار کے ہفتہ وار ایڈیشن میں سچ بیتیاں کے نام سے سچی کہانیاں لکھتی تھی۔ زیادہ تر کہانیاں اسے نازیہ کی مریض خواتین سے ملتی تھیں۔

میں نے کہانی ختم کی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"کوئی اتنا کیسے کرسکتا ہے بابا؟"

"فاطمہ بھی یہ ہی کہتی تھی مدحو لیکن کبھی کبھی حسد کی آگ انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔ اور عثمان پراچہ کو بھی اس آگ نے اندھا کر دیا تھا۔"

وہ فاطمہ اور عثمان پراچہ کے ناموں پر چونکی تھی کہ کہانی سناتے ہوئے میں نے نام کے بجائے ایک لڑکی اور لڑکا کہا تھا۔

"فاطمہ...... آپ کا مطلب ہے......"

وہ فاطمہ کو نام کے حوالے سے جانتی تھی شاید اماں نے کبھی بتایا ہو یا نازیہ نے کہ پہلے میرا نکاح فاطمہ سے ہوا تھا۔ اور نازیہ اکثر فاطمہ کی ذہانت کا بھی ذکر کرتی تھی۔

وہ بات ادھوری چھوڑ کر بے یقینی سے مجھے دیکھ

رہی تھی۔
"عثمان پراچہ!" اس کے لبوں سے چند لمحوں بعد نکلا۔ "ڈاکٹر عثمان پراچہ...... حسان کے ڈیڈ۔"
میں نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔
"ہاں وہ شخص جس نے ہمیشہ کا ہجر ہمارا مقدر کر دیا جس نے میرے پاپا کے خاندان کو تباہ کر دیا۔ فاطمہ، آپا اور پھر عمر چاچا...... حسان میں کوئی کمی نہیں ہے مدحو! لیکن میں اس شخص کا سامنا کیسے کروں گا، کیسے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ پاؤں گا۔ اگر کبھی میرا ضبط جواب دے گیا۔ اگر کبھی میرا ہاتھ اس کے گریبان پر پڑ گیا تو...... پھر بھی میں فیصلہ تم پر چھوڑتا ہوں۔ تم جو بھی فیصلہ کرو گی۔ مجھے اعتراض نہیں ہوگا۔ اگر تم حسان کا ساتھ چاہو گی تو بھی نہیں۔"
اور اس کی آنکھوں میں نمی پھیل گئی پھر وہ اٹھ کر چلی گئی۔
"اگر اس نے حسان کا ساتھ چاہا تو......" نازیہ نے مجھ سے پوچھا۔
"تو اس صورت میں ہم مدیحہ کی رخصتی کے بعد واپس امریکہ چلے جائیں گے۔"
لیکن میں جانتا تھا مدیحہ ایسا کوئی فیصلہ نہیں کرے گی جو اس کے ماں باپ کے لیے اذیت ناک ہو اور ایسا ہی ہوا۔ اس روز میں گھر پر ہی تھا۔ میرا آج کوئی آپریشن نہیں تھا۔ نازیہ ہاسپٹل میں گئی اور مدیحہ کچھ دیر پہلے ہی یونیورسٹی سے آئی تھی۔ میں اسٹڈی میں اپنے کچھ مریضوں کی کیس ہسٹری دیکھ رہا تھا کہ ایک فائل لینے کے لیے اٹھا جو رات میرے بیڈ روم میں رہ گئی تھی۔ ڈرائنگ روم کے پاس سے گزرتے ہوئے مجھے حسان کی آواز آئی۔
"یہ اس بار تم نے کیا کہانی لکھی ہے مدحو! بھلا اتنی معمولی سی بات پر کوئی اتنا بڑا قدم اٹھاتا ہے۔ لگتا ہے تمہاری کہانیاں اب تمہارے تخیل کی پیداوار ہیں۔"
میں غیر ارادی طور پر وہاں ہی رک کر ان کی باتیں سننے لگا۔

تو کیا مدیحہ نے میری سنائی ہوئی کہانی لکھ کر چھپوا دی تھی۔ میں اخبار وغیرہ اتنی تفصیل سے نہیں پڑھتا تھا۔ کبھی کبھار کسی سرخی پر نظر ڈال لیتا تھا کہ میرے پاس وقت ہی نہیں ہوتا تھا۔ مدیحہ کے آرٹیکلز اور کہانیوں کے متعلق مجھے نازیہ ہی بتایا کرتی تھی۔
"نہیں...... یہ کہانی لفظ بہ لفظ سچ ہے۔ کچھ بھی جھوٹ نہیں ہے۔ سوائے ناموں کے جو فرضی ہیں۔"
مدیحہ کی سنجیدہ سی آواز آئی پھر حسان ہولے سے ہنسا۔
"چلو مان لیا، سچ ہی ہوگی اور یہ بھی سچ ہے کہ اتوار کو میرے ڈیڈ اور ماما تمہارے گھر آرہے ہیں۔ باقاعدہ تمہارے لیے جھولی پھیلانے۔" وہ شوخی سے کہہ رہا تھا۔
"اپنے بابا اور ماما کو بتا دینا، تم فون نہیں اٹھا رہی تھیں تو سوچا خود چل کر بتا دوں۔ اسی بہانے ملاقات بھی ہو جائے گی۔"
مدیحہ کیا کہنے والی تھی، میں نہیں جانتا تھا لیکن میرا ہر موئے تن جیسے سماعت بن گیا تھا۔ لمحہ بھر کی خاموشی کے بعد مدیحہ کی آواز آئی۔
"حسان اپنے ڈیڈ اور ماما کو مت لے کر آنا۔"
"کیوں مدحو! کیا تمہارے بابا نے منع کر دیا ہے، انہوں نے مجھے ریجیکٹ کر دیا۔ کیا میں انہیں تمہارے لیے اچھا نہیں لگا؟" وہ بے چینی سے پوچھ رہا تھا۔
"نہیں......" مدیحہ نے ایک گہری سانس لی۔
"تم انہیں بہت اچھے لگے ہو، ہر لحاظ سے۔"
"پھر...... پھر کیوں مدیحہ! میں نے تم سے کبھی کہا نہیں لیکن میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ میرا یقین کرو۔ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ بابا سے کہو ایک بار اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں پلیز۔" اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی۔
"بابا نے فیصلے کا اختیار مجھے دے دیا ہے اور......"
"تم...... تم مدیحہ...... تم نے...... لیکن کیوں؟"

اس نے تیزی اس کی بات کاٹی۔

"کیا یہ بتانا ضروری ہے حسان! بس تم سمجھ لو یہ ممکن نہیں ہے۔" مدیحہ اداس تھی۔ میرے دل کو کچھ ہوا۔

"کیسے سمجھ لوں مدیحہ! تمہیں وجہ بتانا ہوگی۔"

"تمہیں تکلیف ہوگی حسان!"

"ہونے دو تکلیف، لیکن وجہ جانے بغیر میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ اگر وجہ معقول ہوئی تو وعدہ کہ پھر کبھی تمہارے رستے میں نہیں آؤں گا۔"

"کاش...... کاش تم عثمان پراچہ کے بیٹے نہ ہوتے تو تمہاری رفاقت میری خوش نصیبی ہوتی۔" مدیحہ کی آواز بہت آہستہ تھی، میں بمشکل سمجھ پایا۔

"کیا...... کیا مطلب ہے تمہارا...... میرے ڈیڈ نے کیا کیا ہے؟" اس کی آواز قدرے بلند ہوگئی۔

"تمہارے ڈیڈی میری اس بچی کہانی کا وہ کردار ہیں جن سے تم نے نفرت کا اظہار کیا تھا اور کہا تھا کہ بھلا کوئی اتنا کیسے کرسکتا ہے تو اپنے ڈیڈ سے جاکر پوچھنا حسان! فاطمہ عمر کون تھی اور انہوں نے اس کے ساتھ کیا کیا تھا۔" وہ جذباتی سی ہوگئی۔

"فاطمہ عمر میرے بابا کے چچا کی بیٹی تھی اور بابا کی منکوحہ بھی۔ تو اگر میں اس محبت کی خاطر جو تم مجھ سے کرتے ہو اور شاید میں بھی، تم سے شادی کر بھی لوں تو میں خوش نہیں رہ سکوں گی۔ میں، بابا اور ماما کے آنسوؤں اور آہوں پر اپنی خوشی کا محل تعمیر نہیں کرسکتی حسان! بنیادوں میں پانی بھر جائے تو مضبوط سے مضبوط عمارت گر جاتی ہے۔

میری ماما نے مجھے ہر رشتے کا احترام کرنا اور رشتوں کو جوڑ کر رکھنا سکھایا ہے۔ میں کیسے اس شخص کا احترام کرسکوں گی جس نے میرے بابا کے گھرانے میں اندھیرے پھیلا دیے تھے۔ جس کی وجہ سے میرے بابا کے چچا کا پورا خاندان ختم ہوگیا۔ میرے بابا نے فیصلے کا اختیار مجھے دیا ہے لیکن میرے بابا اور ماما میری کسی خوشی میں شریک نہیں ہوں گے تو کیا میں خوش رہ سکوں گی اور کیا تمہیں خوش رکھ سکوں گی۔ نہیں حسان!"

اور میں بوجھل دل لیے وہاں سے لوٹ آیا تھا۔

اس کے بعد حسان نے کیا کہا، مدیحہ نے کیا کہا، مجھے نہیں معلوم۔ لیکن مجھے مدیحہ کا فیصلہ معلوم ہوگیا تھا۔

میں اسٹڈی میں واپس جانے کے بجائے سن روم میں بیٹھ گیا۔ سن روم میں لان کی طرف شیشے کی دیوار تھی اور کچھ دیر بعد میں نے دیکھا حسان سر جھکائے شکست خوردہ جا رہا تھا۔ میرا دل اس کے لیے دکھا تھا اور میں مدیحہ کے لیے بھی اداس تھا۔ میں اٹھا کہ حسان کو آواز دوں، اسے سمجھاؤں کہ کچھ وقت لگے گا، وہ دونوں سیٹ ہوجائیں گے ایک دن...... لیکن دوسری صورت میں وہ دونوں خوش نہیں رہ سکیں گے لیکن اس سے پہلے کہ میں باہر آتا، وہ آندھی طوفان کی طرح اپنی بائیک اڑاتا گیٹ سے باہر نکل گیا۔

گیٹ بند کرتے ہوئے چوکیدار بڑبڑا رہا تھا اور میں نے خلوص دل سے دعا کی تھی۔ یا اللہ اسے خیریت سے گھر پہنچانا، کہیں یہ کوئی حادثہ نہ کر بیٹھے اور میرا خدشہ سچ ہوگیا۔ اس کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔ جب ڈاکٹر جواد نے مجھے فون پر بتایا کہ ڈاکٹر عثمان پراچہ کے بیٹے کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ خطرناک انجری ہے۔"

"نہیں......" بے اختیار میرے لبوں سے نکلا اور آنکھوں کے سامنے حسان کا چہرہ آگیا۔ ڈاکٹر جواد نے جو تفصیل بتائی تھی، میں نے دھیان سے سنی تھی۔

"سر! آپ سن رہے ہیں۔ یہ آپریشن آپ نے کرنا ہے۔ ڈاکٹر عثمان نے ریکویسٹ کی ہے۔"

"ہاں جواد۔" میں چونکا۔ "ڈاکٹر عثمان تو خود اس وقت مانے ہوئے سرجن ہیں۔"

"سر! وہ اپنے اکلوتے بیٹے کا آپریشن نہیں کرسکتے۔ وہ......"

پتا نہیں وہ کیا کیا کہہ رہا تھا۔ میں نے ریسیور رکھ دیا۔ چند لمحوں کے لیے میرے دل میں خیال آیا کہ میں نہ جاؤں۔ وہ اپنے بیٹے کا آپریشن کرتے

ہوئے اگر کسی جذباتی لمحے میں کوئی غلطی کرتا ہے تو کرے۔ اپنے اکلوتے بیٹے کو کھو دیتا ہے تو کھو دے۔ وہ بھی تو ایسے ہی تڑپے جیسے میں اور میرا پورا خاندان تڑپا تھا۔ وہ بھی تو ہجر کا وہ درد سہے جو ہم نے سہا۔ لیکن یہ بس چند لمحوں کی بات تھی۔

چند لمحوں بعد ہی میں تیزی سے ڈرائیو کرتا پراچہ ہاسپٹل کی طرف جا رہا تھا اور میری آنکھوں کے سامنے حسان کا چہرہ تھا۔ مسکراتا ہوا، بے حد خوب صورت لہجے میں بات کرتا۔ یا اللہ اسے زندگی عطا فرمانا۔ میری لاج رکھنا۔ اگر میں کامیابی سے اس کا آپریشن نہ کر سکا تو ساری زندگی خود سے بھی نظر نہ ملا سکوں گا اور اللہ نے میری لاج رکھ لی تھی۔

حسان زندگی کی طرف پلٹ آیا تھا۔ اس روز پراچہ ہسپتال میں میرا آخری وزٹ تھا۔ میں نے حسان کو اوکے کر کے گھر لے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ اس روز میرے ساتھ مدیحہ بھی تھی اور اس وی آئی پی روم میں ہمارے لیے سلیمان، مدیحہ، اس کی بیٹی اور خود عثمان بھی تھا۔ حالانکہ گزرے دس پندرہ دنوں میں وہ میرے سامنے نہیں آیا تھا۔

''نئی زندگی مبارک ہو حسان! خوش رہو۔''

میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی تو اس نے نظریں اٹھائیں۔

اس کی آنکھوں میں آنسو چمکتے تھے، اس کی نظریں مجھ سے ہوتی ہوئی لمحہ بھر کو مدیحہ کے چہرے پر ٹھہریں پھر جھک گئیں۔

''عبدالرافع بھائی! میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں آپ کا شکریہ ادا کر سکوں۔ پپا نے یہ چیک دیا ہے، آپ کی فیس......''

میں نے چیک نہیں پکڑا اور شاکی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''آپ فاطمہ کی مخلص دوست تھیں اور اس گہری دوستی کا ثبوت آپ کی بیٹی فاطمہ ہے۔'' میں نے کونے میں گہری اسکارف اور عبایا میں ملبوس نازک سی لڑکی کی طرف دیکھا اور پھر مدیحہ کی طرف۔

''اور یہ میری بیٹی مدیحہ...... کہ نازیہ فاطمہ کی خواہش کی گواہ تھی۔''

اس روز مدیحہ مجھے پکارتی ہوئی پارکنگ تک آئی تھی۔ اس نے اپنے بھائی کے لیے معافی مانگی تھی اور روتے ہوئے اپنی بیٹی فاطمہ کے متعلق بتایا تھا۔ مجھے تو کبھی بھی اس کے خلوص اور محبت پر شک نہیں ہوا تھا۔

''کیا میں آپ کے بھتیجے کے علاج کی فیس وصول کروں گا مدیحہ!''

اور اس نے چیک والا ہاتھ پیچھے کر لیا تھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے تھے۔

''چلیں مدیحہ!'' میں مدیحہ کی خواہش پر اسے یہاں لایا تھا کہ وہ شاید آخری بار اسے دیکھنا چاہتی تھی کہ میں نے اور نازیہ نے کچھ عرصہ کے لیے واپس امریکہ جانے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ مدیحہ اور حسان کے زخموں سے خون رستا رہے۔ دوریاں یقیناً زخم مندمل کرنے میں مددگار ثابت ہوں گی۔

''جی!'' مدیحہ کی آنکھوں میں بھی آنسو چمک رہے تھے لیکن اس چمک میں میرے لیے تشکر تھا۔ احترام تھا، محبت تھی اور فخر بھی...... پھر میری نظروں نے کمرے میں موجود باقی چاروں کو حصار میں لیا۔

سب کی نظریں عثمان کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ ان نظروں میں ملامت اور افسوس تھا۔ محبت اور احترام نہیں تھا۔ بس رشتوں کا بھرم تھا جب رشتوں سے محبت ختم ہو جائے صرف بھرم رہ جائے تو یہ سزا ہوتی ہے اور اب عثمان پراچہ کو ساری زندگی ان ہی نظروں کا سامنا کرنا تھا۔

میں سب سے ہاتھ ملا کر اور فاطمہ کے سر پر ہاتھ پھیر کر مدیحہ کے ساتھ باہر نکل آیا۔

بے شک میرا اللہ ظالم کو اس کے ظلم کی سزا ضرور دیتا ہے۔ کبھی اپنوں کی بیگانگی اور نفرت کی صورت میں۔ کبھی اولاد کو ملنے والے دکھ کی صورت اور کبھی کسی اور صورت میں......!!!

ودیعہ بخاری

"کتنا عرصہ ہوگیا شادی کو لیکن تمہیں بات کرنے کا طریقہ نہ آیا۔" حیدر نے تاسف سے اسے دیکھا۔

"لیکن حیدر! میرا مطلب وہ نہیں تھا جو فرحین آپی نے لیا۔" اس نے بے ساختہ وضاحت دینے کی کوشش کی۔

"ہاں، وہ تو پاگل ہیں ناں۔ یار! تمہیں تمیز نہیں ہے، وہ مہمان تھیں ہمارے گھر۔ میری بہن ہیں۔ اتنے عرصے بعد آئی تھیں۔ اتنا اہتمام کیا تھا میں نے، مگر کیا فائدہ تم جب بھی بولو گی برا بولو گی۔" حیدر ہمیشہ کی طرح غصے میں بے لحاظ ہوا تھا۔ اور وہ "میں نے اتنا اہتمام کیا" پر اٹک گئی تھی۔

"صبح سے شام تو اسے کچن میں ہوگئی تھی لیکن پیسے تو حیدر کے خرچ ہوئے ناں۔ اس کی محنت کیا تھی۔" نازش نے سوچا تھا۔

حیدر اسے سخت سست سنا کر چلا گیا تھا اور وہ پھر سے کل شام کے تمام واقعات کو یاد کرنے لگی تھی کہ غلطی کہاں ہوئی۔

☆☆☆

سب کچھ بہترین تھا۔ اس نے کھانا بہت دل لگا کر تیار کیا تھا۔ مینیو میں فرحین آپی کی پسند کا خاص خیال رکھا تھا۔ دو سالن، روسٹ، کباب، سلاد اور میٹھے میں فرحین آپی کے بیٹے سالار کا فیورٹ چاکلیٹ ٹرائفل۔ وہ ٹھنڈا ہونے کے لیے فریج میں رکھ چکی تھی۔

"اوہ، شام کے پانچ بج گئے۔" نازش نے سر پر ہاتھ مارا۔ "چلو، عصر پڑھ کر تیار ہو جاتی ہوں۔"

چھ بجے تک گھر اور بچوں کو بھی از سر نو تیار کر کے وہ حیدر اور فرحین آپی کا انتظار کرنے لگی۔ فرحین آپی رشتے میں اس کی نند تھیں اور کچھ تنک مزاج تھیں۔ سو وہ ہمیشہ کوشش کرتی کہ کوئی کمی بیشی نہ ہو۔ پھر وہ آتی بھی کم کم تھیں بھائیوں کی طرف۔ سو سب خاص اہتمام کیا کرتے۔ نازش کے ساس سسر کا انتقال ہو چکا تھا۔ گھر میں بس ایک چھوٹا دیور تھا، جو اپنی یونیورسٹی اور دیگر مشاغل میں مصروف رہتا۔

دفعتاً ڈور بیل بجی تھی۔ نازش اپنے خیالوں کو جھٹک کر مین گیٹ کی طرف بڑھی۔

"السلام علیکم بھابھی! سوری، آج یونیورسٹی سے کچھ لیٹ ہوگیا۔" آج فرینڈز کے ساتھ کمبائن اسٹڈی کا پلان تھا۔

"ارے بڑی خوشبوئیں اٹھ رہی ہیں آج تو۔ کون آرہا ہے۔ بڑا اہتمام کیا ہوا ہے۔" ریحان لاؤنج میں داخل ہوتا رک کر بولا۔

"فرحین آپی! آرہی ہیں ناں۔ میں ان کا انتظار کر رہی تھی۔ چلو شاباش، چینج کر کے جلدی سے آؤ۔ وہ آتی ہی ہوں گی۔" نازش خوش دلی سے بولی۔

"اوکے باس۔" ریحان اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔

گھڑی نے سات کے ہندسے کو چھوا اور باہر زور و شور سے بیل ہونے لگی۔ لگتا ہے ننھا سالار بیل پر ہاتھ رکھ کر بھول گیا ہے۔ وہ سوچ کر مسکرائی اور گیٹ کھولنے کو بڑھی۔

گیٹ کھولتے ہی فرحین آپی کی مغرور صورت نظر آئی۔ اپنا برانڈڈ پرس سنبھالتی وہ جلدی سے اندر آئی تھیں۔

''ارے نازش! اتنی دیر لگادی۔ اس قدر گرمی ہورہی ہے۔ چلو چلو، اندر چلتے ہیں۔'' وہ ملنے کو آگے بڑھتی نازش کو ٹوکتی، اندر کی جانب بڑھیں۔

''کس قدر گرمی ہورہی ہے۔ لگتا ہے رات کو بھی سورج نکلنے لگا ہے۔'' پیچھے پیچھے سکندر بھائی اور سالار تھے۔ وہ کندھے اچکاتی ان کی معیت میں اندر چلی آئی۔ سالار، ریحان اور بچوں سے ملنے کو اندر دوڑ گیا۔

''آپ لوگ پلیز آرام سے بیٹھیں۔ حیدر آتے ہی ہوں گے۔'' نازش نے مہمان داری نبھاتے ہوئے کہا اور کولڈ ڈرنک سرو کرنے کے لیے کچن کی طرف بڑھی۔

حیدر کے آنے کے بعد ماحول مزید خوش گوار ہوگیا تھا۔ ریحان اور سکندر بھائی کی باتیں چل رہی تھیں اور وہ اور فرحین آپی نئی آنے والی لان کلیکشن ڈسکس کرنے لگی۔

نو بجتے ہی گرماگرم کھانا پیش کیا گیا۔ نازش کی کوکنگ شروع سے ہی اچھی تھی اور کچھ پیش کرنے کا سلیقہ بھی تھا۔ سکندر بھائی نے کھانے کی تعریف شروع کردی۔

''واہ نازش! آج تو آپ نے بہت محنت کی۔ کھانا بہت عمدہ بنا ہے اور یہ اتنی ساری ڈشز آپ نے اکیلے بنالیں۔''

''جی بالکل، یہ سب کھانا میں نے اکیلے بنایا ہے۔ بغیر کسی ہیلپ کے۔'' نازش نے ہنس کر حیدر کو دیکھا کہ وہ اس کے لاکھ کہنے پر بھی آج جلدی نہیں آیا تھا۔

حیدر زیرلب مسکرایا۔ پر کیا کرتا آج کل آفس میں کام بہت تھا اور پھر اسے پتا تھا کہ نازش اکیلے سب کچھ بہت اچھی طرح سنبھال لے گی۔

یوں ہی گپ شپ میں نازش نے محسوس کیا کہ فرحین آپی ایک دم سے خاموش ہوگئیں۔ بس ہوں ہاں میں جواب دینے لگیں اور پھر جلد واپسی کا شور بھی مچادیا۔ نازش اور حیدر نے بہت زور لگایا کہ چائے پی کر جائیں پر وہ معذرت کرتی نکلتی چلی گئیں تو سکندر بھائی بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

وہ فرحین آپی کے رویے کو سوچتی برتن سمیٹ رہی تھی۔

''مجھ سے کوئی غلطی تو نہیں ہوگئی۔'' وہ ہمیشہ کی طرح کانشیس ہوئی تھی۔ لیکن نہیں، میں نے تو بہت اچھے طریقے سے سب کو پوچھا تھا۔ کمرے میں آئی تو حیدر سوچکا تھا، وہ بھی خود سے الجھتی سوگئی۔

صبح معمول کے مطابق حیدر اور ریحان آفس اور یونیورسٹی چلے گئے اور وہ کل کی باقیات سمیٹنے لگی۔

☆☆☆

اور یہ اسی شام کا واقعہ تھا کہ حیدر کا آفس سے واپسی پر موڈ بہت خراب تھا۔ چائے کو بھی منع کردیا تھا اور اس کے کمرے میں آتے ہی اسے سخت سست سنانی شروع کردی تھیں۔

''تمہیں کیا ضرورت تھی، سب پر ثابت کرنے کی کہ تم نے سارا کھانا اکیلے بنایا اور وہ ہمیشہ کام والی کی ہیلپ لیتی ہیں۔ تمہیں پتا ہے سکندر بھائی نے انہیں کتنی باتیں سنائی ہیں۔''

''لیکن حیدر! میں نے ماسی کا نام کب لیا۔ میں تو آپ کے حوالے سے بات کررہی تھی۔'' حیران پریشان سی اس نے وضاحت دینے کی کوشش کی تھی۔

فرحین آپی کے گھر باقاعدہ کھانا پکانے کے لیے الگ سے ملازمہ تھی۔ یہ اور بات کہ ہر دعوت میں وہ ظاہر یہی کیا کرتیں کہ سب کھانا انہوں نے خود بنایا ہے اور کھانے کی تعریفیں بھی حق سے وصولتیں۔

''تمہارا انداز کتنا طنزیہ تھا، جب تم سکندر بھائی سے بات کررہی تھیں۔ فرحین آپی رورہی تھیں فون پر کہ اگر تمہیں ان کا گھر آنا پسند نہیں تو وہ آئندہ بھی نہیں آئیں گی۔'' حیدر مکمل طور پر آپی کی زبان بول رہا تھا۔

بات اب بہت سنجیدہ ہو چلی تھی۔ وہ بے اختیار کھڑی ہو گئی۔

"میں کیوں چاہوں گی حیدر! کیا آپ مجھے جانتے نہیں۔ میں نے تو کبھی کسی پر طنز نہیں کیا اور فریمین آپی کی تو میں بہت عزت کرتی ہوں۔ وہ تو سکندر بھائی مزاج کے بہت اچھے ہیں تو ان سے بھی کبھی مذاق کر لیتی ہوں۔ پلیز بات کو نہیں بڑھائیں اور فریمین آپی کو سمجھائیں۔" وہ لجاجت سے بولی۔

"کیا سمجھاؤں۔" حیدر تو جیسے اکھڑ گیا۔

"تم خود ان سے بات کرو، بلکہ معافی مانگو اور آئندہ احتیاط کرو۔"

وہ اسے تنبیہ کرتے ہوئے کمرے سے نکل گیا تھا۔

اس نے ہاتھوں پر سر گرا لیا۔ کیا اس کی محنت، اس کی محبت کی کوئی وقعت نہیں تھی حیدر کی نظروں میں۔ کتنی خوش نصیب ہوتی ہیں وہ عورتیں جو مرد کی محبت کے ساتھ ساتھ اس کی عزت کی بھی حق دار ٹھہرتی ہیں۔ نازش نے حسرت سے سوچا۔

فریمین آپی کے ساتھ وہ کتنا بھی اچھا سلوک کرتی۔ وہ ہر دفعہ کوئی نہ کوئی کمی ڈھونڈ ہی لیا کرتیں اور حیدر تو ٹھہرا ان کا فرماں بردار بھائی جس کے لیے ان کی ہر بات پتھر پر لکیر تھی۔ خاندان میں کہاں جانا ہے اور کہاں نہیں، کس سے تعلق رکھنا ہے اور کس سے نہیں۔ یہ سب فریمین آپی کی ہدایت پر ہوتا۔ وہ تو بس اپنے میاں کو ان کے ہر حکم کی تعمیل کرتے دیکھا کرتی۔ اور اب وہ کیا کرے۔ وہ کر ہی کیا سکتی تھی۔ اس نے بے چارگی سے سوچا۔ ہو گا تو وہی جو فریمین آپی چاہتی ہیں۔

☆☆☆

گھر کا ماحول نارمل ہو چکا تھا۔ نازش نے حیدر کی ہدایت کے مطابق فریمین آپی سے فون پر اپنے رویے کی معافی مانگ لی تھی۔ پھر مارکیٹ سے وہ دونوں میاں بیوی آپی کے پسندیدہ برانڈ کا سوٹ لے کر ان کے گھر بھی ہو آئے تھے۔

فریمین آپی پھولے نہیں سما رہی تھیں۔ اپنے بھائی پر واری صدقے ہوتیں، اسے مسلسل جتاتی نظروں سے دیکھتی رہی تھیں کہ دیکھو یہ پہلے میرا بھائی اور بعد میں تمہارا شوہر ہے اور وہ یاسیت سے مسکرا دی تھی۔ کچھ بھی تھا مگر اس کا ضبط کمال کا تھا۔

وہ ہمیشہ سے بہت شکر گزار طبیعت کی مالک تھی۔ سو اس سارے معاملے کو زندگی میں آئی ایک مشکل سمجھ کر سر جھٹک دیا تھا اور اپنا سارا دھیان اپنے گھر اور بچوں میں لگا لیا تھا۔

حیدر کو اس کی خاموشی اور تابع داری دیکھ کر کچھ دن میں اپنی زیادتی کا احساس ہو گیا تھا۔ مگر اس کے پوچھنے پر نازش نے اسے نرمی سے ٹال دیا تھا۔

وہ اپنے شوہر کے دھوپ چھاؤں سے مزاج کو جانتی تھی اور یہ بھی کہ زندگی کے کچھ معاملوں میں انسان سوائے صبر اور شکر کے اور کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ نازک رشتے تھے اور اسے اپنے گھر کا سکون بہت عزیز تھا۔ سو پہلے سے زیادہ محتاط ہو گئی۔ فریمین آپی کے آنے پر اب وہ ان کی خاطر مدارت تو کرتی مگر زیادہ تر خاموش ہی رہتی۔

☆☆☆

ان ہی حبس بھرے دنوں میں گھر میں ریحان کی شادی کا ہنگامہ جاگ اٹھا۔ ریحان یونیورسٹی ختم کرنے کے بعد ایک پرائیوٹ فرم میں بہت اچھی ملازمت حاصل کر چکا تھا۔

گھر کی بڑی بھابھی ہونے کے ناتے اس نے تمام ذمہ داریاں بہت خوش اسلوبی سے نبھائیں۔ اور زرتاشہ، ریحان کی زندگی کا روشن ستارہ بن کر گھر میں جگمگانے لگی۔

ریحان کی جاب تو بہت اچھی تھی۔ مگر کام کے اوقات کار زیادہ تھے۔ سو شادی کے شروع میں ایک مہینے کی چھٹی منظور کروا کے ریحان مطمئن تھا کہ بیگم کو آہستہ آہستہ اپنی مصروف روٹین کے لیے قائل کرے گا۔

زرتاشہ اور ریحان ایک ہی یونیورسٹی میں

پڑھتے تھے۔ زرتاشہ بے حد خوب صورت مگر کچھ
نخرے والی لڑکی تھی۔ ریحان کو اس کے مزاج کا
اندازہ تھا اس لیے کوشش کرتا کہ کوئی بات اسے ناگوار
نہ گزرے۔

کچھ دن بھی شادی کے شروع شروع کے تھے
ان میں بیوی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ ہنی مون پیریڈ
چل رہا تھا۔ صبح لیٹ اٹھ کر ناشتہ کیا جاتا اور پھر گھومنے
پھرنے نکل جاتے۔ دونوں کو زندگی جنت سی معلوم ہوا
کرتی۔ نازش کی ہنس مکھ سی زرتاشہ سے اچھی خاصی
بننے لگی تھی۔ وہ بہت زندہ دل لڑکی تھی۔ خوب بولتی اور
نازش کو بھی بولنے پر مجبور کرتی۔

آج ہفتہ تھا اور فرحین آپی نے آنا تھا۔ نازش
لنچ کی تیاریوں میں مصروف تھی کہ زرتاشہ کچن میں
چلی آئی۔

"کیا ہوا بھابھی! آج بہت مصروف ہیں۔"
زرتاشہ مسکرائی تھی۔

"ہاں، جلد اٹھنا پڑا زرتاشہ! آؤ ناشتہ کرلو۔
بنادوں؟" نازش جلدی جلدی ہاتھ چلاتے بولی۔

"نہیں بھابھی! میں خود بنالوں گی ناشتہ۔"
زرتاشہ ممنون ہوئی تھی۔ "آپ بتائیں، آج کوئی
آرہا ہے کیا؟"

"ہاں، آج فرحین آپی آرہی ہیں ناں۔" وہ
جوش سے بولی۔

"اچھا......" زرتاشہ نے اچھا کو لمبا کیا۔
دھیان میں فرحین آپی کا مغرور چہرہ لہرایا۔

"چلیں، اچھی بات ہے۔" چائے کا کپ
اٹھاتی وہ کچن سے چلی گئی۔

گھنٹے بعد ریحان اور زرتاشہ کو خوب تیار ہوکر باہر
جاتے دیکھا تو نازش بے اختیار ٹوک گئی کہ فرحین آپی
کسی بھی وقت آنے والی ہیں۔

"بس بھابھی! زرتاشہ کو کچھ کتابیں بہت
ضروری چاہئیں، ہم یوں گئے اور یوں آئے۔"
ریحان چٹکی بجا کر بولا اور زرتاشہ ہنس دی۔

"اچھا چلو، ٹھیک ہے۔" نیم دلی سے اجازت
دیتے ہوئے وہ کچن کی طرف مڑ گئی تھی کہ کھانا اختتامی
مراحل میں تھا۔

☆☆☆

ریحان اور زرتاشہ کی غیر موجودگی پر فرحین آپی
کی پیشانی پر کئی بل نمودار ہوئے تھے۔ نازش خائف
سی اپنی طرف سے وضاحت دینے لگی کہ ان کے
جانے میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں۔

کچھ دیر انتظار کے بعد اس نے کھانا لگا دیا اور وہ
اور حیدر، آپی کی آؤ بھگت میں مصروف ہوگئے۔ اس
وقت ریحان ڈائننگ میں داخل ہوا۔

"السلام علیکم آپی! سوری، میں لیٹ ہوگیا۔"

"ہاں بھئی، اب کہاں یاد آئے گی تمہیں آپی
کی۔" فرحین بظاہر مسکراتے ہوئے بولیں مگر چہرے
کے تاثرات ان کے رنج کا پتا دے رہے تھے۔

"آپی! آتو گئے ہم، خواہ مخواہ بات کو بڑھائیں
تو نہیں۔"

زرتاشہ نخوت سے بولی اور ساتھ ہی نازش کی
طرف مڑ گئی۔

"بھابھی! مجھے بھی پلیٹ دیجیے گا۔"

"میں بات بڑھا رہی ہوں۔ زرتاشہ! تم یہ
کیسے بات کررہی ہو مجھ سے۔" فرحین کے اندر غصے
کی لہر سی اٹھی تھی۔

"اوہو آپی! اب کچھ وقت مجھے زرتاشہ کو بھی
دینا ہے ناں۔ آخر کو وہ میری بیوی ہے۔" دونوں کی
بحث سے تنگ آتا ریحان دوٹوک بولا۔

حیدر نے بے اختیار اسے دیکھا۔ وہ مزید
خاموش نہیں رہ سکا تھا اور ریحان کو خاموشی کی تلقین
کرتا آپی سے کھانے کے لیے اصرار کرنے لگا۔ لیکن
اب زرتاشہ کا موڈ خراب ہوچکا تھا، سو وہ معذرت
کرتی ڈائننگ سے نکل گئی۔ اس کے جاتے ہی
ریحان بھی اس کے پیچھے چلا گیا تھا۔

فرحین آپی نے بے حد صدمے سے لاڈلے
بھائی کی یہ حرکت دیکھی اور رات یہیں بھائیوں کے
گھر رہنے کا سوچ لیا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ رات میں

آرام سے ریحان سے بات کریں گی کہ مزید کوئی غلط فہمی نہ ہو۔ وہ لاکھ تنک مزاج سہی مگر اپنے بھائیوں سے بہت محبت کرتی تھیں اور ہمیشہ ان سے بہت اچھے تعلق کی خواہاں تھیں۔

رات کا کھانا سب نے نارمل موڈ میں کھایا تھا۔ ریحان، زرتاشہ کو منا چکا تھا اور فرمین نے بھی بھائی کے تیور دیکھتے ہوئے اپنا موڈ خوش گوار کرلیا تھا۔ مگر زرتاشہ ہنوز ان سے کھنچی کھنچی تھی۔

رات دس بجے لاؤنج سے ریحان کے بولنے کی آواز آئی تو فرمین نے سوچا کہ بات کرنے کے لیے یہ وقت مناسب ہے مگر باہر تو زرتاشہ بھی تھی۔

ریحان کے ہاتھ میں آئس کریم تھی اور وہ باوجود زرتاشہ کے اصرار کے اسے تنگ کرتے ہوئے آئس کریم نہیں دے رہا تھا۔ اپنی جھونک میں زرتاشہ آئس کریم لینے کے لیے آگے ہوئی تو نجانے کیسے ریحان کے پہلو میں آسمائی تھی۔ ریحان نے بڑی چاہ سے اسے سنبھالا تھا اور اسی تگ و دو میں ساری آئس کریم زرتاشہ کے بالوں پر لگتی چلی گئی۔ اس کا حلیہ دیکھ کر ریحان بے اختیار ہنس پڑا۔

ریحان کی شرارتی مسکراہٹ دیکھ کر بے اختیار فرمین آپی کے لبوں کو بھی مسکراہٹ نے چھوا تھا۔ بڑا دلچسپ منظر تھا۔ زرتاشہ شررفشاں نگاہوں سے ریحان کو گھور رہی تھی۔ جو آئس کریم اس کے ہاتھوں میں دیے اب ٹشو سے اس کے بال صاف کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ زرتاشہ نخرے دکھا رہی تھی اور وہ نخرے اٹھا رہا تھا۔

اس منظر میں خود کو مس فٹ سمجھتے ہوئے وہ جانے کے لیے پلٹی ہی تھیں کہ زرتاشہ کی نظر ان پر پڑگئی۔ ان کے مسکراتے لب دیکھ کر اسے اپنی توہین کا شدت سے احساس ہوا اور وہ آئس کریم زمین پر پھینکتی پاؤں پٹختی، اپنے کمرے کی طرف چل گئی۔

ریحان نے تعجب سے فرمین آپی کی طرف دیکھا اور کندھے اچکاتا زرتاشہ کے پیچھے کمرے میں چلا گیا۔ گہری سانس بھرتی فرمین آپی کچن سے پانی پینے کو مڑی تھیں کہ زرتاشہ کی اونچی آواز سن کر رک گئی۔

"آخر مسئلہ کیا ہے آپ کی آپی کے ساتھ۔ وہ کیوں ہماری جاسوسیاں کرتی پھرتی ہیں اور دیکھا تھا کس طرح مسکرا رہی تھیں وہ ہمیں دیکھ کر۔ کتنا تمسخر تھا ان کی نظروں میں کہ جیسے میں نے کبھی آئس کریم دیکھی نہ ہو اور میں کسی ایسے ویسے خاندان سے ہوں۔"

"نہیں یار! ایسا نہیں ہے۔ تم آپی کو غلط سمجھ رہی ہو۔" ریحان آہستہ آواز میں وضاحت دینے کی کوشش کررہا تھا۔

"ایسا ہی ہے۔ ہماری کوئی لائف، کوئی پرائیویسی نہیں ہے۔ وہ جب چاہے آجائیں گی اور جو مرضی باتیں سنائیں گی۔" زرتاشہ غصے سے کھول رہی تھی۔

فرمین آپی ششدر سی سن رہی تھیں۔ انہوں نے کیا کہا تھا۔ زرتاشہ سے تو ایک لفظ بھی نہیں اور وہ ان کی بے ضرر سی مسکراہٹ کی کتنی کہانیاں بنا رہی تھی۔ ریحان شروع سے ہی بہت شرارتی تھا اور وہ ہمیشہ اس کی شرارتوں پر ایسے ہی مسکرایا کرتی تھیں۔ جو باتیں زرتاشہ کررہی تھی، وہ تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔

"آپ مجھے میری امی کی طرف چھوڑ آئیں، اگر آپ کی آپی کو میں برداشت نہیں۔" زرتاشہ کے بھڑکنے پر حیدر کی جان پر بن آئی۔

"اچھا ناں جان! آپی کی طرف سے میں معافی مانگتا ہوں۔ وہ ایسی ہی ہیں یار! ہمیشہ نازش بھابی کی زندگی تنگ کیے رکھی۔" وہ اسے تسلیاں دیتے ہوئے بولا۔

فرمین آپی سن کھڑی تھیں۔ یہ ان کا لاڈلا بھائی کیا کہہ رہا تھا اور یہ کون سا آئینہ اس نے ان کے سامنے لا کھڑا کیا تھا جس میں اپنا آپ اتنا کریہہ نظر آنے لگا تھا۔

"ہاں، زیادتی تو ہوئی ان سے۔" انہیں نازش

کا ضبط سے سرخ پڑتا چہرہ یاد آیا تھا۔ جب وہ اسے ایک کی دس سنایا کرتی تھیں۔ ہر بار بہترین خاطر مدارت کے بعد بھائی سے کوئی نہ کوئی شکایت کرنا ان کی داد دینے کا انداز بن گیا تھا اور بھلا ہو نازش کا جس نے کبھی کسی بات کا پلٹ کر جواب نہیں دیا تھا۔ دل نازش کے لیے نرمی سے بھرنے لگا۔

"ارے آپی! آپ اس طرح یہاں کیوں کھڑی ہیں؟" نازش کسی کام سے کمرے سے باہر نکلی تھی۔

"ہاں......وہ میں......بس جا رہی ہوں۔" بے ربط بولتی آپی کو نازش نے حیرت سے دیکھا۔ لیکن اپنی حیثیت جانتے ہوئے کچھ پوچھنے کی ہمت بھی نہیں کر سکی تھی۔

"کچھ چاہیے تھا آپ کو آپی!" اس نے حق میزبانی نبھایا تھا۔

"ہاں......وہ نازش......مجھے معاف کر دو۔" ندامت سے ان کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

"کیا ہوا آپی! یہاں بیٹھیں پلیز۔" حیرت زدہ سی نازش نے پکڑ کر انہیں کرسی پر بٹھایا۔

"نازش! مجھے ان تمام لمحوں کے لیے معاف کر دو جب جب میں نے تمہارا دل دکھایا۔ تمہیں پتا ہے امی ابا کے فوت ہونے کے بعد میں بہت ان سیکیور ہو گئی تھی۔" ان کی آواز میں سوچ کی پرچھائی تھی۔

"ہمارے معاشرے میں عورت کی سسرال میں عزت اس کے میکے کے دم سے ہوتی ہے۔ حیدر کی شادی کے بعد اس کا جھکاؤ تمہاری طرف دیکھتے ہوئے مجھے لگا کہ میرا بھائی مجھے بہت جلد بھول جائے گا۔ تمہاری اچھائی بھی مجھے برائی لگنے لگی۔ جب جب میں تمہیں اور حیدر کو ایک ساتھ دیکھتی، اندر کوئی بے چینی سی مچل جاتی اور میں جانے انجانے کچھ ایسا کر دیتی کہ حیدر کا دل تمہاری طرف سے خراب ہو جائے۔ مجھے معاف کر دو۔" فرحین آپی نے ندامت سے سر جھکایا۔

"نہیں آپی!" نازش نے متانت سے ان کے ہاتھ تھام لیے۔ "ایسے نہ کریں، آپ بڑی ہیں مجھ سے۔"

"نہیں نازش! مجھے کہنے دو۔ پتا نہیں ہم انسان اپنی چالیں چلتے ہوئے یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ مکافات عمل بھی کوئی چیز ہے اور کون جانے زندگی کے کس لمحے ہمارا کوئی بہت اپنا ہمارے سامنے ایسا آئینہ رکھ جائے، جس میں اپنے عیب خود کو ہی ڈرانے لگیں۔" آپی خود کلامی کے عالم میں بڑبڑائی تھیں۔

"آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا آپی! اس سے بڑی اور کوئی بات نہیں۔" نازش اپنائیت سے مسکرائی۔ "آپ صرف حیدر کی ہی نہیں میری بھی بڑی بہن ہیں، مجھے کچھ بھی کہہ سکتی ہیں بلکہ زیادہ غصہ آئے تو ڈانٹ بھی لیا کریں۔"

نازش کا انداز ان کے لبوں پر مسکراہٹ لے آیا تھا۔ اس نے نہ صرف ان کی دل جوئی کی تھی بلکہ ان کا مان کئی گنا بڑھا دیا تھا۔

کتنا غلط سمجھا تھا انہوں نے اسے۔ وہ محبت سے اسے اپنے لیے چائے بناتا دیکھ رہی تھیں۔ انسان اپنی آنکھوں سے نفرت اور تعصب کی عینک اتار دے تو منظر کتنے صاف دکھائی دینے لگتے ہیں۔ انہوں نے سوچا تھا اور کمرے سے نکلتی زرتاشہ کو دیکھنے لگی تھیں جو ان ہی کا عکس تھی۔ اور کون جانے اسے کتنا وقت لگنا تھا، زندگی کی حقیقت کو سمجھنے میں۔ رشتوں کو سمجھنے میں اور اپنوں کو سمجھنے میں۔ کرسی کی پشت سے سر ٹکائے انہوں نے آنکھیں موند لی تھیں۔

☆

مارچ 2021ء کے شمارے کی ایک جھلک

- "کرن" کی سالگرہ کے موقع پر قارئین سے خصوصی سروے۔
- اداکارہ "مہر جزہ کی" کہتی ہیں "میری بھی سنیے"۔
- اس ماہ "مسکان نور" کے "مقابل ہے آئینہ"۔
- "دامن سحاب" سحرش مختار کا سلسلے وار ناول۔
- "میرے ہم قدم میرے ہمنوا" آمنہ مرزا کا سلسلے وار ناول۔
- "کار خواب ہے" فرح بخاری کے مکمل ناول کی آخری قسط۔
- "زندگی خوب صورت ہے" نگہت سیما کا مکمل ناول۔
- "راج کماری" کلثوم صدف کا مکمل ناول۔
- "جنہیں راستے میں خبر ہوئی" نازیہ کنول نازی کا ناولٹ۔
- "اس کے تمام خواب" مشعل ملک کا ناولٹ۔
- "کاش" ام ہانی کا ناولٹ۔
- قرۃ العین سکندر، حمیرا فرید خان اور عذرا فردوس کے افسانے اور مستقل سلسلے۔
- **"کرن کتاب"**

سالگرہ نمبر کا خصوصی شمارہ

مارچ 2021ء کا شمارہ شائع ہوگیا

فریدہ بتول

قیمتی لیمپ کو ٹھوکر سے گراتے وہ روتے روتے ہنس دیا تھا۔

"خدا رحیم و کریم ہے۔" کسی کی دھیمی آواز گونجی تھی اور الاؤ عجز کا گئی تھی۔

مسلسل ہوتی دستک نے اس کے غصے کو اور بڑھاوا دیا تھا۔ بے کجوم کی شیشی ڈریسنگ کے شیشے پر

مار کے اس نے اپنا عکس مٹانے کی کوشش کی تھی۔ دستک دیتے ہاتھ بے جان ہوئے تھے لیکن زور سے دروازہ دھڑدھڑایا تھا۔

"جائیں آپ یہاں سے۔ آپ کے پڑھائے ہوئے سبق نے ڈبو دیا مجھے، کہیں کا نہیں چھوڑا۔" وہ حلق کے بل چلا رہا تھا۔ "آپ نے کہا تھا، خدا سے محبت کرو، اس کی مخلوق سے محبت کرو۔ لیکن اس کی بنائی مخلوق بے رحم ہے۔"

آس و امید سے ہاری ہوئی آواز نے باہر کھڑے وجود کو جیسے برف کیا تھا۔ دستک دیتا ہاتھ منجمد ہوا تھا۔

"ہرا دیا آپ نے مجھے ہرا دیا۔" وہ حواس کھوتے ہوئے گر سا گیا تھا۔

☆☆☆

"زینب او زینب! جلدی ہتھ چلا، تیرے پیو کو آج راجا نے بلایا تھا۔ میرا تو دل ہول رہا ہے، پتا نہیں اس نے کیا کہا ہوگا۔"

مکئی توڑتے ہاتھوں کی لرزش نمایاں تھی اور زینب کے دل پر خوف کا سایہ کچھ اور بڑھا تھا۔

"اماں! یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کوئی اچھی خبر ہو۔" زینب نے خوش گمانی کی تتلی کو قید کرنا چاہا تھا۔

"ہونے کو تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ منت مانی تھی میں نے کہ اگر آج راجا نے تیرے باپ کو ذلیل نہ کیا تو پچاس نفلوں والے نفل پڑھوں گی میں۔" بے حد سنجیدگی سے کی گئی بات پہ زینب کو ہنسی آئی تھی۔

"اماں اور اس کی منتیں۔" اور اماں نے گھور کے اس کی ہنسی بند کروائی تھی۔

"دوپٹہ ٹھیک طرح سے لے لے، اتنے بندے پھرتے ہیں ادھر، اپنا دھیان آپ ہی رکھنا ہوتا ہے۔"

سرزنش کے ساتھ ہدایت آئی تھی۔
"اور کتنا ٹھیک سے لوں اماں! کہو منہ سے چپکا لوں

مکمل ناول

سر کے ساتھ؟'' آگ برساتا لہجہ بالکل سورج سا معلوم ہوا تھا۔

''ہولی گل کر یا کر، کڑیاں اتنی اونچی آواز میں بات نہیں کرتیں۔''

اور وہ سر جھٹک کے پھر سے مکئی توڑنے لگی تھی۔ کچھ فاصلے پر اس کی سکھیاں تمام باتوں سے بے نیاز مکئی توڑنے میں مصروف تھی۔ زینب کو اس کے ہر کام میں مگن ہو جانے پر حیرت ہوتی تھی۔

''فضول سے فضول کام بھی تم اتنے شوق سے کرلیتی ہو بشریٰ؟'' زینب نے میلے دوپٹے سے مٹی سے بھرے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اسے مخاطب کیا تھا۔

''تو نے سنا نہیں کہ کام کرم ہوتے ہیں اور کرم کو محبت سے سمیٹا جائے تو فائدہ زیادہ ہوتا ہے۔ بے زاری دکھاؤ تو رب برکت نہیں دیتا۔ بس تھکا دیتا ہے اس کام میں۔''

بات کرتے ہوئے بھی اس کے ہاتھ مسلسل حرکت میں تھے اور زینب نے تھوڑا پشیمان ہو کر اس کی شکل دیکھی تھی۔ سانولا رنگ دھوپ کی تمازت سے کچھ اور کالا ہوا تھا۔ ہاتھوں کی جلد اب کچھ اور ہی رنگت اختیار کر چکی تھی۔ ان ہاتھوں نے کتنے بیج بوئے اور کتنی فصلیں سدھاریں اس کی تو گنتی بھی اب بھول چکی تھی۔

''تم کل سے مت آنا بشریٰ! کل بھی چاچی کہہ رہی تھی کہ کڑی کی بارات میں دن ہی کتنے رہ گئے ہیں اور وہ مکئی توڑ توڑ کر ادھ موئی ہوئی جا رہی ہے۔''

''کم کرنے سے کوئی ادھ موا ہوتا نا تو میں، اماں، فوزیہ اور فرخندہ تو اب تک مر چکے ہوتے۔'' وہ رسان سے بولی تھی۔

''یعنی کہ تیرا مطلب ہے کہ میں کام نہیں کراتی تم لوگوں کے ساتھ؟''

''یہ تو تجھے ہی بہتر پتا ہوگا۔'' وہ اب کام ختم کر کے وہیں چوکڑی مار کر بیٹھی تھی۔ اماں اور فوزیہ بوڑھ کے نیچے بیٹھی روٹی کھا رہی تھیں جو ابھی زینب ان سب کے لیے بنا کر لائی تھی۔

''تو نے روٹی نہیں کھانی بشریٰ؟''

''روٹی چھوڑ۔ یہ بتا، ابا گھر آ گیا تھا؟ کیا کہا راجا نے۔'' بشریٰ نے امید کے سب ہی رنگ جما کر پوچھا تھا۔

''ابھی تو نہیں آیا تھا اور میں ادھر آ گئی تو اماں نے مجھے کام پر لگا دیا میں واپس گئی ہی نہیں کیا پتا آ گیا ہو۔''

تفصیلی جواب دیتی وہ اب اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ بشریٰ نے حسرت سے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔

وہ سات بہنوں میں سب سے زیادہ خوب صورت تھی اور پڑھی لکھی بھی۔ پوری آٹھ جماعتیں پاس کی تھیں اس نے اور رنگ بھی کیسا ملائی جیسا تھا، نہ دھوپ کی شدت سے کم ہوتا نہ ساون میں پھیکا پڑتا اور بشریٰ نے کتنی ہی کوشش کی تھی کہ چلو شادی تک منہ دیکھنے جوگا ہی ہو جائے پر نہ جی ایک ذرہ برابر فرق نہیں پڑا تھا۔

وہ دور تک پھیلے سرسبز کھیتوں پر نگاہ جما کر کچھ سوچ رہی تھی جب نظروں کے ارتکاز پر اس نے رخ پھیر کر بشریٰ کو دیکھا تھا۔

''کیا ہوا؟'' زینب نے ابرو اچکاتے ہوئے پوچھا۔

''تو کتنی سوہنی ہے نا زینب۔'' بشریٰ حسرت سے بولی تھی۔

''تو بھی تو خوب صورت ہے۔ پتا ہے بشریٰ! تیرا دل بہت خوب صورت ہے شیشے جیسا۔'' وہ پھر سے اس کے سامنے بیٹھی تھی۔

''دنیا دل نہیں دیکھتی زینب!'' وہ فوراً بولی تھی۔

''لیکن اللہ دل ہی دیکھتا ہے اور اللہ کا دیکھنا ہی معنی رکھتا ہے میری جان!''

اور بشریٰ اس کے یقین پر دل سے مسکرائی تھی۔ ایسی ہی تھی زینب۔ مایوسی کے اندھیروں میں امید کا

واحد چراغ......

☆☆☆

الارم کی آواز پہ وہ ہڑبڑا کر اٹھا تھا اور جلدی سے باہر بھاگا تھا۔ کمرے کا دروازہ ابھی بند تھا۔ وہ بے حد خوش ہوا تھا۔

یعنی کہ وہ جیت گیا۔ الٹے قدموں واپس بھاگا اور جلدی جلدی وضو کرنے لگا۔ آئینے میں اپنے عکس پہ نظر پڑتے ہی اسے یاد آیا تھا۔

"وضو آرام آرام سے کرتے ہیں شاہ ویر!"

اور اس نے دوبارہ سے وضو شروع کیا تھا۔ سفید ٹوپی سر پر جمائے اس نے جائے نماز اٹھائی اور تیز قدموں سے چلتا ہوا لاؤنج تک آیا تھا۔

داخلی دروازہ کھول کر جوں ہی باہر قدم رکھا۔ ساری خوشی اڑن چھو ہوئی تھی۔

وہ سامنے گھاس پر اپنی مخصوص جگہ پہ نماز پڑھنے میں مشغول تھے۔

"جتنی بھی کوشش کرلوں، ان سے نہیں جیت سکتا۔" وہ سر جھٹک کر آگے بڑھا تھا اور ان کے برابر میں جائے نماز بچھا کر ایک بار پھر سوچا تھا، کل ساڑھے تین کا الارم لگایا پھر بھی یہ پہلے موجود تھے آج تین بجے کا لگایا پھر بھی "حد ہے یار۔"

سر جھٹک کر گویا لایعنی سوچوں کو جھٹکا تھا اور اپنے آپ سے لگائی جانے والی شرط کے ہار جانے کے ملال کو دباتے ہوئے تہجد کی نیت باندھی تھی۔

نوافل پڑھنے کے بعد وہ اذان ہونے کے انتظار میں بیٹھا تھا کہ اس کی ذہنی رو ایک بار پھر بھٹکی تھی لیکن جوں ہی اس کی نظر ساتھ بیٹھے شخص پہ پڑی وہ پھر نادم ہوا تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے زیر لب تسبیح پڑھنے میں مصروف تھے اور ہزار بار اس کو بھی کہہ چکے تھے کہ کچھ بھی سوچنے کے بجائے یکسوئی سے درود شریف پڑھا کرو، یکسوئی اور شاہ ویر کا بھی کوئی ملاپ تھا بھلا۔

☆☆☆

وہ گھر جانے والی گلی میں مڑی ہی تھی کہ سامنے کھڑی موٹر سائیکل دیکھ کر اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ خوش ہو یا اداس۔

خوش وہ اس لیے ہونا چاہتی تھی کہ اس کی بڑی شادی شدہ بہن فاطمہ آئی ہوئی تھی اور اداس اس لیے کہ بھائی طفیل ضرور ایسی کوئی بات کرے گا جو دنوں تک سب کو پریشان کرے گی۔

مگر اب وہ بشریٰ کی شادی کے لیے آچکے تھے سو برداشت کرنا تھا۔ نہ صرف برداشت بلکہ ہنس ہنس کر یہ تاثر بھی تو دینا تھا کہ آپ جوائی ہیں تو کچھ بھی کہنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ ان ہی سوچوں میں گھری وہ گھر پہنچی تھی کہ حماد کی خوشی سے چہکتی آواز نے اس کی ساری کثافت دور کردی تھی۔

فاطمہ سے ملنے کے بعد وہ بڑے کمرے میں آئی تھی جس کا بس نام ہی بڑا تھا۔

تین چارپائیاں قطار میں رکھی تھیں۔ کچے فرش پر اس خوب صورتی سے لپائی کی گئی تھی کہ لوٹنیاں بھی لیتے رہو تو ایک ذرہ مٹی کا نہ لگے۔ پر چھتی پر لگے برتنوں میں سے اس نے کانچ کے گلاس نکالے تھے۔ فاطمہ اس کے پیچھے ہی آئی تھی۔

"زینب! کتنی دیر ہوگئی ساتوں آئے ہوئے پانی شانی تو ہم نے پی لیا۔ تو شام کی روٹی ہی پکالے بس۔"

اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس نے گلاس

واپس رکھے تھے۔ تب ہی بھا طفیل کمرے کے دروازے پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا تھا۔
"ارے تو کب آئی زینب؟"
زینب نے سوال نظرانداز کرتے ہوئے سلام کیا تھا۔
"السلام علیکم بھاجی!" سر اس کے آگے جھکاتے وہ شرمندہ سی بولی تھی۔
"وعلیکم السلام۔ ہم آئے تو اصغر نے بتایا کہ پورا ٹبر ہی ماشاء اللہ سے دیہاڑی کرنے نکلا ہوا ہے۔ کتنے پیسے کما لیے کڑیے! بتا تو ذرا۔"
طنز کرتے ہوئے وہ بے رحمی کی حد پر اتر آیا تھا۔ زینب نے رخ موڑ کر سرخ پڑتی فاطمہ کا چہرہ دیکھا تھا اور باہر نکل گئی تھی۔
"لے جواب تو دیا ہی نہیں تیری بہن نے۔ کچھ زیادہ ہی نخرہ نہیں ہو گیا اس کا۔"
فاطمہ کی طرف دیکھتا وہ جوتوں سمیت چارپائی پر لیٹا تھا اور وہ خاموشی سے باہر آکر زینب کے ساتھ والی پیڑھی پر بیٹھی تھی۔ جو پیاز کاٹنے میں مصروف تھی۔ اصغر کو اس نے گوشت لینے بھیجا تھا۔
"تم برا نہ ماننا زینب! تو جانتی ہے نا تیرے بھاجی کو نہیں پسند کہ جوان لڑکیاں اس طرح کھیتوں میں کام کریں۔" وہ نہ جانے کیوں وضاحت دے رہی تھی۔
"ہم کون سا شوق سے کام کرتے ہیں فاطمہ! بھاجی کو یہ بات کیوں سمجھ میں نہیں آتی۔"
"جن کے پیٹ بھرے ہوں، ان کو کہاں سمجھ میں آتی ہیں ایسی باتیں۔ اب تو بھا نذیر نے ورکشاپ خرید لی ہے نا تو وہ مٹی پلید کریں گے ہماری۔"
آمنہ اور فاطمہ دونوں بہنیں ایک ہی گھر میں بیاہی گئی تھیں۔ جس ورکشاپ میں دونوں کے شوہر کام کرتے تھے، ماں کو ملنے والی زمین بیچ کر وہ ورکشاپ خریدی گئی تھی اور جب سے خریدی تھی۔ ساری دنیا حقیر لگنے لگی تھی ان کو۔ اور زینب نے سوچا تھا رویوں کی بدصورتی کو ہم جیسے لوگ صرف لحاظ میں سہہ جاتے ہیں۔

☆☆☆

جاگنگ ٹریک پہ بھاگتے ہوئے بھی اس کا ذہن باقی ہر چیز پہ تھا سوائے اس کے کہ وہ یہاں اس پارک میں ایکسرسائز کرنے آئے ہیں۔
کشادہ پیشانی پہ بال الجھ چکے تھے۔ سفید رنگت بھاگنے کے باعث سرخ ہو چکی تھی، ہلکی بھوری آنکھوں میں یادوں کے کئی در کھلے تھے۔ وہ آٹھ سال کا تھا جب اس کی ماں اس کی چھوٹی بہن امل کو ساتھ لیے اس گھر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئی تھی۔
وجہ وہ آج تک نہیں جان سکا تھا۔ گھر میں شاہ دیر مسعود، مسعود احمد اور اس کے دادا اکیلے رہ گئے۔
اس رات کا خوف آج بھی اس کے دل پر حاوی تھا۔ وہ ماں ہی کے ساتھ سونے کا عادی تھا اور آج جب ماں نہیں تھی تو وہ باپ کے سینے پر سر رکھے روتے ہوئے سو گیا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد اس کی آنکھ کھلی تھی اور اس کا دل جیسے کسی نے نچوڑ دیا تھا۔ وہ کمرے میں اکیلا تھا تو کیا بابا بھی اس کو چھوڑ کر چلے گئے؟ یہ خیال آری کی طرح ثابت ہوا تھا۔ بمشکل کمرے کا دروازہ کھولتے وہ لاؤنج میں آیا تھا۔
"بابا!" پوری قوت لگانے کے باوجود اس کی آواز اتنی تھی کہ بس وہی سن سکتا تھا۔
لاؤنج کا داخلی دروازہ نیم وا تھا۔ بابا واقعی مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ من من بھر کے قدم اٹھاتا وہ دروازے تک آیا تھا۔ آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ ڈرتے ڈرتے باہر جھانکا تھا۔
ڈر کی جگہ حیرانی اور پھر خوشی نے لی تھی۔ وہ گھاس پر جائے نماز بچھائے نماز پڑھنے میں مصروف تھے۔ وہ بھاگتا ہوا آیا تھا اور بے دھیانی میں کیاری کے ساتھ ٹھوکر کھا کر گرا تھا۔
اس کے گرنے کا احساس ہوتے ہی مسعود احمد کو دوراہا ہی بھولا تھا۔ وہ درمیان میں چھوڑ کر پھر سے پڑھنے لگے تھے۔

شاہ ویر کی تکلیف کا احساس ہر چیز پہ حاوی تھا۔ بمشکل سلام تک پہنچے تھے اور نماز ختم ہونے پر وہ شاہ ویر تک پہنچے تھے۔ جو پاؤں پکڑے درد سے نڈھال بیٹھا تھا۔

"شاہ ویر! بیٹا دکھاؤ۔ کہاں چوٹ لگی ہے۔" وہ اس کے سامنے دوزانو بیٹھتے ہوئے بولے تھے اور وہ پاؤں دکھانے کے بجائے ان کے گلے لگ کر رونے لگا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن اتنی تیز تھی کہ مسعود احمد کو خوف محسوس ہوا تھا۔

"مجھے لگا، ماما کی طرح آپ بھی مجھے چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔" ہچکیوں سے روتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔

"میں مر جاتا بابا! اگر آپ مجھے کچھ دیر اور نظر نہ آتے۔"

"میں اپنے اتنے اچھے بیٹے کو چھوڑ کر کیوں جاؤں گا بھلا۔" اس کی پیشانی چومتے ہوئے وہ اسے تسلی دے رہے تھے۔

"میں ہمیشہ اپنے شاہ ویر کے ساتھ رہوں گا۔" وہ اسے ساتھ لیے اب جائے نماز پہ آ کر بیٹھ گئے تھے۔

"آپ دوبارہ سے عشا کی نماز پڑھ رہے تھے۔" کیونکہ اسے یاد تھا کہ نو بجے ان دونوں نے ساتھ ہی عشا کی نماز پڑھی تھی۔ ان کی بند آنکھوں کو دیکھتے شاہ ویر نے سوال کیا تھا۔

"نہیں، یہ سیکرٹ نماز ہے۔" اس کے خوب صورت بالوں کو سہلاتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"اچھا اس لیے آپ چھپ کر پڑھ رہے تھے۔" اور مسعود احمد کو نہ جانے کیوں ہنسی آ گئی تھی۔

"ہاں جی۔"

"میں بھی پڑھوں گا سیکرٹ نماز۔" وہ عزم سے بولا تھا۔

"اتنی جلدی اٹھو گے کیسے اور پھر صبح اسکول بھی تو جانا ہوتا ہے۔ ایسا کرتے ہیں، تمہارے حصہ کی بھی میں پڑھ لیا کروں گا۔" انہوں نے شاہ ویر کی مشکل آسان کی تھی۔ اور وہ ایسے ہی تھے سب کی مشکل آسان کرنے والے۔

"نہیں بابا! میں خود پڑھ لوں گا۔ پلیز بابا!"

"او کے یار! پڑھ لینا۔" وہ خوش ہوئے تھے۔

شاہ ویر نے ان کی چمکتی آنکھوں کو دیکھا تھا اور اب وہ چمک نہ جانے کہاں کھو گئی تھی۔ ڈھونڈنے سے بھی کہیں نہیں ملتی تھی۔ وہ سوچتے سوچتے تھکا تھا یا بھاگتے بھاگتے۔ یہ اندازہ کرنا مشکل تھا۔ وہ ابھی تھک کر رکا ہی تھا کہ مسعود احمد پانی کی بوتل لیے اس کی جانب بڑھے تھے۔

گھٹنوں پر جھکے گہرے سانس لیتے ہوئے اس نے بغیر دیکھے ہاتھ بڑھایا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ جہاں کہیں بھی تھک کر رکے گا۔ بابا وہیں موجود ہوں گے۔ تبھی اسے لگتا ساری دنیا میں وہ بس ایک شخص کو جانتا اور جاننے کے بعد مانتا ہے اور وہ ہیں مسعود احمد۔

☆☆☆

کچے گھر میں بڑی ہلکی سی خوشی اتری تھی وہ سب حیران تھے کہ سخت دلوں میں ہمدردی کی دراڑ کیسے پڑ سکتی ہے اور جب سے دین محمد نے یہ بتایا تھا کہ راجا نے کہا ہے کہ اب بھی دین محمد چلایا کرے گا بس شرط صرف اتنی سی ہے کہ روز کا چار کلو آٹا راجا کو دیا جائے اور دین محمد حیران ہوا تھا۔ اتنی سستی شرط۔

پر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ شرطیں کبھی سستی نہیں ہو سکتیں۔

رشیدہ نے بات سننے اور نفل پڑھنے میں صرف کھانا پکانے کا وقفہ رکھا تھا۔ اور کھانا کھانے کے دوران اس نے خوش گمانیوں کے کئی پہاڑ کھڑے کر لیے تھے۔

ہنسی کی آواز پر اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا تھا۔ ساتھ والی دونوں چارپائیاں جوڑ کر وہ سب ایک ساتھ کھانا کھا رہی تھیں اور نہ جانے کیا ایسی بات تھی کہ ان کی ہنسی رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

ذرا پرے دوسری چارپائی پہ اصغر، دین محمد اور

طفیل روٹی کھا رہے تھے۔

"چپ کر کے روٹی کھاؤ باپ اور بھرا (بھائی) پاس بیٹھے ہیں۔ پتا نہیں کدوں (کب) عقل آنی اے۔" رشیدہ کی گھرکی نے سب کو بمشکل چپ کرایا تھا۔

"جلدی کرو۔ نفل پڑھو ساریاں۔"

"نفل کی منت اماں مانتی ہے اور شامت ساروں کی آجاتی ہے۔" زینب نے دھیمی آواز میں کہا تھا لیکن پھر بھی اماں نے سن لیا تھا۔

"اس لڑکی نے ہر بات کا جواب پہلے ہی گھڑا ہوتا ہے۔ چل اٹھ جلدی۔"

زینب سات برس کی تھی جب مستری دین محمد کے والد نے بٹوارہ کیا تھا۔ دو مرلے کا گھر اور آٹا پیسنے کی چکی جو کہ بڑے بھائی کی زمین میں لگی تھی اور خوب آمدن کا ذریعہ تھی دین محمد کو دے دی گئی کہ اس کی سات بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے وہ بھی سب سے چھوٹا تو یہ چکی دین محمد کے حصے میں آئی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ بڑا بھائی چکی اتار کر دین محمد کے گھر رکھ گیا تھا اور یہ بھی کہہ گیا تھا کہ اس نے دھوکے سے سب اپنے نام کروالیا ہے۔ باپ کی بات وہ ٹال نہیں سکتا لیکن وہ اپنے دل کی بھی نہیں ٹال سکتا۔ سو آئندہ دین محمد اس کے گھر قدم نہ دھرے۔

وہ حد درجہ پریشان تھا۔ بڑے بھائی کی لاکھ منتیں کیں کہ پہلے کی طرح سب مل کر چکی چلا لیتے ہیں۔ لیکن وہ نہیں مانے، تب ہی ایک دوست نے مشورہ دیا کہ محمد یار راجا جو کہ علاقے کا بڑا زمین دار ہے، اس سے کچھ مدد مانگ لو، وہ خدا ترس انسان ہے۔

اسی دن دین محمد اس خدا ترسی کے چنگل میں ایسا پھنسا کہ بات بے رحمی سے بھی آگے بڑھ گئی تھی۔ محمد یار راجا نے فوراً چکی لگانے کی اجازت دی تھی لیکن آدھے پیسے راجا کو دینے ہوں گے۔ وہ دن یوں تھے گویا خدا ساری دنیا چھوڑ کر ان کے کام سنوارنے میں لگا تھا۔

اس کی دونوں بڑی بہنوں کے اچھی جگہ رشتے ہوئے تھے اور چکی سے ہونے والی آمدن کا ایک روپیہ بھی گھر کے لیے استعمال نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ پیسے انہوں نے گھر کے پاس جگہ خریدنے کے لیے جوڑنے شروع کیے تھے کہ بعد میں چکی ادھر منتقل کرلی جائے گی۔

رشیدہ اپنے تینوں بچوں کے ہمراہ کھیتوں میں کام کرنے جاتی۔ کبھی دھان کی فصل لگائی تو کبھی کپاس چنتے۔ چکی دوپہروں کو کاتا جاتا۔ بیٹیوں کو رخصت کیا تھا اور ساتھ ہی زمین کے لیے کچھ پیسے اس کے مالک کو ادا کیے تھے۔

اگلے دن وہ کام پہ پہنچا ہی تھا کہ راجا کا بلاوا آگیا تھا۔

"دین محمد! اس مہینے چکی چلنے کی وجہ سے بجلی کا بل بہت زیادہ آیا ہے، پہلے بل ادا کرو پھر چکی چلانا۔"

"سرکار! میں اگلے مہینے ادا کردوں گا، ابھی آپ جانتے ہیں کہ میں کتنی بڑی ذمہ داریاں ادا کرکے آیا ہوں۔"

ہاتھ جوڑے وہ منت کر رہا تھا۔ منتیں ترلے کچھ کام نہیں آیا تھا اور دین محمد کو دھکے دے کر نکال دیا گیا تھا اور چکی ضبط کرلی گئی تھی۔

پورے دس سال چکی راجا نے چلائی اور بل کے پیسے شاید ابھی تک پورے نہیں ہوئے تھے جو آج اس نے دین محمد کو واپس بلایا تھا اور ایک نئی شرط کے ساتھ چکی چلانے کی اجازت دی تھی کہ اب دین محمد چکی چلا سکتا ہے لیکن روز چار کلو آٹا یا اس کے پیسے راجا کو دینے ہوں گے۔ ان دس سالوں میں مستری دین محمد نے مزدوری کی تھی ایک بڑے مستری کے ہاں کیونکہ وہ اپنے کام میں اتنا ماہر نہیں تھا کہ لوگ اب دین محمد سے گھر ہی بنوانے کا رسک لے لیتے۔

رشیدہ ایک معصوم عورت تھی۔ اس نے ہر حال میں اللہ کا شکر کرنا سیکھا تھا۔ اور یہی توکل اس کی اولاد میں نظر آتا تھا۔

وہ اگر خوشی ملنے پر شکرانے کے نفل پڑھتی تو غم کے نوافل بھی لازمی تھے۔ خدا نے نیک اولاد سے نوازا تھا۔ ساری بیٹیاں باہر کھیتوں میں کام کرنے جاتیں لیکن گاؤں کا ہر شخص کردار کی گواہی دینے کو تیار بیٹھا تھا۔ غریب سے زندگی بڑے امتحان لیتی ہے۔ لیکن ساتھ بڑے حوصلے بھی عطا کرتی ہے۔

☆☆☆

وہ دونوں گھر پہنچے تو اشرف نے بتایا کہ خاور صاحب ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔ نام سنتے ہی مسعود احمد کے چہرے پر مسکراہٹ ابھری تھی۔

شاہ ویر نے بھی کمرے میں جانے کے بجائے ان کو سلام کرنا ضروری سمجھا تھا۔

"ماشاءاللہ مسعود احمد! بیٹے کے ساتھ کوئی مقابلہ بازی شروع کر رکھی ہے۔" خاور صاحب نے ملتے ہی دل کی بات کہی تھی۔

"کیسی مقابلے بازی؟" مسعود احمد نے ابرو اچکاتے پوچھا تھا اور ایک نظر شاہ ویر کو دیکھا تھا۔

"خوب صورت اور جوان لگنے کی تجھے پتا ہے شاہ ویر! یہ مسعود دن رات ایکسرسائز کے چکروں میں کیوں پڑا رہتا ہے۔"

انہوں نے مسکراتے ہوئے شاہ ویر سے سوال کیا تھا۔ اور شاہ ویر نے بات سمجھتے ہوئے مسکراہٹ چھپاتے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"کہ ساری خواتین کولیگز اپنے کام چھوڑ کر اس کا دم بھرتی نظر آئیں اب اور کتنا کمال کرے گا۔ ان کو کل جناب نے یونیورسٹی سے چھٹی کر لی بے چاری سارا دن بجھی رہیں۔"

پانی پیتے شاہ ویر کو کھانسی آ گئی۔

"جی بالکل خاور صاحب! آپ سے ہی تو وہ اپنے دل کا حال بیان کرتی ہیں۔ یقیناً آپ اس بارے میں بہتر جانتے ہوں گے۔" مسعود احمد نے فوراً تائید کی تھی۔

"آپ بیٹھیں، میں فریش ہو کر آتا ہوں۔" بوتل میز پہ رکھتا وہ سیدھا کمرے میں پہنچا تھا۔

پندرہ منٹ بعد وہ واپس آیا تو وہ دونوں باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ لیکن بات کسی اور رخ پر چل چکی تھی۔ اپنا نام سنتے وہ داخلی دروازے کی اوٹ میں رکا تھا۔

"دیکھو خاور! میں پہلے ہی شاہ ویر کا بہت نقصان کر چکا ہوں، میں اور کوئی فیصلہ اس پر مسلط نہیں کرنا چاہتا۔" مسعود احمد دھیمے سے لہجے میں بولے تھے۔

"پھر بھی مسعود! کچھ تو سوچا ہو گا تو نے اس کے مستقبل کے بارے میں؟"

"جب وہ چھوٹا تھا تو پتا نہیں کیوں میرا دل چاہتا تھا کہ وہ انجینئر بنے۔" بولتے بولتے وہ ٹھٹک کر چپ ہوئے تھے۔ وہ شاہ ویر کی موجودگی محسوس کر چکے تھے۔

"لیکن اب میں یہ چاہتا ہوں کہ جو اس کا دل چاہے وہ کرے۔" انجینئر کا لفظ سنتے ہی شاہ ویر کے ماتھے پر پسینہ آیا تھا وہ جتنی چاہے کوشش کرے بھی انجینئر نہیں بن سکتا۔ وہ الٹے قدموں واپس مڑا اور کمرے میں واپس آیا تھا۔

"کیا میں بابا کو خوش کرنے کے لیے انجینئر نہیں بن سکتا۔ میں انجینئر بنوں گا۔"

وہ خود کلامی کرتا ہوا شیشے تک آیا تھا۔ اپنے عکس کو دیکھتے ہوئے اسے بہت سی ناخوش گوار باتیں یاد آئی تھیں۔

لیکن شاہ ویر مسعود کیسے انجینئر بن سکتا ہے؟

سوالیہ نشان ابھرا تھا۔

☆☆☆

مسعود احمد اپنی بیوی زہرہ بیگم سے علیحدگی کے بعد مطمئن تھے کہ انہیں شاہ ویر کی وجہ سے کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس نے ماں کی جدائی کا کوئی واویلا نہیں مچایا۔ شاہ ویر ایک ذہین اور فرماں بردار بچہ تھا اور کچھ مسعود احمد کا پیشہ ایسا تھا کہ وہ تعلیم کے شعبے سے وابستہ تھے اور شاہ ویر کی تعلیم کے حوالے سے بہت مطمئن تھے۔

لیکن اصل پریشانی تب ہوئی تھی جب زہرہ بیگم

کے جانے کے کچھ عرصے بعد شاہ ویر کے اسکول سے ان کا بلاوا آیا۔

”دیکھیں مسعود صاحب! پچھلے دو تین ہفتوں سے شاہ ویر کی کارکردگی بہت بری ہے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے پرنسپل! آپ جانتے ہیں کہ شاہ ویر ہمیشہ پوری کلاس سے آگے ہوتا ہے۔“ مسعود احمد نے پریشانی سے پرنسپل کی بات کا جواب دیا تھا۔

”جی اسی لیے تو ہم پریشان ہیں وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہا۔ تمام ٹیچرز اس بات پہ حیران ہیں کہ وہ آسان سے ٹاپکس کو سمجھنے میں بھی بہت ٹائم لے رہا ہے۔“

”میں کوشش کروں گا پرنسپل صاحب! کہ آئندہ آپ کو شکایت نہ ہو۔“ وہ مصافحہ کرتے تیز تیز قدموں سے باہر نکلے تھے۔

”میں گھر کو سیٹ کرنے میں مصروف تھا تو میری پوری توجہ شاہ ویر پر نہیں تھی لیکن اب میں سب ٹھیک کرلوں گا۔“ اپنے آپ کو تسلی دیتے ہوئے وہ پھر سے مطمئن ہوئے تھے۔

اور جب وہ اسے پڑھانے بیٹھے تھے تو صحیح معنوں میں سر چکرانے لگا تھا وہ مسلسل ”بابا سمجھ میں نہیں آرہا“ کی گردان کر رہا تھا۔ مسعود احمد جھنجلائے تھے۔

”پورے گھنٹے سے سمجھا تو رہا ہوں اور اس میں اتنا مشکل کیا ہے جو تمہارے پلے نہیں پڑ رہا۔“

وہ غصے سے بھرے تھے اور شاہ ویر کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ اس دن مسعود احمد نے ارادہ باندھا تھا کہ وہ آئندہ کبھی اس کو غصے سے نہیں پڑھائیں گے۔

مسعود احمد کی ہزار ہا کوششوں کے باوجود وہ پانچویں کے امتحان میں کمل ہوا تھا۔

اگلے سال بھرپور محنت کے باوجود اس کے اتنے نمبر نہیں آئے تھے جتنے مسعود احمد نے سوچے تھے۔ اس کی خود اعتمادی ختم ہو رہی تھی۔ مسعود احمد کی راتوں کی نیند اڑ چکی تھی۔ وہ ہفتے میں تین دن اس کے اسکول جاتے اور ٹیچرز کی منت سماجت کرتے کہ وہ شاہ ویر پر زیادہ توجہ دیں اور بدقسمتی کی بات یہ تھی کہ اس کا کوئی دوست نہیں بن سکا تھا۔

مسعود احمد نت نئے طریقوں سے اسے پڑھاتے پر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ وہ یکسوئی کھو چکا تھا۔

وہ ساتویں جماعت میں تھا جب ایک دن واپسی پہ اس نے اسکول نہ جانے کی رٹ لگائی تھی۔

سر وائٹ بورڈ پہ ریاضی کا سوال سمجھا رہے تھے جب اس نے کھڑے ہو کر کہا تھا کہ ”سر فورتھ پوائنٹ دوبارہ سمجھا دیں“ ساری کلاس نے گردن موڑ کر یوں دیکھا تھا گویا اس نے گالی دے دی ہو۔

”یہ تو کسی پرائمری کے بچے کو بھی ایک بار بتا دیں تو اس کی سمجھ میں آجائے لیکن شاہ ویر کی سمجھ سے تو ہر چیز بالاتر ہے۔“

احسن کے شوخی سے کہے گئے جملے نے پوری کلاس کو خوب ہنسایا تھا اور شاہ ویر کا دل چاہا تھا۔ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ گھر آکر وہ اس بات پہ بضد تھا کہ وہ آئندہ اسکول نہیں جائے گا۔

بڑی بڑی آنکھوں میں آنسوؤں کو چھپاتے اس نے بمشکل یہ بات کہی تھی۔

”شاہ ویر! تمہارے کہنے پہ اسکول چینج کیا ہے۔ بیٹا ایڈجسٹ ہونے کی کوشش کرو۔ بہت اچھا اسکول ہے اور تمہارے کلاس فیلوز سے بھی میں ملا ہوں، سب بہت اچھے بچے ہیں۔“

اس کے ہاتھوں کو تھام کر وہ محبت سے سمجھا رہے تھے۔ اس نے یک دم ہاتھ چھڑائے تھے۔

”وہ سب لوگ مذاق اڑاتے ہیں میرا اور آپ کہہ رہے ہیں کہ وہ اچھے ہیں اور میں غلط۔ آپ نے کہا تھا سوال پوچھنا ذہانت کی علامت ہے۔ میں کچھ پوچھ لوں تو سب ایسے ری ایکٹ کرتے ہیں جیسے کوئی گناہ ہو گیا ہو، مجھے نہیں جانا وہاں۔ مجھے کسی اسکول نہیں جانا۔“

جھنجلاتے لہجے میں وہ روہانسا ہوا کہتا تھا اور

مسعود احمد کا سارا حوصلہ جیسے بہہ گیا۔
"اوکے جیسے تمہاری مرضی۔" ہارے ہوئے لہجے میں کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔ شاہ ویر کے ملال میں کچھ اور اضافہ ہوا تھا۔
وہ ساری رات ان دونوں نے جاگ کر گزاری تھی۔
"کاش میں اس وقت کوئی درمیانی راہ نکال لیتا تو آج یہ سب نہ ہوتا۔ میں خود غرض بن گیا بیٹے کی محبت میں۔ اس کو زہرہ کے ساتھ جانے دیتا تو آج صورت حال اتنی تکلیف دہ نہ ہوتی۔ خود غرضی بھی انسان کو فائدہ نہیں دے سکتی۔"
ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے وہ وضو کرنے چل دیے۔ وہ لان میں پہنچے ہی تھے کہ شاہ ویر کی آواز نے ان کو حیران کیا تھا۔ سرخ آنکھیں لیے وہ شرمندہ نظر آرہا تھا۔
"کیا ہوا شاہ ویر؟" دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھامے وہ بے قراری سے سوال کر رہے تھے۔
"بابا! آئی ایم سوری۔ میں آئندہ ایسے بات نہیں کروں گا۔" بھرائی ہوئی آواز میں نیچی آنکھیں کیے وہ کہہ رہا تھا۔
"اٹس اوکے بیٹا! میں ناراض نہیں ہوں تم سے، اتنی سی بات پر پریشان نہیں ہوتے۔ میری جان تم تو بہت بہادر ہو اور بہادر لوگ اس طرح چھوٹی چھوٹی باتوں پر پریشان نہیں ہوتے۔"
اس کے سب کلاس فیلوز آگے نکل چکے تھے اور کبھی تو اسے لگتا، سوائے مسعود احمد کے ساری دنیا اسے روند کے آگے بڑھ چکی ہے۔
مسعود احمد کے لیے تو شاہ ویر جان بھی دے سکتا تھا تو انجینئرنگ پڑھنا کون سا مشکل ہے۔ اور اس دھڑکتے دل کو تسلی دیتا وہ آئینے کے سامنے سے ہٹا تھا گویا ڈر کے سامنے سے ہٹا تھا۔

☆☆☆

بشریٰ کی رخصتی کے بعد وہ سب یوں خاموش بیٹھے تھے گویا نہ بولنے والے کو انعام دیا جائے گا۔
رشیدہ حسب معمول نوافل پڑھنے میں مصروف تھی کہ سب کچھ خیر و عافیت سے ہو گیا۔
زینب نے سب کی چارپائیاں صحن میں بچھا کر بستر لگا دیے تھے اور اپنی چھوٹی بہنوں کو اکٹھا کر کے کہانی سنانے لگی وہ سب کونوں کھدروں میں چھپ کر رو رہی تھیں کہ "بشریٰ باجی ہمیں کیوں چھوڑ کر چلی گئی۔"
زینب نے ان کا دل بہلانے کی خاطر عجیب و غریب کہانیاں بن رکھی تھیں۔ رشیدہ نے ایک نظر ان چاروں پر ڈالی تھی اور اس کا دل نئی جوڑ توڑ میں مصروف ہوا تھا۔
"کاش دین محمد کا بھائی مان جائے اور زینب کا رشتہ مانگ لے۔" زینب نے نظر اٹھا کر ماں کو دیکھا تھا وہ اس کی حسرتوں سے بخوبی واقف تھی۔
"کیا ہوا اماں!" ابرو اچکاتے ہوئے زینب نے پوچھا تھا۔
"کچھ نہیں، کل تو نے میرے ساتھ جانا ہے دھان لگانے، زبیدہ آئی تھی بتانے سویرے جلدی جانا ہے۔"
"جی اماں!" خلاف عادت وہ فوراً مان گئی تھی عموماً وہ ان کاموں میں کام چور تھی لیکن اب پتا نہیں کیوں مان گئی تھی۔
فجر پڑھ کر اس نے ابا کو ناشتہ بنا دیا تھا۔ باقی سب نے لسی پی تھی۔ چھوٹی دونوں اسکول جاتی تھیں۔ فوزیہ نے اتنی دیر میں پورے گھر کی جھاڑو لگائی تھی اور دونوں ماں کے ساتھ چلنے کو تیار کھڑی تھیں۔
رشیدہ نے ایک نظر دونوں پر ڈالی تھی۔ گلابی دوپٹے میں اس کا رنگ دمکتا ہوا سا لگ رہا تھا۔
"چل زینب! چادر لے کر آ۔" رشیدہ نے نظر چراتے ہوئے کہا تھا۔
"اماں کو اب اس صدیوں پرانے دوپٹے میں بھی ہیرے جڑے نظر آنے لگے ہیں۔" وہ منہ بناتی اندر گئی تھی اور کالی چادر اوڑھ کر باہر نکلی تھی اور رشیدہ

نے سوچا تھا کہ کالا رنگ تو اس پر زیادہ جچتا ہے۔
آیت الکرسی کا ورد کرتی وہ باہر نکلی تھی۔ وہ دھیمے قدموں چلتی جا رہی تھی۔ جب فصلوں سے کچھ فاصلے پر بنے گھر کو دیکھ کر اس کے قدموں میں تیزی آئی تھی۔
"اماں یہ کس کا گھر ہے یہاں فصلوں میں؟" اشتیاق بھرے لہجے میں اس نے ماں سے پوچھا تھا۔ فوزیہ نے بھی اس کے اشارے پر دیکھا تھا۔
"راجا کا ڈیرہ ہے۔ زمینوں کی دیکھ بھال کے لیے بنوایا تھا۔ یہ برآمدہ سا بنایا ہے آگے۔" رشیدہ کے بجائے جواب فوزیہ نے دیا تھا۔
"میں دیکھ آؤں اماں!" ایک قدم آگے چلتی ماں کے ہم قدم ہوتے ہوئے زینب نے کہا تھا۔
"نہیں۔" تسبیح پڑھتی رشیدہ نے فوراً جواب دیا تھا۔
"دیکھ اماں! کوئی بھی نہیں ہے۔ میں بس یہ برآمدہ دیکھ کر آجاؤں گی۔"
"کوئی ضرورت نہیں ہے ادھر جانے کی۔" رشیدہ نے تسبیح چھوڑ کر کہا تھا۔
"میں یہ بلر سے دیکھ کر ابھی آجاؤں گی۔" کہتی فوزیہ کا ہاتھ پکڑتے وہ تقریباً بھاگی تھی چار پانچ لمبی لمبی سیڑھیاں طے کر کے وہ برآمدے میں پہنچی تھی جس کا خوب صورت چکنا فرش زینب کے پیر (پاؤں) ٹکنے نہیں دے رہا تھا۔ گول ستونوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ سحر زدہ سی ہوئی تھی۔
"بس زینب! چلتے ہیں، کوئی آ گیا تو۔" فوزیہ نے چادر ٹھیک کرتے ہوئے کہا تھا۔
"فوزیہ یار! یہ کیسے بنتے ہیں۔" چہرہ اوپر اٹھا کر ستونوں کو دیکھتی وہ سوال پوچھ رہی تھی۔
"کیوں تو نے بنانے ہیں۔" فوزیہ نے چڑ کر سوال کیا تھا۔ رشیدہ نے ہاتھ کے اشارے سے واپس بلایا تھا۔
"بنا بھی سکتی ہوں میں۔" رخ پھیر کر ڈرتی ہوئی فوزیہ کو دیکھا تھا اور فوزیہ نے پیچھے دیکھا تھا۔
راجا، چاچا خیر دین کے ہمراہ بڑے گیٹ سے اندر داخل ہوا تھا۔
عمر تقریباً پچاس سال، صحت مند جسامت، گندمی رنگ، ہلکی داڑھی وہ ان ہی کی طرف آ رہا تھا۔ فوزیہ کے اوسان خطا ہوئے تھے۔
"بھاگ زینب! راجا آ گیا۔" سحر زدہ کھڑی زینب کو بھی ہوش آیا تھا۔ اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا تو وہ آنکھوں میں حیرت لیے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ زینب نے فوزیہ کا ہاتھ پکڑا تھا اور پوری رفتار سے اتری بھاگی تھی۔
راجے کی نظروں نے دور تک تعاقب کیا تھا۔ وہ دونوں رشیدہ کے پاس پہنچ کر رک گئیں۔
"خیرو! کون تھی یہ؟" خیرو جو جتے میں مگن ہو چکا تھا سوال پر ہڑبڑا کر اپنے مالک کو دیکھا تھا۔
"یہ جی اپنے دین محمد کی بیٹیاں ہیں۔"
"اوہ اپنا دین محمد۔" وہ عجیب طرح سے ہنسا تھا۔ خیرو کا دل دہل کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆

"کیا ہوا۔" رشیدہ نے دونوں کے گھبرائے چہرے دیکھ کر سوال کیا تھا۔ زینب نے سکون کا سانس لیا تھا۔ شکر ہے اماں کو پتا نہیں چلا۔
"کوئی نہیں اماں! کتا آ گیا تھا تو تو جانتی ہے فوزیہ کتنی ڈرپوک ہے۔" جلدی سے جھوٹ گھڑ کر وہ مطمئن ہوئی تھی۔
"روکا تھا میں نے۔" فوزیہ نے غراتی ہوئی سرگوشی کی تھی۔
"جب وہاں کوئی گیٹ نہیں تھا، مطلب کسی کے جانے پر پابندی نہیں ہے۔ کوئی بھی جا سکتا ہے۔ تو خوامخواہ ہی ڈر رہی تھی۔" زینب نے چادر درست کرتے گویا فوزیہ کو درست کیا تھا۔
"ہاں تو ڈر کر بھاگی کیوں تھی، کھڑی رہتی نا وہاں۔" فوزیہ نے اس کی بہادری یاد دلائی تھی۔
"تو نے ڈرایا تھا مجھے، لگا راجا کوئی تلوار لے کر آ گیا ہے اور بس تیرا میرا سر دڈ (کاٹ) کر رکھ

دے گا۔ تیری شکل دیکھ کر بھاگی تھی میں تو۔" زینب نے خود کو بہادر ثابت کرنے کی قسم کھائی تھی۔

"اس کی نظریں ہی تیکھی ہیں۔ دیکھا نہیں تو نے۔" فوزیہ نے جھرجھری لی تھی۔

"تجھے کس نے کہا تھا اس کی آنکھوں میں دیکھنے کو۔"

"کیا اس بن لڑکی کی ہے تم دونوں نے۔ کتنی بار کہا ہے کہ استغفار پڑھا کرو۔" رشیدہ کی آواز پر دونوں کی زبانوں کو بریک لگا۔

شام کو وہ سب بیٹھے کھانا کھا رہے تھے جب زینب کا دن بھر کا صبر بالآخر ختم ہوا تھا۔

"ابا! یہ جو راجے کے ڈیرے کے آگے برآمدہ بنا ہے یہ کس مستری نے بنایا ہے؟"

باپ کے جھوٹے برتن اٹھاتے ہوئے اس نے پیار سے پوچھا تھا۔

"وہ شہر سے مستری آیا تھا کوئی۔ ادھر پنڈ والوں کو تو کچھ ہی نہیں لگنے دیتے وہ کسی شے کی۔" دین محمد نے اپنا دکھڑا رو دیا تھا۔

"ابا! یہ جو بڑے بڑے سے پلرز (ستون) بناتے ہیں میں تو حیران ہوں، کیسے بن جاتے ہیں۔" اور دین محمد کو اس سے ایسے ہی کسی سوال کی توقع تھی۔

اپنے گھر کا غسل خانہ اور کمرا بناتے ہوئے آدھے سے زیادہ کام تو زینب نے کیا تھا۔ کدھر کتنا مسالا لگے گا اور گھر کی کون سی دیوار ٹیڑھی ہے یہ سب زینب اکثر دین محمد کو بتایا کرتی اور دین محمد یوں شروع ہو چکا تھا کہ بس اب بنا کر ہی اٹھے گا۔ زینب نے ٹھان لیا تھا کہ وہ اب چکی کے لیے خریدی گئی جگہ پر ایسا ستونوں والا برآمدہ بنائے گی۔ اس کا دل اور دماغ اینٹ و سیمنٹ، بجری سے بھر گیا تھا۔

☆☆☆

اب اس نے الارم لگانا چھوڑ دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کوشش کے باوجود وہ مسعود احمد سے پہلے نہیں اٹھ سکتا۔ اب تہجد کے وقت اٹھنا اس کا معمول تھا۔ بچپن کی سیکرٹ نماز اب ضروری نماز بن چکی تھی۔

سردی ہو یا گرمی، تہجد وہ لان میں ہی پڑھتے تھے۔ وضو کر کے اپنی جائے نماز اٹھا کر لان میں پہنچا تھا۔ مسعود احمد نماز پڑھ رہے تھے۔ انہیں دیکھتے شاہ ویر کو احساس ہوا تھا۔ ایسی نماز میں کبھی نہیں پڑھ سکتا۔ اس طرح ساری دنیا سے لاتعلق جیسے...... جیسے ...... اسے کوئی لفظ مناسب نہیں لگا تھا۔ وہ سر جھٹک کر جائے نماز بچھانے لگا تھا۔

جب مسعود احمد نے سلام پھیر کر اسے دیکھا تھا۔

"شاہ ویر۔" اس سے پہلے کہ وہ نیت باندھتا مسعود احمد نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھایا تھا۔

"جی بابا!" وہ دو زانو ان کے سامنے بیٹھا تھا۔

"جب نماز کی نیت کرو اور ہاتھ باندھ لو تو یہ خیال کرو کہ اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ یہ خیال کرتے ہی تمام سوچیں مؤدب سی اس خیال کے سامنے نظر آئیں گی اور منتشر ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

اور شاہ ویر حیران ہوا تھا اور پھر پریشان کہ اس کی چند لمحے قبل سوچی گئی بات کا جواب اتنی جلدی کیسے مل سکتا ہے۔

"جی بابا۔" بہت مشکل ہوئی تھی اسے یہ لفظ ادا کرنے میں۔

"چلو شاباش۔ پڑھ لو۔ اذان ہونے والی ہے۔"

وہ آنکھیں بند کر کے درود شریف پڑھنے لگے تھے۔

☆☆☆

"شکریہ بابا۔" وہ ممنون ہوا تھا۔ جاگنگ ٹریک پر اسپیڈ پکڑنے سے پہلے شاہ ویر نے بات کرنا ضروری سمجھا تھا۔

"بابا! میں سوچ رہا تھا کہ میں آگے انجینئرنگ پڑھ لوں۔" تیز چلتے قدم ٹھہر گئے تو وہ سن ہو چکا تھا۔

"انجینئرنگ یونیورسٹیز کے میرٹ بہت آگے پہنچ چکے ہیں شاہ ویر!" مسعود احمد نے حیرت اور خوف کو ایک جملے میں سمیٹا تھا۔ ٹریک پر وہ دونوں

آمنے سامنے کھڑے تھے۔"

"بابا آپ ہی تو کہتے ہیں کہ انسان محنت سے سب کچھ کرسکتا ہے۔ تو بس میں کرلوں گا، گر کے سنبھلنے کی عادت ہوچکی ہے مجھے۔ آپ فکر نہ کریں۔ بس دعا کریں۔" اس کی آنکھوں میں عزم تھا۔

"میں دوبارہ پیپرز دے دوں گا اور اب کی بار اتنے نمبر تو آہی جائیں گے کہ آپ کی یونیورسٹی والے رکھ لیں مجھے۔" وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"ان شاءاللہ۔ میری ہر سانس تمہارے لیے دعا گو ہے بیٹا۔"

مسعود احمد کا سینہ فخر سے پھولا تھا تو میرا شاہ ویر میرے لیے اتنی مشقت اٹھانے کو تیار ہے۔ وہ وہیں کھڑے اس کو دیکھ رہے تھے جو اب جاگنگ ٹریک پر بھاگتا دور ہوتا جارہا تھا۔

☆☆☆

محنت میں عظمت ہے۔ محنت میں برکت ہے

محنت کا ایک نیا دور شروع ہوا تھا۔

وہ ساری رات زینب نے جوڑ توڑ کرتے گزاری تھی۔ کتنی اینٹیں اور بجری لگ سکتی ہے؟ کتنے پیسے خرچ ہوسکتے ہیں۔

دین محمد ابھی نماز پڑھ کر گھر میں داخل ہوا تھا کہ زینب ماں سے نظر بچا کر اس کا ہاتھ پکڑے اس جگہ پہنچی تھی، جہاں آج کل اس کی تمام سوچیں موجود رہتیں۔

"ابا! اگر ہم یہاں چکی کے لیے جگہ بنالیں تو راجے کی چاکری سے بچ سکتے ہیں۔ اب دیکھ ناں، ابا وہ تجھ سے اور بھی کتنے کام کروالیتے ہیں۔ مجھے اچھا نہیں لگتا جب تو ایسے ان کے کام کرتا ہے۔ ہم اپنی جگہ پر چکی لگائیں گے تو راجے کو پیسے بھی نہیں دینے پڑیں گے۔"

بات ختم کرکے اس نے باپ کا چہرہ دیکھا تھا جو کسی گہری سوچ میں گم دکھائی دے رہا تھا۔

"زینب پتر! یہ ساری باتیں پیسے نال ہی اچھی لگتی ہیں۔ پیسہ نہیں تو کچھ نہیں۔"

بات ختم کرکے وہ پلٹنے کو تھا جب زینب نے اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔

"ابا! ہم کوشش تو کرسکتے ہیں ناں اور انسان کے لیے وہی کچھ تو ہے جس کے لیے وہ محنت کرے۔"

"پھل اللہ دے گا۔ ہم ہمت تو کرسکتے ہیں ناں تو بس میرا ساتھ دے۔ میں سب کچھ کرلوں گی اور تو جانتا ہے ناں ابا میں کرلوں گی۔"

دین محمد نے اس کی امید بھری آنکھوں کی لاج رکھی تھی۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑا کر کچھ ڈھونڈنا چاہا تھا ایک چھوٹا سا کنکر اٹھا کر مٹی پر چوکور خانہ کھینچا تھا۔ گویا بنیاد رکھ دی گئی تھی۔ نیت اچھی ہو تو اللہ راہیں ہموار کرتا ہے۔

رشیدہ کے لاکھ منع کرنے کے باوجود دین محمد نے مٹی کی ریڑھی ڈلوادی تھی اور خود کام پر چل دیا تھا۔ اور رشیدہ کا دماغ تب گھوما تھا جب وہ رضیہ کے گھر سے اینٹیں بنانے کا سانچہ لے آئی تھی۔

"اس کا کیا کرے گی تو۔" رشیدہ نے پوچھا تھا۔

"اماں! اس کا کچھ اور ہوسکتا تو وہ کرلیتی فی الحال تو اینٹیں نکالوں گی میں۔" وہ یوں مزے سے جواب دے رہی تھی کہ جیسے سانچے سے اینٹیں بنانا روٹی توڑ کر کھانے جیسا ہے۔

"بنانی آتی ہیں تجھے۔" رشیدہ کپڑے دھونا بھول کر اس کے سر پر آکھڑی ہوئی تھی جو سانچہ گود میں رکھے بیٹھی تھی۔

"نہیں۔ رضیہ سے کہا تھا میں نے کہ ایک بار وہ بنا دے پھر میں آپے ہی بنالوں گی۔"

"اور یہ کام تو ادھر باہر بیٹھ کر کرے گی۔ شرم کر پچھلی گلی میں تیرے تایا کا گھر ہے۔ کیا کہیں گے وہ، اب نیا کام شروع کردیا ہم لوگوں نے۔ نہیں بنانی کی تو اینٹیں پوچھ لیتی ہوں میں تیرے پیو کو، وہ جو بھی تیں دیتا ہے تجھے آنے دے ذرا۔"

"اماں! چھوٹی چھوٹی چار دیواری تو ہے ناں تو

ادھر بیٹھ جا ہمارے پاس۔ کوئی کچھ نہیں کہے گا اور تایا نے تو آج تک گل کرنا مناسب نہیں سمجھا، وہ کیوں کچھ کہے گا۔ تو پریشان نہ ہو اماں۔"

تب ہی گھر کا دروازہ زور سے بجا تھا۔

"رضیہ آگئی۔" وہ خوش ہوتی باہر بھاگی تھی۔ رشیدہ سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گئی تھی۔ شام تک رضیہ اور اس کی ماں نے سانچے سے اینٹیں نکالنا سکھا دیا تھا۔ دین محمد کے گھر آتے ہی اس نے سارے دن کی روداد سنائی تھی۔

اس نے خوش ہو کر شاباش دی تھی۔ اس کا خیال تھا ایک دو دن میں زینب کے سر سے یہ بھوت اتر جائے گا کیونکہ خواہش کرنے اور محنت سے حاصل کرنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

اگلے دن وہ پھر سے کام میں مگن تھی۔ رشیدہ نے گھر کا دروازہ کھول رکھا تھا کہ باہر نظر رکھی جا سکے۔ زینب مٹی کو سانچے میں بھر رہی تھی کہ ایک سیاہ کار چار دیواری کے باہر آکر رکی تھی۔ اس نے نظر اٹھا کر آنے والے کو دیکھا تھا۔

"یہ راجا کیا کر رہا ہے یہاں۔" دیکھ کر اس نے فوراً سر نیچے کیا تھا۔ چھوٹی سی چار دیواری کو ایک چھلانگ میں پھلانگتے وہ عین اس کے سر پر پہنچا تھا۔ نظریں نیچے کیے وہ اپنے کام میں مگن تھی۔ اس کے نہ دیکھنے پر راجا حیران ہوا تھا۔

"سن نام کیا ہے تیرا۔" زینب نے نظر اٹھا کر اس کو دیکھا تھا۔

"کیوں بتاؤں؟" تڑخ کر جواب دیا تھا اور دوبارہ سے مٹی گوندھنے لگی تھی۔

"جانتی نہیں ہے مجھے، تیرا باپ نوکر ہے میرا۔" تھوڑا سا جھکتے ہوئے راجا نے اس کو اوقات یاد دلانے کی کوشش کی تھی۔

"پتا ہے مجھے۔" پیر کے انگوٹھے پر لگی مٹی کو اتارتے اس نے آرام سے جواب دیا تھا۔

اور یار محمد راجا کی زندگی میں یہ پہلی بار ہوا تھا کہ کوئی اس کے احترام میں کھڑا نہ ہو یا ہاتھ ماتھے تک لے جا کر سلام نہ کرے۔ لیکن پھر بھی اسے غصہ نہیں آیا تھا۔ زینب کا سرخ چہرہ دیکھتے وہ مسکرایا تھا۔

"اچھا چل، شاباش نام بتا دے اپنا۔" وہ پچکارتا ہوا بولا تھا۔ اور زینب کا دل چاہا تھا، یہ سانچہ اس کے منہ پر مار دے۔

"کیوں تو نے شناختی کارڈ بنوانا ہے میرا؟" مٹی سے لتھڑے ہاتھوں سے سانچے کی سطح کو برابر کیا تھا۔ اور راجا دل کھول کر ہنسا تھا۔

رشیدہ چولہا صاف کر رہی تھی۔ بھاگ کر باہر آئی تھی۔ اس کا دل خوف سے بھرا تھا۔

"راجا جی! تسی یہاں؟" سر پر دوپٹہ جماتی وہ جلدی سے بولی تھی ایک نظر زینب پر ڈالی تھی جو مٹی گوندھ رہی تھی۔

"ہاں بس ادھر سے گزر رہا تھا تو بس سوچا پوچھ لوں کہ کسی شے کی ضرورت تو نہیں ہے۔" نظریں ابھی بھی زینب پر جمی تھیں۔

"زینب! چل اٹھ کر راجا صاحب کے لیے کوئی چاہ پانی لے آ۔" رشیدہ اس کو منظر سے غائب کرنا چاہ رہی تھی۔

"نہیں۔ میں چلتا ہوں ضرورت نہیں ہے اس کی۔" اس کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ نام پتا ہوتا تو ہی دین محمد سے بات کرتا اب آسانی ہو گئی تھی۔

☆☆☆

تیزی سے گزرتے دنوں کی فکر دونوں کے دلوں پر حاوی تھی۔ بس کسی طرح شاہ ویر کے اتنے نمبر آجائیں کہ انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخلہ ہو سکے۔ اور پھر داخلے سے پہلے والے ٹیسٹ کی تلوار بھی تو سر پر لٹک رہی تھی۔

وہ ہمیشہ سے اپنے باپ سے ہی پڑھنے کا عادی تھا۔ بہت عرصہ ہوا۔ مسعود احمد نے ٹیوٹر بدلنے والی ڈیوٹی چھوڑ دی تھی۔ ابھی بھی وہ بند ہوتی آنکھوں کو بمشکل کھولے بیٹھے تھے کہ آج کا کام ختم کر کے ہی سکون کا سانس لیں گے۔

"شاہ ویر یار! چائے ہی بنا لاؤ۔" وہ تھکے تھکے

سے کہہ رہے تھے۔

"جی میں بلاتا ہوں۔" ابھی شاہ ویر کچن کے دروازے تک ہی پہنچا تھا کہ مسعود احمد کے فون کی گھنٹی بجی تھی۔

"کیسی ہو میری جان؟" شاہ ویر کے قدم وہیں تھمے تھے۔

"ہاں۔ میں ٹھیک ہوں۔"

"جی جی بالکل۔ ضرور آؤں گا۔"

"ارے واہ گڈ۔ اچھا میں بات کروں گا۔ اوکے اللہ حافظ۔"

کیسی بشاشت تھی ان کے لہجے میں، فون بند ہو چکا تھا اور وہ وہیں کھڑا تھا۔ عجیب سی سوچوں میں گھرا کس کا فون ہو سکتا ہے یہ؟

"شاہ ویر یار! لے بھی آؤ۔" اب اور وہ ہڑبڑا کر بھاگا تھا۔

"یہ کیا خالی چائے لے آئے ہو۔ میں کچھ کھانے کے لیے لے آتا ہوں۔"

ساری تھکن اڑن چھو ہوگئی تھی کیا' شاہ ویر نے ایک نظر جاتے ہوئے باپ کو دیکھا تھا۔

فون پھر سے بجا تھا، غیر ارادی طور پر اس نے فون کان سے لگایا تھا۔

"وہ مجھے یہ کہنا تھا کہ جب آئیں تو آئس کریم ضرور لے آئیے گا۔" کھنکتی ہوئی آواز نے شاہ ویر کا دماغ ایک دم سے خالی کیا تھا۔

اس نے لرزتے ہاتھوں سے جلدی سے فون بند کیا تھا، وہ جو کوئی بھی تھی بے حد فرینک تھی اس کے باپ سے، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہ اپنے کمرے میں پہنچا تھا۔

تب ہی مسعود احمد کمرے میں داخل ہوئے تھے۔

"کیا ہوا؟" وہ فکرمندی سے پوچھ رہے تھے۔

"کچھ نہیں۔" شاہ ویر نے نظریں چرائی تھیں۔

"پڑھنا نہیں ہے کیا؟" وہ ایک قدم آگے چلے آئے تھے۔

"نہیں۔ مجھے نیند آرہی ہے۔ آپ بھی سو جائیں۔"

"پریشان لگ رہے ہو۔"

اس کے جھکے ہوئے چہرے کو ایک ہاتھ سے اوپر کیا تھا اور جانچتی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا۔

"نہیں، میں کیوں ہونے لگا پریشان۔"

زبردستی کی مسکراہٹ نے شاہ ویر کا بھرم رکھا تھا۔

مسعود احمد نے آگے بڑھ کر گلے لگایا تھا۔

"باپ سے جھوٹ نہیں بولتے۔"

شرمندگی سے اس کا چہرہ سرخ ہوا تھا۔ "اچھا چلو سو جاؤ۔"

اور صبح ان کے ساتھ کھڑے ہو کر تہجد کی نیت کرتے اس نے سوچا تھا۔ مجھے کوئی حق نہیں ہے کہ میں ان کے بارے میں کچھ غلط سوچوں۔ وہ کبھی غلط نہیں ہو سکتے۔ کبھی نہیں۔

☆☆☆

سارا دن کام کرنے کے بعد شام تک اس کے ہاتھ چھالوں سے بھر چکے تھے اور ماں کی باتیں سن سن کر دماغ پک چکا تھا۔ وہ روٹی سامنے لیے بیٹھی تھی لیکن توڑ کر کھانے میں مشکل ہو رہی تھی۔ سو اس نے چنگیر اٹھا کر ساتھ والی چارپائی پر رکھی تھی اور خود وہیں لیٹ گئی تھی۔

ہر روز کے بنے جانے والے چپٹے قطار بنا کر کھڑے تھے۔ جب یہ جگہ بن جائے گی۔ ہم بھی ادھر لگائیں گے۔ پہلے تو آدھے سے زیادہ پیسے راجا کی جیب میں جاتے ہیں پھر سارے ہمیں ملا کریں گے۔ گاؤں میں ایک ہی تو بھٹی ہے، ظاہر ہے سب ادھر آیا کریں گے پھر سارے پیسے اکٹھے ہو جائیں گے تو سب سے پہلے اصغر کے لیے بہت ساری نئی پینٹ شرٹ خرید کر لاؤں گی اور اصغر کو کسی اچھے سکول میں داخل کرواؤں گی تاکہ پڑھے اور بڑا آدمی بن جائے۔ ابا کتنا خوش ہوگا اور اماں تو سجدے کر کر پاگل ہی ہو جائے گی۔

اپنی ہی سوچ پر وہ مسکرائی تھی۔ میں بھی آگے

داخلہ لے لوں گی پھر فوزیہ، فرشتہ اور اماں کو باہر کام بھی نہیں کرنے دوں گی۔ اور پھر...... خوابوں کی فہرست لمبی ہونے لگی تھی۔

اگلے دن اس نے زیادہ دل جمعی سے کام کیا تھا۔ اینٹیں وہ ساری نکال چکی تھی۔ پھر زکی کو لائی میں لگنے والی اینٹیں اس نے خود گول کی تھیں۔ دین محمد جو کچھ بتا کر جاتا۔ وہ ہمیشہ اس سے زیادہ کام مکمل کر لیتی تھی۔ سب لوگ اسے کام کرتے ہوئے دیکھتے اور ہنستے ہوئے آگے بڑھ جاتے کیونکہ وہ سب جانتے تھے، زینب پھر نہ کچھ بنا ہی لے گی۔ دین محمد کی پریشانی بھانپتے رشیدہ نے جلدی سے پانی کا گلاس بھرا تھا اور پاس آ بیٹھی تھی۔

"کیا ہوا؟" دین محمد کی طرف پانی کا گلاس بڑھاتے رشیدہ نے پوچھا تھا۔ "راجے نے کچھ کہا ہے کیا؟"

وہ یوں چپ بیٹھا تھا جیسے کچھ سنا نہ ہو۔

"اللہ خیر کرے اصغر دے ابا! دسو تے سہی کی ہو یا اے۔"

"راجے نے زینب دے رشتے دی گل کی ہے۔" وہ آہستہ سے بولا تھا۔

"اچھا، کس کے ساتھ کرائے گا وہ۔"

"اپنے ساتھ۔"

"ہائے ہائے ستیاناس۔ پہلی تین کو تو رکھ نہیں سکا وہ اور اب نیا شوق چڑھا ہے ماس کو، اس کی پچھلی بیوی کے قصے بھول گئے ہیں کسی کو جو اس نے اپنے منہ سے یہ بات کی، کیسے مارتا تھا اس وچاری کو نہ اس کی بہن گھر بسا سکی۔ چھوٹی سی کڑی کو چک کرا گئی تھی کیسے ترلے کیے اس کے بندے نے پر یہ ڈھیٹ نہ مانی۔ ہیرے جیسے پتر کو وی چھڈ دیا اس نے۔ میں اپنی کڑی نئی دینی اس قصائی کے ہتھ نوں۔ انکار کر دے۔"

"کر دیا انکار......"

"تے فیر......"

"فیر کی نکال باہر کیا اس نے۔"

دین محمد نے ہاتھ کی پشت سے پسینہ صاف کیا تھا۔

"ہائے میں مر گئی۔ تے چنگی دی گل نہیں کی۔"

"کمال کرتی ہے تو۔ وہ گل کی تھی میں نے۔ اس نے کہا تیس ہزار لے آ اور لے جا۔ اب تو بتا کہاں سے لاؤں تیس ہزار؟"

"چنگی تو ہم ضرور لیں گے ابا!" جواب زینب کی طرف سے آیا تھا۔

"اماں نے میرے ویاہ کے لیے جو کمیٹی ڈالی ہے۔ اس سے چنگی خرید لیں گے۔" وہ پاس آ کر بیٹھی تھی۔

"اور تیرا ویاہ؟"

"مجھے نہیں کرنی اماں کوئی شادی وادی؟" رشیدہ کی بات درمیان میں ہی رہ گئی تھی۔

"میں جلد یہ چک مکمل کر لوں گی پھر خرید لیں گے ٹھیک ہے نا ابا؟"

اور دین محمد نے سر مزید جھکایا تھا۔ سب اتنا آسان نہیں تھا، جتنا وہ سمجھ رہی تھی۔

☆☆☆

"شاہ ویر! میری خاور سے بات ہوئی تھی اکیڈمی کے سلسلے میں۔ وہ کہہ رہا تھا کہ حنا پا نے بھی اکیڈمی جوائن کی ہے، سو تم بھی بات کر لو حنا پا سے پھر چلتے ہیں صبح۔"

مسعود احمد نے کھانے کی ٹیبل پر ہی پورا پلان ترتیب دیا تھا۔

"بابا! میں کیا بات کروں گا اس سے، اگر ضروری ہے جوائن کرنا تو صبح چلیں گے بس۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ شکر ہے خدا کا کہ نمبر اچھے آ گئے ورنہ مشکل ہو جاتی ابھی تو مجھے نوافل بھی پڑھنے تھے۔"

تازہ ہوا کو اپنے اندر اتارتے مسعود احمد لان میں بیٹھے اخبار پڑھنے میں مصروف تھے۔ جب وہ نک سک سے تیار ہو کر وہاں پہنچا تھا۔ وائٹ شرٹ پر براؤن شارٹ جیکٹ پہنے وہ بہت فریش لگ رہا تھا۔

"بابا! آپ تیار نہیں ہوئے ابھی۔" وہ سامنے والی کرسی پر بیٹھا تھا۔

"دونوں تیار ہو کر جائیں گے تو نظر لگ جائے گی۔ یار! ایسے ہی چلتے ہیں۔"

مسعود احمد وہاں پہنچتے ہی پروفیسر صاحب سے ضروری بات کرنے میں مصروف ہو گئے۔

اور شاہ ویر کوریڈور میں کھڑا ادھر ادھر کا جائزہ لے رہا تھا۔

سفید ٹراؤزر پر سرخ پھولوں والی شارٹ فراک پہنے، کھلے بالوں والی لڑکی بھاگتی ہوئی اس تک ہی آئی تھی۔

"ارے شاہ ویر تم آ گئے۔" پھولی سانس کو درست کرتے اس نے جلدی سے بات مکمل کی تھی۔ اور شاہ ویر کے حیران چہرے کو دیکھتے اس نے جلدی سے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا تھا۔

"ہائے عنایا۔" شاہ ویر نے جھجکتے ہوئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تھا۔

"ڈیڈی نے بتایا تھا کہ آپ آج آئیں گے میں انتظار کر رہی تھی آپ کا، آئیں نا باقی سب سے ملتے ہیں۔"

سارے سوال جواب وہ خود کر رہی تھی۔ وہ دو قدم چلی تھی۔ شاہ ویر ابھی وہیں کھڑا تھا۔ "آؤ۔" اسے آواز دی۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

"کیا بتاؤں، کیسے کیسے اعلا نمونے پائے جاتے ہیں یہاں۔ تومی اور ضوفشاں کی آج پھر لڑائی ہو گئی۔ اور اتنی فضول بات پر لڑائی ہوئی کہ مطلب حد ہی ہو گئی۔"

"ہاں جیسے مجھے تو تومی اور ضوفشاں کا سارا بائیو ڈیٹا معلوم ہے۔"

وہ اپنی ہی سوچ پر مسکرایا اور نظر اٹھا کر اس کو دیکھا تھا۔

"اور مزے کی بات سنو، دو جڑواں بہنیں پڑھتی ہیں یہاں عیشا، میشا۔ کپڑے جوتے حتیٰ کہ ہیئر سٹائل تک ایک جیسی ہوتی ہیں۔ ہے ناں مزے کی بات۔" اس نے رک کر شاہ ویر کا چہرہ دیکھا تھا وہ مسکرا رہا تھا۔

وہ کہنا چاہتا تھا کہ اتنی فضول باتوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے اسے۔

"جی جی۔ بہت مزے کی ہے۔" یہ بابا پتا نہیں کہاں رہ گئے۔ شاہ ویر نے سوچا تھا۔

"آؤ۔ کینٹین چلتے ہیں، وہاں ہوں گے سب عدید ے۔"

شاہ ویر نے ناچار قدم آگے بڑھائے تھے۔

کچھ دیر میں وہ سب بیٹھے کولڈ ڈرنک پی رہے تھے وقتی وہ سب اچھے تھے احد (عنایا کا کزن) ضوفشاں، عنایا اور سلمان وہ سب اس سے یوں ملے تھے جیسے برسوں سے جانتے ہوں۔

"تو بابا ٹھیک کہا کرتے تھے کہ انسان سے بہتر چیز اللہ نے اور کوئی نہیں بنائی۔ دادا جی کہا کرتے تھے نا (بندہ بندے دا دارو اے)۔"

☆☆☆

دین محمد پھر اس جگہ پہنچا تھا جہاں اسے کام ملنے کی امید تھی۔ ٹھیکے داروں کی منتیں کرتے وہ اپنی زندگی کا ہر گزرا پل سوچنے پر مجبور تھا۔ اس سے ایسی کون سی غلطی ہوئی کہ آزمائش ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ نامراد گھر کی طرف جاتے اس کے قدم اٹھنے سے انکاری ہوئے جاتے۔ دور سے ہی اسے وہ پلرز نظر آنے لگے تھے جو زینب نے بنائے تھے۔ چھوٹے موٹے پتھروں کو گول کر کے گوبر اور کچی مٹی سے لپائی کی تھی۔

اب وہ چھت ڈالنے کا سوچ بیٹھی تھی اور اس کی یہ سوچیں دین محمد کی پشیمانی کو اور بڑھا دیتیں۔ بے رنگ سوچوں میں گھرا وہ گھر کے دروازے تک پہنچ کر ٹھٹکا تھا۔ چھت ڈالی جا چکی تھی جو دور سے اس کو نظر نہیں آئی تھی۔

چھوٹی سی باڑ پھلانگتے وہ برآمدے میں داخل ہوا تھا۔ نظر اٹھی تھی تو اٹھی رہ گئی تھی۔ دین محمد کو موٹی کالی سی چادر نظر آئی تھی جو چار سال پہلے لنڈے سے خریدی گئی تھی۔ جانوروں کو ڈالنے والے چارے اور

جوار سے اس نے اس موٹی ترپال کو رسی کی مدد سے سلائی کیا تھا۔ اور مضبوط رسے سے اس کو بلرز کے ساتھ باندھا تھا۔

اس کی محنت کو سوچتے دین محمد کو آنکھیں نم ہوئی تھیں۔ دھندلی آنکھیں فرش پر جمائے وہ زینب کی ہمت پر حیران ہوا تھا۔ اسے وہ دن بھی اچھی طرح یاد تھا جب نذیر اور خلیل اس کی دونوں بیٹیوں کو اس بات پر گھر بٹھا گئے تھے کہ زینب کے مستریوں والے کام کرنے سے ان کی عزت پر حرف آتا ہے۔ اور یہ زینب ہی تھی جس نے ایسی شرم دلائی تھی کہ دونوں عزت نہ سہی مجبور ہو کر اپنی بیویوں کو لے گئے تھے۔

اس کے اچھے نصیب کی دعا مانگتے ہوئے وہ گھر میں داخل ہوا تھا۔

"شکر ہے ابا جی آ گئے ہیں۔" فرخندہ کی خوشی سے بھرپور آواز نے دین محمد کی بے بسی کے دکھ کو کم کیا تھا۔

"پتا ہے ابا! ہم سب بڑی بے صبری سے انتظار کر رہے تھے" وہ پانی کا گلاس لے کر آئی تھی۔

"اچھا وہ کیوں اور تیری ماں اور زینب کدھر ہیں؟"

"زینب تو رضیہ باجی کے گھر گئی ہے اور اماں ادھر ہی تھی اماں کو کمیٹی کے پیسے مل گئے ہیں۔ زینب کہہ رہی تھی سویرے بجلی خرید لیں گے۔ ان شاء اللہ۔"

☆☆☆

صبح وہ پیسوں کو متاع جان کی طرح سنبھالتے ڈیرے پر پہنچا تھا۔ خیر دراجا کو بلا لایا تھا۔

"میں بجلی لینے آیا تھا سرکار!" یار محمد راجا نے نظر اٹھا کر اوپر سے نیچے تک اسے دیکھا تھا ہنستے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تھا۔

"لاؤ پیسے۔" دین محمد نے لرزتے ہاتھوں سے رومال میں بندھے پیسے اس کے ہاتھ پر رکھے تھے۔

"جا خیر دا! دین محمد صاحب کی مدد کروا بجلی گھر تک چھوڑ کر آنا۔"

وہ سر ہلاتا دین محمد کے پیچھے چل دیا تھا۔ وہ دل کھول کر ہنسا تھا۔ "یہ غریب اتنے کم عقل کیوں ہوتے ہیں۔" پیسوں کو جیب میں رکھتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔

بجلی کے ادھر منتقل ہونے کی خوشی جیسے سارے گاؤں کی خوشی تھی۔

وہ سب دین محمد کو مبارک دینے آئے تھے۔ سب خوش تھے۔

☆☆☆

"کیسا رہا پہلا دن اکیڈمی کا؟" وہ دونوں مغرب کی نماز پڑھ کر واپس آ رہے تھے جب مسعود احمد نے سوال کیا تھا۔

"بہترین بہت اچھے ہیں سب فیلوز اور خاور انکل کی بیٹی سے بھی ملاقات ہوئی۔ میں حیران اس بات پر ہوں کہ وہ مجھے دیکھتے ہی فوراً پہچان گئی حالانکہ بچپن میں ایک دو بار ملاقات ہوئی تھی۔"

"ارے یار! میں جاتا ہوں نا ان کے گھر تو تمہاری شکل مجھ سے ملتی ہے تو اس لیے وہ پہچان گئی ہوگی تمہیں۔" مسعود احمد نے اس کی مشکل آسان کی تھی۔

اس کا مطمئن چہرہ دیکھتے ہوئے مسعود احمد کو احساس ہوا تھا کہ انہوں نے گھاٹے کا سودا نہیں کیا لیکن یہ بات تو وقت ثابت کرتا ہے کہ فائدہ سوچ کر کیے جانے والے فیصلے پاتال میں بھی گرا سکتے ہیں۔

☆☆☆

شاہ ویر نے ڈرتے ڈرتے دوبارہ کھڑے ہو کر سوال پوچھ لیا تھا۔ لیکن وہاں کسی نے اس کی بات پر منہ تک نہیں بنایا تھا اور پروفیسر صاحب کے لہجے کی شیرینی نے اسے سب سے زیادہ حیران کیا تھا۔ وہ خوش تھا کہ یہاں سب لوگ اسے نالائق نہیں سمجھ رہے اور اگر سمجھ بھی رہے ہیں تو اس کا اظہار نہیں کر رہے۔

آج ہفتہ ہو چکا تھا اسے اکیڈمی جاتے۔ پہلی کلاس اٹینڈ کرتے ہوئے اسے احساس ہوا تھا کہ جیسے

کچھ مسنگ ہے لیکن کیا؟ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ سر ابرار کچھ سمجھانے میں مصروف تھے جب دروازہ بجا تھا۔

"میں اندر آجاؤں سر۔"

آجائیں مس حنایا! لیکن یہ لاسٹ ٹائم ہے آئندہ۔

"جی سر آئندہ نہیں ہوگا۔"

وہ بھاگی ہوئی آئی تھی اور شاہ ویر کے ساتھ والی کرسی پر دھپ سے بیٹھی تھی۔

"کیسے ہو شاہ ویر؟" کلاس ختم ہوتے ہی اس نے پہلا سوال کیا تھا۔

"میں تو ٹھیک ہوں، تم ٹھیک نہیں لگ رہیں۔"

"ارے یار! ٹھیک ہوں میں بھی، بس دوپٹا نہیں مل رہا تھا۔ اس لیے لیٹ ہوگئی۔ کیا بتاؤں یہ ملیحہ کی بچی میرے کپڑوں کا ستیاناس کردیتی ہے۔"

شاہ ویر کو اس کی ایسی باتیں سننے کی عادت ہو چکی تھی اور وہ حیران تھا کہ اس کے پاس کتنی کہانیاں ہوتی ہیں سنانے کے لیے۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

"تمہیں لگ رہا ہے۔ یہ کوئی مذاق ہے۔" بالوں کو کان کے پیچھے اڑستی وہ پوری اس کی طرف گھومی تھی۔ شاہ ویر نے فوراً اپنی مسکراہٹ چھپائی تھی۔

"نہیں، یہ واقعی بہت سیریس مسئلہ ہے۔" وہ جلدی سے اس کے مشکوک چہرے کو دیکھ کر بولا تھا۔

کلاس ختم ہوتے ہی سب باہر نکل گئے تھے۔ شاہ ویر وہیں بیٹھا کچھ فارمولے حل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تم لوگ چلو، میں آتی ہوں ابھی۔" وہ احد، نوی اور سلمان کو ہاتھ سے آگے بڑھنے کا اشارہ کرتے بولی تھی۔

"کیا ہوا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کیا۔" وہ جھکتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"نہیں۔ بس وہ۔" شاہ ویر بس اتنا ہی کہہ سکا تھا۔

"کیا نہیں، لاؤ میں سمجھاتی ہوں۔"

اس کے گھٹنے پر پڑے ہوئے رجسٹر کو اس نے بیٹھتے ہوئے اپنے گھٹنے پر رکھا تھا۔ اور یوں منٹوں میں اس نے شاہ ویر کا مسئلہ حل کیا تھا۔ وہ ممنون ہوا تھا۔

"تھینک یو حنایا۔"

"ارے یار! شکریہ کس بات کا دوست ہو تم میرے۔ آؤ کینٹین چلتے ہیں۔ بہت بھوک لگ رہی ہے۔" اس نے شاہ ویر کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا کیا تھا۔ ان دونوں کے انتظار میں وہ سب بھوکے بیٹھے تھے۔ احد کا موڈ از حد خراب تھا۔

"یہ غلط بات ہے، ادھر ہم دس لوگ تم دونوں کی وجہ سے بھوکے بیٹھے ہیں۔" ضبط کے باوجود احد کے منہ سے نکلا تھا۔

"سوری یار! بس وہ تھوڑی دیر ہوگئی۔" بیگ میز پر رکھتے وہ آرام سے بیٹھ گئی تھی۔

مسعود احمد خوش تھے کہ شاہ ویر خوش اور مطمئن ہے کتنے دن ہوئے وہ شرمندہ، پریشان اور مایوس سا شاہ ویر نظر نہیں آیا تھا۔ گھر آکر وہ گھنٹوں حنایا کے بارے میں باتیں کرتا۔ حنایا کا پورا شجرہ نسب شاہ ویر سمیت مسعود احمد کو بھی یاد ہو چکا تھا۔

☆☆☆

چکی لگ چکی تھی۔ سب لوگ یوں اس کے گرد جمع تھے جیسے خوشیاں بغیر کسی شرط کے بانٹی جارہی ہوں۔

زینب کو اپنے دل کی دھڑکن چکی کی آواز سے زیادہ تیز معلوم ہوئی تھی رگڑ رگڑ کر برتن دھوتے ہوئے بھی اس کی تمام تر توجہ باہر سے آنے والی آوازوں پر تھی۔ چکی کی آواز بس چند منٹ کے لیے ہی آئی تھی اور پھر بھانت بھانت کی پریشان کن آوازوں سے سارا سکون غارت ہوگیا تھا ہاتھ میں پکڑی صابن لگی کٹوری کو جلدی سے دھویا اور چپل پیروں میں اڑس کر باہر جانے کو کھڑی ہوئی تھی۔ جب اصغر منہ لٹکائے اندر داخل ہوا تھا۔

"کیا ہوا اصغر؟" زینب نے سوال کیا تھا۔

"وہی جو غریبوں کے ساتھ ہوتا ہے۔" جل بھن کر جواب دیا تھا اس نے۔

"مطلب؟"

"مطلب یہ کہ چکی خراب ہے۔ سارا آٹا کالا کر دیا اس نے۔"

جواب دے کر وہ اندر کی جانب بڑھا تھا اور زینب وہیں کھڑی رہ گئی تھی۔ تمام خواہشیں حسرتوں کے روپ میں ڈھلتی بالکل سامنے کھڑی ہوئی تھیں۔ کھڑے رہنے کی سکت ختم ہوئی تھی تو وہ وہیں بیٹھ گئی تھی۔ اگر انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے تو یہ میرے ساتھ کیا ہو گیا۔

اور اسے کچھ دیر پہلے اصغر کی کہی گئی بات یاد آئی تھی۔

"وہی ہوا اس کے ساتھ جو غریبوں کے ساتھ ہوتا ہے۔"

بھاگتی دوڑتی سوچیں جیسے شل ہو کر بیٹھ گئی تھیں۔

☆☆☆

کلاس روم میں قدم رکھتے ہی وہ خوش گوار حیرت کا شکار ہوا تھا۔ پورا کمرہ رنگ برنگے غباروں سے سجا تھا اور ہلچل یوں مچی تھی جیسے کسی بڑی تقریب کی تیاری ہو۔ ابھی بیگ رکھ کر پلٹا ہی تھا جب نوی بھاگتا ہوا کلاس روم میں داخل ہوا تھا۔

"وہ آگئی، سیٹ ہو جاؤ سارے۔" شاہ ویر کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ وہیں کھڑا رہ گیا تھا جب حنایا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تھی۔ ڈارک بلیو ویلوٹ شرٹ کے ساتھ پرعذ پاجامہ پہنے وہ آج کچھ خاص تیار ہو کر آئی تھی اور شاہ ویر اس سوچ میں گم تھا کہ اس پر سرخ رنگ زیادہ سوٹ کرتا ہے یا نیلا۔

تب ہی پھولوں کی جیسے بارش ہوئی تھی اور ہیپی برتھ ڈے حنایا کی بھرپور آواز نے شاہ ویر کو چونکایا تھا۔

"اوہ گاڈ!" وہ ایک دم شرمندہ ہوا تھا۔ وہ لب

ایک ہاتھ پیٹ پر رکھے جھک کر چینیوں کے سے انداز میں شکریہ ادا کر رہی تھی۔

کچھ دیر بعد احمد بڑا سا کیک اٹھائے اندر داخل ہوا تھا۔

"حنایا کی سالگرہ کی خوشی میں آج سب کو لنچ احمد مصطفیٰ صاحب کروائیں گے۔"

اعلان کرتے ہوئے اس نے کیک ٹیبل پر رکھا تھا۔ چھوٹی سی پلیٹ میں کیک کا ٹکڑا رکھے وہ شاہ ویر کی طرف ہی آئی تھی۔

"تم نے مجھے برتھ ڈے وش نہیں کیا؟" کیک اس کی طرف بڑھاتے حنایا نے گلہ کیا تھا۔

"ہیپی برتھ ڈے۔" کیک پکڑتے اس نے شرمندہ لہجے میں کہا تھا۔

"لاؤ میرا گفٹ۔" اس نے اپنا ہاتھ شاہ ویر کے سامنے پھیلایا تھا۔

"وہ اصل میں مجھے پتا نہیں تھا کہ آج تمہارا برتھ ڈے ہے اور کسی نے بتایا بھی نہیں مجھے۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے گلہ کیا تھا۔

"اٹس او کے۔ کوئی بات نہیں یہاں بھی آدھے سے زیادہ لوگوں کو نہیں پتا، یہ سب کچھ تو احمد نے ارینج کیا ہے۔"

وہ فخر سے بتا رہی تھی اور اگر شاہ ویر اپنے حواسوں میں ہوتا تو اس کے لہجے میں سچ جان لیتا۔ مگر وہ نہ جان سکا۔

گھر آکر بھی وہ اپنے دل کا بوجھ کم کرنے میں ناکام رہا تھا۔ کیا تھا جو اسے پہلے پتا ہوتا تو وہ اچھا سا گفٹ ہی دے دیتا حنایا کو۔

"کیا ہوا شاہ ویر۔" بہت دنوں بعد وہ پریشان سا نظر آیا تھا۔

"حنایا کی برتھ ڈے تھی اور میں کچھ گفٹ نہیں کر سکا اس کو۔" بغیر کوئی تمہید باندھے اس نے بتایا تھا۔

"تو اتنی بری بری شکلیں بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کو ساتھ لے جاؤ مارکیٹ اور جو وہ چاہے

لے لو بیٹا اس کو۔"

وہ دل لگا کر تیار ہوا تھا اور اب خاور انکل کے سامنے یوں بیٹھا تھا جیسے خود اپنے رشتے کی بات کرنے آیا ہو۔ چائے کا کپ سامنے رکھا تھا۔

"وہ انکل! عنایا سے کام تھا مجھے۔" پندرہ منٹ کی کوشش کے بعد بالآخر اس نے کہہ ہی دیا تھا۔

"وہ بیٹا عنایا تو احد کی طرف گئی ہے۔ ابھی تمہارے آنے سے چند منٹ پہلے ہی گئے ہیں وہ دونوں۔"

شاہ ویر کی تمام خوشی ہوا ہوئی تھی۔ پھیکے پڑتے چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ سجائی تھی۔

"میں چلتا ہوں پھر۔ اکیڈمی میں ہی بات کرلوں گا اس سے" وہ فوراً کھڑا ہوا تھا۔

"ارے بیٹا! تم نے تو چائے بھی نہیں پی۔"

"پھر کبھی سہی۔ ابھی بس۔"

وہ یہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔

آج کا تو دن ہی برا تھا۔ آدھی رات تک جاگنے کے بعد اس نے بالآخر نتیجہ اخذ کرلیا تھا۔

☆☆☆

صبح وہ سب لان میں بیٹھے تھے۔ گروپ اسٹڈی کررہے تھے جب عنایا نے شاہ ویر کی عدم توجہ کے باعث اس کی پریشانی کو بھانپا تھا۔ نظروں کے ارتکاز پر شاہ ویر نے چہرہ اوپر اٹھا کر اردگرد دیکھا تھا۔

تب ہی عنایا نے ہاتھ کے اشارے سے پوچھا تھا کیا ہوا؟

شاہ ویر نے مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"تو عنایا کو پتا چل جاتا ہے کہ میں اداس ہوں۔" خیال ذہن میں آتے ہی وہ خوش ہوا تھا۔

احد نے ترچھی نظر سے ان اشاروں کنایوں کو دیکھا تھا۔

"عنایا سے بات کرنا پڑے گی۔" اور اس سے پہلے کہ کوئی بات ہوتی اس خبر نے ان کے حواس اڑائے تھے کہ ٹیسٹ کی ڈیٹ اناؤنس کردی گئی ہے۔

☆☆☆

"تیرے ایسے سوگ منانے سے کیا چکی ٹھیک ہوجائے گی۔" رشیدہ نے تسبیح کرتے ہوئے کوئی تیسری بار یہ بات کہی تھی۔

"اللہ کی مصلحت ہوتی ہے ہر کام میں۔ چل اٹھ کر شکر ادا کر، کوئی بڑا نقصان نہیں ہوا۔"

وہ جو منہ سر لپیٹے پڑی تھی۔ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھی تھی۔

"کیا مصلحت اماں! وہ راجا چکی جان بوجھ کر خراب کرکے ہمارے سر پر تھوپ دے۔ یہ اللہ کی مصلحت ہے؟ اور بڑا نقصان کیا ہوتا ہے یہی بڑا نقصان ہے۔

چار مہینے لگا کر وہ جگہ تیار کی تھی۔ اتنے پیسے لگائے اور تو کہہ رہی ہے کہ بڑا نقصان نہیں ہوا۔ اور میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں اماں! یہ دکھوں پر بھی جو تو شکر پڑھنے بیٹھ جاتی ہے نا یہ منافقت چھوڑ دے اب۔"

بے بس آنکھوں کے آنسو باہر نکلنے کو بے تاب تھے۔ رشیدہ اپنی چارپائی سے اٹھ کر اس کی چارپائی پر بیٹھی تھی۔

"دیکھ پتر! دکھ پر صبر آنا بھی بڑی نعمت ہے اور نعمتوں کا شکر ادا نہ کرنا کفر، جہاں تک بات ہے بڑے نقصان کی تو سب سے بڑا نقصان کسی اپنے کے مرجانے کا ہے۔ شکر کر، یہاں سب سلامت ہیں۔ سلامتی ہی سب کچھ ہے زینب۔"

اور زینب نے سوچا تھا بس اب وہ آخری بار روئے گی۔

"اور چکی ٹھیک ہوجائے گی۔ تیرا باپ مکینک کو دکھا رہا ہے نا۔" اس کے دل کی حالت کے پیش نظر رشیدہ نے جھوٹی تسلی دی تھی کیونکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ گاؤں کے مکینک سے تو یہ چکی بھی ٹھیک نہیں ہوسکتی۔

☆☆☆

چوبیس گھنٹے گزرنے کے بعد بھی شاہ ویر مسعود کو اپنی کامیابی کا یقین نہیں آیا تھا۔ زندگی کا یہ رخ تو اس

نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا تو ثابت ہوا کہ انسان کے ساتھ جو کچھ ہوتا ہے۔ وہ اس کی سوچ کے مطابق نہیں اللہ کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔

عنایا خاص طور پر مبارک باد دینے آئی تھی باقی سب کی طرف سے بھی ڈھیروں مبارک بادیں ملی تھیں اور وہ حیران تھا کہ سب کے لیے اتنا خاص کب سے ہو گیا۔ اور اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ آج یونیورسٹی جانے سے سب سے پہلے عنایا کا شکریہ ادا کرے گا کیونکہ اس پورے سفر میں اس کا کردار بہت اہم رہا تھا۔

عنایا نے سکھایا تھا کہ مشکلوں کو سر پر سوار نہیں کیا جاتا۔ بلکہ آسانیاں پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ اس نے اپنی زندگی میں عورت ذات کے حوالے سے صرف عنایا کو جانچا تھا۔ لیکن وہ اپنے آپ سے بھی یہ کہنے سے ڈرتا تھا۔ کہ شاہ ویر مسعود کو عنایا خاور سے محبت ہو چکی ہے۔

مسعود احمد کے ساتھ اس نے یونیورسٹی میں قدم رکھا تھا اور مسعود احمد کو محسوس ہوا تھا۔ زندگی بھر کی محنت وصول ہو گئی ہے۔ اپنے ساتھیوں سے اس کا تعارف کرواتے وہ خوشی کی آخری حد کو چھو رہے تھے۔

شاہ ویر کے پروفیسر سے ایک خصوصی اور خفیہ میٹنگ کے بعد وہ مطمئن تھے کہ اگر اپنے بیٹے کے مستقبل اور خوشی کے لیے وہ سیاہ و سفید کا فرق بھلا بیٹھے ہیں تو یہ کچھ غلط بھی تو نہیں ہے۔

پہلے سمسٹر کا رزلٹ اگر بہترین نہیں تھا تو اتنا برا بھی نہیں تھا۔ عنایا اس کا یوں خیال رکھتی جیسے کسی چھوٹے بچے کا رکھا جاتا ہے۔ اور یہی بات احد کے اندر چھپی چنگاری کو جلتا الاؤ بنا چکی تھی۔ اور اس نے سوچا تھا کہ اب بس تماشا ختم ہو ہی جائے تو بہتر ہے۔

بہت روشن دن طلوع ہوا تھا۔ لیکن محبت کی نگری کو سیاہ کرنے والا تھا۔ قیمتی انگوٹھی کو جیکٹ کی اندرونی جیب میں رکھتے اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔

"بابا! میں ٹھیک لگ رہا ہوں ناں۔" گاڑی میں بیٹھنے تک اس نے کوئی پانچویں بار اسی قسم کا سوال پوچھا تھا۔ مسعود احمد نے چہرہ موڑ کر غور سے اس کو دیکھا تھا۔

"بالکل بھی ٹھیک نہیں لگ رہے تم۔ کیا اجارل سوال پوچھ رہے ہو بابا! یہ شرٹ ٹھیک ہے یا نہیں جیکٹ سوٹ کر رہی ہے۔ جرابیں اچھی ہیں یا نہیں۔ بیٹا جی یونیورسٹی جا رہے ہو یا ولیمہ کی دلہن پر اپنا امپریشن ڈالنے۔" بے عزتی کے ساتھ تفصیلی جواب دیا تھا۔

"بابا! آپ بھی ناں، جو پوچھا ہے، وہ بتا دیں۔" شاہ ویر کی سوئی ابھی بھی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

"عنایا سے پوچھ لینا۔" مسعود احمد نے دل کی بات پکڑی تھی۔ "اور یہ جو بات چھپانے کی کوشش میں ہلکان ہو رہے ہو نا ادھر سامنے ماتھے پر لکھی ہوئی ہے تمہارے۔" مسعود احمد نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بتایا تھا۔

"اگر آپ کو پتا چل ہی گیا ہے تو ایسے شرمندہ کیوں کر رہے ہیں۔ دعا کریں نا، سب اچھا ہو جائے۔" پیشانی سے ان کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے وہ شرمندہ سے لہجے میں بولا تھا۔

"لڑکیاں بھی اتنا نہ شرمائیں یار! جتنی بری حالت تمہاری ہے۔"

اور ان کی کہی بات من و عن سچ ثابت ہوئی تھی۔

وہ شرمانے کے بجائے حیرت سے منہ کھولے کبھی سامنے ٹیبل پر پڑی انگوٹھی کو دیکھتی تو کبھی شاہ ویر کے سرخ چہرے کو۔

"لیکن میں یہ رنگ نہیں لے سکتی شاہ ویر۔"

اس کا دل شاید دھڑک دھڑک کر تھک چکا تھا۔

ایک پل کو رکا تھا۔

"کیوں؟"

"کیونکہ تیرے جیسا نالائق شخص جو ہمدردی اور محبت کا فرق ہی سمجھ نہ پائے اس سے کوئی بھی تعلق کیسے جوڑا جا سکتا ہے۔"

زہر اگلتا ہوا وہ سامنے آ کر کھڑا ہوا تھا اور

گریبان سے پکڑ کر شاہ ویر کو اپنے سامنے کھڑا کیا تھا۔
"یہ احد یہاں کیوں آ گیا!" منتایا کی جان حلق میں اٹکی تھی۔
شاہ ویر بس پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی احد کو دیکھتا کبھی زرد پڑی منتایا کو۔
"چھوڑو احد اس کو۔" منتایا نے احد کے ہاتھ سے شاہ ویر کا کالر چھڑایا تھا۔
"بس منتایا بہت کر لیا تم نے انکل کے جڑے ہاتھوں کا لحاظ، ہمت کیسے ہوئی اس کمینے کی کہ یہ میری منگیتر پر نظر رکھے۔"
منتایا کو ایک ہاتھ سے پیچھے دھکیلتے وہ پھر سے سامنے آیا تھا۔
"کیا بکواس کر رہے ہو تم اور یہ کمینہ کس کو بولا تم نے۔"
لفظ "میری منگیتر" نے شاہ ویر مسعود کے اندر آگ بھر دی تھی۔ شاہ ویر نے دونوں ہاتھوں سے اسے پیچھے دھکا دے کر گرانے کی کوشش کی تھی۔ زمین پر گرتے ہی وہ ہنسنے لگا۔
"ہماری بلی ہمیں کو میاؤں۔" شاہ ویر جارحانہ تیور لیے پھر اس کی جانب بڑھا تھا۔
اور منتایا احد کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں کا مفہوم سمجھتے وہ حیران ہوا تھا۔ اور منتایا نظریں چراتے ہوئے وہاں سے نکل گئی تھی۔
وہ عجیب سی ہنسی تھی چڑاتی ہوئی۔ نیچا دکھانے جیسی، شاہ ویر نے اس کا جبڑا سخت ہاتھوں سے پکڑ کر جیسے ہنسی روکنے کی کوشش کی تھی۔
"کیا مطلب ہے اس بات کا ہاں؟" سرخ آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑھے وہ ہر بات اگلوانا چاہ رہا تھا۔
"مطلب اپنے باپ سے پوچھ جا کر جو تیرے لیے لوگوں کی ہمدردیاں خریدتا پھرتا ہے۔"
احد نے اپنا منہ چھڑا کے اسے دھکا دے کر نیچے گرایا تھا۔ اور اپنا گھٹنا اس کے سینے پر رکھ کر اسے سامنے سے روکا تھا۔ اور شاہ ویر ابھی تک پچھلی بات پر ہی اٹکا تھا۔
"تیرے باپ نے ہاتھ جوڑے تھے منتایا کے سامنے کہ وہ تجھ سے دوستی کرے اور ہم سب سے بھی ریکویسٹ کی کہ تیری نالائقی کا مذاق نہ اڑائیں۔ تجھ سے دوستی کریں، ہم تیرے ساتھ ہمدردی کر رہے تھے اور تو کمینگی دکھا رہا ہے۔" وہ بس عجیب سی نظروں سے زہر اگلتے احد کو دیکھ رہا تھا۔
"اکیڈمی کے پروفیسرز کو لاکھوں روپیہ دے کر خریدا ہے تیرے باپ نے اور یونیورسٹی کے پروفیسرز کو تو پتا نہیں کیا کیا دیا ہوگا صرف اس لیے کہ وہ تجھے ڈی گریڈ نہ کریں اپنے بل بوتے پر تو نے کچھ نہیں کیا شاہ ویر مسعود! تیرے تو نہ پر اپنے ہیں نہ پیروں کے نیچے کی زمین اپنی۔ تیرے باپ کی دی ہوئی بیساکھیوں نے آج تجھے اتنا دلیر بنا دیا کہ تو میری منتایا پر ہاتھ ڈالنے آ گیا۔"
سینے پر دباؤ کچھ زیادہ ہی بڑھا تھا۔ اس نے پوری قوت لگا کر احد کو دھکا دیا تھا۔
"بکواس کر رہا ہے تو میرا باپ کبھی یہ نہیں کر سکتا...... کبھی نہیں سنا تو نے۔"
زوردار مکا احد کی ناک پر لگا تھا۔ وہ پھر سے ہنسا تھا۔
"ہمم سے پاگل کتا لگ رہا ہے تو......" ہاتھ کی پشت سے ناک سے نکلتا خون صاف کیا تھا۔ شاہ ویر کو لگ رہا تھا ان باتوں نے جیسے اس کی ساری طاقت چھین لی ہو۔ وہ احد کا منہ توڑنا چاہتا تھا۔ اس کی ہمت کیسے ہوئی اس کے باپ کے بارے میں ایسی بات کرنے کی ۔ بے جان ہاتھوں سے اس نے دوبارہ احد کا گریبان پکڑا تھا۔
"بس بہت سن لی تیری بکواس۔ آگے ایک لفظ بھی بولا تو زبان کھینچ لوں گا تیری۔" معدوم ہوتی دھڑکنوں کو سنبھالتے وہ پھر سے غرایا تھا۔
"میں نے بھی بہت سن لی تیری میں۔" احد نے الٹے ہاتھ کا تھپڑ اس کے منہ پر مارا تھا۔
"آئندہ میری منتایا کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی

دیکھا تو تیری یہ خوب صورت آنکھیں نکال کر ہتھیلی پر رکھ دوں گا۔"

دھکا دے کر اسے نیچے گرایا تھا اور خود شرٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے باہر نکل گیا تھا۔

وہ وہیں پڑا تھا۔ ہونٹ سے رستا خون تھوڑی تک پہنچ گیا تھا۔ آنکھوں سے ٹپکتے آنسو بالوں میں جذب ہوئے تھے۔ سوچ کے تانے بانے سب ادھڑ کر رہ گئے تھے۔ بے آواز اس کے ہونٹوں سے بس ایک ہی لفظ نکلا تھا۔

"بابا!"

☆☆☆

چکی ویسے ہی خراب پڑی تھی۔ زینب رشیدہ کے ساتھ آلو کی بوریاں بھرنے جاتی۔ سارے خوابوں سے نظر ہی چرا کر اسے لگا تھا شاید زندگی اب سکون سے گزر سکتی ہے۔

وہ دونوں ابھی روٹی کھانے بیٹھی ہی تھیں کہ رضیہ کا بھائی حسن زرد چہرہ لیے بھاگتا آیا تھا۔

زینب کے دیکھتے دیکھتے ہی وہ دو بار گرا تھا۔ منہ تک جاتا نوالہ ہاتھ میں ہی معلق رہ گیا تھا۔

"چاچی! اصغر مر گیا، وہ پتا نہیں کیا ہو گیا اس کو۔" رشیدہ کے ہاتھ سے نوالہ چھوٹ کر گرا تھا۔ دل حلق سے باہر آنے کو تیار تھا۔

"کیا بکواس کر رہا ہے حسن!"

"ہم اسکول سے واپس آ رہے تھے۔ گاڑی نے ٹکر ماری اصغر کو۔" آنکھوں کے آگے اندھیرا چھایا تھا ماں کی شکل دیکھتے ہوئے اپنے مختل حواس کو یکجا کیا تھا۔

"بہت خون نکل رہا تھا پھر آپ کے تایا جی اٹھا کر ہسپتال لے گئے۔"

رشیدہ بمشکل اپنے پیروں پر کھڑی ہوئی تھی۔ زینب جلدی جلدی اس کے پیچھے بھاگنے لگی تھی مڑ کر ماں کو دیکھا تھا جو ابھی تک کھڑے ہونے کی کوشش میں ہلکان تھی۔

"جلدی کر اماں!" حلق کڑوا ہو چکا تھا۔ ماں کا ہاتھ پکڑ کر وہ اسے اپنے ساتھ گھسیٹنے لگی تھی۔

سبز خیالے درختوں کو دیکھتے ہوئے اسے کسی کی کہی بات یاد آئی تھی۔ "درختوں کا خیال رکھو تو وہ انسان کے لیے دعا گو رہتے ہیں۔"

اور زینب نے تو کبھی کسی کو ان درختوں کے پتے بھی نہیں توڑنے دیے تھے۔

"گاڑی کس کی تھی حسن؟" لرزتی آواز میں اس نے اپنے آگے چلتے حسن سے پوچھا تھا۔

وہ ایک دم رکا تھا تو زینب کو بھی رکنا پڑا تھا۔

"بتا نا کس کی تھی گاڑی؟"

"وہ نا، راجے کی گاڑی تھی اور وہ خود چلا رہا تھا۔"

ہکلاتے ہوئے حسن نے بات مکمل کی تھی۔

☆☆☆

زرد روشنی میں وہ شاہ ویر کے سامنے یوں کھڑے تھے کہ آئندہ کبھی اس کے سامنے نظر نہیں اٹھا سکیں گے۔

"آپ نے اکیڈمی کے پروفیسر کو پیسے دیے یا نہیں؟" اس نے پھر سے اپنا سوال دہرایا تھا۔

"میری بات سنو شاہ ویر!" مسعود احمد نے شاہ ویر کا ہاتھ پکڑا تھا۔ جسے اس نے فوراً چھڑایا تھا۔

"کوئی بات نہیں سنی مجھے آپ کی صرف ہاں یا نہ میں جواب دیں؟" ان کی آنکھوں میں دیکھتا وہ بدتمیزی سے بولا تھا۔

"ہاں دیے تھے لیکن صرف اس لیے کہ وہ تم پر زیادہ توجہ دیں اور بس۔"

"وضاحتیں نہیں چاہئیں مجھے۔ آپ نے تایا کے سامنے ہاتھ جوڑے۔ آپ نے ان سب سے میرے لیے اچھے روپوں کی بھیک مانگی۔"

ایک ہاتھ سے آنسو پونچھتے اس نے اپنا سوال کیا تھا۔ اس کے آنسو دیکھتے ہوئے مسعود احمد کا دل دکھ سے بھر اتھا۔

"میری بات سمجھنے کی کوشش کرو یار۔"

"کوئی بات نہیں سنی مجھے آپ کی۔ ہاں یا نہ؟"

"ہاں، میں نے کہا تھا اس سے کہ وہ تم سے دوستی کرے اس لیے کہ تمہیں دوستوں کی ضرورت تھی۔"

"آپ نے یونیورسٹی کے لیکچرارز سے بھی یہ بات کی۔ آج تک میں صرف اس ایک بات پر خوش تھا کہ میں نے مشکلیں برداشت کیں لیکن کبھی کچھ غلط نہیں کہا۔"

"آپ نے مجھ سے میرا یہ غرور بھی چھین لیا۔ آپ کو نہیں پتا ان جھوٹی دوستیوں کے چکر میں آپ نے مجھے کس اذیت بھرے راستے ڈال دیا۔ میں عنایا کی نظروں میں گر۔ گیا وہ سب کیا سوچتے ہوں گے میرے بارے میں۔ آپ نے تو مجھے میری نظروں میں گرا دیا بابا۔"

زمین پر بیٹھ کر اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں پر گرایا تھا۔

"میں ٹھیک تھا اپنی جگہ کہ لوگ اچھے نہیں ہوتے پر آپ ہی تھے جس نے مجھے اس بات پر اعتبار کرنے کو کہا کہ اللہ نے بہترین لوگ بنائے ہیں۔ پھر آپ نے یہ جھوٹ بولا کہ اللہ ہر انسان کو اتنا ہی دکھ دیتا ہے جتنا وہ برداشت کر سکے۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ کوئی خوشی نہیں لکھی اس نے میرے مقدر میں۔ میری ماں کو چھین لیا، میری بہن کو دور کیا آپ نے مجھ سے۔"

اسے ہر پرانا دکھ یاد آیا تھا۔ وہ روتے ہوئے زور زور سے بول رہا تھا۔ اور مسعود احمد ہارے ہوئے سے اس کے سامنے بیٹھے تھے۔

☆☆☆

تین دن کے جان لیوا انتظار کے بعد اصغر کو ہوش آیا تھا۔ سر پر چوٹ لگنے کی وجہ سے زیادہ خون بہہ گیا تھا۔ ڈاکٹر نے تفصیلی معائنے کے بعد ڈسچارج کر دیا تھا۔

"صرف اس بات کا خیال رکھیں کہ یہ دائیں طرف کروٹ نہ لیں۔"

پوری رات زینب نے اس کے سرہانے بیٹھ کر جاگ کر گزاری تھی کہ کہیں وہ سوتے میں کروٹ نہ لے لے۔ ان تین دنوں میں اس نے جانا تھا کہ واقعی زندگی میں سب سے بڑا نقصان کسی اپنے کے چھوڑ جانے کا ہے۔ اس نے دل سے شکر ادا کیا تھا کہ اللہ نے اس کی ہی التجاؤں کی لاج رکھ لی۔

راجے کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوئی تھی اس کے باپ کو تو ہسپتال کے چکروں اور ڈاکٹروں کی منت ترلے سے فرصت ملتی بھی تو وہ اس بارے میں کچھ سوچتا۔

صبح وہ فجر کی نماز کے بعد سونے کے لیے لیٹی تھی کیونکہ اصغر کے پاس فوزیہ بیٹھ گئی تھی۔ ابھی اسے سوئے کچھ دیر ہی گزری تھی کہ رشیدہ نے اس کا کندھا ہلایا تھا۔

"جی اماں!" وہ فوراً اٹھی تھی۔

"اصغر کو دیکھ، کب سے رو رہا ہے کہ درد زیادہ ہو رہا ہے۔"

وہ فوراً اصغر کی چارپائی تک پہنچی تھی۔ درد سے اس کا چہرہ مزید زرد ہو رہا تھا۔

"چل اماں! ڈاکٹر کے پاس لے چلتے ہیں۔"

"میں دیکھ کر آئی ہوں کوئی ڈاکٹر نہیں بیٹھا ڈسپنسری والے دوائی نہیں دے رہے اور پہلے والی دوائی سے فرق نہیں پڑا کوئی۔ رضیہ کی ماں بتا رہی تھی کہ اہل آئی ہوئی ہے شہر سے۔ وہ بھی تو ڈاکٹرنی بن رہی ہے تیری تو بچپن کی سہیلی ہے وہ تو جا کر کوئی دوائی پوچھ آ اس سے۔"

"تو بھول رہی ہے اماں! راجے کی بھانجی ہے وہ۔"

"جھلے، وہ دل کی بہت اچھی ہے کبھی انکار نہیں کرے گی۔"

"لیکن اگر وہاں راجا ہوا تو؟" وہ اب اصغر کا بخار چیک کر رہی تھی جو تیز ہوا تھا۔

"تیرا ابا تو کہہ رہا تھا کہ جس دن سے ٹکر ماری ہے اس نے۔ گاؤں والوں نے شکل نہیں دیکھی اس کی اور چاچا خیرو نے بھی بتایا کہ شہر گیا ہوا کم کے لیے۔"

کالی چادر اوڑھ کر وہ باہر نکلی تھی ہر اٹھتے قدم کے ساتھ اس نے شکر ادا کیا تھا۔ اللہ نے اس کی زندگی کو ایک بہت بڑے خالی پن سے بچالیا۔ وہ حویلی کے دروازے پر پہنچ کر پل بھر کو رکی تھی وہ بچپن میں یہاں آیا کرتی تھی۔ ایل سے اس کی دوستی کے باعث وہ اکثر یہاں پائی جاتی تھی۔

ایل کی معصومیت اور اچھائی نے زینب کو حیران کیا تھا کہ ایسی ماں کی ایسی بیٹی بھی ہو سکتی ہے۔ اس کی نظروں میں زہرہ بیگم کا چیختا چنگھاڑتا روپ جیسے ثبت تھا۔

وہ کب چلتی ہوئی لان کے وسط میں پہنچی اسے پتا نہیں چلا تھا۔ اور جب آنکھیں کھلیں تو سامنے کے منظر نے ہوش اڑا دیے تھے۔

☆☆☆

قیمتی لیمپ کو ٹھوکر سے گراتے وہ روتا ہوا انس دیا تھا۔

"اللہ رحیم و کریم ہے۔" مسعود احمد کی دھیمی سی آواز گونجی تھی اور لاؤنج کا گجر کا گئی تھی۔

مسلسل ہوتی دستک نے اس کے غصے کو اور بڑھا دیا تھا۔ پرفیوم کی قیمتی ڈریسنگ کے شیشے پر مارتے اس نے اپنا عکس مٹانے کی کوشش کی تھی۔ اور باہر کھڑے مسعود احمد کا دل ڈر سے بھرا تھا۔ عکس مٹا تو کیا۔ مزید ٹکڑے ٹکڑے ہوا تھا۔ دستک دیتے ہاتھ بے جان سے ہوئے تھے۔ لیکن دروازہ زور سے دھڑ دھڑایا تھا۔

"جائیں آپ یہاں سے۔ آپ کے پڑھائے ہوئے سبق نے ڈبو دیا مجھے۔" شاہ ویر حلق کے بل چلایا تھا۔

"آپ نے کہا تھا اللہ سے محبت کرو۔ اس کی بنائی مخلوق سے محبت کرو۔"

آس و امید سے عاری ہوئی آواز نے باہر کھڑے وجود کو جیسے برف کیا تھا۔ دستک دیتا ہاتھ منجمد ہوا تھا۔

"ہرا دیا، آپ نے مجھے ہرا دیا۔" وہ حواس کھوتا ہوا بس گر سا گیا تھا۔ مسعود احمد ٹوٹے پھوٹے دل کے ساتھ وہیں بیٹھ گئے۔ اپنے بکھرے حواسوں کو یکجا کرتے وہ اٹھا تھا اور بیڈ کے نیچے سے ٹرالی بیگ کھینچنے لگا تھا تمام ہمت تو ختم ہو چکی۔

☆☆☆

مسعود احمد نے لان میں جائے نماز بچھائے ہوئے فریادی نظروں سے ٹی وی لاؤنج کے دروازے کو دیکھا تھا۔ کچھ دیر انتظار کے نیت باندھی تھی۔ تب ہی شاہ ویر بیگ اٹھائے باہر آیا تھا۔ ایک نظر مسعود احمد پر ڈالی تھی جن کے چہرے پر چمکتے آنسوؤں نے شاہ ویر کو رک کر دیکھنے پر مجبور کیا تھا۔ نظریں پھیری تھیں اور سر جھٹک کر آگے بڑھا تھا۔

"دروازہ کھولو اشرف۔" لرزتے لہجے پر قابو پاتے ہوئے اس نے چوکیدار کو کہا تھا۔ جو منہ کھولے کبھی مسعود احمد کو دیکھتا تو کبھی سامنے کھڑے شاہ ویر کو جو بیگ تھامے یہاں سے بھاگ جانے کو تیار تھا۔

"وہ جی بڑے صاحب نے کہا تھا کہ فجر کی اذان سے پہلے گیٹ نہ کھولوں۔" شاہ ویر کی شکل دیکھتے اس نے ڈرتے ہوئے کہا تھا۔

"میں کہہ رہا ہوں، گیٹ کھولو۔" شاہ ویر نے غصے سے کہا تھا۔

"ان کو کیسے پتا چل گیا کہ میں ابھی جاؤں گا۔" دل ہی دل میں سوچتے وہ حیران ہوا تھا۔ اشرف نے نظریں چرائی تھیں۔

"ٹھیک ہے، میں خود کھول لیتا ہوں۔" وہ بیگ زمین پر رکھتے آگے بڑھا تھا۔ اشرف فوراً سامنے آیا تھا۔

"میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں صاحب جی! کچھ دیر انتظار کرلیں۔" مسعود احمد نے درود شریف پڑھتے ہوئے اس تکرار کو سنا تھا۔

وہ اب وہیں اشرف کی کرسی پر بیٹھ گیا تھا آدھے گھنٹے بعد فجر کی اذان ہوئی تھی۔ اللہ اکبر کی صدا سنتے ہی وہ فوراً کھڑا ہوا تھا۔

"ابھی اذان نہیں ختم ہوئی۔" اس نے ایک نظر مسعود احمد کو دیکھا تھا۔ جواب اسی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ کھنکھارتا ہوا لان تک پہنچا تھا۔

"اشرف سے کہیں، گیٹ کھولے۔" وہ نظریں جھکائے کہہ رہا تھا۔

مسعود احمد اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے تھے۔

"گیٹ کھول دو اشرف!" انہوں نے وہیں سے کہا تھا۔

شاہ ویر واپس جانے کو مڑا تھا۔ جب مسعود احمد نے ہاتھ پکڑ کر روکا تھا۔

"جانے سے پہلے مل تو لو یار!" مسعود احمد نے زبردستی گلے سے لگایا تھا اور جیب سے ایک لفافہ نکال کر اس کی طرف بڑھایا تھا۔

"یہ رکھ لو۔"

"نہیں چاہیے مجھے۔" ہاتھ چھڑاتے ہوئے وہ پیچھے ہٹا تھا۔

مسعود احمد ایک قدم آگے بڑھے تھے اور اس کی جیکٹ کی جیب میں لفافہ اڑسا تھا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ لفافہ جیب سے نکال کے سامنے کھڑے باپ کو واپس کر دیتا۔ وہ خاموشی سے مڑا۔ اور باہر نکلتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔

"ایک بار بھی نہیں روکا مجھے۔"

بچے یونیفارم پہنے اسکول جا رہے تھے جب شاہ ویر نے گاؤں کی حدود میں قدم رکھا تھا۔ اس کا دماغ فی الحال اسی کش میں اٹکا تھا جس سے تمام یادوں کے تانے بانے جڑے تھے۔ راجے کے گھر کا پتا پوچھتا وہ مطلوبہ جگہ تک پہنچ گیا تھا۔

جونہی حویلی کا دروازہ کھلا تھا سامنے کے منظر نے شاہ ویر کو بوکھلا دیا تھا۔

☆☆☆

سامنے سے آتے راجے کے قدم زینب کو دیکھ کر تیز ہوئے تھے۔ حواس باختہ سی زینب نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تھی۔

"یہ تو شہر گیا ہوا تھا۔" وہ مالی لان کی کانٹ چھانٹ میں مصروف تھے اور ایک مونچھوں کو تاؤ دیتا گیٹ پر کھڑا تھا۔

دھڑکتے دل کو سنبھالتے اس نے قدموں کا رخ موڑا تھا، بائیں ہاتھ بڑا سا لان تھا اور دائیں ہاتھ انیکسی کی طرف وہ تیز قدموں سے بڑھی تھی جب راجے کی آواز سنتے اس کا دل حلق میں اٹکا تھا۔

"اب آ ہی گئی ہے تو دو گھڑی کہیں تک تو سہی۔" وہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا تھا۔

اور زینب کو لگا تھا یہاں آنا اس کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ بس دو قدموں پر ہی تو تھی انیکسی اس کی رفتار اور تیز ہوئی تھی۔ جب ساتھ چلتے شخص کا ضبط جواب دے گیا تھا، درشتی سے بازو پکڑ کے اپنی طرف کھینچا تھا۔

"بس بہت ہوگئی تیری جی داری۔"

سرخ آنکھوں میں دیکھتی وہ اندر تک لرز گئی تھی۔ مسلسل ہاتھ چھڑانے کی کوشش میں اب وہ بے بس ہونے لگی تھی۔

جونہی اس نے چلانا شروع کیا تھا، کام کرتے مالی اور چوکیدار دونوں غائب ہوئے تھے۔ اس نے ہاتھ چھڑایا تھا اور راجے نے اس کی گردن دبوچ لی تھی۔ گردن پر دباؤ بڑھتے ہی اس نے سوچا تھا مرنا عزت گنوانے سے بہتر ہے۔

اس نے ہار مان لی تھی۔ وہ اس سانڈ جیسے شخص کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ آنکھیں بند کرتے وہ کسی معجزے کے انتظار میں نہیں تھی۔ گردن سے پکڑ کے اس نے گھسیٹنا شروع کیا تھا جب ایک سرد آواز نے راجے کی گرفت کو ڈھیلا کیا تھا۔

"کیا ہو رہا ہے یہ، چھوڑیں اسے" وہ جو کوئی بھی تھا دور سے ہی چلایا تھا۔

"تو معجزے بھی ہوتے ہیں۔" قطعی اجنبی شخص کو دیکھتے اس نے سوچا تھا۔ جواب جھک کے اس کا دوپٹا اٹھا رہا تھا۔

زینب نے راجے پر ڈالی تھی تو کیا فرعون بھی

شرمندہ ہوتے ہیں۔
"شرم آنی چاہیے آپ کو ایسی حرکتیں کرتے ہوئے۔" دوپٹہ زینب کی طرف بڑھاتے ہوئے بھی اس کا مخاطب راجا ہی تھا۔ غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔
"میری بات سنو بیٹا! تم غلط سمجھ رہے ہو۔"
راجا اس کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ شہر جاتا رہتا تھا اس لیے۔ راجے نے نئی کہانی گھڑنے کا سوچا بھانجے کے سامنے عزت رہ جائے۔ دوپٹہ پکڑنے کے بعد بھی وہ وہیں کھڑی تھی۔ اس کی ٹانگوں میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ چل سکتی۔
"سب دیکھ چکا ہوں میں اور آپ پلیز جائیں یہاں سے۔"
"شاہ ویر! بات سنو میری۔" راجے نے پھر سے وضاحت دینی چاہی تھی۔
"کوئی بات نہیں سننی مجھے۔" ہاتھ جھٹک کے وہ انیکسی کی جانب بڑھا تھا۔ اور زینب نے شکر ادا کرتے حویلی کے دروازے سے باہر قدم رکھا تھا۔
"تو اللہ نے بچا لیا مجھے۔" وہ ابھی تک حیران تھی۔
وہ انیکسی میں داخل ہو رہا تھا جب سامنے کھڑی لڑکی اسے دیکھ کر منجمد ہوئی تھی۔
"آپ یہاں؟" وہ بس اتنا ہی بول پائی تھی۔ اب اس بات کا وہ کیا جواب دیتا، چپ چاپ کھڑا رہا۔
"امی! شاہ ویر بھائی آئے ہیں۔" لڑکی نے وہیں کھڑے اونچی آواز میں کہا تھا۔
شاہ ویر نے چونک کے اس کی طرف دیکھا تھا۔ تو وہ امل تھی۔ اس کی حیرانی دیکھتے ہوئے شاہ ویر کی آنکھوں میں نمی اتری تھی۔ اور وہ حیران تھا کہ امل نے اس کو کیسے پہچان لیا۔ وہ اپنی جگہ پر ساکت کھڑی تھی۔
"آپ بابا کو کیوں چھوڑ آئے؟" بغیر سلام دعا کیے اس نے اگلی بات کی تھی۔ تب ہی زہرہ بیگم لاؤنج میں داخل ہوئی تھیں۔
"میرا بیٹا آگیا۔" انہوں نے سامنے کھڑے شاہ ویر کو گلے لگایا تھا۔ وہ ویسی نہیں تھیں جب شاہ ویر کو چھوڑ کے گئی تھیں وہ ویسی تھیں جیسی جوان بیٹیوں کی ماؤں کو ہونا چاہیے۔
"میں جانتی تھی میرا بیٹا ضرور آئے گا۔ ہمیشہ کے لیے آگیا نا تو۔" وہ اس کا ہاتھ تھامے پوچھنے لگی تھیں۔ امل وہاں سے ہٹ چکی تھی۔
"نہیں۔ ملنے کے لیے آیا ہوں۔" عجیب سے احساسات میں گھرے شاہ ویر نے جواب دیا تھا۔ وہ خوش کیوں نہیں ہوا تھا۔
"جانتی تھی میں، وہ ذلیل شخص کبھی کسی کو خوش نہیں رہنے دیتا۔" زہرہ بیگم صوفے پر بیٹھتی کہہ رہی تھیں۔
"پانی پی لیں۔" نارمل سی آواز پر اس نے سر اٹھا کر امل کو دیکھا۔ یہ نازک سی پیاری سی لڑکی اس کی چھوٹی بہن ہے، وہ یہاں نہیں آتا تو ساری زندگی اس کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ لیکن وہ اس کے آنے پر خوش کیوں نہیں تھی۔ اس کا جواب بہت جلد ملنے والا تھا۔ اور ایسا جواب جو سارے سوال لے ڈوبا۔

☆☆☆

وہ بے دلی سے کھانا کھا رہا تھا جب زہرہ بیگم دوبارہ اس کے پاس آ کر بیٹھی تھیں۔
"تیرے ساتھ کیا غلط کیا۔ اس نے؟"
اور وہ چپ رہا تھا۔
"میری تو زندگی برباد ہوگئی اس کے ساتھ ویاہ کر کے۔ حق ہاہ کہتا تھا میرے معذور باپ کی خدمت کر میں کوئی کمی کمین تھی جو باورچن اور دھوبن بنتی وہاں جا کر بتایا تو ہوگا تجھے تیرے باپ نے۔"
اور اس کے باپ نے تو کبھی کوئی بات ہی نہیں کی تھی۔ "میں بھی اڑ کے بیٹھ گئی کہ مجھے وکھرا گھر چاہیے، میں نہیں رہ سکتی اس گھر میں جہاں اس کا باپ کھانستا پھرے۔"

کیسا غرور تھا اس عورت کے لہجے میں۔
"بڑی منتیں کیں تیرے باپ نے پر میں نہ مانی۔"
باپ کی اس وقت کی بے بسی پر وہ دکھی ہوا تھا۔
"اور پھر جب تیرا دادا مر گیا تو آ گیا مجھے لینے میں اتنی کری پڑی تھی کہ پہلے میری خواہش کا احترام نہیں کیا۔ اب میں اٹھ کر چل پڑتی۔ میں اکلوتی بیٹی تھی اچھا باپ کی کیا کہا اس نے مجھے پھر اہل دے دیا اور تجھے رکھ لیا اپنے پاس، ویسے تو اہل بھی اس کے پاس ہی ہے میرا تو نام ہی ہے۔ بڑی کھوٹی نیت ہے تیرے باپ کی۔"
اس سے پہلے کہ گھٹن میں اضافہ ہوتا، وہ تڑپ کسمسا کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

☆☆☆

اصغر کی حالت اب پہلے سے بہتر تھی وہ سارا دن چکی کے پاس چارپائی پر بیٹھا آتے جاتے لوگوں کو دیکھا کرتا کہ یہ نیا مشغلہ اس کے ہاتھ آیا تھا۔ ٹریک سوٹ میں ملبوس شاہ ویر گاؤں کے دھول اڑاتے رستے پر بھاگتا جا رہا تھا جب اس کی نظر اس بچے پر پڑی تھی جو کچے گھر کے ساتھ بنے برآمدے میں چارپائی پر سر نیہوڑائے بیٹھا تھا سر پر پٹی بندھی تھی جانے کیوں اس کے قدم اس کی طرف بڑھے تھے۔ پھولی سانسوں کو درست کرتے اس نے وہ چھوٹی سی باڑ پھلانگی تھی۔
"ہائے لٹل اینجل" اس نے بشاشت سے کہا۔
اصغر نے سر اٹھا کر آنے والے کو دیکھا۔ زرد چہرے کے ساتھ وہ مسکرایا تھا۔
"میں یہاں بیٹھ جاؤں تمہارے پاس۔" شاہ ویر نے ہاتھ سے اشارہ کرتے پاس بیٹھنے کا پوچھا تھا۔
"جی، بیٹھ جائیں۔" وہ تھوڑا سا شرمایا تھا۔
"یہ چوٹ کیسے لگی ہے۔" ماتھے سے بال ہٹاتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔
"کسی گاڑی نے ٹکر ماری تھی۔"
"اوہ اب ٹھیک ہو نا درد تو نہیں ہو رہا زیادہ؟"
وہ فکرمندی سے پوچھ رہا تھا جب زینب دودھ کا گلاس لیے باہر آئی تھی۔
شاہ ویر کو دیکھتے ہی اس کے قدم وہیں تھمے تھے۔ اپنی پوری زندگی میں پہلی بار اس نے ایسا شاندار مرد دیکھا تھا۔ وہ مرعوب سی وہیں کھڑی ان کی باتیں سن رہی تھی جب شاہ ویر نے نظروں کا زاویہ بدل کے آنے والے کو دیکھا۔ چہرے پر نظر پڑتے وہ تھوڑا گڑبڑایا تھا۔
"آپا! یہ اہل باجی کے بھائی ہیں۔ ہمارا گاؤں دیکھنے آئے ہیں۔"
ایک دم ہی زینب کو شرم محسوس ہوئی تھی۔ وہ کیا سوچتا ہوگا اس کے بارے میں۔ چہرے سے نظریں ہٹاتے ہوئے اس نے دودھ کا گلاس اصغر کے ہاتھ میں پکڑایا اور جلدی سے اندر چلی گئی۔
وہ دل دھڑکنے کی رفتار پر حیران ہوئی تھی اور پھر پریشان۔

☆☆☆

"آ گئے آپ!" وہ گھر میں داخل ہو رہا تھا کہ اہل کی آواز پر رکا۔
"ناشتہ کرلیں۔ بہت ضروری بات کرنی ہے آپ سے۔" وہ کہہ کر جانے کو مڑی۔
"تم ناراض ہو مجھ سے؟" یہ پہلی بات تھی جو اتنے سالوں بعد اس نے اپنی بہن سے کی تھی اس کی نظروں میں ہمیشہ اسی اہل کا عکس تھا۔ چھوٹی سی دو پونیاں کیے ہر وقت بابا کی گود میں چڑھی رہتی۔
"کیسے وقت گزارا ہوگا اس نے بابا کے بغیر۔"
"جی۔ ناراض ہوں آپ سے۔" تیز آواز سے وہ حال میں واپس لوٹا تھا۔
"آپ جانتے ہیں بابا کس قدر پریشان ہیں آپ کی وجہ سے۔" سینے پر ہاتھ باندھتے ہوئے اس نے حساب بے باق کرنے کا ارادہ کیا تھا۔
"تمہیں کیسے پتا۔" لان میں پڑی کرسی پر وہ جلدی سے بیٹھا تھا۔
"آپ خوش ہیں یہاں آ کر؟" سوال کے

جواب میں سوال کیا تھا۔اور کیسا بے رحم سوال تھا۔
"پتا نہیں۔" وہ جان چھڑانا چاہتا تھا۔
"اس کا جواب معلوم ہے مجھے۔ بابا یاد نہیں آتے آپ کو؟" وہ جیسے انٹرویو کرنے بیٹھ گئی تھی۔
"اپنے دل اور دماغ کو بند کر دیا ہے۔ میں نے کوئی یاد نہیں آتا مجھے۔"
اس کی نظروں سے حنایا کی التجائیہ نظریں الجھی تھیں۔ مسعود احمد کا عکس اس کے دل پر لکھا تھا۔ پھر بھی وہ یہ کہہ رہا تھا۔ اسے کوئی یاد نہیں آتا۔
"میں تب بہت چھوٹی تھی جب اماں اپنا گھر چھوڑ کر یہاں آ گئیں۔ میں بہت روتی تھی، بابا کے لیے، آپ کے لیے پھر ایک دن بابا آئے اور مجھے گاؤں کے اسکول میں داخل کروا گئے۔ مجھ سے پرامس کیا کہ جب میں پڑھ لوں گی تو وہ مجھے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔"
گھاس پر نظریں جمائے وہ ماضی کے ورق پلٹ رہی تھی۔
"میں بہت ضد کرتی تھی کہ مجھے آپ کے ساتھ جانا ہے۔ وہ کہتے، میں تمہاری ماں سے وعدہ کر چکا ہوں کہ تم اس کے پاس رہو گی۔"
شاہ ویر اٹھ کر جانا چاہتا تھا لیکن نہیں جا سکا تھا۔ وہیں جم کے رہ گیا تھا۔
"پھر پرائمری کے بعد انہوں نے مجھے شہر کے بورڈنگ اسکول میں داخل کروا دیا۔ وہ کہتے تھے شاہ ویر تم لوگوں کے بغیر رہنا سیکھ گیا ہے۔ وہ مجھ سے سارا وقت آپ کی باتیں کرتے، آپ کی فکر میں ہلکان، وہ مجھے اپنے ساتھ نہیں رکھ سکے لیکن میرے ناز نخرے اٹھائے انہوں نے۔"
"جب آئیں تو آئس کریم لیتے آئیے گا۔" شاہ ویر کے کانوں میں وہی آواز گونجی تھی۔
"اماں نے ہمیشہ غلط رویہ رکھا اور ماموں ان کو کام ہی کیا ہے سوائے لوگوں کی عزتیں خراب کرنے کے۔"
زینب کا ڈرا سہما وجود اس کے سامنے آیا تھا۔
کرب سے اس نے آنکھیں بند کی تھیں۔
"اماں نے کبھی سمجھوتا نہیں کیا وہ بابا کے ساتھ رہنا ہی نہیں چاہتی تھیں۔ بابا غلط نہیں تھے، آپ انہیں کیسے چھوڑ سکتے ہیں شاہ ویر بھائی۔"
"تم نہیں جانتیں انہوں نے کیا کیا میرے ساتھ کیسے سر بازار تماشا لگوایا میرا۔"
"وہ سب جانتی ہوں میں، آپ کی محبت میں کیا یہ سب انہوں نے، محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔"
"انہوں نے مجھے ساری زندگی یہ سکھایا کہ غلط ہمیشہ غلط ہی ہوتا ہے چاہے محبت میں ہو یا جنگ میں پھر ایک بار بھی نہیں روکا مجھے کہ مت جاؤ ہاتھ پکڑ کے روک لیتے مگر نہیں، ایک فون تک نہیں کیا مجھے۔"
گلہ بالآخر شکوے میں ڈھلی تھی۔
"آپ خود چھوڑ کر آئے تھے انہیں آپ کو خود واپس جانا چاہیے۔ کوئی اپنے بوڑھے باپ کو یوں چھوڑ کر آتا ہے؟" وہ پھر سے سوال کرنے لگی تھی۔
"بوڑھے تو بالکل نہیں ہیں وہ۔"
"باپ تو ہیں ناں۔" وہ مسکرائی تھی۔
"جب تک نہیں بلائیں گے میں نہیں جاؤں گا۔"
اس نے اٹھ کر اندر کی طرف قدم بڑھائے تھے۔ پھر کچھ یاد آنے پر پلٹا تھا۔
"ماموں نظر نہیں آئے کچھ دن سے۔"
"جب کوئی فضول حرکت کرتے ہیں، شہر جا کر پناہ لیتے ہیں۔ اب پتا نہیں کب آئیں گے بزدل۔"

☆☆☆

اس کے قدم روز کسی معمول کی طرح اس کی طرف کیوں بڑھتے۔ وہ یہ سوچنا نہیں چاہتا تھا وہ بس یہ جانتا تھا کہ وہاں پہنچتے ہی دل کی ویرانی اور خالی پن کہیں دور بھاگ جاتے ہیں۔ ساری زندگی اسے یہ لگا کہ اس کے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔ لیکن

یہاں آکر احساس ہوا تھا کہ اچھا نہیں ہوتا کسے کہتے ہیں۔

وہ بھی بھوکے پیٹ نہیں سویا تھا لیکن اس گھر کے مکین سوئے ہوں گے بہت بار، اس نے بھی تنگ دستی نہیں دیکھی لیکن اصغر کا زرد چہرہ اور زینب کے چہرے پر تھمبر املال بھی داستان تو سناتے تھے۔

رشیدہ سے بھی اس کی ایک آدھ بات ہوئی تھی اس آدھی پونی بات کی شکر گزاری نے شاہ ویر کو اپنی کم ظرفی کی اصل بتادی تھی۔

چکی کے متعلق پوری بات اصغر نے بتائی اور ماضی میں اس کی چکی کے لیے کی گئی محنت رشیدہ نے۔

آج بھی وہ وہیں بیٹھا تھا۔ اور دروازے کی اوٹ میں چھپی زینب کیسے اس نئی اذیت میں جھونک دی گئی تھی اسے خود پتا نہیں چلتا تھا اور اذیت بھی وہ جان لیوا تھی۔

ارے وہی پرانی یک طرفہ محبت آج وہ بہت کم وقت کے لیے آیا تھا۔ اصغر سے ہاتھ ملاتا اب وہ جانے کے لیے کھڑا ہوا تھا۔

وائٹ شرٹ اور بلیو جینز میں وہ کس قدر نکھرا نکھرا لگ رہا تھا۔

''گاؤں کی لڑکیاں تو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی ہوں گی ان کے بھائی کو۔''

اس کی پشت کو تکتے زینب نے چاروں قل پڑھ کر پھونکے تھے۔

☆☆☆

بہت دن بعد آج وہ یونیورسٹی آئے تھے۔ داخلوں کی وجہ سے کام بڑھ گیا تھا اس لیے بلوایا گیا تھا۔

کچھ سینئرز، اسٹوڈنٹس گلے میں کارڈ لٹکائے ادھر سے ادھر پھر رہے تھے۔ مسعود احمد پر نظر پڑتی تو وہ جھک کے سلام کرتے اور گزر جاتے بڑے سے ہال میں نئے آنے والوں کو بٹھایا گیا تھا۔

مسعود احمد ڈائس کے پیچھے کھڑے تھے، اور رجسٹر ہاتھ میں لیے ان کا نام اور رول نمبر نوٹ کر رہے تھے

ٹیلنٹ کہنے پر تیسری رو میں سے کھڑے ہوتے ہوئے اس نے شاہ ویر احمد کہا تھا۔

مصروف سے چلتے ہاتھ پل بھر کو رکے تھے نظریں اٹھا کر عینک ناک پر جما کر انہوں نے شاہ ویر احمد کو دیکھا تھا۔ اس نے وہی براؤن جیکٹ پہن رکھی تھی جو اس رات شاہ ویر نے پہنی تھی۔ وہ مسکرائے تھے اور اور پھر یہ مسکراہٹ آنسوؤں میں ڈھلی تھی اور بالآخر تکلیف میں......

☆☆☆

اکٹھی ملنے والی ان خبروں نے اس کے دل کو مزید بوجھل کیا تھا۔ ایک تو اہل واپس ہوسٹل چلی گئی اور دوسری راجا کا خطرناک ایکسیڈنٹ زہرہ بیگم بھی صبح سویرے سال کے ساتھ ہی گئی تھیں۔

وہ معمول سے ذرا پہلے وہاں پہنچا تھا۔ اصغر وہاں نہیں تھا لیکن پھر بھی وہ بیٹھ گیا تھا کہ شاید وہ آجائے۔

وہ کچھ دیر چارپائی پر بیٹھا رہا۔ اچانک اس کی نظر چکی پر پڑی تھی وہی جسے اصغر منحوس چکی کہا کرتا تھا وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

ان پیچ پرزوں سے اس کا واسطہ پہلے بھی پڑ چکا تھا، اچانک اس الجھی تھی کا ایک سرا اس کے ہاتھ آیا تھا یعنی دو گھنٹوں کی محنت کے بعد وہ مطلوبہ مسئلے تک پہنچا تھا۔ تھوڑی دیر بعد چکی چلنے کی آواز پر زینب کا دل اچھل کے حلق میں آیا تھا۔

اس نے ایک نظر سوئی ہوئی رشیدہ پر ڈالی تھی اور جلدی سے باہر آئی تھی۔ پسینے میں شرابور وہ زینب کو دیکھ کر مسکرایا تھا جو بس پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس سفید آٹے کو دیکھ رہی تھی جو اس چکی سے نکلا تھا۔

اور وہ خود بھی حیران تھا کہ یہ کیسے ہو گیا ان حیران آنکھوں میں اب آنسو بھر آئے تھے۔ وہ وہیں بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

اس کے رونے پر وہ گھبرا گیا تھا۔

''ایسے کیوں رو رہی ہو پاگل لڑکی۔'' وہ تھوڑا سا

جھک کر اس سے کہہ رہا تھا۔

"مت روؤ زینب!" وہ اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ مٹی اس کے سفید ٹراؤزر پر لگی تھی۔

زینب کا دل چاہا تھا، وہ ساری عمر بس یہیں بیٹھ کر رونے میں گزار دے۔ اب تک جھیلے جا چکے تمام دکھوں پر اس کو پھر سے رونا آیا تھا۔ ہاتھ کی پشت سے وہ بہنے والے آنسوؤں کو صاف کرتی تا کہ نئے آنے والوں کی جگہ بن سکے۔

وہ سامنے بیٹھا زینب کو روتا ہوا دیکھ رہا تھا اچانک اس نے اپنے دائیں ہاتھ میں اس کے دونوں ہاتھوں کو پکڑا تھا اور بائیں ہاتھ سے اس کے آنسو صاف کیے تھے۔

زینب نے اس کے مضبوط ہاتھ میں جکڑے اپنے دونوں ہاتھوں کو دیکھا تھا، وہ یکدم چپ ہوئی تھی۔

"اب اگر تم روئیں تو میں اس کو پھر سے خراب کردوں گا سوچ لو۔"

اور اس کی تو سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں ختم ہوئی تھیں۔ تبھی فون کی گھنٹی بجی تھی۔ اس نے فوراً ہاتھ چھوڑے تھے سارا فسوں غارت ہوا تھا۔

"کیا؟ کب؟ وہ ٹھیک ہیں ناں؟" شاہ ویر کا رنگ اڑا تھا۔

"کیا ہوا۔" وہ جلدی سے کھڑی ہوئی تھی۔

"بابا کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے، تم دعا کرنا۔" وہ الٹے قدموں بھاگا تھا۔

☆☆☆

جونہی وہ ہسپتال میں داخل ہوا تھا سب سے پہلے عنایا پر نظر پڑی تھی۔ نعمان، ضوفشاں، عنایا اور بھی بہت سے سنے چہرے وہ سب وہاں موجود تھے۔ بس ایک وہی تھا جو کہیں نہیں تھا۔

اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ ان سے کچھ پوچھ لیتا۔ سب سے پہلے احد اس تک آیا تھا۔

"وہ ٹھیک ہیں؟" شاہ ویر نے پوچھا تھا۔

"وہ ٹھیک ہوتے اگر تم ٹھیک کرتے۔ بہت سی بیماریاں رویے لاحق کرتے ہیں میری جان! میری تم سے کوئی دشمنی نہیں تھی اگر تمہاری جگہ کوئی اور عنایا کے بارے میں ایسے سوچتا تو بھی یہی ہوتا۔ میں تو تھا ہی کم ظرف لیکن بعد میں اندازہ ہوا سارے ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ کوئی شخص ساری زندگی ہماری راہ سے کانٹے چنتا رہے اور گلستان سجاتا رہے۔ لیکن کبھی کوئی کانٹا اس کی نظروں سے اوجھل رہ جائے تو ہم معاف نہیں کرتے۔ کر ہی نہیں سکتے۔ ابھی وہ تمہاری راہ میں پھول بچھانے والا زخمی دل لیے پڑا ہے۔ دعا کرو، وہ سلامت رہے۔ نہیں تو تم کہیں کے نہیں رہو گے۔ اپنی بہن کو سنبھالو۔ رو رہی ہے بہت۔"

☆☆☆

"میں حیران ہوں خواہشات کی جرات پر جو مٹی سے بنے آدم کے دھڑکتے دل میں دھڑکن کی طرح موجود رہتی ہیں۔ قید ہونے کے باوجود یہ خواہشات ہمیں قید کیے رکھتی ہیں اور خواہش بھی ایسی کہ یہ سمجھ نہ آئے کہ حیران ہوا جائے یا پریشان، کبھی چاند کو چھو لینے کی خواہش تو کبھی چاند چہرے جیسے لوگوں کے دل میں سما جانے کی خواہش۔ آج اس کو گئے تین مہینے بارہ دن ہو گئے تھے۔ اس کو تو یاد بھی نہیں ہو گا کہ کبھی اس نے زمین پر بیٹھی کسی زینب کے آنسو پونچھے تھے۔

آسمان کو تکتی وہ اپنی سوچی گئی بات پر روئی تھی۔

"اہل بیٹا! واپس آجاؤ دیکھو ادھر میں اکیلی ہوں تمہارے ماموں بے بس ہیں، بیٹا! وہ تو خود کو سہارا نہیں دے سکتے میرا خیال کیسے رکھیں گے۔"

وہ باپ کے پہلو سے لگی بیٹھی تھی جب زہرہ بیگم نے فون پر دہائی دی تھی۔ مسعود احمد نے سوچا تھا۔ کبھی وہ اس عورت کی ایسے منتیں کیا کرتے تھے کہ وہ ان کے باپ کا خیال رکھے اور اب......

وقت کچھ نہیں بھولتا بھی۔

"جی، میں کوشش کروں گی آنے کی۔" مدھم سے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے فون بند کیا تھا۔

''بابا! میں نہیں جانا چاہتی لیکن میں کیا کروں۔''
''تم جاؤ اہل اللہ کے لیے۔ اس کی جزا کے لیے۔''
شاہ ویر ان دونوں کے لیے چائے بنا رہا تھا۔ اتنے عرصے میں بھی اس کی شرمندگی کم ہونے میں نہیں آئی تھی کہ وہ اپنے اس باپ کو چھوڑ کر چلا گیا۔ جسے دشمنی نبھانی بھی نہیں آتی۔
''اچھا ٹھیک ہے، آپ بھائی کی شادی کر دیں، میں چلی جاؤں گی۔''
''اب اتنی جلدی لڑکی کہاں سے ڈھونڈیں بھی۔'' مسعود احمد نے ایک نظر بیٹے کو دیکھ کر اس سے پوچھا تھا۔
''یہ کام بھائی صاحب خود کر لیں گے۔ آپ بس ہال بک کروائیں۔''
''اور آپ شرافت سے ادھر بیٹھ کر بتائیں کون ہے وہ؟''
اور وہ باپ سے نظریں چراتا چائے پینے لگا تھا۔
''کوئی نہیں ہے بابا! اس کو بھیجیں واپس، کیا فضول باتیں کرتی ہے یہ اور جب تک مجھے اچھی سی جاب نہیں مل جاتی، شادی کیسے ہو سکتی ہے بھلا۔''
''منگنی تو ہو سکتی ہے نا، آپ بس لڑکی بتا دیں۔''
وہ بھی ملنے والوں میں سے نہیں تھی اور اسے نہ جانے کیوں مٹی پر بیٹھی وہ آنسوؤں سے بھیگی لڑکی یاد آئی تھی۔ اس کے یوں کھو جانے پر وہ باپ بیٹی متفق خیز سا ہنسے تھے۔
''تم فکر نہ کرو، میں اگلوالوں گا اس سے۔''
☆☆☆
گھر میں داخل ہوتے ہی گہری خاموشی کو شدت سے محسوس کیا تھا۔ اس لڑکی کے گھر میں ہوتے ہوئے اتنی خاموشی؟ حیرانی سے سوچتا وہ آگے بڑھا۔ کمرے میں داخل ہو کر اسے کچھ دیر لگی تھی۔ اندھیرے سے مانوس ہونے میں، لائٹ آن ہوتے ہی سب سے پہلی نظر اس پر پڑی تھی جو گھٹنوں پر سر رکھے رونے میں مشغول تھی۔ اس کے قریب بیٹھنے پر ایک نظر اٹھا کر بیٹھنے والے کو دیکھا تھا۔
''آئی ایم سوری زینب۔'' جونہی اس نے دیکھا وہ فوراً بولا۔ ''دیکھو، میں میٹنگ میں تھا۔ تم بار بار فون کر رہی تھیں تو مجھے غصہ آ گیا۔''
''اتنی بری طرح ڈانٹا آپ نے مجھے۔'' وہ اس کی بات کاٹ کے بولی تھی۔
''بے وقوف وحشی منہ اور پتا نہیں کیا کیا...... پچھتا رہے ہیں ناں مجھ سے شادی کر کے کہ گاؤں کی لڑکی سے فضول میں شادی کر لی۔'' شاہ ویر نے دائیں ہاتھ سے اس کے آنسو پونچھے تھے۔
''یقین کرو۔ تمہیں روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا میں، تم نے مجھے تب سنبھالا جب نیم جاں سا تھا۔ تمہارے یقین نے شاہ ویر مسعود کو پھر سے زندہ کر دیا۔ تمہارے ساتھ نے مکمل کر دیا اور تم یہ سوچ رہی ہو زینی۔''
''میں ایسا نہیں سوچتی شاہ ویر! لیکن پھر بھی مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں......'' محبت کے واہموں میں گھرے آنسو پھر سے بہنے لگے تھے۔
''تمہارے اس ڈر کا علاج تو ممکن نہیں ہے لہٰذا جو اچھی خبر میں سنانے آیا تھا۔ وہ سن لو پہلے۔'' بھیگی آنکھوں سے ہنستی وہ بے حد اچھی لگی تھی۔
''بابا نے بتا دیا ہے مجھے کہ میرا بہت اچھا رزلٹ آیا ہے۔'' جگر جگر کرتی آنکھیں شاہ ویر پر ٹکی تھیں۔
''ایک تو بابا کی کو کنگ سروس سے میں بہت تنگ ہوں۔ سارا مزا خراب کر دیا۔''
وہ ہنسی تھی۔ دل سے محبت سے اور خوشی سے

پارک میں معمول کے مطابق رش تھا۔ وہ
دونوں پارک کے پرسکون گوشے میں بیٹھی بسنٹ کھا

رہی تھیں۔ یہ اس علاقے کا لیڈیز پارک تھا۔ جہاں
شام کے وقت خواتین اور بچوں کی بہت بڑی تعداد

قرۃ العین خرم ہاشمی

دوڑ

موجود ہوتی تھی۔ ان دونوں کے گھر پارک کے پاس تھے۔ اس لیے دونوں اکثر ملنے کے لیے یہاں آجاتی تھیں۔ یمنٰی اور فاخرہ نے انٹرمیڈیٹ میں اعلا نمبروں سے کامیابی حاصل کر لی تھی۔ اب آگے داخلہ لینے کا فیصلہ کرنا تھا۔ دونوں اسکول کے زمانے سے ایک ساتھ پڑھ رہی تھیں۔ دونوں کے گھروں میں دو گلیوں کا فاصلہ تھا۔ دونوں کی دوستی کی وجہ سے ان کی فیملیز بھی ایک دوسرے کو جاننے لگی تھیں۔

''تم نے آگے کے لیے کیا سوچا ہے؟'' یمنٰی نے فاخرہ سے سوال کیا۔

''تم جانتی تو ہو، مجھے ہمیشہ سے اپنی من پسند یونیورسٹی میں داخلہ لینے کا شوق ہے۔'' فاخرہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں مگر وہ شہر کی سب سے مہنگی یونیورسٹی ہے۔'' یمنٰی نے اداسی سے کہا۔

''تو کیا مہنگے اداروں میں پڑھنا ہمارا حق نہیں؟'' فاخرہ نے منہ بنا کر کہا۔

''فاخرہ! حق یا ناحق کی بات نہیں۔ بات تو اپنے اپنے حالات کی ہوتی ہے۔'' یمنٰی نے سمجھداری سے کہا۔

''حالات تو نجانے کب بدلیں۔ اب کیا ہم اپنی خواہشیں مارتے رہیں۔'' فاخرہ نے ضدی پن سے کہا۔

''فاخرہ! ہم پانچ بہن بھائی ہیں۔ میرا نمبر دوسرا ہے۔ مجھ سے بڑی بہن نے بھی گورنمنٹ کے اداروں میں تعلیم حاصل کی جبکہ تم جانتی ہو کہ وہ کتنی ذہین اور قابل ہیں مگر امی ابو کے ایسے حالات ہی نہیں کہ ہمیں مہنگے اداروں میں پڑھائیں۔'' یمنٰی نے سنجیدگی سے کہا۔

''میرا بھی ایسا ہی معاملہ ہے۔ آمدن نہایت محدود اور ہم چھ بہن بھائی۔ میں سب سے بڑی ہوں۔ باقی سب تو عام اسکولوں میں پڑھ رہے ہیں۔'' فاخرہ نے کہا۔

''یہ بھی شکر ہے کہ مہنگائی اور مشکل حالات میں بھی ہمارے والدین ہمیں تعلیم دلوا رہے ہیں۔ بڑی بہن نے عام اداروں سے پڑھ کے اعلا تعلیم حاصل کی ہے۔ اس لیے میں نے بھی سوچا ہے کہ والدین کو مزید پریشان کرنے کے بجائے گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج میں داخلہ لے لوں گی۔'' یمنٰی نے سوچتے ہوئے کہا۔

''پاگل ہوگئی ہو؟ تم اتنی ذہین اور لائق لڑکی۔ تم اسکالرشپ کے لیے اپلائی کرو۔ ہم دونوں ایک ساتھ یونیورسٹی میں داخلہ لیں گے۔''

فاخرہ نے یمنٰی کو سمجھایا مگر یمنٰی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''میں جانتی ہوں کہ میرے وہاں داخلہ لینے سے باقی بہن بھائیوں کا حق مارا جائے گا۔ میں یہ نہیں کر سکتی۔''

یمنٰی نے سنجیدگی سے کہا مگر فاخرہ تو جیسے ضد پر اڑ گئی تھی۔ یمنٰی نے پوسٹ گریجویٹ کالج میں بی۔ ایس آنرز میں داخلہ لے لیا جبکہ فاخرہ اپنے والدین کے ساتھ مختلف پرائیویٹ یونیورسٹیز کے چکر پر چکر لگانے لگی۔ جب یمنٰی نے ایک سمسٹر مکمل کر بھی لیا تب مختلف سفارشوں اور کچھ اس کے اچھے نمبروں کی بنا پر بمشکل فاخرہ کا داخلہ شہر کی مشہور یونیورسٹی میں ہو گیا۔ فاخرہ خوشی سے ہواؤں میں اڑنے لگی۔ مڈل کلاس لڑکی کے لیے اتنے مہنگے اور بڑے ادارے میں پڑھنا حسین خواب کی طرح تھا۔

☆☆☆

''فاخرہ! اب یہ کیا ہے؟'' صائمہ جو ابھی ہی سب خرچوں سے فارغ ہو کر سکون سے سانس بھی نہیں لے پائی تھی۔ فاخرہ کی نئی فرمائش سن کر تپ گئی۔

''اف امی! اب میں کیا کروں اگر وہاں آن لائن کلاسز اور نوٹس کا سلسلہ چلتا ہے۔ میرے لیے انٹرنیٹ کنکشن اور لیپ ٹاپ بہت ضروری ہے۔'' فاخرہ نے فکرمندی سے کہا تو صائمہ گہری

سانس لے کر رہ گئی۔
"فاخرہ تمہارا داخلہ جس طرح کروایا ہے تم بھی جانتی ہو۔ تمہارے ابو تو پہلے ہی اس حق میں نہیں تھے کہ تمہیں اتنے مہنگے ادارے میں پڑھنے کے لیے بھیجیں۔ ان کی جیب اس کی اجازت نہیں دیتی۔ مگر تمہارے آنسو اور ضد دیکھ کر وہ مان گئے۔ تمہارا داخلہ بھی کتنی مشکل سے ہوا۔ کچھ سفارش، کچھ تمہارے نمبر میرٹ پر آئے تھے۔ ابھی تو ہم نے ان سے فیس بھی آدھی سے بھی کم کروائی ہے۔ جس میں سے آدھی جمع کروا چکے ہیں اور باقی اس سمسٹر کے ختم ہونے تک کروانی ہے۔ مجھے بتاؤ کہ میں یہ سب کیسے کروں؟"
صائمہ نے جھنجلا کر کہا۔ فاخرہ کے داخلے اور اس کے بعد ہونے والی چھوٹی چھوٹی تیاری اور خرچے میں وہ اپنی کمیٹی کے پیسے لگا چکی تھی۔ اس کے باقی بچے بھی اسکول جاتے تھے۔ وہ صرف ایک بچے کو اتنا مہنگا نہیں پڑھا سکتی تھی مگر یہ بات فاخرہ کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔
"امی! پہلے ہی اتنی مشکل سے میرا داخلہ ہوا ہے اور آپ اعتراض کر رہی ہیں؟ بھلا آپ خود ہی بتائیں کہ پورے خاندان میں کوئی بھی لڑکی اتنی مہنگے اور مشہور ادارے میں پڑھی ہے؟" فاخرہ نے غرور سے کہا۔
"ہاں یہ تو ہے۔ سارا خاندان جل گیا ہے۔ تمہاری پھپھو نے تو بہت طنز کیے کہ اس کا داخلہ کیسے ہو گیا؟" صائمہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ساری زندگی سسرال سے پیچھے رہنے والی عورت کو زندگی میں پہلی بار کسی چیز پر اترانے کا موقع ملا تھا۔
"ان کی بیٹی تو عام سے کالج میں جاتی ہے۔"
فاخرہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔
"تو اور کیا۔" صائمہ نے تائید کی۔
"پھر آپ ابو سے بات کریں کہ مجھے لیپ ٹاپ لے دیں۔"
فاخرہ نے جلدی سے کہا تو صائمہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
صائمہ کا شوہر ناصر ایک کمپنی میں جاب کرتا تھا۔ اس کی تنخواہ بس اتنی ہی تھی کہ عزت کے ساتھ گزارا ہو جائے۔
"اچھا کچھ کرتے ہیں۔" صائمہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ صائمہ نے ناصر سے بات کی جس نے اپنے کسی دوست سے بات کر کے فاخرہ کے لیے سیکنڈ ہینڈ سستا لیپ ٹاپ لے لیا۔ فاخرہ کا یہ مسئلہ بھی حل ہوا مگر ابھی عشق کے امتحان اور بھی تھے۔

☆☆☆

یمنیٰ اور فاخرہ کا رابطہ پہلے کی نسبت بہت کم ہو کر رہ گیا تھا۔ یمنیٰ اپنی پڑھائی میں مصروف تھی اور فاخرہ اپنی میں۔ یمنیٰ اور فاخرہ دونوں بہترین دوست تو تھیں ہی مگر دونوں میں مقابلہ بھی کانٹے کا ہوتا تھا کیونکہ دونوں کو ہی پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ دونوں نوٹس بنانے سے لے کر ہر چیز میں ایک دوسرے کی مدد کرتی تھیں۔ ایک دوسرے کی راہنمائی کرتی

تھیں۔ دونوں نے ایف۔ اے میں بہت اچھے نمبر لیے تھے۔

اس لیے ان کا داخلہ بہت سے اداروں میں میرٹ پر ہو رہا تھا مگر اصل مسئلہ مہنگی مہنگی فیسوں کا تھا۔ اس لیے یمنیٰ نے اپنی حیثیت اور چادر کے مطابق قریبی ادارے میں داخلہ لیا۔ جہاں اسے بہت سے اچھے دوست اور بہترین استاد ملے۔ یمنیٰ کو کالج آنے اور جانے میں بھی زیادہ مسئلہ نہیں ہوتا تھا۔ اکثر بائیک پر بھائی یا باپ چھوڑ آتا تھا۔ یا وہ پیدل اپنی دوستوں کے ساتھ چلی جاتی تھی۔

فاخرہ کا مشہور تعلیمی ادارہ شہر کے پوش علاقے میں تھا جو اس کے گھر سے بہت دور تھا۔ جہاں آنے اور جانے میں ہی اچھا خاصا وقت لگتا تھا اور اگر وین وغیرہ لگوائی جاتی تو اسے مہینے کے حساب سے ایک معقول رقم دینی پڑتی۔ جس میں اس کے باقی بہن بھائیوں کی فیس نکل آتی تھی۔ فاخرہ کو یونیورسٹی چھوڑنے کی ذمہ داری اس کے باپ نے لی۔ جو اپنے مقررہ وقت سے کافی پہلے نکلتا۔ پہلے فاخرہ کو ڈراپ کرتا اور پھر خود آفس جاتا۔ بائیک پر بیٹھ کر اتنی دور تک جانا فاخرہ کے لیے ہرگز خوش گوار تجربہ ثابت نہیں ہوا۔ یہ تو معمولی مسئلے تھے۔

اصل مسئلہ تو فاخرہ کو یہاں کے ماحول سے ہوا۔ یہ یونیورسٹی خواتین کی تھی۔ اس لیے یہاں انھیں کافی آزادی ملی ہوئی تھی۔ یہاں کا ماحول فاخرہ کی سوچ سے بالکل مختلف تھا۔ تقریباً سب لڑکیاں ہی پوش علاقوں سے آتی تھیں اور زیادہ تر خود گاڑی ڈرائیو کرتی۔ ان کے انداز، ان کے نخرے ان کے کپڑے، ہاتھ میں پکڑے موبائل سے لے کر ہر چیز ہی بہت الگ تھی۔ فاخرہ جتنا بھی کوشش کر لیتی۔ وہ ان سب چیزوں میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔

خوش قسمتی کہ یونیورسٹی میں بی ایس آنرز کا یونیفارم بھی نہیں تھا بلکہ سب مختلف لباسوں میں آتی تھیں۔

فاخرہ کے لیے یہ بہت بڑا مسئلہ بن گیا تھا۔

معمولی ہی سہی مگر اسے کچھ اچھے، آج کے فیشن کے مطابق کپڑے تو چاہیے تھے، اس نے ضد کر کے اپنے لیے شاپنگ کی۔ مگر خرچے تھے کہ نکلتے ہی آ رہے تھے۔ کبھی کالج میں کسی چیز کے لیے پیسوں کی ضرورت پڑتی، کبھی کسی چیز کے لیے۔ فاخرہ جس کا خواب یہاں سے اعلا ڈگری حاصل کرنا تھا وہ بری طرح احساس کمتری کا شکار ہونے لگی۔ وہ جانے، انجانے میں دوسری لڑکیوں سے اپنا موازنہ کرنے لگی۔ اس کی صرف ایک یا دو لڑکیوں سے دوستی ہوئی۔ جو امیر تو تھیں مگر ان میں نخرہ نہیں تھا۔ فاخرہ اکثر سنتی کہ کلاس کی لڑکیاں، چھٹیاں گزارنے کے لیے ملک کے کسی علاقے کے بجائے بیرون ملک کے تفریحی مقامات کا ذکر کرتیں۔

ان کے پاس ایسی بہت سی تصویریں اور یادیں تھیں کہ وہ کہاں کہاں چھٹیاں گزار چکی تھیں۔ وہ سب اتنے الگ الگ ملکوں کے نام لیتی تھیں جو فاخرہ نے پہلی بار ہی سنے تھے۔ فاخرہ کی شخصیت یہاں آ کر کھلنے کے بجائے مرجھا رہی تھی۔ کیونکہ اس نے جس ماحول کا انتخاب کیا تھا، وہ اسے موافق نہیں آ رہا تھا۔

☆☆☆

فاخرہ کے لیے اتنے بڑے تعلیمی ادارے میں پڑھنا گلے کی ہڈی بن چکا تھا جسے نہ وہ نگل پا رہی تھی اور نہ اگل۔ وہ پہلے کی طرح یکسوئی سے اپنی تعلیم پر توجہ نہیں دے پا رہی تھی۔

پہلے اسے صرف پڑھنے کی فکر ہوتی تھی۔ اب روز یونیورسٹی جانا، واپس آنا، وہاں کے اخراجات اور ماحول کو مدنظر رکھ کر چلنا تھا۔ فاخرہ اس دوڑ میں اب تھکنے لگی تھی مگر وہ یہ بات اپنے والدین سے نہیں کہہ سکتی جو پہلے ہی اس کی فیس کو لے کر پریشان رہتے تھے۔ ان کو پریشان دیکھ کر فاخرہ پشیمان ہو جاتی مگر وہ اپنی ضد کا کیا کرتی۔

یہ جو ضد کی سوئیاں ہوتی ہیں۔ اسے اپنے جسم میں ہم خود چبھوتے ہیں اور پھر اس کی چبھن سے خود

بھی بے چین رہتے ہیں اور اپنے آس پاس رہنے والوں کو بھی بے چین رکھتے ہیں۔

فاخرہ ایک سمسٹر دیر سے داخل ہوئی تھی اس لیے اس پر کام کا لوڈ بھی زیادہ تھا۔ اسے ہر چیز کو بیلنس کرنا تھا۔ فاخرہ کی توجہ اپنی پڑھائی پر سے ہٹ گئی۔ اس کا ذہن دوسرے مسئلوں میں الجھا رہتا۔ مسلسل پریشان رہنے سے وہ ذہنی طور پر تھک گئی اور بیمار رہنے لگی۔ اس کا وزن بھی بہت بڑھ گیا۔ اسے ہر چیز کے لیے پہلے گھر والوں سے ایک لمبی بحث کرنا پڑتی۔ انہیں سمجھانا پڑتا کہ یہ کام ضروری ہے۔ اسے اتنے پیسے چاہئیں تب جا کر مسئلہ حل ہوتا۔

آخری سمسٹر کی فیس جمع کروانا اس کے لیے عذاب بن گیا تھا۔ ہر پل ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ مقررہ وقت پر فیس جمع نہیں کروا سکے گی اور اسے یہاں سے نکال دیا جائے گا مگر اس کے باپ نے اپنے کسی دوست سے ادھار لے کر اس کی فیس جمع کروا دی۔ فاخرہ نے سکھ کا سانس لیا مگر اب اس کے پاس امتحان کی تیاری کے لیے بہت کم وقت بچا تھا۔

☆☆☆

فائنل رزلٹ آیا تو سب حیران رہ گئے۔ یمنیٰ کی پوزیشن ٹاپ فائیو میں تھی جبکہ فاخرہ بری طرح فیل ہو گئی۔ فاخرہ کا رزلٹ اس کے والدین پر بجلی بن کر گرا۔ ناصر اور صائمہ کو اس سے ایسی امید نہیں تھی۔ فاخرہ بری طرح رو رہی تھی۔ ناصر اور صائمہ نے اسے جتنا ڈانٹنا تھا ڈانٹ لیا مگر اس سب کی وجہ سے ہوئے نقصان کو پورا نہیں کر سکتے تھے۔

”تم نے پڑھائی پر توجہ کیوں نہیں دی؟“ صائمہ غصے سے بولی۔

”کیسے دیتی؟ اس کی توجہ اور مسئلے مسائل کی طرف جو تھی۔ بھی یہ چاہیے، بھی وہ۔ اپنی چادر سے باہر پاؤں پھیلانے کا نتیجہ دیکھ لیا تم ماں بیٹی نے۔“ ناصر نے افسوس سے کہا۔

”ابو! کیا بڑے خواب دیکھنا غلط بات ہے؟“ فاخرہ نے روتے ہوئے کہا۔

”نہیں! چھلانگ لگا کر کوئی بھی منزل پر نہیں پہنچتا۔ جو یہ سوچتے ہیں، وہ ہمیشہ منہ کے بل گرتے ہیں۔“ ناصر نے سنجیدگی سے کہا۔

”آپ یہ بات پہلے بھی سمجھا سکتے تھے؟“ صائمہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”سمجھایا اسے جاتا ہے جو سمجھنا چاہے۔ اگر میں فاخرہ کو منع کرتا تو یہ سمجھتی کہ اس کے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے۔ میرا بھی دل کرتا ہے کہ اپنے تمام بچوں کو بہترین اور اعلا اداروں میں پڑھاؤں مگر اونچا اور بڑا نام ادارے کی ساکھ نہیں ہوتا۔ وہاں سے نکلنے والے کامیاب طلباء و طالبات اس کی پہچان ہوتے ہیں۔ اب یمنیٰ بیٹی کو دیکھ لو۔ کیا جس ادارے سے وہ پڑھی ہے، اسے کامیابی نہیں ملی؟

فاخرہ بیٹی! زندگی میں ہمیشہ فوکس اپنے مقصد پر رکھو۔ منزل پر پہنچنے کے لیے راہ کی مشکلوں سے لڑنا پڑتا ہے۔ اسے سہنا پڑتا ہے۔ اگر آپ راہ کی خوب صورتی یا بدصورتی کے رونے ہی روتے رہیں گے تو آپ بھی اپنی منزل پر نہیں پہنچ سکتے۔ جیسے تمہارے ساتھ ہوا۔

اگر تمہارا داخلہ من پسند کالج میں ہوا تھا تو تمہیں اپنا فوکس پڑھائی پر رکھنا چاہیے تھا بجائے اس کے تم دوسروں سے اپنا موازنہ کرتی رہیں۔ دماغ کی انرجی کا رخ جس طرف موڑو گی، یہ اسی طرف دوڑے گا۔ افسوس تو اس بات پر ہوتا ہے کہ اگر اس کی دوڑ غلط سمت میں لگ جائے۔ جیسے تمہارے ساتھ ہوا ہے۔ تم نے اپنے اعلا اور ذہین دماغ کی انرجی غلط دوڑ میں لگا دی۔ جس کا نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔“

ناصر نے افسوس سے کہا اور اٹھ کر کمرے میں چلا گیا۔ فاخرہ اور صائمہ ایک دوسرے سے نظریں چرا کر بیٹھی رہ گئیں۔

کچھ سچ بھی مقناطیس کی طرح ہوتے ہیں جو ہم سے چپک جاتے ہیں۔ ہم جھٹکتے ہیں مگر وہ اسی تیز رفتاری سے ہماری طرف پلٹتے ہیں کیونکہ وہ ہمارے ذات کے سچ ہوتے ہیں۔

زمین اسکول میں پڑھنے والی ایک غریب لڑکی ہے۔ اس کا باپ شکرقندی اور مونگ پھلی کی ریڑھی لگاتا ہے۔ بیوی کی بیماری کی وجہ سے وہ اپنی دکان منشی اکرم کے پاس گروی رکھتا ہے اور سود بھرتا ہے۔

زمین اور افشاں اسکول سے واپسی پر باتیں کرتی آتی ہیں، راستے میں مراد کا رکشہ کھڑا ہوتا ہے۔ وہ اس میں بیٹھ کہتی ہے، میں تو رکشہ چلاؤں گی۔ اسی وقت سامنے والے گھر کا دروازہ کھلتا ہے، مراد کے باہر نکلنے پر دونوں بھاگ جاتی ہیں۔ زمین اپنا بیگ بھول جاتی ہے۔

گھر پہنچ کر بیگ کا خیال آتا ہے۔ وہ ماں سے کہتی ہے کہ کتا پیچھے لگ گیا تھا، بیگ گر گیا راستے میں۔ فرخ کے ہمراہ ثمینہ اسے بیگ لینے بھیجتی ہے لیکن وہاں رکشہ نہیں ہوتا۔ فرخ کہتا ہے کہ وہ دلا دے گا، رکشہ والا اس کا استاد ہے۔

مراد اس کا بیگ گھر دے جاتا ہے لیکن بیگ کھولنے پر اسے زمین کا نام پتا چل جاتا ہے۔ وہ زمین کے بہن بھائی کو پیسے دیتا ہے مونگ پھلی کھانے کے لیے۔

وہ فرخ کے گھر جاتی ہے۔ فرخ کے کمرے کے دروازے میں آٹومیٹک لاک لگا ہوا ہے، وہ بند ہو جاتا ہے۔ زمین ایک دم چیختی ہے۔ ثمرین جو بھن کو بلانے آتی ہے اس کی چیخ سن کر گھر سے باہر نکلتی ہے، جہاں خالہ آ رہی تھیں، وہ ان کو بتاتی ہے۔

راحت جبیں

زندگی ہم تجھے گزار دیں گے

منشی اکرم، انور حسین کے گھر آتا ہے جہاں زمین کو دیکھ کر اس کی نیت پھسل جاتی ہے۔ وہ اس کو پانچ سو روپے دے کر جاتا ہے اور انور حسین سے اس کا رشتہ مانگتا ہے۔ انور حسین انکار کر دیتا ہے۔

ہوٹل میں مراد کو انور حسین ملتا ہے وہ اسے اپنے رکشہ پر گھر چھوڑ دیتا ہے۔

زمین افشاں اور ان کی امی کے ساتھ بازار جاتی ہے جوتا خریدنے، وہاں مراد اسے دیکھتا ہے وہ جس چیز کو دیکھتی ہے، ہاتھ میں لے کر وہ سب خرید کر اس کے گھر دے جاتا ہے۔
افشاں رکھ لیتی ہے لیکن زمین ڈر کے مارے ثمینہ کو سب بتا دیتی ہے۔
ملک صاحب کے بیٹی کی شادی میں پھاتاں اور رشیداں کام کر رہی ہیں۔
ثریا کو تھر کتا دیکھ کر رشیداں کو غصہ آتا ہے۔
زمین پانچ سو کی ٹیوشن پڑھانے لگتی ہے۔ انور حسین ثمینہ کے منع کرنے کے باوجود اجازت دے دیتا ہے۔ وہ نمبردار کے گھر بھی ہو آتا ہے۔
ثریا ملک صاحب کے گھر سے کھانا چوری کر کے لے کر آتی ہے۔ وہاں اس کی ملاقات بشیر سے ہوتی ہے۔
رشیداں کو ملک صاحب کے گھر سے چاول ملتے ہیں۔ رفیق اسے گالیاں بکتا ہے۔
مراد کو بخار ہو جاتا ہے۔ کاکا اسے دیکھنے آتا ہے اور مشورہ دیتا ہے کہ اسے اب شادی کر لینی چاہیے۔ وہ انور حسین کی بیٹی زمین کا کہتا ہے۔ کاکا رشتے کے لیے منشی کو لے جانے کا بھی کہتا ہے۔ منشی ہامی بھر لیتا ہے۔
مراد اور کاکا، انور حسین کے گھر منشی کا انتظار کر کے چلے جاتے ہیں۔ منشی بھی وہاں پہنچ جاتا ہے۔ اسے پتا چلتا ہے کہ مراد کو بھی یہیں آنا تھا تو وہ انور حسین سے کہتا کہ تم نے یا تیری بیٹی نے مراد کو پھنسایا ہے۔

چوتھی قسط

منشی عقب میں الٹ کر پیچھے پڑی کرسی سے ٹکرایا، کرسی کھسک گئی وہ خود زمین بوس ہو گیا۔ یہ سب اتنی اچانک ہوا کہ کوئی آگے بڑھ کر اسے پکڑ بھی نہ سکا۔

''اب اگر ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو میں زبان کاٹ دوں گا۔'' مراد نے نیچے گرے منشی کو گریبان سے پکڑ کر اٹھایا۔ اس کے لہجے میں آگ کی لپٹیں تھیں۔

انور حسین یوں گنگ ہوا کہ منہ سے لفظ تو ایک طرف، ہلکی سی آواز بھی نہ نکلی۔

کاکے نے لپک کر مراد کو قابو کیا۔ ''بس کر بس...... پاگل ہو گیا ہے۔''

''ہاں ہو گیا ہوں۔ جس لڑکی نے آج تک آنکھ اٹھا کر میری طرف نہ دیکھا۔ یہ اس کے بارے میں اتنی گھٹیا بات کیسے کر سکتا ہے۔''

منشی کے ابھی تک حواس بحال نہ ہوئے تھے۔ ناک پر ہاتھ رکھے دائیں بائیں جھولتا رہا۔ تب ہی انور حسین کو ہوش آیا تھا تو اس نے جلدی سے منشی کو پکڑ کر کرسی پر بٹھایا اور خود پانی لینے بھاگا۔

''مراد بھائی نے اس موٹے پیٹ والے آدمی کو زور سے مکا مارا۔''

ثمرین نے ادھ کھلے دروازے سے یہ منظر بذات خود دیکھا تھا۔

''کس کو مارا؟'' زمین اور افشاں ہکا بکا رہ گئیں۔

ثمینہ کے ہاتھ میں چائے کی ٹرے لرز گئی تو گھبرا کر واپس رکھ دی۔

''پانی......'' انور حسین ہولایا بوکھلایا آیا۔

''کیا ہو گیا، کچھ بتائیں بھی؟ کس کے ساتھ لڑائی ہو گئی؟'' گھبراہٹ میں ثمینہ نے پانی گرایا زیادہ اور ڈالا

کم تھا۔ انور حسین بغیر جواب دیے گلاس لے کر واپس چلا گیا۔
"مراد! چل یہاں سے......" منشی اکرم محلے کا جھگڑا بندہ تھا۔ جب ہی کا کا تھوڑا گھبرا کر مراد کو کھینچنے لگا۔
"میں کیوں جاؤں۔ یہ جائے گا یہاں سے۔" وہ پھنکارا۔
"منشی صاحب! پانی لے لو۔" انور حسین نے گلاس منشی کے منہ کو لگایا۔
دو گھونٹ پانی پی کر منشی کے ہوش ٹھکانے آئے تو سامنے کھڑا مراد دکھائی دیا۔ دبلے پتلے مراد کا ہاتھ بڑا سخت تھا۔
"پہلے آئینے میں اپنی شکل دیکھ اور اپنی عمر بھی...... پھر اگلی بات کرنا۔"
اب اگلی بات کیا کرنی ہے۔ بات تو ختم ہو گئی۔ ناک سرخ ہو گئی تھی۔ غنیمت تھا کہ خون نہ نکلا تھا۔
"کاکے! مجھے گھر چھوڑ آ...... ان کو میں بعد میں دیکھ لوں گا۔" وہ ٹھینوں کی طرح بول رہا تھا۔
"بعد میں کیوں، ابھی دیکھ لے۔ اس گھر کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنا، میں ہوں چھڑا چھانٹ...... نہ آگے کوئی نہ پیچھے۔ تجھے قتل کر کے جیل بھی چلا گیا تو نقصان کسی کا نہ ہوگا۔" مراد پھنکارا۔
دروازے سے لگی ثمینہ نے دہل کر دل پر ہاتھ رکھا۔
آہٹ پر مڑ کر دیکھا تو دونوں بھاگی آ رہی تھیں۔ ثمینہ نے انگلی کے اشارے سے واپسی کا رستہ دکھایا، وہ وہیں ایک دوسرے کا بازو پکڑ کر رک گئیں۔
"نہ پتر، ایسی باتیں نہ کر۔" انور حسین نے ہاتھ جوڑ دیے۔
"میں دیکھ لوں گا سب کو......" منشی نے لولی لنگڑی سی دھمکی دی اور باہر نکل گیا۔
"یہ تم نے ٹھیک نہیں کیا، خواہ مخواہ دشمنی پال لی۔"
کاکے نے تاسف سے مراد کو دیکھ کر کہا۔ مراد نے مڑ کر دیکھا۔ ادھ کھلے دروازے سے لگی ثمینہ ان کے عقب میں افشاں کا بازو دبوچے وہ کھڑی تھی حیران پریشان۔ جیسے ہی مراد کی نگاہ کٹی پتنگ کی طرح اس کی نگاہوں کی دہلیز پر گری، وہ پلٹ کر کمرے میں غائب ہو گئی۔
انور حسین نے کانپتے ہاتھوں سے اندرونی دروازہ بند کیا اور لڑکھڑا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔
"مار پیٹ کی کیا ضرورت تھی۔ منشی نے رشتہ دیا تھا۔ انور حسین کی مرضی قبول کرتا نہ کرتا۔"
مراد نے ایک نظر صد درجہ پریشان انور حسین پر ڈالی اور تیزی سے وہاں سے چلا گیا۔
"مراد رشتہ لے کر آیا تھا۔ تو وہ دوسرا شخص کون تھا؟ مراد کی اور اس کی لڑائی کیوں ہوئی۔"
زرمین کا دماغ پھٹنے والا تھا مگر ماں سے سوال کرنے کی ہمت نہ ہوئی تھی۔

☆☆☆

منشی اکرم نے واسکٹ اتار کر کرسی پر پھینکی۔ غصے اور ناک کے درد سے برا حال تھا۔ کمبل اوڑھ کر لیٹی نسیمہ خاتون نے منہ سے کمبل ہٹا کر دیکھا۔ دولہا کی طرح تیار ہو کر جانے والا منشی حال دبے حال ہوا۔
"خیر تو ہے منشی صاحب! یہ آپ کے چہرے کو کیا ہوا؟"
"تمہیں کیا، تم اپنا کمبل اور گھر سنبھال کر لیٹی رہو۔" جب سے نسیمہ کو مہروں کا مسئلہ ہوا تھا۔ گھر اور شوہر کے حالات گڑبڑ ہی چل رہے تھے۔ بجائے اس کا ڈھنگ سے علاج کروانے کے منشی کے دماغ میں دوسری شادی کا سودا سما گیا۔ وہ بے چاری اپنی سمجھ سوچ کے مطابق درد کی گولیاں کھا کھا کر گھر اور بچوں کو گھسیٹ رہی تھی۔
"نجانے یہ پیدائشی روگن کہاں سے میرے پلے پڑ گئی۔ گرم پانی لا کر دو۔"

نسیمہ نے اٹھنے کی کوشش کی تو لبوں سے کراہیں نکل گئیں۔
''بس رہنے دو، تمہارا الارم تو پہلے ہی بج گیا۔'' منشی نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔
''میں مریم سے کہتی ہوں۔'' نسیمہ نے بیٹی کو آواز دی تو وہ نسیمہ کے ساتھ ساتھ اس کے پچھلوں کو کوستا دوبارہ گھر سے نکل گیا۔
''لگتا ہے بات نہیں بنی۔'' نسیمہ نے آسودہ ہو کر سر واپس تکیے پر ڈال دیا۔ مریم بھاگتی ہوئی آئی۔
''جی امی، ابو پھر چلے گئے؟''
''بیٹا! مجھے گرم پانی کی بوتل لا دو۔''
''امی! کب تک گرم پانی کی بوتلیں رکھتی رہیں گی۔ ابو سے کہیں، کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھائیں۔''
وہ ایف ایس سی کی اسٹوڈنٹ تھی اور سب سمجھتی تھی۔ نسیمہ دل گرفتی سے خاموش ہو گئی۔ کہتی بھی تو کیا۔

☆☆☆

''اب کیا سوچا ہے؟''
بجلی جا چکی تھی۔ ٹرنک پر رکھا ننھا سا دیا ٹمٹما رہا تھا۔ اس کی ذرا سی روشنی دبیز تاریکی کے ساتھ دست و گریباں تھی۔
کروٹیں بدل بدل زمین تھک گئی۔ ساتھ والے کمرے سے ہلکی سرگوشیوں کی آواز آرہی تھی۔ زمین اٹھی تو چارپائی چرچرائی۔
''شش......'' بے خیالی میں چارپائی کو خاموشی کا اشارہ دیتی، وہ ننگے پاؤں ساتھ والے کمرے کے دروازے سے آ لگی۔ صحن میں رجب کی ابتدائی تاریخوں کا چاند دیوار پار ایستادہ تھا۔
''میں تو کہتی ہوں اچھا لڑکا ہے۔ فوراً ہاں کر دیں۔ منشی سے بھی جان چھوٹ جائے گی۔''
زمین مسکائی اور دل ہی دل میں اعتراف کیا۔
(ہاں اچھا تو بہت ہے)
''ہاں لڑکا تو اچھا ہے۔'' انور حسین نے تائید کی۔
''مگر غصے کا تیز لگا، کیسے منٹوں میں منشی کو دھول چٹا دی۔'' ثمینہ نے کہا۔
(ہیں منشی کو مارا ہے، پھر تو بہت ہی اچھا کیا)
''اور تم نے سنا ہی نہیں، کیا کہہ رہا تھا۔''
(کیا کہہ رہا تھا؟ کوئی مجھے بھی تو بتائے)
زمین کے اندر کھد بد ہونے لگی۔
''کہہ رہا تھا کہ تم نے پھنسایا ہے لڑکے کو یا......'' ثمینہ کہتے کہتے رک گئی۔
''اسی لیے چاہتی ہوں۔ اس رشتے کے لیے ہاں کر دو تو بس نکاح کر کے زمین کو رخصت کر دیں۔ مراد اس قابل ہے کہ اس کی حفاظت کر سکے۔ وہ...... وہ منشی چپ تو نہیں بیٹھے گا۔''
ثمینہ کسی بھی خدشے کو زبان تک لاتے لاتے رک گئی۔
(میرے رشتے کا منشی سے کیا تعلق)
''تم ٹھیک کہتی ہو۔ ایسا ہی کرتا ہوں۔ وہ اچھا نوجوان ہے۔ زمین کو خوش رکھے گا۔ میں کل ہی کا کے کو ہاں کہہ دوں گا۔''
زمین کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ تیزی سے پلٹی تو دیوار کے ساتھ ماتھا دھو کر رکھی پتیلی سے ٹکرا گئی۔
گہری خاموشی میں پتیلی ڈھولک بجاتی گول گول گھوم گئی۔

"کون...... کون ہے......؟" انور حسین نے پکارا۔
"ب...... بلی ہے ابو جی!" وہ کہہ کر رکی نہ تھی، بھاگ کر بستر میں چھپ گئی۔
نیم تاریکی میں انور حسین اور ثمینہ نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ہنس پڑے۔
کچھ لمحوں کے بعد دل کی دھڑکن اور شرمندگی کا احساس کم ہوا۔ تو زرمین نے رضائی سے منہ نکالا۔ دیے کی ٹمٹماتی لو اس کی آنکھوں میں جگمگانے لگی۔
"مراد......" زیر لب کہتے اس نے دیے کی لو بڑھا دی۔

☆☆☆

زرمین کے گھر سے آنے کے بعد طبیعت یوں مکدر ہوئی کہ کام پر نکلنے کو بھی دل نہ چاہا۔ غشی پر رو رہ کر تاؤ آ رہا تھا۔ کسل مندی سے بستر پر لیٹے لیٹے نجانے کتنی بار غشی کی ٹھکائی کی۔
کہاں کومل پھولوں کی پنکھڑیوں جیسی نازک سی زرمین اور کہاں وہ ادھیڑ عمر گینڈے کے جسامت والا غشی۔
مسجد سے عشاء کی اذان ہونے لگی۔
"اٹھ جا مراد علی...... !بندہ بڑا کمزور ہے، سارے سیاپے اپنے سر لے کر گزارا نہیں ہوتا۔ کچھ کام اللہ کے سپرد کر کے بے فکر ہو جانا چاہیے۔ وہ میرا سوہنا رب...... جو چاہے میری جھولی بھر دے۔ پر تو اسے یاد کرتا رہ کہ اس کا بندہ اسے بھولا نہیں۔"
علی بخش ترکمان نے زور سے اس کا پلنگ ہلایا اور خود مسجد کی طرف دوڑ لگا دی۔
وہ ایسا ہی تھا ہمیشہ سے بلاوے کا منتظر...... ادھر پہلا کلمہ مسجد سے بلند ہوا ادھر اس نے ہاتھ روکا اور بھاگم بھاگ سجدہ کرنے پہنچ گیا۔
مراد ایک دم اٹھ بیٹھا۔
ابا ٹھیک ہی تو کہتا تھا۔ رب کی مرضی جس کی جتنی چاہے۔ جھولی بھر دے۔
مگر علی بخش کی پھرتیاں مراد کے نصیب میں نہ تھیں۔ مسجد بھاگنے کے بجائے وہیں جائے نماز بچھا کر کھڑا ہو گیا۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو زرمین کے سوا کوئی دعا یاد نہ آئی۔ لفظ لفظ سجا سنوار۔ کے اللہ کے حضور درخواست پیش کی۔ درود شریف کی پوری تسبیح پڑھ لی۔
بس اللہ کسی طرح خوش ہو کر، راضی ہو کر اس کے نصیب میں زرمین لکھ دے۔ اسے بس غشی اکرم کے پیسے سے ڈر لگتا تھا۔ اور سنا تھا انور حسین اس کا مقروض ہے۔
"کیا بے وقوفانہ سوچ ہے، کوئی قرضے کے بدلے بیٹی دیتا ہے۔" اس نے خود ہی اپنے خدشے کو رد کر کے خوش امیدی کو گرہ سے باندھ لیا۔
"مراد بھائی...... !" باہر سے فرخ کی آواز آئی تو مراد نے جائے نماز لپیٹ کر دروازہ کھول دیا۔
"آپ نے کہا تھا موبائل لینے جانا ہے، چلیں۔"
"عشاء ہو گئی ہے۔ دکانیں بند ہو گئی ہوں گی۔"
"دوست کے ابو کی دکان ہے، ابھی کھلی ہے، میں نے بتا کیا تھا۔"
"چھوڑ و یار! ابھی موڈ نہیں ہے۔" مراد نے بیٹھ کر اسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
"موڈ کو کیا ہوا سر جی...... " فرخ نے بیٹھ کر پاس پڑی خانہ بدوش اٹھالی۔ سر جی کو سفرنامے پڑھنے کا شوق تھا، اکثر سیکنڈ ہینڈ خرید لاتا۔
"چائے پیو گے؟"

"پلا دیں۔"
مراد کے اپنے سر میں درد شروع ہو گیا تھا چائے بنانے کے ساتھ ساتھ وہ بلند آواز میں فرخ کے ساتھ لایعنی گفتگو کھینچتا رہا۔ فرخ نے ایسی بے مقصد باتیں کم ہی مراد کے منہ سے سنی تھیں۔
"آپ پریشان ہیں مراد بھائی؟" چائے کی پیالی پکڑتے ہوئے اس نے غور سے مراد کو دیکھا۔
"ہاں......" وہ اپنی پیالی لے کر سامنے بیٹھ گیا۔
"کیا ہوا۔ لڑکی والوں نے انکار تو نہیں کر دیا۔" فرخ نے اپنے تئیں مذاق کیا۔
"نہیں۔" مراد نے پیالی ایک طرف رکھی۔ "تمہیں پتا ہے وہ منشی اکرم بھٹے والا جو سود پر لوگوں کو قرض بھی دیتا ہے۔"
"جس کے چہرے پر اس کی سود خوری دکھائی دیتی ہے۔"
"وہ اپنا رشتہ زمین کے گھر لے کر گیا تھا۔"
"اپنے بیٹے کا...... وہ تو ابھی چھوٹا ہے۔" فرخ کو تعجب ہوا۔
"میرے لفظوں پر غور نہیں کیا، اپنا رشتہ لے کر گیا ہے۔" مراد نے اپنا پر زور دے کر کہا۔
"دماغ ٹھیک ہے اس بڈھے کا۔" فرخ سرتاپا سلگ گیا۔
"دماغ ٹھیک کر کے آیا ہوں۔ ناک توڑ دی اس کم بخت کی۔" مراد نے پیالی اٹھا کر گرم گرم گھونٹ بھرا۔
"بالکل ٹھیک کیا۔ میں ہوتا تو یہی کرتا۔" فرخ نے اپنی پیالی اٹھائی۔ انکار تو ہو ہی جانا تھا اس کا فرخ کو صد فیصد یقین تھا۔ مگر زمین کو چھیڑنے کے لیے ایک موضوع ہاتھ لگ گیا تھا۔
"مگر مراد بھائی! آپ وہاں کیا کر رہے تھے؟" فرخ نے چونک کر سوال کیا۔
"میں بھی رشتہ لے کر گیا تھا۔" مراد نے سادگی سے جواب دیا۔
گرم گھونٹ نے اس کے ہونٹ ہی نہیں دل بھی جلا کر راکھ کر دیا تھا۔
وہ ٹکر ٹکر مراد کا منہ دیکھتا رہا۔
"ز...... زمین......"
"ہاں، اچھی ہے نا؟" مراد کے چہرے پر مسکراہٹ بکھری اور فرخ کا دل چاہا جو مکا مراد منشی کو مار کر آیا ہے، وہی مراد کی ناک پر دے مارے۔
مگر اس میں اتنی جرأت تھی نہ ہمت۔
اس نے آہستہ سے پیالی ٹرے میں رکھی اور کھڑا ہو گیا۔
"آپ کی اس سے کب دوستی ہوئی؟"
"دوستی نہیں، محبت ہوئی ہے۔ وہ تو ایسی شرمیلی ہے آنکھ اٹھا کر بات نہیں کرتی۔ تحفہ دوں تو واپس کر دیتی ہے۔ پکار لوں تو بھاگ جاتی ہے۔ اور ایک تمہارا بھائی ہے جسے اس کے سوا کچھ اور نظر ہی نہیں آتا۔" پیالی پر انگلی گھماتے مراد دھیمے لفظوں میں بولتا چلا گیا۔
فرخ کے گلے میں آنسوؤں کا گولہ سا پھنس گیا۔
"یار! اس کے گھر والے مجھے انکار تو نہیں کریں گے۔" مراد نے بڑی آس سے فرخ کو دیکھا۔
"مجھے کیا پتا۔" فرخ کا لہجہ روکھا سا ہو گیا۔
"تمہارا تو ان کے گھر میں بہت آنا جانا ہے۔ میری سفارش کر دینا۔ اسے بتانا، مراد اسے بہت چاہتا ہے۔ اس کی ہر خواہش پوری کرے گا۔ اسے خوش رکھے گا۔"
وہ فرخ کے دروازے سے نکلنے تک بولے گیا۔

☆☆☆

گھر کا دروازہ ابو نے کھولا تھا۔ اس سے کچھ پوچھا بھی، مگر وہ بغیر جواب دیے اپنے کمرے میں گھس گیا۔
دماغ ابھی تک سنسنا رہا تھا۔
منشی کا رشتہ..... مراد کا رشتہ..... تو فرخ کا کیوں نہیں؟
وہ ہر لحاظ سے ان سب سے بہتر تھا۔ کہاں وہ بڈھا اور کہاں وہ رکشے والا..... ہونہہ۔
میرا ایک خاندان ہے..... گھر ہے..... یہ کیسے ممکن ہے کہ امی بات کریں اور زرمین کے گھر والے انکار کردیں۔"
فخر سے اس کا دل و دماغ بھر گیا۔
"زرمین مجھے انکار کر ہی نہیں سکتی۔" خود کو یقین دلا کر وہ صبح کے انتظار میں لیٹ گیا تھا۔

☆☆☆

پیلے سرسوں کے کھیتوں پر دھوپ چاندی کے سکوں کی طرح چمک رہی تھی۔ گندم کی نوخیز فصل کو پانی لگ چکا تھا۔ فضا میں سنگتروں اور سرسوں کی خوشبو گھلی ملی تھی۔ چکوتروں کے باغ اُجڑ گئے تھے جبکہ کینو اور امرود کے باغ اپنے عروج پر تھے۔
وہ جس درخت کے پاس کھڑی تھی، اس کی شاخیں پھلوں کے بوجھ سے جھکیں گھاس پر سجدہ ریز تھیں۔
اس نے چوکنی ہرنی کی طرح اِدھر اُدھر دیکھا، پھر سب سے نچلی شاخ سے کینو توڑ کر چھیلا۔ دو پھانکیں منہ میں رکھیں، کینو کھٹا تھا۔ باقی ماندہ کینو اس نے دور اچھالا اور خود گھاس پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔
گھاس گیلی اور ٹھنڈی تھی۔
اسے سردی محسوس ہونے لگی مگر مجبوری تھی۔ وہ ان گھنے پیڑوں کو چھوڑ کر دھوپ میں نہیں جا سکتی تھی۔
اس کی نظروں کے سامنے جگہ جگہ گھاس پر کینو گرے تھے۔ وہ توبے توجہی سے انہیں گنتی رہی، تب ہی وہ بے آواز چلتا آیا اور دھپ سے اس کے قریب بیٹھ گیا۔
ثریا ڈر گئی..... پھر غصے سے اسے پرے دھکیلا۔
"پراں مر..... یوں جڑ کر بیٹھتا ہے جیسے میرا خصم (شوہر) ہو۔"
اس کی بدزبانی نے ماحول کا سارا فسوں بکھیر کر رکھ دیا۔
بشیر بدمزا ہو کر پیچھے کھسک گیا۔
"ہو ہی جاتا اگر تمہارا باپ اڑنگا (رکاوٹ) نہ ڈال دیتا۔"
"رہنے دے، تجھ میں ہمت ہی نہیں تھی۔"
"ہمت تو اب بھی بہت ہے۔ بھاگ چلو میرے ساتھ۔" بشیر نے ہتھیلی پھیلائی۔
"لے کر کہاں جاؤ گے؟" ثریا نے تذبذب سے پھیلی ہتھیلی کو دیکھا۔
"لاہور چلتے ہیں۔ بڑا کام ہے میرا۔"
"تو تو پکا ہی ہو گیا۔" ثریا نے ہنس کر منہ پھیرا اور آنکھ میں اُتری نمی پونچھ ڈالی۔ کچھ بھی تھا بشیر کے ساتھ وہ بچپن میں گھر بسانا چاہتی تھی۔ باقی تو آتے جاتے موسموں کی طرح گزرتے چلے گئے۔ کبھی ایک سوٹ کے عوض تو کبھی چوڑیاں، سرخی پاؤڈر کے بل پر..... کچھ پل رنگین کرنے والے بے دید لوگ..... ثریا نے ایسی بدنامی پلو سے باندھی کہ لڑکوں کی ماؤں نے اسے دیکھ کر کانوں کو ہاتھ لگانا شروع کردیا تھا۔
"اب بھی تم سے سچا پیار کرتا ہوں ثریا!"
"میں نے تمہارے پیار کا اچار ڈالنا ہے۔"
"تمہاری زبان بہت خراب ہو گئی ہے۔"

''اور تو تو پکالا ہور یا ہو گیا ہے۔'' طنز اس کے لہجے سے جاتا ہی نہ تھا۔
''تمہارے لیے کچھ لایا ہوں۔'' بشیر نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔
''مجھے نہیں چاہیے تمہارے گلٹی بندے اور انگوٹھیاں۔''
''لڑنے آئی ہو۔''
''تم سے نہیں، قسمت سے لڑ رہی ہوں۔'' وہ سچ مچ رونے بیٹھ گئی۔
''اچھا ادھر دیکھ، بات تو سنو۔'' کچھ لمحوں کی کھینچا تانی کے بعد وہ کٹی پتنگ کی طرح ڈول گئی۔
''کیوں روئی؟''
''وہ کرم داد ہے نا۔''
''وہ تندور یا۔''
ثریا نے اثبات میں گردن ہلائی۔ پورے گاؤں میں اس کا واحد تندور تھا۔ روٹیوں کے ساتھ، دال، سبزی اور کلیجی کا سالن بناتا۔
''اس نے میرا رشتہ بھیجا ہے۔''
بشیر نے اسے بے دریغ کئی گالیاں دے ڈالیں۔
''ابا بھی راضی ہے، اور سارا قصور اس رشیداں کا ہے۔ منالیا ابے کو کہ جیتے جی ثریا کا رشتہ کر دے۔ جیسے راتوں رات ابا مرنے والا ہو۔''
''مجھ میں کیا کمی تھی؟'' بشیر کو تاؤ آ گیا۔ وہ لمبے دانتوں اور سانولی رنگت والا کرم داد جسے اس کی بدصورتی کی بنا پر کوئی بھی رشتہ نہ دیتا تھا۔ کیسے اس کے مقابل آ کر ثریا کا امیدوار بن گیا تھا۔
''کماؤ ہے، شریف ہے...... سب سے بڑھ کر برادری کا۔'' ثریا نے رشیداں کے الفاظ دہرائے۔
''تو پھر یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہے، جا کے اس کے نام کی انگوٹھی پہن۔''
بشیر غصے میں کھڑا ہو گیا۔
ثریا نے ہاتھ پکڑ لیا۔
''انگوٹھی پہن لوں گی، پر بیاہ نہیں کروں گی۔''
بشیر نے ثریا کی آنکھوں کی بغاوت پڑھی اور واپس جڑ کر بیٹھ گیا۔ شبنمی گھاس ان کی سرگوشیوں سے چرمرانے لگی۔

☆☆☆

''جانے کیوں دیا؟'' تھکی ہاری رشیداں گھر آئی تو ثریا کو نہ پا کر ماتھا پیٹ لیا۔
''میرے کہنے سے رک جاتی۔'' اقصیٰ نے بے حد بے زاری سے ماں کو دیکھا۔
سارا گھر صاف کر دیا تھا۔ صحن میں بکھری مدھم دھوپ میں چارپائیاں بچھا کر کھیس اور سرہانے بھی رکھ دیے تھے۔ باورچی خانے میں مٹی کے پیالوں میں گاجر کی کھیر ٹھنڈی ہو کر جم گئی تھی اور اندر ابا شور مچا رہا تھا۔
''رفیق کو کیا ہوا؟''
''ابے کے بہت درد ہو رہا ہے اماں!'' اقصیٰ کی آنکھیں بھر آئیں۔ رفیق کی تکلیف دیکھی نہ جاتی تھی۔
''سرسوں کا تیل گرم کر کے لے آ، میں مالش کر دیتی ہوں۔''
رشیداں نے ہاتھ میں پکڑے بسکٹوں کے پیکٹ اور کیک رسک کا لفافہ اقصیٰ کو پکڑایا اور خود اندر چلی گئی۔
رفیق اسے دیکھتے ہی رونے لگا۔

"مجھے معاف کردے رشیداں!"

رشیداں دم بخود رہ گئی۔ علی بخش ترکمان کی وفات کے بعد اس کی دو وقت کی روٹیاں اور سال کے چار جوڑے کپڑے بھائی بھرجائی پر بھاری ہو گئے تھے۔ کیونکہ اکیلی نہیں تھی، ساتھ دو جانیں بھی تھیں۔ ان ہی دنوں رفیق کی بیوی ٹائیفائیڈ سے وفات پا گئی تھی۔ ثریا اور گھر کی دیکھ بھال کے لیے زنانی کی ضرورت تھی۔ بس برادری نے پکڑ دھکڑ کر دونوں کا نکاح پڑھوا دیا۔ وہ کتنا روئی، کرلائی۔ علی بخش کی جگہ کسی اور کو دینا آسان نہیں تھا۔ مگر کڑوا گھونٹ بھرنا پڑ گیا۔

رفیق کا گھر بس گیا اور رشیداں گویا دوبارہ اجڑ گئی۔

اقصیٰ نے تیل کی کٹوری لا کر رکھی۔

"کس بات کی معافی مانگ رہا ہے رفیق؟" رشیداں کا لہجہ برف جیسا سرد ہو گیا۔

رفیق کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی ہوئی۔

وہ اچھی طرح جانتا تھا، رشیداں کیا پوچھ رہی ہے۔

"بس...... کس بات کی معافی مانگ رہا ہے رفیق؟"

رشیداں نے اس کی تہبند ٹانگ سے ہٹائی۔ ٹانگ سیاہی مائل ہو رہی تھی۔

"مجھے گھر کی نوکرانی بنا کر رکھنے کی معافی؟" رشیداں نے انگلیاں سرسوں کے نیم گرم تیل میں ڈبو کر ٹانگ پر پھیریں۔ رفیق کی کراہیں نکل گئیں۔

"نہیں رفیق! یہ درد اتنا نہیں ہے، جتنا میں نے سہا تھا۔"

وہ ایک لفظ نہیں بولی تھی، مگر رفیق نے حرف حرف سنا تھا۔

☆☆☆

"مجھے اس گلی نہیں گزرنا۔" زمین رک گئی۔ بہت دور سے کھڑا رکشہ نظر آ رہا تھا۔ دھڑکنیں خواہ مخواہ اتھل پتھل ہونے لگیں۔

"واہ بھئی واہ۔ جہاں سے بارات آنی ہے، اسی گلی نہیں جانا۔" افشاں نے کھلکھلاتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔

"افشاں!" اس کا احتجاج کسی کام نہ آیا۔

"اچھا، یہ تو بتاؤ۔ مراد بھائی نے نعمی کو کیوں مارا؟"

"مجھے کیا پتا؟ اس نے ابو جی سے بدتمیزی کی ہوگی۔ مراد کو غصہ آ گیا۔" زمین نے سادگی سے بتایا۔ ہلکے ہلکے گانے کی آواز جالی کے دروازوں سے چھن چھن کر آ رہی تھی۔

تم کو بلاؤں کہ پلکیں بچھاؤں

قدم تم جہاں جہاں رکھو......

رکشے کے عین قریب جا کر افشاں کا پاؤں رپٹ گیا اور کندھے پر دھرا بیگ زمین بوس ہو گیا۔ سر راہ بیگ کی زپ کھلنے کی تک کوئی نہ تھی مگر کھل گئی...... کتابیں، کاپیاں بکھر گئیں۔ اوپر سے افشاں کی بلاوجہ کی چیخ......

زمین کو آسماں بناؤں

ستاروں سے سجاؤں اگر تم کہو......

کھٹ سے گانا بند بھی ہو گیا۔

"بدتمیز...... کمینی......" اس کی ساری مکاریوں کو سمجھتے، دانت پیستے زمین نے خود بھی نیچے بیٹھ کر کتابیں اکٹھی کرنی شروع کر دیں۔

تب ہی جالی کا دروازہ کھلا۔ مراد باہر آیا تو افشاں کی باچھیں کھل گئیں۔
زمین گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔
"زمین! کیسی ہو؟" سرمئی شلوار قمیص میں ملبوس وہ اس لمحے کو نعمت کی طرح ہتھیلیوں میں سمیٹنے آ گیا تھا۔
"وہ...... افشاں کا بیگ گر گیا تھا۔"
"شکریہ افشاں!" دانت نکالتی افشاں نے جیومیٹری باکس ہاتھ سے چھوڑ دیا۔
"بیٹھی رہو۔ میں جا رہی ہوں۔" زمین تیزی سے چل دی۔ اس سے زیادہ تیزی سے مراد گھوم کر زمین اس کے سامنے آ گیا۔
"میں کیا تمہیں کھا جاؤں گا۔"
"کسی نے دیکھ لیا تو اچھا نہیں ہوگا۔" زمین نے جلدی سے دوپٹہ ٹھیک کیا۔
افشاں جلدی جلدی پنسلیں، پین اکٹھے کرنے لگی۔
"اتنا تو بتا دو، تمہارے گھر والوں نے کیا سوچا ہے؟"
"مجھے نہیں پتا۔" زمین نے مدد طلب نگاہوں سے مڑ کر افشاں کو دیکھا۔
"تم سے پوچھا تو انکار تو نہیں کرو گی؟"
"مجھ سے نہیں پوچھیں گے۔" وہ کترا کر گزری۔
"کوئی امید بھی نہ رکھوں؟" مراد نے مڑ کر اسے جاتے دیکھا۔
وہ ایک لمحے کو رکی۔ پھر تیزی سے چلی گئی۔
"اسے چھوڑیں مراد بھائی!" افشاں اپنا بیگ سنبھالتی پاس آئی۔
مراد کا دل ڈوب گیا۔
"شادی کی تیاری کریں۔" افشاں کی شوخ آواز پر مراد کا دل ڈوب کر ابھرا۔
"تم سچ کہہ رہی ہو؟"
"ہاں نا۔ چاچا انور آج آپ کو جواب دیں گے۔ یعنی رشتہ پکا ہونے کی خوش خبری سنائیں گے۔" وہ عجلت میں کہہ کر زمین کے پیچھے بھاگی۔
"یا ہو......" فضا میں گلی مراد کی جان دار آواز سے بھر گئی۔
دونوں ایک لمحوں کو رکیں پھر ہنستے ہوئے بھاگ گئیں۔
☆☆☆
"امی! آپ کو پتا ہے، زمین کے لیے رشتہ آیا ہے۔"
"ہیں...... یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔" وہ بڑی فرصت سے کروشیہ دھاگا لے کر صحن میں آ بیٹھی تھیں۔ بڑی بیٹی کے لیے ٹرے کور بنانا تھا۔
"اس میں اچھی کیا بات ہے؟" فرخ کے لہجے میں ناراضی چھلکی۔
"غریبوں کی بیٹیاں جتنی جلدی بیاہی جائیں، اتنا ہی اچھا ہے۔" انہوں نے بسم اللہ پڑھ کے پہلا ٹانکا اٹھایا۔
"کیوں، غریب کی بیٹی کو حق نہیں کہ وہ پڑھے لکھے، اپنی زندگی بنائے۔" فرخ نجانے کیوں جھنجلا رہا تھا۔
"زمین کون سا ڈاکٹر بن رہی ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایف اے کرے گی۔ پھر تو شادی کرنی ہی ہے۔ ذرا یہ دھاگا کھولنا۔ نجانے کہاں پھنس گیا ہے۔"
فرخ نے ان کے ہاتھ سے دھاگا لیا اور اپنی بات کا سرا ڈھونڈنے لگا۔

"زمین کی بات طے ہو گئی تو انہیں کچھ بستر بنوا دوں گی۔ بے چاروں کی امداد ہو جائے گی۔"
"امی! وہ مجھے بھی اچھی لگتی ہے۔"
فرخ نے دل کڑا کر کے کہہ دیا تو خدیجہ بری طرح چونک گئیں۔ بیٹے کو بغور دیکھا تو دھاگے کو سلجھاتے خود الجھا الجھا لگا۔
"اس عمر میں تو ساری لڑکیاں اچھی لگتی ہیں۔"
"افشاں تو نہیں لگتی۔" فرخ نے ترنت جواب دیا۔
"تو پھر؟"
"زمین مجھے زیادہ اچھی لگتی ہے امی! آپ میرے رشتے کی بات کیوں نہیں کرتیں۔"
خدیجہ کو جھٹکا لگا، مگر فوراً سنبھل گئیں۔
"اچھی تو تمہیں کجل اور علیزے شاہ بھی لگتی ہیں۔ ان کے گھر بھی رشتہ لے جاؤں۔"
"امی!" خدیجہ نے مشہور اداکارہ کا نام لیا تو فرخ جھنجلا گیا۔
"چلو رشتہ لے گئی شادی کر لو گے؟"
"اتنی جلدی شادی...... مطلب ابھی تو مجھے پڑھنا ہے۔ کیریر بنانا ہے۔" وہ ماں کے اتنی جلدی مان جانے پر ہکا بکا رہ گیا۔
"مطلب منگنی کر دیں۔"
"اور وہ اتنے سال...... مطلب اگلے پانچ سال اپنی بیٹی کو تمہارے انتظار میں بٹھا کر رکھیں گے۔"
"تو کیا حرج ہے؟"
"زمین بھی تمہیں پسند کرتی ہے؟" انہوں نے کچھ سوچ کر پوچھا۔
"پتا نہیں۔"
"تو پھر بیٹا جی! اپنے دل کو سنبھال کر رکھو۔ ان پانچ سالوں میں تمہیں پانچ لڑکیاں اور پسند آ جائیں گی۔ باقی رہی زمین، تو اس کے ساتھ نہ تمہارا جوڑ ہے نہ ہی تمہارے خاندان کا۔ اس لیے اس بات کو یہیں لپیٹ دو۔ باپ کو پتا چلا تو ہڈی پسلی ایک کر دے گا۔" آخر میں مخصوص ماؤں والی دھمکی دے کر انہوں نے فرخ کی بولتی بند کروا دی تھی۔
"مگر امی!"
"چپ...... پیدا ہوتے ہی شادی کی پڑ گئی۔ پہلے کسی قابل تو ہو جاؤ۔ خبردار جو آج کے بعد زمین کا نام بھی لیا تو۔" مصنوعی تحمل کا لبادہ اتارتے انہوں نے کروشیہ فرخ کے بازو میں چبھو دیا۔ وہ بلبلا کر بھاگا۔
"حد ہے، ان لڑکے لڑکیوں کی تو مت ہی ماری گئی ہے۔ زمین کا داخلہ بند کرواتی ہوں اس گھر میں۔"

☆☆☆

کوئی بچپن تو تھا نہیں کہ کودتا پھاندتا زمین کے گھر پہنچ جاتا۔ تب ہی ماں کی نظر بچا کر گاجر کا حلوہ اٹھا کر لے گیا۔ دروازہ ثمینہ نے کھولا تھا۔
"امی نے نیاز دلوائی ہے۔"
"تمہاری امی تو نیاز نہیں کرتی تھیں۔" ثمینہ کو حیرت ہوئی، اتنے سالوں کی روٹین میں خلل جو پڑا تھا۔
"وہ زمین کہاں ہے؟ اس سے مطالعہ پاکستان کی کتاب لینی تھی۔" ثمینہ کچن کی طرف چل دی۔
"ہیں...... تم نے کیا میٹرک کا امتحان دوبارہ دینا ہے۔" دیوار پر سے افشاں مسکائی۔
"تمہیں کوئی تکلیف ہے؟" فرخ نے غصے سے اسے دیکھا۔

''تکلیف میں کوئی ہنستا ہے۔ میں تو خوش ہوں۔'' وہ زیادہ کھلکھلائی۔
''ہر وقت ہنسنے والے پاگل لگتے ہیں۔ وہ بھی بے وجہ۔''
''میرے پاس تو وجہ ہے۔'' دیوار پر دونوں کہنیاں ٹکا کر وہ اوپر ہوئی۔
''تمہاری شادی ہو رہی ہے؟'' فرخ نے طنز کیا۔
''میری سہیلی کی ہو رہی ہے۔''
چھت سے نیچے آتی زمین نے سر پیٹ لیا۔
''تمہارے سر سے۔'' افشاں نے مزید گوہر افشانی کی۔
''زمین راضی ہے؟''
فرخ نے زمین کو دیکھا۔ اس کے قدم سست اور چہرہ گلابی ہو گیا تھا۔
فرخ کا دل ڈوب گیا۔
''ہاں یہی سمجھو۔ اس کا چہرہ نہیں دیکھ رہے۔''
''اسے بھی مراد بھائی پسند ہیں؟'' وہ دیکھ زمین کو اور سوال افشاں سے کر رہا تھا۔
''ایسے ویسے۔''
''کیوں بولتی چلی جا رہی ہو؟'' زمین تیزی سے پاس آ گئی۔
وہ تو آیا تھا کہ زمین سے کہے گا، اس کا انتظار کرے۔ جب وہ کسی قابل ہو جائے گا تو صرف اسی سے شادی کرے گا مگر زمین کے چہرے کے رنگ، ہونٹوں کے کنارے چھلکتی مسکان..... وہ جیسے ابھی سے مراد کی ڈولی میں بیٹھ گئی تھی۔
وہ جس جوش کے ساتھ آیا تھا، اسی سست روی سے پلٹا۔
''مراد کو کوئی پیغام تو بھیج۔'' افشاں مسلسل اسے اکسا رہی تھی۔
فرخ نے دروازے کے پاس پلٹ کر دیکھا۔
''وہ ان سے کہنا، بی اے کے پرچے ضرور دیں۔'' زمین نے شپٹا کر کہا۔
ثمینہ ڈونگے میں مٹھائی بھر لائی تھی۔
مراد کی لائی مٹھائی......
فرخ نے ڈونگا کچن میں رکھا، جہاں خدیجہ حلوہ ڈھونڈ رہی تھیں۔
''یہ کہاں سے آئی؟''
''زمین کے گھر سے۔'' وہ لبالب بھرتی آنکھیں چھپاتا کمرے میں بھاگ گیا۔
''آ...... شکر ہے اللہ کا۔'' خدیجہ نے سکون بھری سانس کھینچی اور ان رضائیوں کا حساب لگانے لگیں جو انہیں زمین کے جہیز میں دینی تھیں۔

☆☆☆

''فرخ......'' مراد نے اسے گھر کے دروازے پر ہی پکڑ لیا تھا۔ ورنہ اس وقت وہ مراد کی نہ شکل دیکھنا چاہتا تھا نہ آواز سننا۔
''یار! تم سے ایک کام ہے۔''
''مراد بھائی! مجھے کالج جانا ہے، ضروری پریکٹیکل ہے۔''
''مجھے زمین کے لیے رنگ خریدنی ہے۔ مجھے کیا پتا لڑکیاں کیسی پسند کرتی ہیں۔''
''میں کون سا لڑکیوں کو رنگ گفٹ کرتا پھر رہا ہوں۔ مجھے کالج جلدی پہنچنا ہے۔''

وہ اتنی رکھائی سے کہہ کر مڑا کہ مراد ہکا بکا رہ گیا۔
فرخ کچھ دور جا کر مڑا۔
"وہ چاہتی ہے آپ گریجویشن ضرور کریں۔"
"ہیں؟"
"اس لیے گریجویشن کرلیں مراد بھائی! شادی تو ہوتی رہے گی۔" فرخ سپاٹ سے لہجے میں پیغام دے کر چلا گیا۔
"خود کشیدہ چلانا چاہتی ہے اور میں گریجویشن کروں۔" وہ بڑبڑاتا ہوا مڑا۔
سناپ کا پتا تھا، نہ ڈیزائن کی پہچان...... بہت سی انگوٹھیوں میں سے جو اچھی لگی لے لی۔

☆☆☆

"یہ غریب اس قابل نہیں ہوتے کہ ان کے ساتھ نرمی برتی جائے۔ قسط نہیں دے تو ٹانگیں توڑ کے آنا۔"
کونے میں بیٹھے انور حسین کو پسینہ آ گیا۔ وہ کب سے یہاں بیٹھا تھا کہ صبح صبح منشی کا پیغام آ گیا تھا اور اب منشی اسے کونے میں بٹھا کر یوں بھولا کہ انور حسین کو اپنا آپ بوسیدہ رجسٹروں جیسا لگنے لگا تھا۔
"میں نے تو قسط جمع کروادی کل ہی۔" جیسے ہی منشی کا فون بند ہوا۔ انور حسین نے تیزی سے وضاحت کی۔
"تجھے میں نے جتنی ڈھیل دینی تھی، دے دی۔ وقت ختم ہو گیا تیرا۔" منشی نے خشمگیں نگاہوں سے انور کو گھورا۔ "صبح پورے پیسے کلیئر کر۔"
"م...... صبح......" انور ہکا بکا رہ گیا۔ پتا تھا منشی تنگ کرے گا پر اس طرح۔
"میں نے کیا انگریزی بولی ہے۔" منشی گرجا۔ "اپنا ہونے والا سسر سمجھ کر لحاظ کر رہا تھا۔ اب مہلت ختم۔ صبح پیسے نہ ملے تو دکان نیلام کر دوں گا۔"
"منشی صاحب! رحم کریں۔ میں کہاں سے دوں گا۔" انور گڑگڑانے لگا۔
"جا کر اپنے ہونے والے جوائی سے مشورہ کر...... اور نکل یہاں سے...... دفع ہو۔ کم بخت تجھے سر پر بٹھانے کی تیاری کر رہا تھا۔ پر تیرے جیسے ٹھوکروں میں اچھے رہتے ہیں۔"
منشی نے نفرت سے زمین پر تھوک دیا۔
انور حسین کی التجا، گڑگڑانا کچھ بھی کام نہ آیا۔
"اس کو اٹھا کر باہر پھینک...... کچرا ہوتا جا رہا ہے۔"
ملازموں نے اسے دھکے دے کر باہر نکالا تھا۔ وہ لٹا پٹا سا گھر پہنچا تو ساری بات سن کر ثمینہ ڈھے سی گئی۔
"ہم کہاں سے لائیں گے۔"
"ابھی تک بس سود ہی اتار رہے ہیں۔ اصل رقم تو وہیں کھڑی ہے۔" وہ خود پیلا پھٹک ہو رہا تھا، بیوی کو کیا تسلی دیتا۔
"اور سچ کہوں تو ابھی وہ اور بھی ستائے گا۔ اسے پیسہ نہیں۔ زمین کا رشتہ چاہیے، ضد میں جو آ گیا ہے۔ ہمیں سڑک پر لے آئے گا۔"
"تو......" اپنی بے بسی پر بہتے آنسو رکتے ہی نہ تھے۔
"تو کیوں روتی جا رہی ہے۔ میں ابھی زندہ ہوں۔ دکان نیلام ہوتی ہے تو ہو جائے، بیٹی نہیں دوں گا۔"
"ایک بات کہوں؟" ثمینہ نے دوپٹے کے پلو سے چہرہ صاف کیا۔
"ہاں بولو۔" انور حسین تھک کر چارپائی پر لیٹ گیا۔
"اس لڑکے کو بلا کر زمین کا نکاح کر دیتے ہیں۔"

”اتنی جلدی۔“
”بیٹی عزت سے اپنے گھر کی ہو جائے، ہمیں اور کیا چاہیے۔ کماتا کماتا ہے، زمین کے جوڑ کا ہے۔“
”اور منشی سے کیا کہوں؟“
”کچھ دن کے لیے ٹال — زمین رخصت ہو کر چلی گئی تو جو جی میں آئے کرتا رہے۔“
”بات تو ٹھیک ہے۔ میں آج ہی کاکے سے بات کرتا ہوں۔“

☆☆☆

”مجھے کچھ دن کی مہلت دیں منشی صاحب! میں سوچ کر جواب دیتا ہوں۔“
اس کا شکست خوردہ لہجہ......
منشی خباثت سے ہنسا۔
”جب پسلی نہ ہو تو خوامخواہ آوے (پکا) نہیں لیتے انور سے! چل ٹھیک ہے۔“
”ٹھیک ہے، لے لے مہلت۔ پر اب کے جواب ہاں کا چاہیے۔“
”ہاں کا جواب ہی دوں گا منشی صاحب!“ انور نے سر جھکا لیا۔
”وہ لڑکا تجھے کیا دے گا انور سے! میں تیری اور تیرے بچوں کی زندگی بدل دوں گا۔ تیرے دونوں بیٹوں کی پڑھائی لکھائی کا ذمہ بھی میرا۔ کل کو کسی کام کاج پر بھی لگوا دوں گا۔ اور بیٹیاں ہوتی کس لیے ہیں...... ماں باپ، بھائیوں کا احساس کرنے کے لیے...... لڑکی کو شاہ کر بٹھا دینا۔ کپڑے لتے، زیور کسی چیز کی کمی نہ ہونے دوں گا۔ عیش کرے گی عیش......“
منشی نے مستقبل کا پورا پروگرام ترتیب دے دیا تھا۔
انور حسین سر جھکائے پیچ و تاب ہی کھاتا رہا۔

☆☆☆

”سچ کہہ رہے ہو کاکا!“ مراد بے اختیار اس کے گلے آ لگا۔ ابھی ہوٹل کھولا ہی تھا، چھوٹا کرسیاں میز درست کر رہا تھا۔
جب کاکے نے مراد کو بلایا۔ وہ تو صرف رشتے کی ہاں کے چاؤ میں بھاگا آیا تھا۔ سامنے ہفت اقلیم کی دولت آ گئی تھی۔
”شادی...... مطلب کہ ڈائریکٹ شادی۔“
”ہاں یار! سیدھے سیدھے شادی۔“ کاکا زور سے ہنسا۔
”اب مجھے کرنا کیا ہوگا؟“
”تیاری کر اور کیا۔“
”انگوٹھی تو میں نے خرید لی ہے۔ باقی کیا کروں۔“ مراد ہونق ہو رہا تھا۔
”کچھ پیسے دے زمین کی ماں کو، وہ خود ہی تیری طرف سے بھی تیاری کر لے گی۔ بلکہ ایسا کر، گھر کی چابی پکڑا دے۔“ کاکے نے کچھ سوچ کر مشورہ دیا۔
”ہیں......“
”اکیلے رہتے ہو، گھر میں ڈھنگ کے برتن تک نہیں۔ بیوی کو بھی بازار کی پکی ہوئی کھلائے گا۔ وہ لوگ اپنے حساب سے گھر سیٹ کر دیں گی۔“
”یہ تو ٹھیک ہے۔“ مراد نے جیب سے چابی نکال کر کاکے کے ہاتھ پر رکھ دی۔
”پر ایک بات یاد رکھ۔ اس بات کا چرچا نہ ہو۔ وہ منشی ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ وہ صرف ابھی بچی بچارے ہیں۔ باقی تو نجانے کیا کیا بکھیڑا پڑ جائے گا۔“ کاکا اداس ہو گیا۔
”لگتا ہے منشی کی ناک ٹیڑھی ہو گئی ہے۔“ مراد کو غصہ آ گیا۔

"بات سن، ان دنوں اس سے دور دور رہنا۔ پیسے والا بھی ہے اور علاقے میں اثر رسوخ بھی۔" کاکے نے رسانیت سے سمجھایا۔
"دیکھ لوں گا۔" مراد نے لاپروائی سے سر جھٹکا۔

☆☆☆

گھر دیکھنے کے لیے خدیجہ خالہ کو بلایا تھا۔ سیانی عورت تھیں۔ اچھا مشورہ دیتیں۔ زمین کی جلد شادی کی جتنی خوشی انہیں ہوئی تھی۔ بیٹے کی اتری صورت اور لبوں پر لگی چپ دکھائی دیتی تھی مگر وہ اچھی طرح جانتی تھی، دونوں کی شادی ممکن نہیں۔ اکلوتے بیٹے کے حوالے سے بہت خواب دیکھ رکھے تھے اور پھر ابھی وقت بھی تو نہیں تھا۔
دو کمرے، کچن، باتھ روم اور چھوٹے سے صحن پر مشتمل گھر تھا۔
ایک پلنگ، ایک الماری، تھوڑا گزارے لائق (صرف مراد کے) سامان اور کچن میں سنگل چولہا، چائے کے چند برتن...... البتہ بریانی کے ڈبے اور جوس کے پیکٹ وافر مقدار میں موجود تھے۔
"اسے پتا تھا سسرال والے آرہے ہیں۔" افشاں نے زمین کے کان میں سرگوشی کی۔ بچے تو شوق میں بھاگے آئے تھے اور زمین کو افشاں بصد اصرار کھینچ لائی تھی۔
"خالہ! وہاں کون سا مراد بھائی ہوں گے، اسی لیے تو انہوں نے چابی بھیج دی ہے۔"
ثمینہ متذبذب تھی۔ مگر خدیجہ نے کہا تو مان گئی۔
ثمینہ اور خدیجہ بیٹھ کر سامان کی لسٹ بنانے لگیں۔
"تو یہ ہے وہ گھر...... جہاں ہماری زمین مہارانی بن کر آئے گی۔" افشاں بریانی کا ڈبا لے کر کمرے کی اکلوتی کرسی پر آ بیٹھی۔ پاؤں سامنے پلنگ پر رکھ لیے۔
"تم بھی کھالو، اسپیشل تمہارے لیے ہی تو رکھی ہے اس نے۔"
بچے آپس میں جوس کے ڈبے بانٹنے لگے۔
"مجھے لڑکا بڑا فراخ دل لگ رہا ہے۔ گھر بھی اچھا ہے۔" خدیجہ، ثمینہ سے کہہ رہی تھیں۔
زمین مسکرا کر کمرے میں رکھی کتابیں دیکھنے لگی۔
"پتا نہیں اس نے بی اے کے پیپر کیوں نہیں دیے؟" زمین نے کورس کی کتاب اٹھا کر واپس رکھی۔
"کوئی بات نہیں، شادی کے بعد تم میٹرک کر لینا۔ وہ بی اے کر لے گا۔"
زمین نے اس کی بات کا جواب نہ دیا۔ اس کی توجہ کتابوں کے ساتھ رکھے لکڑی کے کھلونے پر تھیں۔ وہ گدھا تھا اور پیچھے ریڑھی جس کے پہیے لگے تھے۔ جیسے گاؤں میں بچے عام طور پر لکڑی کے کھلونوں سے کھیلتے ہیں۔ کھلونا پرانا تھا اور مراد نے اب تک سنبھال کر رکھا تھا۔
زمین نے کھلونا ہاتھ میں لیا۔
تب ہی باہر رکشے کی مخصوص آواز سنائی دی۔
زمین کے ہاتھ سے کھلونا نکل گیا۔ گرا اور پہیہ الگ ہو کر پلنگ کے نیچے چلا گیا۔
"ہائے اللہ، یہ تو مراد بھائی آگئے۔" افشاں بوکھلا کر کھڑی ہوئی تو زمین پہیے کی تلاش میں نیچے بیٹھی۔
افشاں نے جلدی سے جالی کا دروازہ کھول دیا۔
پہیہ ہاتھ میں لے کر زمین تیزی سے کھڑی ہوئی۔
"مراد بھائی! آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟"
"میں تو بس یہ دینے آیا تھا۔" مراد کے ہاتھ میں فروٹ کے شاپر تھے۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ

وہ اپنے سامنے، اپنے کمرے میں زمین کو دیکھے گا۔

''لائیں، مجھے دیں۔'' افشاں نے جلدی سے شاپر لیے۔ اسے ہر صورت دوسرے کمرے میں دونوں خواتین کو روکنا تھا۔

''کیسی ہو؟'' مراد بزل تھا تو زمین کے ہاتھ پسینے پسینے ہو گئے۔

''یہ...... یہ پتا نہیں کیسے ٹوٹ گیا۔''

مراد نے پاس آ کر اس کے ہاتھ سے کھلونا لے لیا۔

''میرے ابا جی کی نشانی ہے۔''

''مجھے معاف کر دیں۔'' ہلکے سبز دوپٹے کو کھینچ کر ماتھے تک لاتی گھبرائی شرمائی وہ اتنا قریب کھڑی تھی کہ مراد اسے فرصت سے دیکھ سکتا تھا۔

مگر اتنی فرصت تھی کہاں؟ خالی جوس کے ڈبے میں پھونکیں مارتے طلحہ اور حذیفہ بھاگتے ہوئے آئے۔

''مراد بھائی جان!''

مراد دبک کر پیچھے ہوا۔

زمین نے نکلنا چاہا کہ مراد نے فوراً کارنس پر ہاتھ رکھ دیا۔

''جا کے رکشے میں بیٹھو، چکر لگوا کے لاتا ہوں۔''

دونوں بھاگ کر باہر نکلے۔

مراد نے مڑ کر زمین کو دیکھا۔

''تمہارے لیے اس گھر کو پھولوں سے سجا دوں گا، کچھ اور چاہیے تو بولو۔''

''ر...... راستہ......'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔

مراد نے ہنس کر ہاتھ ہٹا لیا۔ زمین تیزی سے اندر کی طرف بھاگی۔

مراد باہر کی طرف لپکا۔ جہاں حذیفہ اور طلحہ نے جوس کے خالی ڈبے رکشے کے پہیوں کے سامنے رکھ دیے تھے۔

''کہاں جانا ہے بچو!''

''پارک۔''

''پھر سنبھل کر بیٹھو۔''

جیسے ہی رکشہ چلا۔ جوس کے ڈبے پٹاخ پٹاخ پھٹے۔ ایک لمحے کو گھبرا کر مراد نے رکشہ روکا۔ بچے منہ پر ہاتھ رکھے رکشے کی سیٹ پر اوندھے ہو گئے۔ پھٹے ہوئے جوس کے ڈبے دیکھ کر مراد کو بھی ہنسی آ گئی۔

☆☆☆

''تجھے یاد ہے رفیق! جب تو نے میرے بچوں کو مار مار کر بھوسے والی کوٹھڑی میں بند کر دیا تھا اور میں تیرے پیروں میں پڑی رحم کی بھیک مانگ رہی تھی۔''

اس کی نرم پوریں تیل میں بھیگی رفیق کی زخمی ٹانگ سہلاتی تھیں اور بند لبوں سے اپنے زخم کریدتی۔

''اور تمہاری ٹھوکر نے میرے دانت ہلا دیے تھے۔''

''تو بولتی کیوں نہیں ہے رشیداں!'' رفیق نے دہائی دی۔

''میں اب تک بولی نہیں۔'' رشیداں نے حیرت سے ہاتھ روک کر رفیق کو دیکھا۔

وہ تو کب سے اپنے بین سن رہی تھی پھر رفیق کو سنائی کیوں نہ دیے۔

''مجھے ہسپتال لے کر چل رشیداں!'' رفیق نے التجا کی۔

"ہسپتال والے پیسے مانگتے ہیں۔" رشیداں کا لہجہ سپاٹ تھا۔
"میرے پاس تو بہت پیسے تھے۔" رفیق کی ذہنی رو بھٹکی۔
"پھر بھی تو میرے بچوں کی چنگیر سے روٹی اٹھا کر بھینس کے منہ میں دے دیا کرتا تھا۔"
نجانے رشیداں کا ہاتھ کہاں پڑا تھا کہ رفیق کی چیخیں نکل گئیں۔
رشیداں نے گھبرا کر ہاتھ ہٹایا۔
گھٹنے کے عین اوپر اقصیٰ کے برابر سیاہ دھبہ تھا۔
"اقصیٰ!"
اقصیٰ بھاگتی ہوئی آئی۔
"یہ دیکھ......وہی ہے۔"
اقصیٰ کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ ایسا ایک دھبہ انگوٹھے کے نیچے نمودار ہوا تھا تو انگوٹھے کی ہڈی نکالنی پڑی تھی۔
"اماں! ہاتھ مت لگانا۔" اقصیٰ نے گھبرا کر رشیداں کا ہاتھ پکڑا تو رشیداں نے خاموشی سے رفیق کی ٹانگ چادر سے ڈھانپ دی۔
باہر کرم داد کی ماں تاجاں آوازیں دے رہی تھی۔
رشیداں خشک ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے پذیرائی کو بڑھی۔
☆☆☆
"فرخ......فرخ...... ذرا ادھر آنا۔" وہ کرسی پر چڑھی الماری پر سے نجانے کیا اتارنے کی کوشش میں مصروف تھیں۔ فرخ باہر جانے کو تیار تھا، کمرے کی طرف مڑ گیا۔
"جی امی!"
بیڈ پر دو بچے اور مقیش کے کام والے جوڑے پڑے تھے۔
"یہ کیا ہے؟"
"تمہاری بہنوں کی شادیوں پر بچ گئے تھے۔ سوچا زرمین کو سلوا دوں۔ خواہ مخواہ ٹرنک بھر کے رکھنے کا فائدہ...... یہ سوٹ کیس تو اتار دو۔ کوئی مردانہ سوٹ مل جائے تو ثمینہ داماد کو لگا دے گی۔ ان بے چاروں کی تو آتی پہلی ہی نہیں کہ جو چار لوگ بارات میں آ رہے ہیں، انہیں کھانا ہی کھلا دیں۔"
فرخ نے سوٹ کیس اتار کر بیڈ پر رکھ دیا۔
اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اترتی خدیجہ نے بغور بیٹے کی اتری صورت کو دیکھا۔
دل ڈوب سا گیا۔ مگر لہجہ سرسری سا ہی رکھا۔
"تم نے بتایا ہی نہیں زرمین کی شادی تمہارے سر لا دے ہو رہی ہے۔ وہ تو پڑھا لکھا لڑکا تھا، رکشہ کہاں سے چلانے لگا؟"
"اس نے کون سا پی ایچ ڈی کر لی تھی۔ سیکنڈ بی اے کو کون نوکری دیتا ہے۔ اس نے تو پرچے بھی نہیں دیے تھے۔" فرخ نے اندر کی کھولن باہر نکالی۔
"چلو، اچھا کماتا کماتا تو ہے نا۔"
"پتا نہیں زرمین کو اس میں نظر کیا آیا؟"
"اس کی کون سی محبت کی شادی ہے۔ گھر والوں نے رشتہ طے کر دیا۔ اس نے اچھی بیٹی کی طرح سر جھکا دیا۔" خدیجہ نے سوٹ کیس کھنگالنا شروع کیا۔ جلد ہی آسانی کاٹن کا مردانہ سوٹ مل گیا۔ کچھ اور چیزیں بھی...... جو ثمینہ کے

داماد کے کام آ سکتی تھیں۔ سفید نیا تولیہ، بنیان اور جرابیں...... جو وہ فرخ کے لیے لائی تھیں اور رکھ کر بھول گئی تھیں۔ شاید اسی دن کے لیے......

"چار جوڑے، دو شنیل کی رضائیاں اور ڈنر سیٹ...... اب اس سے زیادہ تو مجھ میں بھی ہمت نہیں ہے۔"

وہ خود ہی حساب لگا رہی تھیں۔ فرخ بے زاری سے باہر نکل گیا۔

خدیجہ نے مڑ کر تاسف سے اسے دیکھا اور خود کو تسلی دی۔

"وقت کے ساتھ سنبھل جائے گا۔"

☆☆☆

"ہیں زمین! تمہاری شادی...... اتنی جلدی......" نمبردار صاحب کی بہو کو یہ بات ہضم نہیں ہو پائی تھی۔

"جی، بس اچانک ہی......" زمین اداس ہوگئی۔ بچوں کے ساتھ اس کا دل لگ گیا تھا۔

"لگتا ہے ماں نے خوب جہیز جمع کر لیا تھا۔ تب ہی تو ادھر اچھا رشتہ ملا، ادھر شادی کا سوچ لیا۔" وہ مسکرائیں۔

"غریب کی بیٹی کا جہیز نہیں ہوتا باجی! غریب کی بیٹی کا بس نصیب ہوتا ہے۔ اسی کے سر پر بستی اور اسی کے سر پر اجڑتی ہے۔"

"ایسی بڑی بڑی باتیں نہ کرو۔ اچھی اچھی باتیں سوچو۔ میں ابا جی سے بات کروں گی۔ گاؤں میں بہت لڑکیوں کو جہیز دیا ہے۔ تم تو انہیں ویسے بھی بہت پسند ہو، کہتے ہیں بڑی محنتی اور خود دار لڑکی ہے۔"

"اس کی ضرورت نہیں باجی! جو میرے نصیب میں ہے، مل ہی جائے گا۔ بس آپ سے کہنے آئی تھی، اب پڑھانے نہیں آسکوں گی۔"

"مجھے کتنی تسلی تھی زمین! بچے بھی تم سے اچھے ہو گئے تھے۔" وہ اداس ہوگئیں۔

"دادا جی کہاں گئے ہیں؟"

"ظہر کی نماز پڑھنے گئے ہیں۔"

"میرا سلام کہیے گا۔" زمین کھڑی ہوئی۔

"رکو تھوڑا" باجی اسے روک کر خود اندر چلی گئیں۔ تھوڑی دیر میں واپس آئیں تو ساتھ میں بہت خوب صورت میک اپ کٹ اور واٹر سیٹ تھا۔ زمین شرمندہ سی ہو کر منع کرنے لگی۔

"ایسے ناشکری نہیں کرتے۔ ابا جی کہتے ہیں ہر پیسے والے کے نصیب میں کچھ دوسرے لوگوں کا حصہ ہوتا ہے۔ ہمیں پتا بھی نہیں، ہم کس کا نصیب کھا رہے ہیں۔"

قطرہ قطرہ جمع ہو رہا تھا۔

مگر ہر چیز نئی نکور اور ان لگ (جو چیز استعمال نہ کی ہو) تھی۔

ثمینہ کی پلکیں بھیگ گئیں۔

اس کی بیٹی بہت نصیب والی تھی۔

☆☆☆

چھت پر ایک نئی دنیا آباد تھی۔ نئے نکور لحافوں میں دھنکی ہوئی روئی یوں تھی جیسے نیلگوں آسمان سے کسی نے سپید بدلیاں چرا کر بھر دی ہوں۔ ثمینہ نے میرون شنیل کا کور چڑھایا تو زمین نے جھکے سے چھو کر دیکھا۔

شنیل کی مخملیں نرماہٹ نے ان کہی کہانیاں سنائیں تو زمین نے شرما کر ہاتھ کھینچ لیا۔

افشاں نے لحاف پر بندھی کھولی تو سنہری سوئی اس پر بکھرتے چلے گئے۔

ثمینہ نے بسم اللہ پڑھ کر پہلا ٹانکا بھرا تو لبوں پر بول خود بخود مچل گئے۔

دھانیاں......

ہائے او وہ میرے ڈاڈھاں رہا
کیتاتھوں، کیتا نے لے جانیاں ہائے......

وہ ہر تاگے میں ایک سنہرا موتی پروتی اور بدھائی کے گیت گاتی۔
زمین کی آنکھیں بھیگ گئیں۔
جہیز کی رضائی میں ڈورے ڈالنے کا عمل اتنا سادہ کہاں تھا؟
ماں اور سکھیاں ایک ایک تاگے میں دعا پروتی تھیں تو دوسرے میں جدائی کا آنسو اٹک جاتا۔ لحاف میں روئی نہیں ارمان سلے تھے۔
افشاں نے زمین کے ابٹن ملنا شروع کر دیا۔ سنگترے کے چھلکے سکھا کر پیس کر دودھ میں بھگوئے تھے۔ اس کی اماں گڑ والے میٹھے چاول نکالائی۔
شگن تھا۔
جس دن لحاف سے جاتے سکھیاں میٹھا بنا کر لاتی تھیں۔
انہوں نے نوالہ بنا کر خود زمین کے منہ میں ڈال کر شگن پورا کیا تھا۔

☆☆☆

ثریا گھر اس وقت آئی جب تاجاں نے ٹھنڈی کھیر کھا کے چائے کے ساتھ بسکٹ بھی لے لیے تھے۔ اس کے پیلے جوڑے پر ہری گھاس کی لکیریں تھیں اور لبوں کی کھلکھلاہٹیں۔
وہ بے وجہ ہنستی تاجاں کے پاس بیٹھ کر کھیر کھانے لگی۔
رشیداں بے بسی سے ثریا کے تیور دیکھتی رہی۔
عورت تو نام ہی بھید بھری بھول بھلیوں کا ہے......
وہی اس کی کشش ہے وہی اس کا اسرار......
جس عورت کو ہر کوئی پڑھ لے وہ کس کام کی۔
جیسے گلی کے نکڑ پر گرا پچھلا اخبار کا کوئی صفحہ......
شرم و حیا کے معاملے میں تو قدرت نے بھی کوئی چھوٹ نہ رکھی تھی تو تاجاں کیا رکھتی۔ نجانے کون سی چھٹی حس تھی کہ وہ کھیر کھا کر بنا رشتے کی بات کیے اٹھ گئی۔
رشیداں کا رنگ پیلا پڑ گیا۔
جیسے آخری موقعہ ہاتھ سے نکل گیا ہو۔
ثریا نے کٹوری میں انگلی پھیر کر چاٹتے ہوئے اماں کی حیران صورت دیکھی تو ایک لمحے کو شدید بے عزتی کے احساس نے اسے کاٹ کر رکھ دیا۔
اس نے کٹوری اٹھا کر دور ماری۔ وہ نلکے سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔
"ہاں، کہاں گیا تیرا رشتہ؟ تاجاں رشتہ لے کر آ رہی ہے...... تو منہ میں گھنگھنیاں ڈال کر کیوں چلی گئی؟"
"جا کے دیکھ ثریا! وہ رشتہ تو مالٹے کے باغ میں کسی درخت کے نیچے دفن کر کے آئی ہے۔" رشیداں پھٹ پڑی۔
"تیری سمجھ میں کیوں نہیں آتا، کوجے سے کوجا (بدصورت) مرد بھی اسی عورت کو گھر بٹھاتا ہے جس کی شرافت کی قسم زمانہ کھائے...... تو نے کس کس کا نام اپنے نام کے ساتھ نہ جوڑا۔"
"جھوٹ بولتے ہیں سارے کے سارے......" ثریا رونے بیٹھ گئی۔

''آج تو بھی جھوٹ کی اوڑھنی اوڑھ لیتی۔ کم بخت! تو تیرا بھی گھر بس جاتا۔'' رشیداں نے اس سے زیادہ اونچی آواز میں رونا شروع کر دیا تھا۔

اقصیٰ کی سمجھ میں نہ آیا، دونوں میں سے اسے کس کا ساتھ دینا ہے تو بےزاری سے بیٹھ کر بچی ہوئی کھیر کھانے لگی۔

''میں مر گیا ہوں کم بختو! جو ویہڑے میں بیٹھ کر کیرنے (بین) ڈالنے لگی ہو۔''

اندر رفیق کی دہائیاں شروع ہو گئی تھیں۔

☆☆☆

''فرخ!'' رکشے نے کالے بلے کی طرح موڑ پر اس کا راستہ کاٹا تھا۔

فرخ رکنا نہیں چاہتا تھا مگر رکنا پڑا۔ مروت بھی تھی اس میں، کھل کر اپنی کیفیت اور احساسات بیان نہیں کر پاتا تھا ورنہ صاف کہہ دیتا۔ وہ اب مراد کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

''یار! کہاں ہو ملتے ہی نہیں۔'' مراد اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''مصروف ہوتا ہوں مراد بھائی۔''

''اتنے مصروف کہ بھائی کے نکاح میں بھی شرکت گوارا نہیں۔''

فرخ نے اسے غور سے دیکھا۔ صاف ستھرا لباس، نکھرا چہرہ، لگتا تھا اپنا خیال رکھنے لگا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے زمین اور مراد کا چہرا گڈمڈ ہونے لگا۔

دونوں کتنے خوش اور مطمئن دکھائی دیتے تھے۔

جو چاہا قسمت نے کتنی آسانی سے ان کے نصیب میں لکھ دیا تھا۔

فرخ کے اندر اشتعال کی لہر سی ابھری۔

''بس کسی کو پتا نہ چلے۔''

''کیوں؟'' فرخ چونکا۔

''یار! اب تم سے کیا پردہ۔ وہ منشی اکرم ہے نا، ہاتھ دھو کر زمین کے پیچھے پڑ گیا ہے۔''

''کیوں؟'' فرخ نے تحیر سے پوچھا۔

''بس خبیث روح ہے، بیوی بیمار ہے تو دوسری شادی کرنا چاہتا ہے۔ چلو کر لے، مجھے کیا اعتراض۔ پر کسی بیوہ کسی غریب طلاق یافتہ یا ڈھلتی عمر کی لڑکی کو سہارا دے دے۔ مگر نہیں...... بڈھے کی نظر رکی بھی تو زمین پر۔''

''وہ تو مجھے آپ پہلے بھی بتا چکے ہیں۔'' فرخ نے جھنجلا کر بات کاٹی۔

''مگر اب کیا مسئلہ ہے؟ اب تو زمین کی شادی آپ سے ہو رہی ہے۔''

''وہ پیچھے پڑ گیا ہے، دھمکیاں دے رہا ہے۔ چاچا بہت ڈر گئے ہیں۔ اس لیے بس منشی تک یہ خبر نہ پہنچے، باقی سب خیر ہے۔ مگر تم وقت پر آ جانا ہے۔ بارات تو کیا لے جانی ہے بس یہی چار یار دوست ہوں گے۔''

''آ جاؤں گا۔'' فرخ الجھا الجھا سا تھا۔

''بس پھر یاد رکھنا......'' مراد تاکید کرتا گھر پہنچا تو اس کا محدود سا سامان گھر سے باہر تھا۔

وہ ششدر سا رہ گیا۔

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

عطیہ خالد

ناولٹ

کیا قیامت کی رات بھی اتنی لمبی، اتنی مہیب اتنی ڈراؤنی اور یخ بستہ ہوگی جتنی مہیب اور یخ بستہ اور بھیانک رات اس 27 جنوری کی شام ہم پر طلوع ہوئی تھی۔ ہسپتال کے اس سفید مرمر کے ٹھنڈے یخ طویل کاریڈور میں ہم تین نفوس کی سانس ہمارے سینوں میں گھٹ گئی تھی۔

ابھی میں نے مغرب کی حاضری لگائی ہی تھی کہ انس کا فون آیا کہ میں تیار ہو جاؤں وہ پانچ منٹ بعد مجھے لینے آرہا ہے۔ عجلت میں اس نے اتنا کہہ کر فون بند کر دیا۔ نہ کچھ بتایا نہ مجھے پوچھنے کا موقع دیا۔ میرا ناتواں اور کمزور دل پسلیوں کے پیچھے دھڑ دھڑانے لگا۔ کانپتے ہاتھوں سے میں نے گرم کوٹ پہنا، کنٹوپ لیا، مفلر گردن کے گرد کسا، گرم جوتے پہننے تک انس آچکا تھا۔

"بابا کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے دادا! اور وہ آپریشن تھیٹر میں ہیں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں ان کے بچنے کی امید کم ہے۔ جلدی چلیں دادا!"

انس مجھ سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ لیکن اس نے جلدی سے میرے ہاتھ سے تالا لے کر گھر بند کیا اور مجھے گاڑی میں بٹھایا اور روتے روتے مجھے تفصیل بتانے لگا۔

تایا عبدالرحمان اور بابا کی مشترکہ کپڑوں کی فیکٹری میں آگ لگ گئی تھی۔ تایا نے بابا کو فون کیا تو بابا اندھا دھند گاڑی لے کر نکلے۔ راستے میں دھند کی وجہ سے ایکسیڈنٹ ہو گیا۔" بڑا اینٹوں سے لدا ٹرک عبدالرب کی چھوٹی سی کار کو کچل گیا۔ اور میرے عبد الرب کو بھی۔

"دادا! بابا کو صرف آپ کی دعا بچا سکتی ہے، آپ دعا کریں......دادا آپ دعا کریں۔" انس رو رو کر کہہ رہا تھا۔

عبدالرب کا یہ اکلوتا لاڈلا انس ہمیشہ سے میرے دل کے بہت قریب تھا۔ یہ ہمیشہ مجھ سے محبت کرتا تھا۔ اپنے ماں باپ سے چھپ کر مجھ سے ہمدردی کرتا تھا۔ اپنی دادی کو اولڈ ہوم بھیجنے کی

اسی نے مخالفت کی تھی۔ اس نے مجھے خود بتایا تھا۔ اب بھی کبھی کبھار عبدالرب کے ساتھ ضد کر کے مجھ سے ملنے آجایا کرتا تھا۔ آج بھی وہ ماں باپ کی ساری تاکیدیں بھلائے مجھ سے چپک کر بیٹھا دادا، دادا کی گردان کرتا لگاتار رو رہا تھا۔ میری زبان گو کہ کوئی بھی لفظ ادا کرنے سے قاصر تھی مگر میرا رواں رواں اس وقت عبدالرب کی زندگی کے لیے دعا بنا ہوا تھا۔

میرے دائیں طرف اس کی بیوی شدید سکتے کی کیفیت میں بیٹھی تھی۔ البتہ عبدالرحمٰن غم و غصے کی کیفیت میں تیز تیز ٹہل رہا تھا۔ اس کے حساب سے اسے اس وقت فیکٹری میں ہونا چاہیے تھا۔ نفع نقصان کے اندازے کے لیے جبکہ عبدالرب نے اسے ہسپتال میں باندھ لیا تھا۔ وہ تو چاہ رہا تھا کہ اگر بالفرض عبدالرب نے مرنا بھی تھا تو وہ جلد مر جاتا تاکہ وہ جلد فارغ ہو سکتا۔ وہ بار بار سر جھٹکتا۔ بوٹ سے فرش کو ٹھوکر مارتا اور کہتا "کیا مصیبت ہے۔" بے ہی اس کے منہ سے بڑبڑاہٹ بلند ہوئی اور چہرے کا تناؤ بڑھتا۔ انس میرے ہاتھ کس کر تھام لیتا اور کہتا۔

"دادا آپ دعا کریں میرے بابا کو کچھ نہ ہو۔"

میں اس سے کیسے کہتا اس کا بابا میرے جگر کا ٹکڑا تھا۔ میرا ذرہ ذرہ اس کی زندگی کے لیے مجسم دعا تھا۔ اہلی میرے عبدالرب کو کچھ نہ ہو۔

☆☆☆

میں گھپ اندھیرے میں ادھڑے فرش، ادھڑی دیواروں کے درمیان اپنا پلنگ ڈالے لیٹا تھا۔ برقی قمقمے کی ناکافی روشنی رات کو مزید مہیب بنا رہی تھی۔ لمبے لمبے چمگادڑ چھت سے الٹے لٹکے تھے۔ ابابیلوں کے گھونسلوں نے میرے کمرے کو میرے جیتے جی ہی میرا مرقد جان لیا تھا۔ اور یہ کون سا غلط ہے۔ یہ میرا مرقد ہی تو ہے۔ کھوں کھوں کھوں...... سب نے ساتھ چھوڑ دیا لیکن یہ کھانسی ...... یہ دم تو دم کا ساتھی ہے۔ پرانا وفادار۔ کہاں رکھ دیا میں نے

کھانسی کا شربت۔ اسپغول بھی منگوانا ہے۔ فون، ہاں فون...... کل کروں گا عبداللہ کو فون کہ سب ضروری چیزیں مجھے پہنچا دے۔ دوائیں، دلیہ، رسک، بسکٹ...... سب ہی کچھ تو ختم ہے۔

ادھر میں اسے یہ سب گنواؤں گا ادھر وہ اصرار شروع کردے گا۔ ''ابا! آپ آخر اتنے ضدی کیوں ہیں۔ بات کیوں نہیں مان لیتے۔ مان جائیں تو سب سکھ کا سانس لیں۔ نرسنگ ہوم بہت اچھا ہے۔ ہر سہولت ہے وہاں۔ دیکھ بھال کرنے کے لیے ڈاکٹر......'' ابھی وہ اتنا ہی کہے گا کہ میں نہیں نہیں کہہ کر فون بند کردوں گا۔ ایسا نہیں ہے کہ مجھے اپنے بچوں کی سہولت عزیز نہیں۔ میں جان بوجھ کر اس جنگل نما ویرانے میں تنہا پڑا رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے نرسنگ ہوم میں میسر علاج کی سہولتیں نہیں چاہئیں۔ بات صرف اتنی نہیں ہے۔ بات کچھ اور ہے۔

اگلے دن میں نے عبداللہ کو فون کیا تو اس نے ڈانٹ دیا کہ میں ہمیشہ بھول جاتا ہوں کہ یہ ہفتہ عبدالرب کی ڈیوٹی کا ہے۔ اس سے معذرت کرکے عبدالرب کو کال ملائی اور سب ضرورت کی چیزیں نوٹ کروائیں۔ اسپغول اور طاقت کے کیپسول پھر بھی بھول گیا۔ تھوڑی دیر بعد پھر فون کیا۔

''بیٹا! میں اسپغول، طاقت کے کیپسول اور رسکٹ تو بھول ہی گیا۔''

''بڈھے خبطی کبھی ایسا ہوا ہے کہ تم کچھ نہ بھولے ہو۔ ایک بار میں تم نے چیزیں لکھوا دی ہوں۔ اب مجھے دوبارہ مال جانا پڑے گا' لاتا ہوں......''

باقی کی بڑبڑاہٹیں میں نے ان سنی کردیں۔ تنہائی کا زہر بری طرح کاٹنے لگا تو میں نے کلام الٰہی پڑھنا شروع کردیا۔ نجانے کتنی دیر اپنے محبوب کے دلنشیں خط میں ڈوبا رہا۔ چڑیوں کا شور سن کر توجہ ہٹی تو دیکھا عصر کا وقت نکلا جارہا تھا۔ تیمم کرکے حاضری لگائی تو فون بجنے لگا۔ اسریٰ کا فون تھا میری اکلوتی بیٹی۔ جان دیتی ہے مجھ پر، لیکن نہ ملنے آسکتی ہے نہ مجھے بلا سکتی ہے۔ میرا داماد ڈپٹی کمشنر ہے۔ اس کے اسٹیٹس پر حرف آتا ہے۔ اس لیے کبھی کبھار ہم فون پر ویڈیو کال کرکے ملاقات کرلیتے ہیں۔

☆☆☆

''ارے اسریٰ میری بچی...... تم...... تم کیسے؟''

میں نے اسریٰ کا سر سینے سے لگاتے ہوئے پوچھا۔ وہ بے قراری سے رو رہی تھی۔

''ابا! عمران تین روز کے لیے ملتان دورے پر گئے ہیں اور پیچھے سے ان کی اماں بھی اپنی بہن کے گھر رہنے چلی گئیں۔ بس میں بھی فوراً آپ کی طرف آگئی۔''

''بیٹا! لیکن ڈرائیور کا کیا اعتبار؟ وہ بتادے گا عمران کو...... تو......'' میں پریشان تھا۔

''نہیں بتائے گا ابا! پورے پانچ ہزار دے چکی ہوں اسے زبان بند رکھنے کے لیے۔'' اسریٰ میری بچی بھی سے بھری ہوئی تھی۔

''آپ اپنی طبیعت کا بتائیں۔ آپ کو نمونیہ ہوگیا تھا مجھے رحمٰن بھائی نے بتایا تھا۔ بلکہ وہ کب بتاتے ہیں مجھے۔ بس برسبیل تذکرہ ان کے منہ سے نکل گیا تھا۔ اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟''

''بتاتا ہوں بیٹا! پہلے رضیہ کو فون کرلوں۔ آکر تمہارے لیے چائے تو بنادے۔''

''نہیں ابا! بالکل نہیں......'' اسریٰ نے میرے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر روک دیا۔

''بس تھوڑا سا وقت ہے میرے پاس۔ مجھے آپ سے باتیں کرنی ہیں۔ آپ اپنا حال بتائیں مجھے؟''

''طبیعت پہلے سے بہتر ہے بیٹا! لیکن اینٹی بائیوٹک بہت ہارڈ ہیں۔ ان سے خشکی ہوگئی ہے۔ اور پسلیوں میں بہت درد ہے۔''

''بھاپ لیتے ہیں؟ یخنی پیتے ہیں؟'' وہ تڑپ اٹھی۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔

"ہاں! ہاں! سب کرتا ہوں......" میں نے اس کا سر تھپتھپایا۔

"میرے بچوں کو کیوں نہیں لائیں۔ احد کتنا بڑا ہو گیا اور منزہ...... کیسی ہے میری چڑیا؟" میں نے اس کا دھیان بٹایا۔

"بہت شرارتی ہو گئے ہیں دونوں ابا! دونوں کو ٹیوٹر کے حوالے کر کے آئی ہوں۔ کسی دن لے کر آؤں گی۔" اس نے مسکرا کر مجھے جھوٹی تسلی دی۔

"اچھا! ویڈیو کال کرو تو مجھے ان کی شکلیں ضرور دکھا دیا کرو......" میں نے اپنے آنسو پونچھے۔

"ضرور دکھا دوں گی ابا! دونوں بہت خوش ہوں گے......" وہ متوقع خوشی سے مسکرائی۔

"ابا! آپ کے لیے روٹی پکا دوں؟ چائے؟ یا پھر یخنی؟" اس نے لاڈ سے میرا ہاتھ اپنے گال پر رکھا۔ کیسی ہوتی ہیں یہ بیٹیاں۔ ذرا سی دیر کو آئی تھی۔ مگر میری ساری دواؤں کے لیبل پڑھتی ہوئی، میری چیزیں سمیٹتی ہوئی مجھ سے باتیں کر رہی تھی اور اب میرے لیے کچھ پکانا چاہتی تھی۔

"میرا بچہ کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ رضیہ ہر چیز وقت پر پکا دیتی ہے۔ ابھی آتی ہی ہوگی۔ دوپہر میں مجھے کھانا کھلا کر گئی تھی۔ تم فکر نہ کرو......"

"ابا میں اب چلتی ہوں۔ بچوں کے ٹیوٹر کے جانے کا وقت ہو رہا ہے۔" وہ بے چین بے چین سی انگلیاں مروڑتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اب نہ جانے کب آپ سے ملاقات ہوگی۔" وہ رو پڑی تھی۔

"میرا بچہ...... میری جان......" میں نے اس کا سر تھپکا۔

"میں آپ کو فون کرتی رہوں گی ابا!" وہ کہتی ہوئی تیزی سے باہر نکل گئی۔

"دیکھ لو عشاء چلی گئی تمہاری بیٹی۔ جانے کیسے دو سالوں بعد اتنی سی مہلت نکال کر آئی تھی۔ اس کے بچوں کی تو مجھے شکلیں تک بھول گئی ہیں۔"

"اچھا! اب مایوسی مت پھیلاؤ۔ شکر ادا کرو کہ خوش ہے ہماری بیٹی۔ اچھا کماتا ہے داماد، خدا نے اولاد سے نوازا ہوا ہے۔ ہر دوسرے تیسرے دن بات کر لیتی ہے تم سے۔ اب ملنے نہیں آنے دیتا اس کا شوہر تو نہیں آنے دیتا۔ صبر کرو۔" صابر و شاکر عشا مجھے بھی صبر کا درس دینے لگی۔

"اچھا اب میں عصر کی نماز پڑھ لوں، پھر رضیہ آجائے گی۔" میں نے نماز کی چوکی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں! ہاں! پڑھ لو نماز، میرا کیا ہے میں تو یہیں موجود ہوں۔" اس نے مجھے چڑایا۔

☆☆☆

"وقت پر دوا کیوں نہیں کھاتے؟" عشا نے غصہ دکھایا۔

"کھا لوں گا...... کھا لوں گا...... وقت کون سا بھاگا جا رہا ہے۔ ابھی تو دو ہی بجے ہیں۔"

"ٹھیک کہتے ہیں بچے اتنے ضدی ہو گئے ہو۔ رضیہ روٹی کے ساتھ دوا بھی رکھ کر گئی ہے اور سماور میں چائے بھی۔ تم خواہ مخواہ میں دیر کر رہے ہو، پھر کھانسی بڑھ جائے گی۔"

"کھانسی بڑھ جائے گی تو مجھے تکلیف ہوگی ناں! تمہارا تو کچھ نہیں بگڑے گا۔ بلاوجہ بولے جاتی ہو۔ چپ بالکل چپ۔" وہ کھلکھلا کر ہنسی جیسے کوئی جھرنا بہہ اٹھا ہو۔

"میں چپ ہو گئی تو تنہائیوں کا زہر نگل جائے گا تم کو......" اس نے مجھے ڈرایا۔

"سنو! کیا میں واقعی خبطی ہو گیا ہوں یا بچے بلاوجہ چڑنے لگے ہیں۔ یہ بچے تو جھڑکے بنا بات ہی نہیں کرتے۔" میرا عبداللہ کی ڈانٹ کھایا ہوا دل زخم کی طرح دکھ رہا تھا۔

"نہیں...... نہیں۔ تم بالکل ٹھیک ہو۔ بس ذرا سے چڑچڑے ہو گئے ہو۔ وقت پر کھا پی لیا کرو تو اس میں تمہارا ہی بھلا ہے۔" عشا حسب معمول مجھے سمجھانے لگی۔

☆☆☆

دروازہ کھولا تو سامنے عبدالرب تھا۔ مجھے

دروازہ کھولنے میں دیر لگی تو اس کا پارہ چڑھ گیا تھا۔
''کنڈا لگا کر رکھنے کی کیا ضرورت ہے یہاں کون سے خزانے دفن ہیں۔'' وہ بکتا ہوا اندر آیا۔
''رضیہ روز نہیں آتی؟ کتنی بدبو ہے کمرے میں، اور ڈسٹنگ بھی جیسے کبھی نہیں ہوئی ہو۔ تم کو پتا ہے بڈھے کہ ہم رضیہ کو سارے دن کے کتنے پیسے دیتے ہیں۔ اور تم اس سے ایک صفائی تک نہیں کروا سکتے۔''
''نہیں بیٹا وہ کرتی ہے سب کام! آج اسے بخار تھا اور اتفاق کہ آج ہی آندھی بھی آگئی...... ورنہ وہ کام بڑا اچھا کرتی ہے۔''
''سلام صاب جی! ڈاکٹر نے ڈرپ لگا دی تھی کلینک میں، اس لیے چار پانچ گھنٹے لگ گئے ورنہ میں جلدی آجاتی۔''
رضیہ نے اندر داخل ہو کر مجھے لمبی بحث سے بچا لیا۔ جلدی سے عبدالرب کا لایا سارا سامان ٹھکانے لگا کر مجھے سوپ بھی گرم کر کے دے دیا۔ میں سوپ پینے لگا تو عبدالرب میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی کانچ جیسی سنہری آنکھیں سکوڑ کر مجھ پر جما رکھی تھیں۔ مجھے لگا عشاء مجھے دیکھ رہی ہو۔ ہو بہو وہی سنہری کانچ آنکھیں...... عشق و محبت سے گندھی آنکھیں۔ دل فریب ہنسی اور غم ناک آنسوؤں میں ڈوب ڈوب جانے والی آنکھیں...... میں عبدالرب کی آنکھوں کے ذریعے عشاء سے ملاقات کر رہا تھا اس کے مدھ بھرے نینوں کی حلاوت میں ڈوب رہا تھا کہ عبدالرب کی چیخ نما آواز مجھے واپس لے آئی۔
''او سنتے کیوں نہیں ہو تم خبطی بڈھے! میں کب سے بک رہا ہوں۔'' اس نے اپنے سگار سے میری سوپ کی ٹرے کو ہلایا۔
''یہ ضد چھوڑ دو اس کھنڈر میں مرنے کی اور اولڈ ہوم میں چلو۔ وہاں بہت سہولتیں ہیں، تمہارا علاج بھی اچھا ہو جائے گا۔''
''نہیں بیٹا! مجھ سے اولڈ ہوم کی تنہائی سہی نہ جائے گی، میں جیتے جی مر جاؤں گا۔'' میرے ہاتھوں میں سوپ کا پیالہ لرزنے لگا۔
''یہاں بھی تو اکیلے ہی رہتے ہو، یہاں کون سا کوہ قاف کی پریاں تمہارے ساتھ رہتی ہیں۔'' وہ منہ ٹیڑھا کر کے ہنسا۔
''دن میں باہر نکل جاتا ہوں۔ کوئی واقف کار دوست مل جاتا ہے، بات چیت ہو جاتی ہے۔ چائے والی دوکان پر کئی دوست مل جاتے ہیں۔ منیجر صاحب کے ساتھ ڈاک پر چلا جاتا ہوں، حاجی صاحب بھی تقریباً روز ہی آجاتے ہیں۔'' میں نے تفصیلاً بتایا۔
''ان ہی سب بڈھوں نے تمہارا دماغ خراب کر دیا ہے۔ ایسے کئی بڈھے دوست تمہیں اولڈ ہوم میں بھی مل جائیں گے۔''
''نہیں بیٹا نہیں۔'' میں نے ہاتھ جوڑ دیے۔
''اچھا تھا ماں کے بجائے تم مر جاتے، کم از کم وہ تمہاری طرح ضدی تو نہیں تھی، آرام سے اولڈ ہوم چلی گئی تھی۔''
عبدالرب نے میرے دل کے زخم کو ناخن سے کھرچ ڈالا۔ آہ میری مظلوم عشاء۔ جیتے جی ہی مجھ سے بچھڑ گئی۔ اولڈ ہوم کی تنہائیوں میں کھو گئی۔ میں تڑپ تڑپ گیا۔ میری آنکھوں میں اس کی آخری دم بند ہوتی ہوئی سنہری کانچ سی آنکھوں کی محرومیاں تازہ ہو گئی تھیں۔ دل میں شدید درد اٹھا تھا۔ اس کے کانپتے لبوں کے آخری الفاظ۔
''شیراز! یہاں کی تنہائیوں نے مجھے بے موت مار ڈالا۔''

☆☆☆

اپنے سب بچوں کو پڑھا لکھا کر وقت پر ان کی پسند سے ان کی شادیاں کر کے ان کی خواہش کے مطابق ہم نے اپنا آبائی بڑا سا مکان بیچ کر ان کو ان کے حصے بھی دے دیے تھے۔ اب ہم دونوں اکیلے رہ گئے تھے۔ مکان بیچ کر حصے بانٹ کر بس اتنی رقم بچی کہ ہم نے یہ پرانا چھوٹا سا بوسیدہ مکان خرید لیا۔ سامان بھی سب بچوں میں بانٹ دیا۔ چند ضرورت کی چیزیں لے کر ہم اپنے آشیانے میں آگئے۔

جہاں کبھی کبھار ناک بھوں چڑھاتے کوئی بیٹا آجاتا۔ ہماری آنکھوں کی روشنی تیز ہو جاتی۔ بہوؤں نے تو قسم کھائی تھی کبھی نہ آنے کی۔ داماد خیر سے ڈپٹی کمشنر تھا۔ نہ آتا تھا نہ بیٹی کو آنے دیتا تھا۔ ادھر وہ تڑپتی تھی ادھر ہمارے پیٹ میں گرہیں پڑتی تھیں۔

سارا دن ہم دونوں بوڑھا بوڑھی اکیلے ہوتے۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کے سہارے وقت گزارنا شروع کر دیا تھا۔ مل بانٹ کر گھر کے کام کر لیتے پھر بیٹھ کر باتیں کرتے رہتے۔ باتیں نہ ختم ہونے والی۔ کچھ وقت گزرا تو میری عشا کو بار بار بخار آنے لگا۔ ذرا سا چلنے پھرنے سے نڈھال ہونے لگی۔ تھوڑا سا کام کر لیتی تو سانس پھول جاتا۔ رنگ پیلا زرد ہو رہا تھا۔ بیٹھ جاتی تو اٹھنے سے رہ جاتی تھی۔ ایک دن عبدالرحمن آیا ہوا تھا میں نے اس سے ذکر کیا۔ اس نے اپنے ایک دوست ڈاکٹر کا ایڈریس لکھ کر تھما دیا اور یہ جا وہ جا۔ عشا گجریلے کا ڈونگا لیے لیے اس کے پیچھے تک گئی لیکن وہ رکا ہی نہیں۔ عشا جچتی نہیں تھی لگی اس کے کھانے صحت بخش نہیں رہے تھے۔

"لاؤ عشا! مجھے دو۔ میں کھاؤں گا۔ عشا...... عشا......"

"صاحب جی میں ہوں رضیہ! آپ کی روٹی پکانے آئی ہوں۔ آج تو کمال کر دیا آپ نے صاحب! چھوٹے صاب کے جانے کے بعد دروازہ بھی بند نہیں کیا۔ سارا گھر ٹھنڈا ٹھار ہوا پڑا ہے۔"

رضیہ نے ہیٹر جلا کر میرے پاس رکھا۔ میں نے اپنی آنسوؤں سے تر داڑھی کو اپنے مفلر سے صاف کر لیا۔

"بڑی سردی ہے رضیہ آج تو......" میں نے سینے کے درد سے خوف زدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"یہ سویٹر پہنیں صاب جی پہلے آپ اور پھر یہ کوٹ اور یہ دستانے۔ آج تو حد ہی کر دی آپ نے جو چیزیں دھوپ میں اتاری تھیں دوبارہ پہنی ہی نہیں۔ اور یہ لیں ہاف بوائل انڈے۔ اور یہ ہاٹ پاٹ میں روٹی اور یہ پائے کا سالن ہے، جلدی سے کھا لیں، سب کچھ گرم گرم ہے۔"

رضیہ کے ہدایت نامے کو سنتے ہوئے میں نے شوربے میں روٹی چور کر کھالی۔ نہایت لذیذ سالن تھا۔ پھر دونوں انڈے بھی کھا لیے۔ سینے کا درد تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ رضیہ چلی گئی تو میں نے اپنی گرم جاء نماز بچھالی اور کنٹوپ کے اوپر سے گرم دوشالہ بھی اوڑھ لیا۔ ہیٹر بھی قریب تھا لیکن پھر بھی گرمائش کا احساس نہیں ہو۔ خیر میں نے پورے خشوع سے نیت باندھ لی۔ دو گھنٹے رو رو کر میرا دم پھول گیا جب میں نے سلام پھیرا۔

ایک باقرخانی کے ساتھ سماور سے گرم گرم چائے کا مگ نکال کر پیا۔ اور قرآن پاک نکال لیا۔ اب مجھے ایک گھنٹہ اپنے محبوب کا خط پڑھنا تھا۔ سو میں پڑھتا رہا۔ سینے کا درد پسلیاں توڑنے لگا۔ قرآن پاک پڑھ کر میں نے دو پونسٹان کی ٹیبلٹس نگل کر چائے کا ایک مگ اور پی لیا اور دوبارہ اپنی جائے نماز پر آ گیا۔ یہ میری شکر گزاری کا وقت تھا۔ اس کی عنایات اور میری شکر گزاریوں کا، اس کی عطاؤں، انعامات، افضال احسانات کے ان گنت تذکروں کا اور میری ندامت اور شرمندگی سے بھری عقیدت و محبت سے لبریز حمد کا۔ نجانے کتنا وقت بیت گیا۔

جب میں نے سلام پھیرا تو گھڑیال رات کے تین بجا رہا تھا۔ سینے کا درد مجھے نڈھال کر رہا تھا۔ میں نے گرم گرم پانی میں شہد ڈال کر پیا تو قدرے سکون محسوس ہوا۔ پھر چائے بھی پی لی۔ اب یہ میرا اور اس کا گلے شکوں کا وقت تھا۔

میری عشا چلی گئی ہائے عشا۔ آج 16 جنوری تھی۔ آج ہماری شادی کی سالگرہ تھی۔ آج کے دن میری عشا میری دلہن بن کے مجھے ملی تھی۔ اور آج کے دن ہی وہ مجھ سے بچھڑی تھی۔ عشا کو میں عبدالرحمان کے بتائے ہوئے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ اس نے دیکھتے ہی ڈھیر ٹیسٹ لکھ مارے۔ مجبوراً ہمیں کروانے پڑے۔ اور ایک ہفتے بعد اس نے بلا کر

ہمارے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی۔ اس نے بتایا کہ میری عشا کو بلڈ کینسر ہے۔ ہم نڈھال غم زدہ گھر لوٹ آئے۔ چند دن بعد تینوں بیٹے اور بہوویں نخرے دکھاتی ہوئے ہمارے گھر آئے کہ اب ماں کو دیکھ بھال کی ضرورت ہے۔ مجھے سب یاد آگیا۔ میری رقت بندھ گئی۔ میرے بچے نافرمان نکلے...... تینوں کے تینوں ایک جیسے۔ میرا کیا قصور تھا میرے ربا......

ہائے میرا قصور...... سارا میرا ہی قصور تھا......

☆☆☆

قدرت بعض روحوں کو یوں ملاتی ہے مانو برسوں سے بچھڑی ہوں۔ ترس رہی ہوں ایک دوسرے کے لیے۔ آدھی ادھوری بے کل بے چین بے چین پھرتی ہیں دیوانوں کی صورت اور جب تقدیر انہیں ملانے کا سامان کرے تو وہ خوشی سے دیوانی ہو جاتی ہیں۔ ایسی ہی بچھڑی روحیں تھیں ہماری...... میری اور عشا کی...... پہلی ہی رات ہماری روحوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔ ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا، شاید ہی کوئی اور جوڑا ایک دوسرے کو پا کر اتنا خوش ہوتا جتنا کہ ہم تھے۔ ایک دوسرے کی آنکھوں سے امڈتی محبت کے ہنڈولوں میں جھولتے ہم دن رات مگن تھے۔ ہمارا گھر ہماری محبت کی رعنائیوں سے جگمگا اٹھا تھا۔ اماں ابا کا میں اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ ہمیں خوش دیکھ کر بے حد مطمئن تھے۔ وہ ہر دم ہمیں اللہ کے شکر کی طرف متوجہ کرتے لیکن ہم اس کان سے سنتے اس کان سے اڑا دیتے۔ وہ دن ہمارے تھے۔ وہ زمانہ ہمارا تھا۔ دن ہمارے تھے، راتیں ہماری تھیں۔

میں سرکاری دفتر میں ہیڈ کلرک تھا۔ ابا جی کی پنشن آتی تھی محتاط خرچ کے باعث اچھی گزر بسر ہو جاتی تھی۔ عشا آئی تو وہ سلیقے اور سگھڑاپے میں اماں جی سے بھی دس ہاتھ آگے تھی۔ سو خرچ کے سلسلے میں کوئی مشکل نہیں آئی۔ بلکہ دو ماہ گزرے تو عشا نے اماں اور میری اجازت سے سلائی کا کام شروع کر دیا۔ میرا دل تو نہیں چاہتا تھا کہ وہ اپنی اتنی خوب صورت آنکھوں کو سلائی کی محنت میں پھوڑے لیکن اس کے اصرار پر کہ وہ دن بھر فارغ ہوتی ہے میں نے اجازت دے دی۔ اور ساتھ ہی شرط لگا دی کہ وہ میری موجودگی میں مشین کو ہاتھ بھی نہیں لگائے گی، اور اس نے فوراً وعدہ کر لیا۔ اب وہ تھی اور سلائی مشین۔ گھر کا سارا کام تو پہلے ہی اماں کے سپرد تھا۔

اگلے مہینے میری تنخواہ سے دوگنی رقم اس نے میرے ہاتھ پر رکھی۔ خوشی سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا، جبکہ میرا چہرہ کچھ پھیکا پڑ گیا۔ اماں جی کو میں نے لگا بندھا خرچا پکڑایا تو وہ کہنے لگیں کہ "کچھ رقم زائد دے دو تمہارے ابا جی کا چیک اپ کروانا ہے ساری رات کھانستے ہیں۔"

"ہمیشہ کی کھانسی ہے ابا جی کی، کوئی نئی بات تو نہیں، میں سیرپ لا دوں گا۔ زائد رقم نہیں دے سکتا مجھے عشا کو لے کر مری جانا ہے۔ شادی کے بعد کہیں بھی لے کر نہیں گیا۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے شیراز! اس کو جانے دو گھومنے پھرنے، یہی دن تو ہوتے ہیں باہر نکلنے کے۔ بعد میں بچوں کے جھمیلے میں پڑ کر کہاں ہوتی ہیں سیریں۔" اندر سے ابا جی کی آواز آئی۔

اگلے روز ہی ہم مری کے لیے روانہ ہو گئے۔ مری میں گزرے پانچ دن ہماری زندگی کا اثاثہ تھے۔ کیسا روپ دھارا تھا عشا نے ان دنوں۔ کسی جوگن جیسا، کسی برہن، بیرن، جیسا جو عرصہ دراز بعد پی سے ملی ہو۔ پیاسی اور ترسی ہوئی...... اور میں گھنا ابر تھا۔ اُمڈ اُمڈ گھٹاؤں کی طرح برستا جاتا...... برستا جاتا...... میں ابر تھا تو وہ میری برکھا۔ میں چاند تھا تو وہ میری چاندنی۔

☆☆☆

"بیٹا! تم لوگوں نے جو کمیٹی ڈالی تھی اس میں سے پندرہ ہزار اگر مجھے دے دو۔ مجھے بہت ضرورت ہے۔ زری زچگی کے لیے آئی ہوئی ہے، اب اس کا وقت بالکل قریب ہے۔" اماں کا انداز منت بھرا تھا

اور آواز میں لرزش تھی۔

"کمیٹی تو آپ کی بھی نکلی ہے اماں جی۔" عشا نے میری شہ پر خوب پر پرزے نکال لیے تھے۔ فوراً چمک کر بولی۔

"بیٹا! زری کا بڑا آپریشن ہونا ہے، آپریشن کی فیس ہی تیس ہزار ہے، میری کمیٹی سے تو بمشکل ڈاکٹرز کی فیس ادا ہو پائے گی۔ اس کے علاوہ ہزار خرچے ہوں گے۔ تم لوگ جو رقم دو گے اس سے چلے کے باقی اخراجات پورے کرلوں گی۔" اماں کا وضاحت دیتا چہرہ جھکتے جھکتے سینے سے جا لگا تھا۔

"اماں زین کی پیدائش پر بھی سارا خرچہ ہم نے کیا تھا، اب تو عابد بھائی کا فرض بنتا ہے کہ وہ سوچیں۔ اٹھا کر بھیج دیا میکے۔ کوئی طریقہ ہوتا ہے، آپ پھوپھو سے بات کریں۔" میری بے حسی کی حد نہ تھی۔

"اماں آپ کو اس بار آپا کو بلانا ہی نہیں چاہیے تھا۔" عشا کیوں خاموش رہتی۔

"میں نے کہاں بلایا بیٹا! وہ تو عابد خود ہی چھوڑ گیا کہ اماں کہتی ہیں زری چلّہ میکے میں ہی کرے گی۔ تو میں کیا کرتی۔" اماں نے وضاحت دی۔

"اماں! آپ پریشان نہ ہوں، میں عابد سے بات کروں گی۔" زری نے پھولتی سانسوں کو قابو کرتے ہوئے کہا۔ کم خوراک اور سسرال کی سخت مشقت نے زری کو نچوڑ لیا تھا۔ لیکن مجھے ذرہ بھر بھی پروا نہیں تھی۔

زری ہماری پھوپھو کی طرف بیاہی تھی۔ سگی پھوپھو ساس بن کر اتنی ظالم نکلیں کہ کسی کو بھی اندازہ نہ تھا۔ زری کو تو انہوں نے نچوڑ ڈالا تھا اپنے بے رحم ہاتھوں سے۔ عابد بھائی کو جیسے اس کی زبوں حالی سے کوئی غرض ہی نہیں تھی۔ اماں ابا تو اس کے لیے تڑپتے تھے۔ لیکن میں نے کبھی زری کی پشت پر ہاتھ نہیں رکھا اس ڈر سے کہ کہیں وہ میکے میں ہی ڈیرا نہ ڈال لے۔ جو بھی تھا یہ اس کا اپنا مسئلہ تھا۔ ہم اسے بیاہ چکے تھے۔ اچھے خاصے جہیز کے ساتھ۔ میں نے آفس سے ایک لاکھ روپیہ لون لیا تھا۔ سال بھر قسطیں کٹواتا رہا تھا۔ اس سے بڑھ کر کیا کر سکتا تھا میں، اب کیا جان دے دیتا۔

☆☆☆

"کیا بات ہے جانو! ایسے منہ سر لپیٹے کیوں لیٹی ہو، تمہیں تو پتا ہے میں آفس سے آتا ہوں تو مجھے بجی سنوری عشا کو دیکھنے کی عادت ہے۔" میں نے عشا کا رخ اپنی طرف موڑتے ہوئے کہا۔

"شیراز! میں آج کل کام کر کر کے تھک جاتی ہوں۔" عشا کی بات سن کر میں تو تڑپ گیا۔

"کیا کہہ رہی ہو تم، اماں اس حال میں تم سے کام کروا رہی ہیں۔" میں نے عشاء کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا

"زین بہت شرارتی ہے، بار بار گھر گندا کر دیتا ہے، آپا تو ہلنا نہیں جانتیں۔ اماں بھی بس ان کی خدمتوں میں لگی رہتی ہیں۔ میں سارا دن گھر کے کام میں الجھی رہتی ہوں۔ سلائی کا بھی وقت نہیں ملتا۔"

"میں اماں سے بات کرتا ہوں، یہ کوئی طریقہ نہیں۔ زین چار سال کا ہے، آپا کو چاہیے اسے تمیز سکھائیں۔ اگر زری کام نہیں کر سکتی تو اماں خود کریں، یہ گھر تمھاری ذمہ داری نہیں ہے۔ میں ابھی اماں سے پوچھتا ہوں۔"

"نہیں! نہیں! شیراز۔ ایک حل ہے میرے پاس۔ آپ مجھے صبح دفتر جاتے ہوئے امی کی طرف چھوڑ دیا کریں اور واپسی پر لے لیا کریں۔ میں وہاں آرام بھی کرلوں گی اور سلائی بھی۔" عشا نے تو ایسا حل بتایا تھا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

اب یہ معمول ٹھہرا کہ میں صبح عشا کو اس کی امی کی طرف چھوڑ دیتا اور واپسی پر لیتا آتا۔ اماں نے دبی دبی زبان میں مجھ سے سوال کیا تو میں نے آواز کے سر دس گنا اونچے کر لیے۔ نا صرف اماں ابا ڈر گئے بلکہ زری کا زرد چہرہ نیلگوں ہو گیا وہ کھینچ کھینچ کر سانس لینے لگی۔ میرے دل کو چوٹ سی لگی لیکن میں

نے دل کڑا کیا اور کمرے میں چلا آیا۔ جہاں میری راحت جاں، میری محبت، میری دل ربا کا روپ دھارے میری منتظر تھی۔

گرمیوں کے حبس بھرے دنوں میں پیزا اور کولڈ ڈرنک کا ڈنر کر کے اے سی کی کولنگ سے ٹھنڈے یخ کمرے میں سوئے ہوئے میری آنکھ بہت دیر سے کھلی۔ نجانے کب سے دروازہ بجاتا اماں کا ہاتھ شل ہو چکا تھا۔ زری کو ہسپتال لے جانا تھا۔ زین کو ابا کے پاس چھوڑ کر میں زری کو اماں اور عشا کے ساتھ لے کر ہسپتال پہنچا۔ جہاں اسے فوراً ہی آپریشن تھیٹر لے جایا گیا پہلے ہی بہت دیر ہو چکی تھی۔

زری کو تکلیف رات کے ابتدائی حصے میں شروع ہو چکی تھی لیکن پہلے وہ عابد بھائی کو کال کرتی رہی۔ ان کو مناتی رہی۔ لیکن ان کی طرف سے صاف جواب ملنے کے بعد اس نے اماں کو میرا دروازہ کھٹکھٹانے کو کہا۔ جو کہ گھنٹہ بھر بعد کھولا گیا۔ پھر ٹیکسی کے انتظار میں گھنٹہ لگ گیا۔ پھر ڈاکٹرز نے فوری خون مہیا کرنے کے لیے کہا۔ جس کے انتظام میں ہی دو گھنٹے لگ گئے۔ لیکن شکر ہے مل گیا۔ چھ بوتلیں لگانی پڑیں، لیکن ماں اور بچی دونوں کو بچایا نہ جا سکا۔

اماں کی حالت تو اتنی خراب تھی کہ ان کو وہیں ہسپتال میں داخل کروانا پڑا۔ گھر سے دو دو جنازے اٹھاتے ہوئے ایک بار تو میں اور عشا بھی ہل گئے۔ اماں کو ٹھیک ہو کر گھر آتے آتے بیس دن لگ گئے۔ وہ تو شکر ہے انور خالہ اور ان کی بیٹی کے آنے سے بہت سہولت ہو گئی ورنہ میں اور عشا تو پاگل ہو جاتے۔

ہسپتال سے آ کر اماں تو جیسے گونگی ہو گئی تھیں۔ عابد بھائی تو زری کا جنازہ اٹھتے ہی زین کو لے گئے تھے۔ اماں تو جیسے خالی ہاتھ ہو گئی تھیں۔ دونوں ہاتھ پھیلائے بیٹھی خلا میں گھورتی رہتیں۔ عشا کھانا بناتی۔ ابا جی نوالے بنا کر منہ میں رکھتے۔ تین چار نوالے لے کر وہ پانی کا گلاس پی لیتیں اس کے بعد کسی طور منہ نہیں کھولتی تھیں۔ ابا جی منتیں کرتے رہتے۔

ابا جی کپڑے تھما کر غسل خانے بھیجتے تو وہ نہائے جاتیں نہائے جاتیں۔ ابا جی دروازہ کھٹکھٹا کر کہتے ”بس کر ہو گیا غسل۔“ تو وہ کپڑے پہن کر نکل آتیں۔ نماز شروع کرتیں تو گھنٹہ گھنٹہ بھر سجدے میں پڑی رہتیں۔ ابا جی جھنجھوڑتے تو اٹھ جاتیں۔ ساری ساری رات صحن میں چلتی رہتیں۔ ابا جی کھانستے ہوئے برآمدے میں لاٹھی لیے بیٹھے ان کا پہرہ دیتے۔ پھر کسی دن بڑی مشکل سے منا کر ان کو نیند کی گولی کھلا دیتے۔ اس رات دونوں بڑے پلنگ پر سر جوڑے سو جاتے۔ مجھے تو ان سے خوف آتا تھا۔ میں چپکے چپکے دعا کرتا کہ اماں مر جائیں اور یہ مصیبت ختم ہو۔ لیکن ابا تھے کہ انہیں دونوں ہاتھوں سے سنبھالے جا رہے تھے متاع جاں کی طرح۔

☆☆☆

”آپ کی وجہ سے ہوا ہے شیراز! سب آپ کی غلطی ہے۔ کتنی دعاؤں اور منتوں کے بعد سنی تھی اس نے میری۔ چار سال بعد امید ہوئی تھی۔ میری ممی کہتی تھیں دو دو حمل والیوں کو ایک جگہ نہیں رکھتے۔ منحوس ہوتا ہے، مگر نہ آپ نے سنی نہ اماں نے، نہ اپنی بچی بچی، نہ میرا بچہ بچا!“ جب سے اَبارشن ہوا تھا عشا تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔

”بس کرو عشا! کتنا روؤ گی..... آؤ باہر چلیں۔“ میں نے اس کا ہاتھ تھاما۔

”نہیں جانا مجھے کہیں! آپ جائیں جہاں آپ کا دل چاہتا ہے۔ مجھے نہیں دیکھنی آپ کے اماں ابا کی شکل۔“ اس نے مجھ سے ہاتھ چھڑا لیا۔

”اتنی مایوسی اچھی نہیں! پھر دے دے گا اللہ تعالیٰ..... تم کیوں مایوس ہوتی ہو۔“ میں نے اس کا سر سہلایا۔

”چار سال..... تھوڑے ہوتے ہیں چار سال..... میں انتظار کرتے کرتے تھک چکی ہوں۔“ اس نے نئے سرے سے رونا شروع کر دیا تھا۔

”لوگوں کے گھر تو دس دس بیس بیس سال بعد

اولاد ہو جایا کرتی ہے۔ تم بس اللہ سے دعا مانگا کرو۔ رونا بند کرو، میں تمہارے آنسو برداشت نہیں کرسکتا؟" میں نے اس کے آنسو پونچھے۔

"ہونہہ! آنسو نہیں دیکھ سکتے۔ اگر نہیں دیکھ سکتے تھے تو پہلے ہی اماں کو پاگل خانے بھیج دیتا تھا ناں۔ ان ہی کی وجہ سے سب ہوا ہے۔" عشا نے ایک دم سے مجھے جھنجوڑا۔

"اس میں اماں کا کیا قصور عشا! یاد ہے تو تمہارا خود بخود پھسل گیا تھا ناں!" میں نے اس کو منانے کی کوشش کی۔

"ہے قصور تمہاری ماں کا سارا قصور تمہاری ماں کا ہی ہے۔ جس کی رات دن کی منحوس آہوں کا اثر مجھے لے ڈوبا۔ اپنی بیٹی مرگئی تھی تو وہ چاہتی تھیں سب مر جائیں۔" اس نے نئے سرے سے رونا شروع کردیا۔

ایک طرف عشا تھی اور دوسری طرف اماں کی وحشت اور دیوانگی بڑھتی ہی جارہی تھی۔ وہ کسی سے مخاطب نہیں ہوتی تھیں۔ لیکن ان کی ہر حرکت سے دیوانگی ظاہر ہوتی تھی۔ زری کی ہر چیز انہوں نے صدقہ کردی تھی۔ اس کے کپڑے اس کے جوتے اس کے چھوٹے موٹے زیور یہاں تک کہ اس کے بنائے تکیے اور پراندے تک بانٹ ڈالے تھے۔ زری بڑی سگھڑ لڑکی تھی۔ اماں نے اس کے سگھڑاپے کے سارے ہی راز بانٹ ڈالے تو گھر خالی خالی لگنے لگا تھا۔

اس کے بعد جو کچھ آنے والے بچے کے کپڑے بنائے تھے وہ بھی مستحقین میں بانٹ دیے تھے۔ بلکہ پیلے اونی سیٹ پر عشا کی پہلے دن سے نظر تھی، لیکن اماں نے اس کی نظر پہچانتے ہوئے بھی وہ سیٹ رانو کمہاری کی بیٹی کو دے دیا جس کا آتی سردیوں میں جننا پاتا تھا۔ سوٹ پا کر تو وہ اماں کی سات پشتوں کو دعائیں دیتی گئی تھی۔ زری کے لیے جو پنجیری بنائی تھی بنا کر کے غریب زچاؤں کو بھجوادی تھی۔ جو گائے بچے کے دودھ کے لیے پالی تھی وہ تک کسی مستحق کو دے دی تھی۔ اس پر میں جتنا چیخ سکتا تھا چیخا۔ گھر میں خوب توڑ پھوڑ کی۔ لیکن اماں کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ اب انہوں نے اپنی چیزیں بانٹنی شروع کردی تھیں۔ میرا غصہ روز بروز بڑھتا جارہا تھا۔ میں نے منع کیا تو انہوں نے کہا کہ ایک دھیلے کی بھی تمہاری چیز نہیں دوں گی تم دیکھ لینا، لیکن اپنا سارا سامان میں بانٹ دوں گی اور تم اس پر مجھے روک نہیں سکتے۔ اور اس بات پر عمل کرکے وہ بالکل مطمئن نظر آتی تھیں۔

عشا کہتی اماں نے اپنی سونے کی چاند بالیاں بھی دے دیں جبکہ وہ اس کو بہت پسند تھیں۔ اور اس نے اماں سے مانگی بھی تھیں۔ عشا چاہتی تھی کہ میں اماں سے اس معاملے پر بات کروں۔ لیکن مجھے بات کرنے کا فائدہ نظر نہیں آتا تھا۔ بیس پچیس دیسی مرغیاں تو اماں نے ہمسائیوں کو پکڑا دی تھیں۔ آخری کو تین مرغیاں دیتے ہوئے کہا تھا کہ وہ روز صبح دو انڈے گھر پہنچا دیا کرے میرے اور عشا کے لیے۔ اپنی سلائی مشین پر خالہ انور کے نام کی چٹ لگادی تھی۔ زین کا پسندیدہ مٹھو کا پنجرہ اور زین کو اٹھائے آخری روز کی زری کی تصویر زین کو بھجوادی تھی۔ یہ تصویر زری نے فرمائش کرکے کھنچوائی تھی۔ زین نہا دھو کر سفید نیکر شرٹ میں چمک رہا تھا اور خود وہ کاسنی سوٹ میں سرسوں کا زرد پھول دکھ رہی تھی۔ کالے ہونٹ، رخسار کی ہڈیاں۔ کتنی ہی دیر میں اس کا سانس سنبھلا تھا تصویر کے لیے۔ کل ملا کر اماں کو برداشت کرنا اب مشکل ہورہا تھا۔ اماں کے جیتے جی ہمارا جینا اب محال تھا۔ میرے لیے تو عشا کو سنبھالنا ہی مشکل تھا جس کی واحد ضد تھی کہ اماں کو کہیں بھیج دو۔

☆☆☆

سرشام ہی آندھی آئی تھی۔ آسمان لال تانبا ہورہا تھا۔ ہوا شوکتی پھرتی تھی گرد باد کی صورت۔ اس کی سیٹیوں کی دہشت دلوں پر چڑھی آتی تھی۔ غبار نے ہر چیز دھندلادی تھی۔ لائٹ بھی صبح سے بند تھی اور اب یو پی ایس بھی جواب دے چکا تھا۔ عشا موم

جتیاں جلا کر لے آئی تھی۔ اس کی روشنی میں اماں کی لال آنکھیں خون کی طرح سرخ معلوم ہوتی تھیں۔ خلاف معمول وہ بالکل پرسکون تھیں۔

"عابد نے، آپا سکینہ نے میری زری کو مار ڈالا زری کے ابا!"

زری کی وفات کے بعد اس قسم کا پہلا جملہ اماں کے منہ سے ہم نے سنا تھا۔ اماں تو ہمیشہ "شیراز کے ابا" کہتی تھیں۔

"جس جس نے زری کے قتل میں حصہ ڈالا سب کو پوچھے گا۔ بڑا انصاف والا ہے میرا رب۔ میرا سوہنا۔" انہوں نے مجھے اور عشا کو اپنی سونی آنکھوں سے دیکھا۔ میرے اندر کچھ کانپ گیا۔

"پانی پلا دو زری کے۔" اباجی نے آبخورا اماں کے قریب کیا۔ دو گھونٹ لے کر انہوں نے ہٹا دیا۔

"اب مجھے لٹا دو زری کے ابا!"

اباجی نے انہیں لٹا دیا۔ ایک دم غبار چھٹ گیا اور تڑاتڑ بارش برسنے لگی۔ سارے دن کا حبس اور گرمی آن کی آن میں ختم ہو گئے۔ میں نے اباجی کی چارپائی بالکل اماں کے ساتھ جوڑ کر ڈال دی۔ اور کچھ دوری پر اپنی اور عشا کی چارپائیاں بھی بچھا لیں۔ ہمارے لیٹتے ہی ٹھنڈی ہوا چل پڑی اور مزید سکون ہو گیا۔ ہم سب ہی سو گئے۔

تہجد کے وقت میری آنکھ اباجی کے رونے کی آواز سے کھلی۔ ایک تو یہ اباجی بھی سمجھتے ہیں جب تک آوازیں نکال کر نہیں روئیں گے ان کا مالک نہیں سنے گا۔ کون سمجھائے ان کو۔ میں نے کروٹ بدل کر تکیہ کانوں کے گرد لپیٹ لیا۔ لیکن پانچ منٹ گزرے ہوں گے کہ عشا نے مجھے ہلایا۔

"وہ اباجی!" اس نے ڈری ڈری آواز میں اشارہ کیا۔ اباجی اماں کے سرہانے ان کی چارپائی پر سر رکھے رو رہے تھے۔ زور زور سے بچوں کی طرح۔ اور ان کی بڑبڑاہٹیں بھی ذرا سا دھیان دینے پر مجھے سمجھ میں آنے لگی تھیں۔ میں لپک کر ان کے پاس پہنچا۔

"اباجی!" میں نے ان کے سر پر ہاتھ رکھے رکھے مٹھی بھینچ لی۔

"اباجی کیا ہوا ہے؟ میں ڈاکٹر خان کو لے کر آتا ہوں، یا اماں کو ہسپتال لے جاتے ہیں۔"

"اس کی کوئی ضرورت نہیں شیراز! اب وہ ان جھگڑوں سے بہت دور جا چکی ہے۔ وہ مجھے اکیلا چھوڑ گئی۔ چلی گئی اپنی زری کے پاس۔"

اباجی بری طرح رو رہے تھے۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ عشا نے کہا کہ میں خالہ انور کو فون کر دوں۔ فجر کی اذانوں کے وقت میں نے خالہ کو فون کیا اور دو گھنٹے تک وہ اپنی بیٹی اور بیٹے کے ساتھ پہنچ گئی تھیں۔ خالہ بڑی حوصلہ مند عورت تھیں۔ انہوں نے آتے ہی سب انتظام سنبھال لیا۔ مجھ سے اور عشا سے وہ کچھ اکھڑی اکھڑی تھیں بلاوجہ ہی۔ چلو ہمیں کیا۔ کام تو سب سلیقے اور ڈھنگ سے کر رہی تھیں۔ کسی مہمان کو کوئی شکایت نہیں تھی۔ شام تک جنازہ اٹھا لیا گیا۔ قبرستان کی طرف جاتا میرا ایک ایک قدم من من بھر کا تھا۔ جنازے کی گاڑی کو ہولے ہولے کھینچتا میں کسی اور جہان میں گم تھا۔

مجھے رہ رہ کر زری اور اماں یاد آ رہی تھیں۔ دونوں کیسے جان لٹایا کرتی تھیں مجھ پر۔ چلتے چلتے مجھے پتھر سے ٹھوکر لگی اور میں واپس حال میں لوٹ آیا۔ قبرستان کا گیٹ سامنے تھا۔ اماں کو لحد میں اتارنے کے لیے بھی میں قبر میں نہ اترا۔ یہ فریضہ بھی خالہ انور کے نوید نے ادا کیا۔ کیسے قبر تیار ہوئی کیسے مٹی ڈالی گئی کیسے دعا کی گئی۔ لوگ مجھ سے آ آ کر ملتے رہے۔

جنتی عورت تھی ہر کسی کی زبان پر یہی الفاظ تھے۔ جو ملتا رو رو کر اماں کی خوبیاں ہی بیان کرتا تھا۔ کتنے گھروں کا چولہا ان کی وجہ سے جلتا تھا۔ کتنی بیٹیاں انہوں نے بسائی تھیں۔ کتنوں کے ہاں ان کا سلیقہ کام آ گیا تھا۔ کتنے اتھرے بے لگام ان کی بات سر جھکا کے مانتے تھے۔ کیسے نہ مانتے سارا دن تو

باوضو رہتی تھیں وہ۔ ہر وقت بچوں کو قرآن پاک پڑھاتی تھیں۔ نماز یاد کراتیں۔ انبیاء کرام کی کہانیاں سناتی تھیں۔ گھر کے کاموں سے انہیں ایک منٹ فرصت نہیں تھی لیکن ساتھ ساتھ بنا کوئی کام روکے وہ بچوں کو سبق دیے جاتیں۔ مغرب کے بعد وہ ہم سب کو کھانا دے دیتیں۔ ابا کی چلم تازہ کر دیتیں۔ بستر بچھا دیتیں۔ سرہانے پانی، دوا، موم بتی، ماچس، سب چیز رکھ کر وہ عشا کی اذان کے ساتھ پچھلا کمرہ بند کر لیتیں۔ پھر وہ ہوتیں اور ان کا اللہ۔ جانے کیا کیا مناجاتیں کرتی تھیں۔ ہم سب کے لیے دعائیں مانگتی تھیں۔ ہم سب سو جاتے جانے کب وہ اس کمرے سے نکل کر سوتیں۔

☆☆☆

لوگوں کے ہجوم سے تنگ آ کر میں اندر کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ میرے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ مجھے چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ میں آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ میری بند آنکھوں کے پیچھے ایک فلم سی چل پڑی تھی۔

"بیٹا! مجھ سے اب کپڑے نہیں دھلتے، نہ ہی جھاڑو پوچا ہوتا ہے۔" اماں کی آواز ڈری ڈری تھی۔

"تو.....؟" میرے ماتھے پر ہزار بل تھے۔

"بہو سارا دن سلائی میں لگی رہتی ہے، اگر وہ کپڑوں اور صفائی کا کام سنبھال لے تو۔"

"تو آپ کام والی رکھ لیں۔"

"شہباز! پتر گھر کا خرچ ہزار مشکلوں سے چلتا ہے۔ مہنگائی بھی تو دیکھو کتنی بڑھ گئی ہے۔"

"یہ میرا مسئلہ نہیں ہے اماں! اب تو ابا جی کی پنشن بھی 20 فیصد بڑھ گئی ہے۔ میرے اپنے بھی سو خرچے ہیں، اور رہ گئی بات عشا کے کام کرنے کی۔ عشا بہو ہے اس گھر کی کوئی نوکرانی نہیں، پہلے ہی وہ سلائی کر کر کے تھک جاتی ہے۔"

میں نے ان خیالات کو جھٹک کر کروٹ بدل لی۔ میری آنکھوں کے آگے گھر کا کام کرتی اماں تھیں۔

"اماں! میرا ناشتہ کہاں ہے؟" میں نے بند کچن کو دیکھ کر پوچھا۔

"بیٹا مجھے بہت تیز بخار ہے، تم بہو سے کہہ کر ناشتہ بنوا لو۔" اماں سر باندھے کمرے سے نکلیں اور برآمدے میں پڑی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"کیا مصیبت ہے اماں!" مجھے اپنے غصے پر ذرا لاج نہ آئی۔

"دفتر میں ہی کچھ کھا لوں گا۔" میں تن فن کرتا نکل گیا۔

"نہ میرا لعل بھوکا نہ جانا۔ میں ہمت کرتی ہوں۔" اماں کرسی سے اٹھیں تو لڑکھڑا گئیں۔

"نرے ڈرامے۔" میں نے مرغی کے پانی والے برتن کو ٹھوکر سے اڑایا۔ واپسی پر دیکھا تو اماں سر باندھے کھانا پکا رہی تھیں۔ ان کا چہرہ لال سوہا ہو رہا تھا۔ عشا اپنے تخت پر بیٹھی سلائی کر رہی تھی۔

کام کر کر کے اماں کا بخار بگڑ گیا۔ مجبوراً ابا نے مجھ سے بات کی۔ نجانے کس مصیبت سے عشا نے ایک ہفتہ گھر سنبھالا۔ اماں کے ذرا سا سنبھلتے ہی وہ واپس اپنے تخت پر چلی گئی۔ اور اماں گھر کے کاموں میں جت گئیں۔ لیکن اب ان میں تیزی نہ رہی تھی۔ بہت آہستہ آہستہ کام کرتی تھیں۔ لیکن کر ہی لیتی تھیں کسی نہ کسی طرح، بیچ بیچ میں سانس لے کر بیٹھ بیٹھ کر۔ ایک بار تو حد ہو گئی ہانڈی چڑھا کر سو گئیں۔ جھونکا آیا تو وہیں ہاتھ جلا بیٹھیں۔ لیکن اپنا کوئی بھی کام نہ چھوڑا، گیلا آٹا ہاتھ پر لگائے کام میں مصروف رہیں۔

عید آئی تو ہر سال کی طرح عشا کے میکے سے بھی پرتکلف عیدی آئی جس کی رقم عشا نے اپنی سلائی سے ہی اپنے میکے والوں کو دی تھی۔ ورنہ تو وہ بے حد کنجوس لوگ تھے۔ زری کا فون آیا کہ اس کو بھی عیدی بھیجی جائے۔ جس میں اس کے سب سسرال والوں کے مہنگے مہنگے برانڈ کے جوڑے ہوں ورنہ عابد اسے طلاق دے دے گا۔ اماں نے مجھ سے بڑی امید سے رقم مانگی۔ لیکن میں نے صاف انکار کر دیا۔ اماں نے اپنی قربانی کے لیے پالی ہوئی وہ

بکریاں بیچ کر زری کو عیدی بھجوائی۔ میں جب عیدی دینے گیا تو زری مجھ سے لپٹ کر رو پڑی۔ بکھرے بال، سیاہی مائل نیلگوں چہرہ، بھوک اور کام کی زیادتی اور آئے دن کی مار پٹائی سے بے حال اس کا سراپا دیکھ کر مجھے بہت ترس آیا۔ ایک بار تو اس کی حالت زار دیکھ کر میرے دل میں آیا کہ بونس میں ملے پانچ ہزار روپے چپکے سے اس کے ہاتھ پر رکھ دوں۔ لیکن فوراً ہی مجھے خیال آگیا کہ عشا کے سونے کے کنگنوں میں بس پانچ ہزار ہی کی کمی ہے۔ میں نے زری کے سر پر ہاتھ پھیرنے پر اکتفا کیا۔

"بھائی شیراز مجھے عید پر گھر لے جا اس بار! زرینہ اور پارو کو عیدی پسند نہیں آئی۔ عابد نے مار مار کر میرا حشر کر دیا ہے۔ مجھے کچھ دن کے لیے لے جا، میں بہت تھک گئی ہوں۔" زری نے اپنے نیل و نیل ہاتھ مجھے دکھاتے ہوئے کہا۔ ایسی منت تو اس نے کبھی نہیں کی تھی۔

"عید گزار لے زری صبر سے۔ عید کے بعد میں تجھے خود لے جاؤں گا۔ عید پر پھوپھی بڑا سیاپا ڈالے گی۔" میں نے صاف جھوٹی تسلی دی۔

"سچ بھائی!" زری خوشی خوشی مان گئی۔ میں واپس آگیا۔

☆☆☆

"ابا چار سال بعد عشا امید سے ہوئی ہے، اس کے لیے ٹینشن بہت خطرناک ہے۔" میں نے ابا کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"تو...... ہمارے گھر میں کون سی ٹینشن ہے۔" ابا نے حیرانی سے پوچھا۔

"اماں سے بڑی کوئی ٹینشن ہے ابا! زری کی موت نے پاگل کر دیا ہے انہیں، عشا کو ذہنی سکون کی ضرورت ہے۔ وہ بہت پریشان ہے۔ میں اسے اماں کے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔"

"او نہیں رکھ سکتا تو اسے میکے چھوڑ آ۔" ابا نے صاف جواب دیا۔

"اس کا یہ حل نہیں کہ اسے میکے بھیج دوں۔ اماں کو کہیں بھیجنا چاہیے۔" میں نے بلی تھیلے سے نکالی۔

"شیراز! مجھے لگتا ہے تو پاگل ہو گیا ہے۔ ماں کو کہاں بھیجے گا؟" ابا کو جلال آگیا۔

"ابا! شہر میں ایسے اولڈ ہوم ہوتے ہیں، وہاں ایسے ذہنی مریضوں کو رکھتے ہیں۔ ہر طرح ان کا خیال۔"

"بکواس بند کر اپنی...... ابھی میں زندہ ہوں، دیکھتا ہوں کون میری بیوی کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے بھی دیکھتا ہے۔" ابا کی غیرت پوری طرح جاگ گئی تھی۔ لیکن مجھے کیا فرق پڑتا تھا۔

☆☆☆

نجانے کتنی دیر میں ایسے ہی پڑا رہتا کہ انور خالہ نے مجھے آکر اٹھایا۔ باہر دسترخوان لگ گیا تھا۔ سب مجھے پوچھ رہے تھے۔ چند دن لگے تھے مجھے اماں کی موت کو بھولنے میں۔ گھر میں تھا اور میری عشا۔ مجبوری کو ہم ابا کا کھانا بنا کر جیسے تیسے تین وقت ان کے کمرے میں رکھ دیتے۔ وہ بھی بنا کوئی اعتراض کیے کھا کر برتن باہر رکھ دیتے۔ آپس میں بات کیے ہمیں ہفتوں گزر جاتے۔ بس رات رات بھر وہ کھانستے رہتے۔ جس کی ہمیں کوئی پرواہ نہ تھی۔

عشا پھر امید سے تھی۔ میں نے اسے ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھا تھا۔ میری تنخواہ میں اضافہ ہو گیا تھا۔ میں نے سب کاموں کے لیے ملازمہ رکھ لی تھی۔ اب میں عشا کو سلائی بھی نہیں کرنے دیتا تھا۔ خدا خدا کر کے نو ماہ گزرے اور عبدالرحمن ہمارے گھر آگیا۔ ہم نے اس کی پیدائش پر جی بھر کر خوشیاں منائیں۔ ابا کو کھانسی تھی۔ ہم نے ان کو عبدالرحمن کے پاس پھٹکنے تک نہ دیا۔ وہ بہت روئے کہ ایک بار مجھے گود میں لینے دو۔ لیکن ہم نے ان کی ایک نہ سنی۔ عبدالرحمن چلنے لگا تو ہم نے ابا جی کو ان کے کمرے تک محدود کر دیا۔ عبداللہ آیا تو ہم نے ان پر مزید پابندیاں لگا دیں۔ ایک دن وہ خاموشی سے گھر چھوڑ گئے۔ ہمیں کیا فرق پڑتا۔ ہمارے لیے تو خس کم

جہاں پاک والی بات تھی۔ اگلے ہی سال عبدالرب اور اسری اکٹھے ہی چلے آئے۔ ہماری خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ ہم اپنے بچوں میں مگن تھے۔ اباجی کہاں تھے، ہمیں کبھی خیال تک نہیں آیا تھا۔

☆☆☆

"تڑپ تو تم یوں رہے ہو جیسے کسی نے گولی مار دی ہو۔"

عبدالرحمن نے فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔ میں ایک ہفتہ عبدالرب اور ایک ہفتہ عبداللہ کے پاس رہوں گا۔ اور عشا عبدالرحمن کے پاس رہے گی۔ میں نے احتجاج کیا۔ میں رویا چلایا کہ مجھے میری عشا سے دور مت کرو۔ لیکن کسی نے میری نہیں سنی۔ ان لوگوں نے ہمیں الگ الگ کر دیا۔

میں تو باری باری سارا سارا دن عبدالرب اور عبداللہ کے گھر بے کار پڑا رہتا۔ نہ کوئی کام تھا نہ کوئی مصروفیت۔ بچے میرے قریب نہیں پھٹکتے تھے۔ وقت پر کھانا اور چائے مل جاتی۔ بیچ میں چائے کو جی چاہتا تو اتنی باتیں سننے کو ملتیں کہ توبہ ہی بھلی۔ کھانے کے نام پر بس مریضوں والی پھیکی دال یا شوربہ یا چپاتی۔ مجھے تو عشا کے ہاتھ کا لگتا کھانا تھا۔ اس کے ہاتھ کا نمکین گوشت، کڑھی اور بینگن کا بھرتہ۔ لذیذ اتنا کہ بندہ انگلیاں چاٹتا رہ جائے۔ یہ نالائق بدتمیز عبداللہ اور عبدالرب سب بھول گئے۔ لیکن مجھے خبر نہیں تھی کہ وہ کچھ نہیں بھولے تھے صرف مجھے بھلانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اندر تو لمبی شیشے کی میز انواع واقسام کے کھانوں سے بھری ہوئی ہوتی تھی، تینوں وقت۔

ایک روز میں نے عبدالرب کی منت کی کہ مجھے عشا سے ملنا ہے۔ مجھے اپنی عشا کو دیکھنا ہے۔ بس ایک بار وہ مجھے اس سے ملوا دے۔ تو وہ مجھے گاڑی میں بٹھا کر لے گیا۔ لیکن وہ عبدالرحمن کا گھر تو نہیں تھا۔ وہ تو کوئی اور جگہ تھی۔ وہاں اور بھی کچھ لوگ تھے۔ بالکل بوڑھے۔ اپنے آپ میں گم۔ ایک بستر پر عشا لیٹی ہوئی تھی۔ اسے ڈھیر ساری نالیاں لگی ہوئی تھیں۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کا ماتھا چوما تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ میں نے پوچھا کہ وہ ٹھیک ہے؟ تو اس نے حیرانی سے میری طرف دیکھا جیسے کہتی ہو بھلا میں کیسے ٹھیک ہو سکتی ہوں۔ واقعی وہ میرے بنا کیسے ٹھیک ہو سکتی تھی۔ میں نے عبدالرب سے کہا میں عشا کے پاس رہوں گا۔ عبدالرب کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

"اسی لیے میں تمہیں یہاں لانا ہی نہیں چاہتا تھا منحوس، بڈھے! مجھے پتا تھا تم یہاں آ کر پھیل جاؤ گے۔ یہاں ماں کا علاج ہو رہا ہے۔ تم فوراً واپس چلو۔" وہ آہستہ آواز میں غرایا اور مجھے گھسیٹتا ہوا واپس لے لیا۔ اس بات کو پانچ روز گزرے تھے کہ عبد الرحمن تیزی سے میرے کمرے میں آیا۔

"جلدی اٹھو بابا! اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" میں تو بے دم سا ہو کر چارپائی پر ڈھے گیا۔ عبد الرحمن مجھے ڈرانے لگا۔

"نخرے کرتے رہو گے تو یہیں پڑے رہو گے اور وہ وہاں مر جائے گی، بعد میں مجھے مت کہنا۔"

یہ عبدالرحمن تھا جس کی پیدائش پر میں اور عشا خوشی سے دیوانے ہو گئے تھے۔ ہفتوں مٹھائیاں بانٹتے پھرے تھے۔ کانپتے لرزتے قدموں سے میں کھڑا ہوا اور عبدالرحمن کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی تو اس نے ہاتھ جھٹک دیا۔ میں لڑکھڑاتے قدموں سے اس کی گاڑی میں جا بیٹھا۔ کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ لبوں پر ایک ہی صدا تھی۔

"یا اللہ میری عشا کو کچھ نہ ہو۔"

"جلدی اترو! ماں بس مرنے ہی والی ہے۔"

عبدالرب نے گاڑی کا دروازہ کھول کر میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچ کر مجھے اتارا۔ عبداللہ اور عبدالرب دونوں مجھے گھسیٹتے ہوئے عشا کے پلنگ کے پاس لے گئے۔ جہاں وہ آخری سانسیں لے رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں پل دو پل کو زندگی کی رمق لہرائی۔

"شیراز! ابھی اولڈ ہوم نہیں......"

اتنا کہہ کر اس نے جان جان آفریں کے سپرد

کردی۔ آہ! نجانے کیسے زخم کھائے تھے میری عشا نے ان تین مہینوں میں، کیسی تکلیف اٹھائی تھی کہ مجھے بھی بتاتے ہوئے اس کی جان نکلی۔ میری عشا تو رہی نہیں تھی جو میں کسی کی سنتا۔ میں اس کی تدفین کے بعد اپنے گھر واپس آگیا۔ اپنی پینشن کی رقم سے رضیہ کو رکھ لیا اور زندگی کے بقیہ دن گزارنے لگا۔ مجبوراً بیٹوں نے ہر ہفتے کی ڈیوٹی لگالی۔ ہفتہ وار وہ مجھے ضرورت کی سب چیزیں دے جاتے۔ میرا گزارا ہو جاتا۔

☆☆☆

ساری دعائیں مستجاب ہو جاتیں تو بندے دعا کا فلسفہ ہی بھول جاتے۔ معبود کی بڑائی کے آگے سرنگوں ہونے کا سلیقہ اس کے آگے گڑگڑانے کا قرینہ...... کچھ بھی یاد نہ رہتا......سو ہماری اس وقت کی ساری دعاؤں کی قبولیت کی ساعت اس گھڑی نہیں آئی تھی۔

میرا عبدالرب ہم سب کو چھوڑ گیا تھا۔ میری بوڑھی ہڈیوں کو جیتا چھوڑ کر مر گیا تھا۔ میرے کندھوں پر سوار ہونے کا شوق اس نے آج بھی پورا کر لیا تھا۔ مجھے مٹی کے اوپر گھسٹتا چھوڑ کر خود مٹی اوڑھ کر سو گیا تھا۔ میرا انس میری گود میں تڑپ رہا تھا۔ اس کی شدتِ غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ بظاہر اس کے مرنے کا ذمہ دار عبدالرحمٰن اور اس کی بیوی کی حالت تو سب سے خراب تھی۔ خون آخر خون ہوتا ہے۔

عبدالرب کو گئے تیسرا روز تھا۔ میں انس کے قریب بیٹھا اسے تسلی دے رہا تھا کہ عبدالرحمٰن بلکتا ہوا آیا اور میرے قدموں میں بیٹھ گیا۔

"اباجی! مجھے معاف کر دیں۔ آپ کے ساتھ اور ماں کے ساتھ جو ظلم ہم نے کیا۔ اس کی ہمیں قدرت نے بڑی بھیانک سزا دی ہے۔"

وہ اونچی آواز میں رو رہا تھا۔ مجھے حیرانی ہوئی کہ اس کو عبدالرب کے جانے کا اس قدر غم ہوا ہے۔ لیکن اس کی اگلی بات نے مجھ پر حقیقت کھول دی۔

"اباجی! میری بچی نے اپنے عیسائی کلاس فیلو سے شادی کر لی ہے۔ میری عزت تو خاک میں مل گئی۔ دین تو پہلے ہی ہم نے کھو دیا تھا۔ دنیا بھی چلی گئی۔ ہمیں معاف کر دیں اباجی۔"

عبداللہ بھی میرے قدموں میں جھکا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ایک بھائی کی موت اور دوسرے کی زبوں حالی نے اس کی بھی آنکھیں کھول دی تھیں۔ کچھ ویسے بھی اس کی تین تین بیٹیاں تھیں۔ اور بات صرف اتنی نہیں رہی تھی۔ اس نے عبدالرحمٰن کے جس بیٹے سے اپنی بڑی اور لاڈلی بیٹی کا نکاح کیا تھا۔ وہ اسے طلاق دے کر لندن جا بیٹھا تھا۔ اور اس کی بیٹی سکتے میں پڑی تھی۔

"اباجی! آپ ہمارے ساتھ رہیں گے۔"

عبداللہ کی بیوی آمنہ نے میرے گھٹنوں پر ہاتھ رکھا۔ میں نے جواب دینا چاہا تو آواز نے ساتھ چھوڑ دیا۔ میں نے اپنے لرزتے ہاتھ ان کے سروں پر رکھے۔ آنسوؤں کی طغیانی نے میرا دم الٹا دیا تھا۔ میرا سانس رکنے لگا۔ میں نے انہیلر کی تلاش میں ادھر ادھر ہاتھ مارا۔ لیکن وہاں انہیلر کہاں تھا۔ لیکن بچے فوراً سمجھ گئے۔ مجھے ہسپتال لے کر بھاگے۔ مجھے دمے کا سخت اٹیک ہوا تھا۔ میں آئی سی یو میں تھا۔

میرے بچے میرے پوتے پوتیاں شیشے کے اس پار اپنے چہرے جوڑے کھڑے تھے۔ طبیعت سنبھل گئی تو انس مجھے اپنے ساتھ لے آیا۔ میری پہلے بھی چلی تھی جو آج چلتی۔ سب نے مجھے منا کر ہی دم لیا تھا۔ یوں بھی مجھ میں اب کسی قرنطینہ کو سہنے کی طاقت نہیں تھی۔ میں نے انس کے ساتھ رہنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ باقی سب وہیں مجھ سے ملنے آجایا کریں گے۔ مجھے چاروں طرف سے میرے بچوں نے گھیرا ہوا تھا اور سامنے سنہری فریم میں عشا مسکرا رہی تھی۔

نمرہ احمد

اڑتیسویں قسط

عدالت سے واپسی کے سفر میں ان روشنیوں میں اضافہ ہو چکا تھا۔ چلچلاتی دھوپ آنکھوں میں پڑ رہی تھی۔ اوپر سے کیمروں کے چمکتے فلیش... نگاہیں چندھیا گئی تھیں۔

یا شاید اس کی آنکھیں چندھیائی ہوئی تھیں۔

کسی خواب کی سی کیفیت میں باہر آ رہی تھی۔ ایڈم اس کے ساتھ تھا۔ اور رپورٹرز کا ہجوم اس کے سامنے مائیک اور کیمرے اٹھائے' چلا چلا کے پوچھ رہا تھا۔
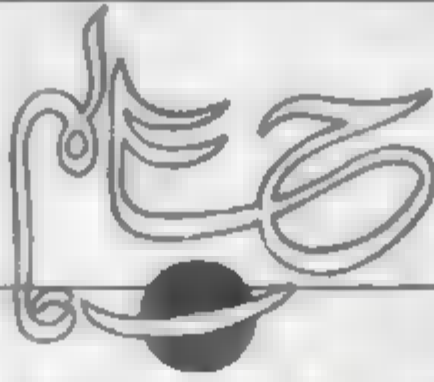
"حالیہ... عدالت نے آپ کے ٹرائل کو مس ٹرائل قرار دے کر آپ کو ہر الزام سے بری کر دیا ہے۔ اس پہ کیا کہیں گی؟"

"کیا آپ کو اشعر محمود نے اغوا کیا تھا؟ کیا اشعر محمود نے اپنی بہن کا قتل کروایا ہے؟"

"کیا عدالت سرمد کو چھوڑ دے گی؟"

ہر شے سلو موشن میں ہو رہی تھی۔ ایڈم رپورٹرز سے بات کر رہا تھا۔ وہ بس خاموشی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ ہر الزام اور ہر جرم سے آزاد۔

کچھ رپورٹرز ایسے تھے جو دور گھاس پہ کھڑے

اپنے اپنے کیمرہ مینوں کی طرف چہرہ کیے مائیک اٹھا کے رپورٹ پیش کر رہے تھے۔

"وہ کیک کس نے بھیجے' ہم نہیں جانتے' ناظرین۔ عدالت نے سرمد زیدی کو گرفتار کر کے ری ٹرائل کا حکم دیا ہے۔ تالیہ مراد اب آزاد ہیں۔ آزاد تو اشعر محمود بھی ہیں لیکن وہ ری ٹرائل سے پہلے تک ملک نہیں چھوڑ سکتے۔ سوال یہ ہے کہ کیا کسی کو آرسینک مہیا کرنا جرم ہے؟ آرسینک ہوتا کیا ہے اور یہ کن کاموں کے لیے استعمال ہوتا ہے؟ اس بارے میں ہم آپ کو ایک ڈاکومنٹری دکھانے جا رہے ہیں....."

تھوڑے تھوڑے فاصلے پہ کئی رپورٹرز کھڑے اپنے چینل کے کیمرے کو دیکھتے ہوئے اپنی اپنی عدالت سجائے ہوئے تھے۔

وہ سیاہ شیشوں والی کار میں بیٹھی۔ اور دروازہ بند کیا۔ اس لمبی کار میں نشستیں آمنے سامنے بنی تھیں۔ ایڈم اس کے ساتھ بیٹھا تھا اور احمد نظام سامنے۔

کار چل پڑی۔ رپورٹرز کے سوالات سے دور۔ عدالت کی عمارت کی دھوپ سے دور۔ احمد نظام نے بالآخر گہری سانس لی۔

"یہ خون کے نشانات والے کنٹینرز کا آپ نے بہت رسک لیا' بے تالیہ۔ مجھے پہلے معلوم ہوتا تو آپ کو روک دیتا۔"

"لیکن مان لیں کہ اس سے فرق پڑا ہے۔ اشعر محمود ایک لمبے عرصے کے لیے مشکوک ہو گیا ہے۔"

"لیکن وہ اس کیس سے بری ہو جائے گا۔"

"مجھے معلوم ہے وہ بری ہو جائے گا۔ سرمد بھی بری ہو جائے گا۔ کسی کو سزا نہیں ہوگی۔ مگر میں سروائیول موڈ میں ہوں' احمد نظام صاحب۔ مجھے خود کو بری کروانے کے لیے وہ سب کرنا تھا جو میں کر سکتی تھی۔"

"اشعر جانتا تھا کہ عصرہ زہر منگوا رہی ہیں تو اس نے ان کو کیوں نہیں روکا؟" ایڈم نے سوچتے ہوئے افسوس سے پوچھا۔

"کیونکہ عصرہ اور فاتح کے تعلقات اچھے نہیں تھے۔ اشعر نے سمجھا ہوگا کہ یا تو وہ فاتح کو مارنا چاہتی ہیں یا تالیہ کو۔ دونوں صورتوں میں اشعر کا فائدہ تھا۔"

"یعنی اتنے سالوں سے اشعر جانتا تھا کہ زہر عصرہ نے منگوایا تھا پھر بھی اس نے آپ کو ہر جگہ مورد الزام ٹھہرایا۔" ایڈم نے افسوس کرتے ہوئے سر ہلایا۔ وہ پراسراریت سے مسکرائی۔

"میں نے اشعر کو اس کیس میں اس لیے پھنسایا ہے کیونکہ وہ اس ملک کا پردھان منتری بننا چاہتا ہے۔ لیکن اس دھبے کے بعد الیکشن تو کیا اس کو پارٹی کا کوئی اہم عہدہ بھی نہیں ملے گا۔ بعد میں وہ بری ہو جائے گا۔ ثبوت ناکافی ہوں گے لیکن اعظم کمپنی اس کو دوران تفتیش ہی پارٹی سے سائیڈ لائن کر دے گی۔ میں نے کہا تھا نا' میں سیاہ ہوں' ایڈم۔"

"آپ سیاہ نہیں ہیں' بے تالیہ۔" احمد نظام سادگی سے مسکرا کے بولے۔ وہ بھی مسکرا دی۔

"لیکن آر یو شیور کہ آپ نے وقت کو روکنے والی کوئی گھڑی استعمال نہیں کی تھی؟"

تالیہ ہنس دی۔ "نہیں۔ ہم نے صرف وہی کیا تھا جو ہمیں کرنا آتا ہے۔ سرمد ایک ہی جگہ سے شام کی چائے پیتا ہے۔ ہم نے اس کی چائے کو ڈرگ کیا تھا۔ وہ اتنی گہری نیند سویا کہ اسے معلوم نہ ہوا کب کوئی اس کے گھر بنا آواز کے داخل ہوا ہے اور اس کے فون اور گھڑیوں کے اوقات کو دو گھنٹے آگے کر گیا ہے۔ ہم اس سے ایک بجے ملنے گئے تھے۔ اور جاتے ہوئے اس کی کیبل کی تار کاٹ گئے تھے۔ اگلی رات داتن نے اس کی گھڑیاں درست کر دی تھیں۔ انٹرنیٹ ابھی تک اس کا خراب ہے جب ہی اس نے سم کارڈ سے اشعر کو کال ملائی تھی۔"

"اور واپسی پہ بے تالیہ نے اس اسٹور میں

میرے بھیجے رپورٹرز کو مکا مارا جو توقع کے مطابق آپ کو تھانے لے گیا۔ تھانے سے بہترین اچلی بائی کوئی نہیں ہوتی۔ اس لیے 'فار دی لاسٹ ٹائم احمد نظام صاحب' ہم نے کوئی ٹائم ٹریزر استعمال نہیں کیا تھا۔"

"آپ لوگوں سے کچھ بعید بھی نہیں ہے۔ آخر آپ وقت کے مسافر رہے ہیں۔" انہوں نے جھرجھری لے کر سر جھٹکا۔ وہ تالیہ کی وقت کے سفر والی باتیں یوں دہراتے تھے جیسے انہیں ان پہ یقین ہو لیکن تالیہ کا خیال تھا وہ اندر سے ابھی تک ان پہ یقین نہیں کر پائے۔ کوئی بھی نہیں کر پائے گا۔

"آپ کا شکریہ۔" کار احمد نظام کے گھر کے قریب رکی تو وہ بولی۔ شوفر نے دروازہ کھولا تو باہر سے سرما کی دھوپ میں لپٹی دھنک اندر اڈ آئی۔

ادھیڑ عمر وکیل نے شانے اچکائے اور اپنا بریف کیس سنبھالتے ہوئے اٹھا۔ شوفر نے دروازہ کھولا تو انہوں نے نیچے اترتے ہوئے کہا۔

"آپ نے میری فیس دے دی۔ دیٹس اٹ۔ میں نے یہ سب فیس کے لیے ہی کیا تھا۔"

تالیہ کی سوگوار مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ "اگر آپ نہ ہوتے تو میں اس کیس سے نہ نکل پاتی۔ اور اگر آپ کا دوست میری مدد نہ کرتا تو میں اپنے پرانے جرائم کے لیے معافی نامہ بھی حاصل نہ کر سکتی۔"

احمد نظام اپنے گھر کے لان کی طرف پشت کیے کھڑے تھے۔ تالیہ کو تعجب سے دیکھا اور بولے۔

"کون سا دوست؟" اور کندھے اچکا کے مڑ گئے۔ تیز دھوپ ان کے عقب سے آرہی تھی جہاں گھاس پہ دھنک کے سارے رنگ بکھرے تھے۔ تالیہ نے ماتھے پہ چھجا بنا کے ان کو جاتے دیکھا اور مسکرا دی۔

"جانتے ہو مجھے اس آدمی کی سب سے اچھی بات کیا لگتی ہے؟"

دروازہ بند ہوا تو وہ ایڈم سے بولی۔

"کیا؟"

"جب ان کو احساس ہوا کہ میں برائی کا راستہ چھوڑ چکی ہوں تو انہوں نے میرے اندر کی اچھائی کو

ایک نہیں کئی موقعے دیے۔ ان کے کسی قدم سے کوئی اچھائی کے راستے پہ جاتا ہوا شخص بددل نہ ہو جائے' بس اس ایک بات کے لیے یہ اتنا عرصہ میرے ساتھ لگے رہے۔ ایسے لوگ کم ملتے ہیں ایڈم۔"

"اور آپ جیسی ہماری قیس بھی کم لوگ ہی دیتے ہیں۔"

ایڈم ہنس کے بولا تھا۔ تالیہ مسکرا کے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ صدیوں کی مسافت کے بعد بالآخر وہ آزاد تھی۔

☆☆☆

دو دن بعد۔

صبح کی تازگی اس خوب صورت کالونی کی سڑک پہ پھیلی تھی۔ دونوں طرف دو رویہ درخت تھے جنہوں نے ٹھنڈی سی چھایا کر رکھی تھی۔ آسمان آج گہرا جامنی تھا اور سورج کو نکلنے کا راستہ تک نہیں دے رہا تھا۔

ایڈم نے کار اسٹریٹ کے کنارے کھڑی کی۔ پھر گہری سانس لے کر ساتھ بیٹھی تالیہ کو دیکھا۔ وہ ہاتھوں میں پکڑے پرنٹ شدہ کاغذ کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے جھکے سر پہ سیاہ ہیٹ تھا جس میں سرخ پھول لگا تھا۔

"فاتح ابھی آفس نہیں گئے ہوں گے۔ میں بس ان سے یہ سائن کروا کے آتی ہوں۔"

"دوستانہ مشورہ دے رہا ہوں۔ یہ نہ کریں۔"

تالیہ نے چہرہ اٹھا کے اسے دیکھا۔

"تمہیں ڈر ہے کہ وہ سائن کر دیں گے؟"

"مجھے ڈر ہے کہ وہ سائن نہیں کریں گے اور پھر آپ اپنی ضد پہ اڑ جائیں گی اور ان سے سائن کروا کے دم لیں گی۔ جب آپ ضد کرتی ہیں تو اسے منوا لیتی ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ ایسی چیز پہ ضد کریں جو آپ کو خوشی نہیں دے گی۔"

تالیہ کی آنکھوں میں آج کوئی نمی نہ تھی۔ ایک سوگواریت تھی لیکن اعتماد بھی تھا۔ وہ جیسے اس جذباتی جھٹکے سے سنبھل چکی تھی۔ جیسے اس نے اس رشتے کے تحلیل ہو جانے کو قبول کر لیا تھا۔

"میرا رنگ سیاہ ہے ایڈم۔ میں تمہاری کتابوں میں لکھی کوئی سفید گھوڑے والی شہزادی نہیں ہوں۔ میں اپنی سیاہی سمیت ان کی زندگی سے دور جانا چاہتی ہوں۔ کسی اور ملک۔ کسی اور جزیرے پہ کسی نئی داستان کا حصہ بننا چاہتی ہوں۔"

"کہا نا... میں یہ آزما چکا ہوں۔" وہ مسکرایا اور نفی میں سر ہلایا۔ "یہ کام نہیں کرتا۔"

دونوں گھنے درختوں کے سائے تلے کار میں بیٹھے سامنے پھیلی سڑک کو دیکھ رہے تھے۔

"میں ان کے ساتھ بھی خوش نہیں رہوں گی۔ ان کے بغیر رہ کے دیکھ لوں گی۔ اتنا عرصہ ان کے بغیر ہی تو رہ رہی تھی۔ تم میرا انتظار کرنا۔"

"اور ہیشا والا معاملہ؟"

"کہا نا... میں سیاہ ہوں۔ مجھے اب کسی دوسرے کو بچانے میں دلچسپی نہیں۔"

"پھر تالیہ... ہیشا کو وقت دیں۔ ہو سکتا ہے وہ ویسی نہ ہو جیسا آپ اس کو سمجھ رہی ہیں۔"

تالیہ نے بس ایک نظر اسے دیکھا اور زخمی سا مسکرائی۔ "تم بھی سمجھتے ہو کہ تالیہ پیرانائڈ ہے؟"

"اچھا چھوڑیں..." ایڈم نے گھڑی دیکھی اور سامنے اسٹریٹ میں بنی فاتح کی رہائش گاہ کو دیکھا۔ "اندر کتنا وقت لگے گا آپ کو؟"

"ایک دستخط کروانے میں کتنا وقت لگ سکتا ہے؟"

"شاید ایک لمحہ۔ شاید پانچ سو ستاون برس۔"

ایڈم نے گہری سانس لے کر کندھے اچکائے۔ سیٹ بیلٹ کھولی اور ڈرائیونگ سیٹ پیچھے کر کے ٹیک لگالی۔ اسے تالیہ کی واپسی کا انتظار کرنا تھا۔

چند منٹ بعد... سیکیورٹی کے مراحل سے گزار کے بٹلر اسے گھر کے اندر لے آیا۔ وہ گردن سیدھی رکھے اس کے عقب میں چلتی رہی۔

"داتو سری اسٹڈی میں ہیں۔" بٹلر نے راستے

میں بتایا تھا۔

ہاتھ میں پکڑے فولڈر پہ اس کے ہاتھوں کی گرفت نرم ہوگئی۔ یہ مرحلہ مشکل نہیں تھا۔ اسٹڈی میں جانا... فاتح سے ایک کاغذ پہ سائن لینا.... مشکل کچھ نہ تھا۔ بس تکلیف دہ تھا۔ اور تکلیف ابھی سے ہونا شروع ہوگئی تھی۔

راہداری کے دوسری طرف سے بیٹا آتی دکھائی دی۔ تالیہ رک گئی۔ بٹلر بھی رک گیا۔ بیٹا ایک لمحے کو ہچکچائی پھر قریب آئی۔ اس کے ہاتھ میں دو خالی شاپنگ بیگز تھے۔

"بے تالیہ.... ایک بات کر سکتی ہوں آپ سے؟" وہ اسے دیکھ کے سادگی سے گویا ہوئی۔ (بٹلر ہاتھ باندھے چند قدم پیچھے کھڑا ہو گیا۔) "میں نے ملازموں سے سنا کہ آپ آ رہی ہیں تو یہاں سے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں اپنا سامان پیک کر رہی ہوں۔ میری وجہ سے آپ لوگوں کی زندگی میں جھگڑا ہو میں یہ نہیں چاہتی۔"

تالیہ خاموشی سے اسے دیکھے گئی۔ وہ اسی انداز میں کہے جا رہی تھی۔

"آپ مجھے غلط سمجھتی ہیں لیکن بے فکر رہیے۔ میں کسی غلط ارادے سے اس گھر میں نہیں آئی تھی۔ داتو سری میرے لیے قابل احترام ہیں۔ انہوں نے مجھے اس گھر میں جگہ دی۔ برے وقت میں ساتھ دیا۔ یہ بہت ہے۔ میں ایک سنگل مدر ہوں بے تالیہ۔ میں اپنے ایکس ہزبینڈ کی ہراسمنٹ کا شکار ہوں۔ میں مردوں کی دنیا میں کام کرنے والی عورت ہوں۔ مجھے ہر جگہ غلط سمجھا جائے گا جانتی ہوں۔ لیکن میری زندگی میں پہلے ہی بہت مسئلے ہیں۔ میں ان میں مزید اضافہ نہیں چاہتی۔" وہ تھکی تھکی لگ رہی تھی۔

دونوں کے درمیان خاموشی چھا گئی۔

"آپ کہاں جائیں گی؟" پھر تالیہ نے قدرے ٹھہرے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"اپنی فرینڈ کے گھر۔" پھر اس نے گہری سانس لی اور ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "میں جانتی ہوں آپ یہ پیپرز کیوں لائی ہیں۔ بچوں نے ذکر کیا تھا۔ میرا معاملہ نہیں ہے اس لیے مجھے کہنا نہیں چاہیے لیکن میں بھی ایک عورت ہوں۔ آپ کا چہرہ پڑھ سکتی ہوں۔ آپ ڈسٹرب ہیں۔ یہ کر کے (کاغذ کی طرف اشارہ کیا) آپ خوش نہیں رہیں گی۔ اس لیے ایسا کچھ مت کریں جو آپ کو تکلیف دے۔ اپنے فیصلے پہ غور کریں۔ اس گھر میں آپ کے لیے جگہ ہے اگر آپ چاہیں۔" نرمی سے کہا۔ اور آگے بڑھ گئی۔

تالیہ نے کچھ نہیں کہا۔ بس بٹلر کو اشارہ کیا۔ وہ اسے اسٹڈی کی سمت میں لے گیا۔

جب بٹلر نے اسٹڈی کا دروازہ کھولا تو سامنے فاتح اپنی کرسی پہ بیٹھا تھا۔ دروازہ پورا کھل گیا تو جہاں کتابوں کے ریکس نمایاں ہوئے وہیں تالیہ نے دیکھا' سکندر اور جولیانہ وہیں بیٹھے تھے۔ تالیہ کو دیکھ کے دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ہم جائیں ڈیڈ؟"

"ہاں۔"

"نہیں۔" دونوں ایک ساتھ بولے۔ فاتح نے سوالیہ نظروں سے تالیہ کو دیکھا جو انہیں جانے سے منع کر رہی تھی۔ ان دونوں نے بے اختیار باپ کو دیکھا۔

"میں زیادہ وقت نہیں لوں گی۔" وہ آگے آئی اور فولڈر ان کی میز پہ رکھا۔ فاتح نے ایک نظر فولڈر کو دیکھا اور دوسری سنجیدہ نظر اس پہ ڈالی۔

"آپ یہ سائن کر دیں تو میں جاؤں۔"

جولیانہ نے سکندر کو دیکھا۔ (ہمیں یہاں سے چلے جانا چاہیے۔)

سکندر نے اشارہ کیا۔ (خیر ہے... کھڑی رہو۔)

اسٹڈی میں بالکل سناٹا چھا گیا۔

اپنی کرسی پہ بیٹھے فاتح نے فولڈر اٹھا کے کھولا۔ سپاٹ چہرے سے اس پہ لکھی عبارت پڑھی۔ تالیہ سامنے کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ بھی سپاٹ تھا۔ فاتح

نے چہرہ اٹھا کے اسے زخمی نظروں سے دیکھا۔
"میں سائن کر کے تمہیں بھجوا دوں گا۔" اس نے فولڈر بند کر دیا۔

تالیہ کا دل اندر ہی اندر کٹ کے رہ گیا۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ وہ اسے ابھی اسی وقت کاغذ سائن کر کے دے ڈالے۔ لیکن وہ یہ نہیں کہنا چاہتی تھی۔ اس نے تائیدی انداز میں سر کو خم دیا۔

"شیور۔ میں انتظار کروں گی۔" اب وہ مڑنا چاہتی تھی اور یہاں سے چلے جانا چاہتی تھی۔ وہ بہت کچھ چاہتی تھی لیکن معلوم نہیں کیوں وہ چند لمحے مزید کھڑی رہی۔ وہ اپنی کرسی پہ بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظروں میں استفہام تھا۔

"کچھ اور؟" اس کے انداز میں گلہ تھا۔

"ویل۔" تالیہ نے سنجیدہ چہرہ سکندر اور جولیانہ کی طرف موڑا جو اسے ان ہی اجنبی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"آپ کو اب تک یقین آجانا چاہیے کہ میں نے عصرہ کا قتل نہیں کیا تھا۔ اور نہ ہی میں کوئی گولڈ ڈگر ہوں۔ میری اگلے ہفتے فلائٹ ہے اور میں یہاں سے جا رہی ہوں۔ ہمارے راستے اب ایک دوسرے کو نہیں کاٹیں گے۔ امید ہے میں نے اپنے اوپر لگے تمام الزام دھو ڈالے ہیں۔" وہ پرس لیے مڑی تو جولیانہ بولی۔

"اور جو الزام آپ نے دوسروں پہ لگائے؟ ان کا کیا؟"

تالیہ بہت ضبط سے واپس پلٹی۔ فاتح نے اکتا کے ہاتھ اٹھایا۔

"اس قصے کو اب ختم کرو، جولی۔"

"کیوں؟ کیا انہیں معذرت نہیں کرنی چاہیے؟ انہوں نے میری ٹیچر کو فراڈ ثابت کرنے کی کوشش کی۔"

وہ ترخ کے بولی۔

تالیہ نے تعجب سے اسے دیکھا۔ "میں نے اس عورت کو کچھ ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی۔"

"کیا آپ نے نہیں کہا تھا کہ وہ فراڈ ہیں؟"

"صرف کہا تھا۔ ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ تب کرتی جب آپ میری کبھی بات پہ اعتبار کرتے۔ لیکن چونکہ آپ اس کے ساتھ خوش ہیں تو میں اس معاملے میں دخل نہیں دینا چاہتی۔" وہ ہیٹ سر پہ ٹھیک سے جماتی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ جولیانہ نے استہزائیہ انداز میں سر جھٹکا۔ ابھی اس کا ہاتھ ڈورناب پہ تھا جب فاتح نے اسے پکارا۔

"ایک منٹ۔"

وہ پیچھے نہیں مڑنا چاہتی تھی۔ پیچھے مڑنے والے نمک کے مجسمے بن جاتے ہیں اور ان مجسموں کو آنسو گھول کے بہا دیتے ہیں۔ اسے بس یہاں سے نکلنا تھا۔

"یعنی تم پیٹا کو فراڈ ثابت کر سکتی ہو؟" وہ تعجب سے بولا۔ تالیہ نے گہری سانس لی اور واپس پلٹی۔

"ظاہر ہے، فاتح۔ میری ایک عمر گزری ہے اصل اور نقل پینٹنگ کا فرق معلوم کرنے میں۔"

"اچھا۔ کیسے؟" فاتح نے پیچھے ٹیک لگا کے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ تھوڑی دیر کے لیے وہ جیسے سارے اختلافات بھول گیا تھا۔ یا بھولنا چاہتا تھا۔

"پلیز ہے تالیہ....." جولیانہ کوفت سے بولی۔ "میری ٹیچر کی فوٹوگرافز نقل نہیں ہیں۔"

تالیہ نے افسوس سے جولیانہ کو دیکھا اور گردن دائیں بائیں ہلائی۔ "اونہوں۔ میں اصلی پینٹنگ ہوں۔ وہ نقلی ہے۔"

"ڈیڈ..... آپ اس خاتون کو کیوں سن رہے ہیں؟ مسز پیٹا کی سکیورٹی کلیئرنس....."

مگر فاتح نے سکندر کو ہاتھ اٹھا کے خاموش کروا دیا۔

"میں سن رہا ہوں۔" تالیہ کو بات جاری رکھنے کا اشارہ کیا۔

تالیہ ہلکا سا مسکرائی۔ "اسے بلا کے پوچھیں کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔" وہ رکی۔ "وہ سیدھی کہاں جا رہی ہے۔ اور اس کے جواب میں اپنا جواب

ڈھونڈیں۔"
فاتح نے انٹرکام اٹھایا اور ییشا کو بلانے کا کہا۔ اس کی نگاہیں ابھی تک تالیہ پہ جمی تھیں۔

چند لمحے بعد دروازے پہ دستک ہوئی اور ییشا اندر داخل ہوئی۔ اس کا ہینڈ بیگ کندھے پہ تھا اور اس نے سفید ہیٹ پہن رکھا تھا۔ ایک نظر سب کے منتظر چہروں کو دیکھا۔ تالیہ پیچھے بک شیلف سے ٹیک لگائے کھڑی ابھی تک فاتح کو دیکھ رہی تھی۔

"ییشا... آپ کی تیاری مکمل ہوگئی؟ میں نے سنا ہے کہ آپ جا رہی ہیں؟" فاتح نے نارمل انداز میں پوچھا۔ جواباً وہ سادگی سے مسکرادی۔

"جی داتو سری۔ میں بس نکلنے ہی والی ہوں۔"

"آپ کہاں جائیں گی؟"

"اپنی فرینڈ کی طرف۔"

"سیدھی وہیں جائیں گی؟ میرا مطلب ہے کہیں اور تو نہیں جائیں گی؟"

"جی نہیں۔" ییشا نے گہری سانس اندر کھینچی۔ "میرا ایکس ہزبینڈ ابھی تک مفرور ہے۔ اس لیے بے فکر رہیں۔ میں سیدھی اپنی فرینڈ کی طرف جاؤں گی اور وہیں رہوں گی۔"

تالیہ ابھی تک فاتح کو دیکھ رہی تھی۔ اس جواب پہ مسکرائی اور ابرو اٹھایا۔ "کیا میں نے ثابت نہیں کر دیا اصلی اور نقلی پینٹنگ کا فرق؟"

ییشا نے ناسمجھی سے اسے دیکھا اور پھر فاتح کو۔ تالیہ نے اپنا بیگ اٹھایا اور ہیٹ کو دو انگلیوں سے ماتھے پہ مزید جھکاتے ہوئے مسکرا کے باہر نکل گئی۔ وہ اب اس سے زیادہ یہاں نہیں ٹھہر سکتی تھی۔

"میں جاؤں داتو سری؟" ییشا نے اجازت چاہی۔

"ییشا... آپ کو معلوم ہے اصلی اور نقلی پینٹنگ کا فرق کیسے معلوم کیا جاتا ہے؟" فاتح نے اس پہ نگاہیں مرکوز کیے کہا۔ وہ اپنی کرسی پہ بیٹھا تھا اور ییشا دروازے کی چوکھٹ پہ کھڑی تھی۔ "اس ایک چیز سے جو اصلی پینٹنگ میں نہیں تھی اور اسے نقلی پینٹر نے اپنی پینٹنگ میں ڈال دیا۔ آپ کی اور تالیہ کی کہانی میں ایک چیز کا فرق ہے۔"

"میں سمجھی نہیں۔" اس نے اچنبھے سے فاتح کو دیکھا۔

"آپ کی ایک بیٹی بھی ہے۔" وہ بالکل اجنبی لہجے میں کہتے ہوئے اٹھا۔ "اور ایک ماں کی پہلی instinct (فطرت) اپنے بچے کی حفاظت ہوتی ہے۔ آپ نے کہا تھا کہ آپ کی دوست کا فارم ہاؤس شہر سے دور ہے۔ لیکن آپ سیدھی وہاں جا رہی ہیں۔ ایمی کو اسکول سے پک کیے بغیر۔" وہ دروازے کی طرف آیا۔ ییشا کا ہاتھ ڈور ناب پہ تھا۔ فاتح نے نرمی سے اس کا ہاتھ وہاں سے ہٹایا اور دروازہ بند کیا۔

"سکندر... باہر جاؤ اور سکیورٹی ٹیم کو بلاؤ۔ ان سے کہو باہر انتظار کریں۔ اور تم ییشا... تم یہاں بیٹھو اور مجھے بتاؤ کہ تم کون ہو۔" اس نے سنجیدگی سے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

ییشا چند لمحے بالکل ساکت سی اسے دیکھتی رہی۔ پھر ایک دم وہ ہنس پڑی۔

"دو سال لگے آپ کو مجھے پکڑنے میں۔ ناٹ بیڈ۔" اس نے مسکرا کے ہیٹ اتارا اور آرام سے سامنے رکھے صوفے کی طرف بڑھ گئی۔ پھر اس پہ بیٹھی، ٹانگ پہ ٹانگ جمائی اور کہنی صوفے کے ہتھے پہ رکھے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

"ذوالکفلی ٹھیک کہتا تھا۔ تالیہ آپ کی زندگی میں واپس آگئی ہے اور صرف وہی مجھے پکڑ سکتی ہے۔ مجھے پہلے نکل جانا چاہیے تھا لیکن اٹس او کے۔" مسکرا کے شانے اچکائے۔ "تو ریگریٹس"

اسٹڈی میں ششدر سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ سکندر تو ہکا بکا تھا ہی... لیکن جولیانہ... اس کی رنگت فق ہوگئی تھی۔

"میم... آپ مذاق..."

"پلیز شٹ اپ جولیانہ۔" ییشا نے فاتح کو دیکھتے ہوئے دایاں ہاتھ جھلا کے اشارہ کیا۔ "تم

"بہت اٹو انگ اور بہت اسپوائلڈ ہو۔"

علیشا کا لہجہ اب وہ نرم مہذب لہجہ نہیں رہا تھا جسے سننے کا وہ عادی تھا۔ بلکہ کے ایل کی تاریک گلیوں میں سلینگ بولنے والے نوجوانوں جیسا ہو گیا تھا۔

فاتح نے سکندر کو اشارہ کیا۔ وہ تیزی سے دروازے سے باہر نکل گیا۔ فاتح نے میز پہ رکھا فون اٹھایا اور سختی سے بولا۔

"مسز علیشا اندر میرے ساتھ ہیں۔ سکیورٹی سے کہہ دو وہ باہر نہیں جائیں گی۔ ایک اور سکیورٹی ٹیم کو میری اسٹڈی کے باہر تعینات کر دو۔ میں مسز علیشا سے چند باتیں کہہ لوں' پھر تم ان کو لے جا سکتے ہو۔"

فون رکھ کے جولیانہ کو دیکھا جو پلکیں تک نہیں جھپک پا رہی تھی۔ آنسو اس کی آنکھوں میں تیر رہے تھے۔

"جولی...تم جاؤ۔"

"ہاں' جولی.... پلیز تم جاؤ۔ داتو سری ویسے بھی مجھے دس منٹ سے زیادہ یہاں نہیں روک سکیں گے۔" وہ جو اطمینان سے بیٹھی تھی' اسی انداز میں بولی۔ اس کا اعتماد.... اس کی بے خوفی.... فاتح نے جولیانہ کو وہاں سے بھیجا... اور خود کرسی کھینچ کے اس کے سامنے بیٹھا۔

"تو تمہیں ذوالکفلی نے بھیجا ہے۔"

"آف کورس مجھے ذوالکفلی نے بھیجا ہے۔ کوئی اور مجھے دو سال کے لیے اتنا معاوضہ دے بھی نہیں سکتا۔"

"دو سال.... ایک طویل عرصہ ہے۔ تم صرف معاوضے کے لیے نہیں یہاں رہیں۔" وہ غور سے اس کی آنکھوں میں چھپی مسکراہٹ پڑھ رہا تھا۔ فاتح کا چہرہ ایسا کرتے ہوئے بالکل سپاٹ تھا۔ اندر اٹھتے طوفانوں کو اندر دبائے وہ بظاہر بالکل پرسکون تھا۔

"یہ ایک بہترین کور تھا۔ شہر کے امراء تک رسائی۔ اسٹوڈنٹس کے گھروں میں نقب لگانا۔ طاقتور لوگوں کے اہم راز ان کے بچوں کی زبانی سننا۔ ٹیچر اور ڈاکٹر کو لوگ سب بتا دیتے ہیں۔ اور انفارمیشن کی قیمت ہوتی ہے۔"

"تمہارے آئی ڈی کارڈز... پاسپورٹ... کسی چیز پہ بھی کوئی ریڈ فلیگ نہیں تھا۔"

"کیونکہ میرے پاس اونچے عہدوں والے دوست ہیں' داتو سری۔ کیونکہ میں اپنے کام میں اچھی ہوں۔ تالیہ مراد سے بہت بہتر۔ شاید بیسٹ۔" وہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھے پاؤں جھلا رہی تھی۔

"اور تم نے میری بیٹی کو استعمال کیا؟"

"نہ صرف آپ کی بیٹی کو بلکہ اس کی سائیکولوجسٹ کو جس کے پاس اس کی تھراپی ہو رہی تھی۔ اس کی کیس فائلز سے یہ معلوم کرنا کہ آپ کو ہوم ٹیوٹر کی تلاش ہے' یا جولیانہ کو کس طرح کی ٹیچر چاہیے' بہت آسان تھا۔ میں امیدواروں کی قطار میں داخل ہو گئی اور آپ نے مجھے خود چنا۔ ایسے جیسے یہ آپ کا اپنا آئیڈیا ہو۔"

اسٹڈی میں وہ دونوں تھے اور خاموش کتابیں تھیں۔ وہ کسی سانپ کی طرح دھیمی آواز میں بول رہی تھی۔ نظریں فاتح کی آنکھوں سے ہٹائے بغیر۔ اس کے چہرے پہ ایک عجب تمسخر تھا جس کو وہ کوئی نام نہیں دے پا رہا تھا۔

"اور ایلی؟ وہ تمہاری بیٹی نہیں ہے؟"

"ہاں۔ وہ بھی ذوالکفلی کی ایک اسٹوڈنٹ ہے۔ لیکن اس کی فکر مت کریں۔ اس کو اسکول سے کسی نے پک کر لیا ہوگا۔ وہ اپنا خیال خود رکھ سکتی ہے۔" اس نے کندھے اچکائے۔ "اور پھر؟"

"تم ہم سے تالیہ کے بارے میں ہمیشہ اچھی باتیں کیا کرتی تھی۔"

"ڈونٹ یو انڈرسٹینڈ' داتو سری؟ وہ ایک رول تھا۔ علیشا تاج۔ ایک اچھی ٹیچر۔ کون آرٹسٹ پورے آرٹسٹ ہوتے ہیں۔" وہ جوش سے کہنے لگی۔ "وہ ایک کردار تخلیق کرتے ہیں اور اسے آخر تک نبھاتے ہیں۔"

"جب تالیہ نے تم پہ شک کا اظہار کیا تو تم بھاگیں کیوں نہیں؟" وہ سوچتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔

"کیونکہ مجھے ذوالکفل نے تالیہ کی جگہ لینے بھیجا تھا یار۔ میں نے آخری حد تک کوشش کرلی تھی۔ لیکن آج مجھے احساس ہوا کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ میں بھاگ ہی رہی تھی۔ لیکن پھر آپ نے مجھے پکڑ لیا۔ کپل۔" اس نے شانے اچکائے۔ اس کے انداز میں کچھ عجیب سا تھا۔ وہ بالکل پرسکون اور پراعتماد تھی۔

"کتنے افسوس کی بات ہے۔ میں نے اور میری بیٹی نے تم پہ اعتماد کیا۔ تمہیں گھر میں جگہ دی۔ اور تم سارا وقت ہمارے ساتھ جھوٹ بولتی آئیں؟ مجھے تمہارے لیے افسوس ہے ییشا۔ تم اپنی زندگی میں جھوٹے رشتوں کے سوا کچھ نہیں پاؤ گی۔"

"اور آپ جیسے سچ بولنے والوں کی زندگی میں کیا ہے؟ یہ اونچا محل؟ خالی دیواریں؟ اپنی کرسی کو بچانے کی فکر؟ ہونہہ۔" وہ مسکرا کے اٹھی۔ "میں جاؤں؟"

"اور تمہیں کیوں لگا کہ میں تمہیں جیل بھیجنے کے بجائے یہاں سے جانے دوں گا۔"

"لوہ آپ مجھے ابھی بہت عزت سے رخصت کرنے والے ہیں' داتو سری۔" وہ مسکرا کے بولی۔ "کیونکہ میرے پاس ایک انشورنس پالیسی ہے۔"

"انٹرسٹنگ۔ کیا ہے وہ پالیسی؟"

"میں ذوالکفل کے اس کام کے لیے اس لیے راضی ہوئی تھی کیونکہ اس نے مجھے بچ نکلنے کا راستہ دکھا دیا تھا۔" وہ صوفے پہ آگے کو ہوئی اور اس کی طرف جھکی۔ "میری انشورنس پالیسی ہے تالیہ مراد۔"

فاتح نے چبھتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ مسکرا کے کہہ رہی تھی۔

"تالیہ نے بہت سے جرائم ذوالکفل کے ساتھ مل کے کیے ہیں۔ اس کے پاس ان کے ثبوت ہیں۔"

"وہ ان جرائم کے لیے معافی نامہ حاصل کرچکی ہے۔"

"ہاں تو میں کب کہہ رہی ہوں کہ میں ان ثبوتوں کو پولیس کے حوالے کردوں گی؟ اونہوں۔"

ییشا نے دائیں سے بائیں گردن ہلائی۔ "اگر آج میں صحیح سلامت یہاں سے نہ نکلی تو ذوالکفل ان ساری چیزوں کو منظر عام پہ لے آئے گا۔ انٹرنیٹ کی دنیا کریزی ہوتی ہے داتو سری۔ وہاں پہ سیشن ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ تالیہ مراد کے جرائم کا پنڈورا باکس کھل جائے گا۔ ابھی تو بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ تالیہ ایک کون آرٹسٹ تھی۔ اس کا معافی نامہ بھی صوفیہ رحمن نے سیل کروا دیا تھا کوئی اسے کھول بھی نہیں سکتا۔ لیکن... اگر میری زبان کھل گئی تو..." اس کی آواز ہلکی ہوگئی۔ وہ بنا پلک جھپکے فاتح کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔

"تو سارا ملک جان جائے گا۔ سارا ملک یہ بھی پوچھے گا کہ صوفیہ رحمن نے کیسے ایک مجرم کو معاف کردیا۔ تالیہ مراد ابھی ابھی ایک الزام سے نکلی ہے۔ وہ اگلی صبح کا سورج طلوع ہونے سے پہلے ایسے کئی اسکینڈلز میں گھر جائے گی۔ جن لوگوں کی چیزیں اس نے چرائی تھیں یا ان کو لوٹا تھا' وہ بدلہ لینے نکل آئیں گے۔ اس دفعہ تالیہ پہ لگنے والے الزامات سچے ہوں گے۔ اب آپ بتائیں داتو سری... آپ مجھے یہاں روکیں گے یا عزت سے جانے دیں گے؟"

یہ وہ ییشا نہیں تھی جسے وہ اتنے عرصے سے جانتا تھا۔ یہ چمکتی آنکھوں اور عامیانہ لہجے میں بولنے والی عورت کوئی اور تھی۔

فاتح خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ییشا کی آنکھوں پہ جمی تھیں۔

"گھڑی کی سوئیاں آپ کا وقت کم کر رہی ہیں۔ مجھے گیارہ بجے سے پہلے اس گھر سے باہر ہونا چاہیے۔ ورنہ تالیہ کے ساتھ بہت برا ہوگا۔ کیا آپ اس کی عزت سے زندگی گزارنے کی خواہش پوری نہیں ہونے دیں گے؟"

وان فاتح نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی اور ییشا کو معلوم تھا وہ جیت چکی ہے۔

"تم یہاں سے خالی ہاتھ جاؤ گی۔ تم اپنا سامان' اپنی چیزیں' سب یہاں چھوڑ کے جاؤ گی اور دوبارہ

میرے گھر یا میرے بچوں کے قریب بھی نہیں آؤ گی۔اور تم کبھی بھی تالیہ کو ہرٹ کرنے کی کوشش نہیں کرو گی۔"

"اچھا.....وی ہیو اے...یں۔" یشا نے مسکرا کے دونوں ہاتھ اٹھائے۔

کچھ دیر بعد یشا تاج اس گھر کے گیٹ سے باہر نکل رہی تھی۔جولیانہ اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی اور سکندر...وہ اسٹڈی کے ایک کونے سے دوسرے کا چکر کاٹتے ہوئے غصے سے کہہ رہا تھا۔

"ڈیڈ.....وہ عورت...وہ فراڈ تھی...آپ اس کو کیسے جانے دے سکتے ہیں؟" وہ بار بار پیشانی چھوتا تھا۔رنگت سرخ پڑ رہی تھی۔

"ہم اس کو روک نہیں سکتے تھے۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔اس کے چہرے پہ ڈھیروں ملال تھا۔

"وہ آپ کو نقصان پہنچائے گی۔ڈیڈ میں آپ کو بتا رہا ہوں.....یہ یہاں سے جا کے بھی کچھ ایسا ضرور کرے گی جس سے آپ کو نقصان ہو۔"

فاتح سوگواریت سے مسکرایا اور کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

"تمہیں لگتا ہے میں یہ بات نہیں جانتا؟" اور دروازے سے باہر نکل گیا۔سکندر بے بسی سے اسے دیکھتا رہ گیا۔وہ اب پورے گھر میں جولیانہ کو آوازیں دے رہا تھا۔جولیانہ کو اس صدمے سے نکلنے میں اب ایک لمبا عرصہ لگنا تھا' وہ جانتا تھا۔

وہ فولادراس کی اسٹڈی ٹیبل پہ دکھارہ گیا۔

☆☆☆

"کیا انہوں نے دستخط کیے؟" تالیہ جب واپس کار میں آئی تو ایڈم نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"نہیں لیکن ان کو یشا کی حقیقت جلد معلوم ہونے والی ہے۔" وہ کچھ مضمحل سی لگ رہی تھی۔ساری تفصیل سن کے ایڈم نے بے اختیار ماتھے کو چھوا۔

"یعنی ثابت ہوا...تالیہ مراد کے اندازے غلط نہیں ہوتے۔" پھر اس نے جھرجھری لی۔"آپ چلی کیوں آئیں؟وہاں رہ کے یشا کے تاثرات کیوں نہیں دیکھے؟"

"میں فاتح کو افسردہ نہیں دیکھنا چاہتی تھی' ایڈم۔" وہ پر ملال لگ رہی تھی۔ایڈم نے کار سڑک پہ ڈال دی تھی اور اب ڈرائیو کرتے ہوئے گاہے بگاہے اس کو دیکھ رہا تھا جو پریشان سی کھڑکی کی طرف چہرہ موڑے ہوئے تھی۔

"ایک بات مجھے سمجھ نہیں آئی۔" تھوڑی دیر بعد تالیہ نے اپنے خدشے کو زبان دی۔"یشا وہاں رکی کیوں رہی؟جب میں نے اس سے تیز تیز سوال پوچھے تھے...اس روز ڈنر پہ...تو اس کا کور خراب ہو چکا تھا۔اسے وہاں سے بھاگ جانا چاہیے تھا۔اس نے اتنے دن انتظار کیوں کیا؟"

"کیونکہ وان فاتح اس پہ ابھی تک بھروسہ کیے ہوئے تھے۔"

"نہیں' ایڈم۔وہ عورت ان کو نقصان پہنچائے گی۔"

"تو آپ کو فکر کیوں ہے؟آپ تو ویسے بھی ان کو چھوڑ کے جا رہی ہیں۔اب آپ یہاں نہیں ہوں گی تو بھلے کوئی بھی ان کو نقصان پہنچائے۔آپ کو کیا؟"

تالیہ کے ماتھے پہ شکنیں پڑیں۔اس نے ناگواری سے ڈرائیو کرتے ہوئے ایڈم کو دیکھا۔

"میں نے صرف دایاں ہاتھ کٹوانے کی بات کی تھی یا زبان کی بھی؟"

ایڈم نے افسوس سے اسے دیکھ کے سر جھٹکا۔

"دنیا ادھر سے ادھر ہو گئی' لیکن شہزادی تاشہ کی رعونت نہیں گئی۔"

"جائے گی بھی نہیں۔" وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔جو بھی تھا' وہ اب اس بارے میں نہیں سوچے گی۔وہ ہر ایک کو بچانے کی ٹھیکیدار نہیں کرے گی۔بس۔

☆☆☆

ملاکہ شہر میں سلطنت محل اب ایک میوزیم بن

چکا تھا۔ یہ وہ سلطنت محل نہیں تھا جس میں ایک زمانے میں شہزادی تاشہ داخل ہوئی تھی۔ مراد راجہ کی موت کے چند سال بعد پرتگالی ملاکہ پہ قابض ہوئے اور اس محل کو جلا کے راکھ کر دیا۔ صدیوں بعد پرانے نقشے دریافت ہوئے اور ان کتابوں کی مدد سے ہو بہو ویسا ہی محل تعمیر کیا گیا۔

لکڑی کا یہ خوب صورت محل گو کہ وہی تھا لیکن... یہ وہ نہیں تھا۔ وہ ایسے بدل چکا تھا جیسے انسان بدل جاتے ہیں۔ ڈھانچہ وہی رہتا ہے۔ نقش وہی ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا دل بدل جاتا ہے۔ پرانا جل کے راکھ ہو جاتا ہے اور جو نیا دل اس کی جگہ لیتا ہے اس میں گوشت کم اور پتھر زیادہ ہوتے ہیں۔

اس محل کو دیکھنے سیاح دن رات دور دور سے آتے تھے۔ انسٹا ورڈی فوٹوز کھنچواتے' وہاں درج تحریریں پڑھتے' ہنستے بولتے کھاتے پیتے وہاں سے رخصت ہو جاتے۔

کچھ البتہ پچھلی طرف بنے احاطے میں بھی جاتے تھے جہاں گزشتہ سلاطین کی قبریں موجود تھیں۔ پتھریلی کتبوں والی یہ قبریں پرتگالیوں کی آگ سے محفوظ رہ گئی تھیں۔ وہاں تین چار قطاریں بنی تھیں اور اپنے وقت کے طاقت ور ترین حکمران ایک ہی صف میں ابدی نیند سو رہے تھے۔

ان قبروں کی وسطی قطار میں تالیہ مراد موجود تھی۔ سر پہ سیاہ اسکارف اوڑھے' دعا کے انداز میں ہاتھ باہم ملائے ایک قبر کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کی گلابی آنکھیں کتبے پہ جمی تھیں۔

"سلطان مراد راجہ!"

آنکھ سے آنسو گرا اور گال پہ بہہ گیا۔ اس نے اپنے لمبے سیاہ کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور وہ قدیم طرز کا لفافہ نکالا۔ لفافے کے اندر سے خط نکالا اور وہ تحریر پھر سے پڑھنے لگی۔

اس کا باپ مر چکا تھا۔ اس کی قبر سامنے تھی۔

لیکن کسی اور دنیا میں اس کا باپ زندہ تھا۔ اور وہ اس کا انتظار کر رہا تھا۔

اس نے بھیگی آنکھیں بند کیں۔ گرم آنسو گال پہ لڑھکنے لگے۔ اس نے قبر پہ ہاتھ پھیرا۔

"میرے آپ سے سارے گلے دور ہو چکے ہیں بابا۔ لیکن میں اب واپس نہیں جا سکتی۔ کیونکہ میں نے آپ کو ہر صورت موت کے ہاتھوں کھو دینا ہے۔ وہ میری دنیا نہیں ہے۔ یہ میری دنیا ہے۔ تالیہ نے زندگی میں بہت سے غلط فیصلے کیے ہیں۔ اب بھی شاید کر رہی ہے۔ لیکن بابا...... میں اپنی دنیا نہیں چھوڑ سکتی۔ میری دعا ہے کہ آپ اپنی موت سے پہلے مجھے معاف کر دیں۔ میں نے آپ کا دل دکھایا تھا لیکن میں خود بھی دکھی ہوں۔"

وہ زیر لب بڑبڑا رہی تھی۔ آنسو تھوڑی سے نیچے گردن پہ ٹپک رہے تھے۔

اس احاطے کے باہر ایڈم اور داتن منتظر سے کھڑے اسے دیکھ رہے تھے۔ تالیہ کی ان کی جانب پشت تھی۔ دور سے وہ بس سر جھکائے کھڑی نظر آ رہی تھی۔

وہ دونوں ایک درخت کے ساتھ کھڑے اس کے منتظر تھے۔ دونوں خاموش تھے۔ دونوں اداس تھے۔

پھر داتن کھنکھاری۔ "تالیہ واپس جانے کا تو نہیں سوچے گی؟"

"یہ ناممکن ہے' داتن۔ وہ اپنے بابا کے خط کے بعد سے گلٹی ضرور ہیں لیکن بے وقوف نہیں ہیں۔"

دونوں کے درمیان خاموشی کا وقفہ آ گیا۔ پھر داتن گویا ہوئی۔

"وہ فاتح کو چھوڑ رہی ہے۔ تم جانتے ہو۔ پھر بھی تم نے اس سے اب تک بات کیوں نہیں کی؟"

ایڈم نے سن گلاسز اتارے اور مسکرا کے داتن کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں زمانے بھر کی اداسی تھی۔

"پہلے مجھے ڈر تھا کہ وہ میرا انتخاب نہیں کریں گی۔ لیکن اب بات انتخاب سے آگے نکل چکی ہے۔ یہ جو دل ہوتا ہے نا' اس میں ایک وقت میں ایک شخص سما سکتا ہے اور جب تک وہ نہ نکلے کسی دوسرے کو اس

میں داخل ہونے کی خواہش نہیں کرنی چاہیے۔"

"کیا تم اس کے دل سے فاتح کے نکلنے کا انتظار کرو گے؟"

"نہیں داتن۔ جس کے محبوب کے دل میں کوئی اور ہو اور وہ پھر بھی اس کو پانے کے لیے جتن کرتا رہے ایسا شخص ہمیشہ مغموم رہتا ہے۔ محبوب کے لیے دودھ کی نہر کھودنا یا زہر کھانا آسان ہوتا ہے۔ جانتی ہو مشکل کیا ہوتا ہے؟"

ایڈم اس کی طرف گھوما۔ وہ سرما کی دھوپ میں کھڑا تھا اور داتن چھاؤں میں۔ دھوپ اور سائے میں تین قدموں کا فاصلہ تھا۔ داتن نے ماتھے پہ ہاتھ کا چھجا بنا کے اسے دیکھا جس کے ارد گرد سے روشنی کی تیز شعاعیں نکل رہی تھیں۔

"کیا مشکل ہوتا ہے؟"

"اس کی محبت سے موو آن کر کے آگے بڑھ جانا۔ کسی کو ان لو نہیں کیا جا سکتا میں مانتا ہوں۔ لیکن اپنے دل کو اس کی خواہش سے خالی کیا جا سکتا ہے۔"

"نہیں کیا جا سکتا۔"

"مگر میں کرنے کی کوشش کروں گا۔ کیونکہ جب دو لوگ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہوں تو کسی تیسرے کو ان کے درمیان کی لکیر نہیں بننا چاہیے۔ ایڈم بن محمد میں اتنی سیلف اسٹیم ہے کہ وہ ٹھکرائے جانے کا انتظار کیے بغیر ہی اس تکون سے الگ ہو جائے۔ میں ان سے کچھ نہیں کہوں گا داتن۔ کیونکہ اب میں خود سے بھی محبت کرتا ہوں۔ اور اگر میں ان کے درمیان میں آیا تو ایڈم کو ایڈم بھی معاف نہیں کر سکے گا۔"

سیاہ لباس والی تالیہ اب قبروں کی قطار سے نکل کے ان کی طرف آ رہی تھی۔ وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ وہ خط تہہ کرتے ہوئے آنکھیں رگڑتی احاطے سے باہر نکلی۔ ان کے پاس پہنچنے تک اس کی آنکھیں خشک ہو چکی تھیں۔ وہ خط کو پرس میں ڈالنے لگی کہ داتن نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"کیا میں اس کا لفافہ رکھ سکتی ہوں؟ یہ اینٹیک ہے اور میرے کام آئے گا۔"

"نہیں۔" تالیہ نے سختی سے کہا اور خط اندر پرس میں ڈال دیا۔ "یہ میرے پاس میرے بابا کی آخری نشانی ہے۔"

داتن نے خفت سے کندھے اچکائے۔

"او کے۔ او کے۔ سوری۔" پھر گھڑی دیکھی۔ "کہیں چل کے کھانا کھاتے ہیں۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" وہ مغموم سے انداز میں بولی۔ اس کی ناک ابھی تک سرخ پڑ رہی تھی۔

"تالیہ.... ہم تینوں آخری دفعہ ملاکہ ساتھ آ رہے ہیں۔ تم اگلے ہفتے ہمارا ملک چھوڑ کے چلی جاؤ گی۔ ہم پھر کب آسکیں گے بھلا؟ کم از کم آج کا دن یاد اس شکل نہ بناؤ اور اچھی یادیں لے کر جاؤ۔"

داتن قدرے خفگی سے بولی تو تالیہ جبراً مسکرائی اور اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بھی ایڈم کی طرح دھوپ میں کھڑی تھی۔

"اور یہ طے ہے کہ آپ اپنا ارادہ نہیں بدلیں گی؟" ایڈم نے بغور اسے دیکھا۔

"نہیں۔ میں مزید اس ملک میں نہیں رہنا چاہتی۔ مجھے یہاں سے دور جانا ہے۔"

"کہا نا... یہ کام نہیں کرتا۔" ایڈم نے ابرو اچکا کے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ وہ گہری سانس لے کر اس کے ساتھ ہو لی۔ داتن ایک قدم پیچھے تھی۔

"آج کے دن تم اپنا سارا وقت مجھے اور ایڈم کو دو گی تالیہ۔" داتن ساتھ چلتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "آج کے دن تم اپنی آزادی کو انجوائے کرو گی۔ اگر فاتح سے دور جانے کا فیصلہ کیا ہی ہے تو اس کو برداشت بھی کرو۔ آج ہم فاتح کے بارے میں کوئی بات نہیں کریں گے۔"

"شیور۔ کون فاتح؟" شہزادی نے شانے اچکا کے کہا اور گیلی سانس ناک سے اندر کھینچی۔

داتن مسکرا دی۔ ایڈم نے البتہ اپنی مسکراہٹ چھپالی تھی۔

چلتے چلتے تالیہ نے چہرہ اٹھا کے آسمان کو دیکھا

جہاں آج ایک روشن دن نکلا تھا۔ پھر اس نے آنکھیں بند کر کے گہری سانس لی۔

ہاں آج کے دن وہ نہ فاتح کی فکر کرے گی' نہ اس کے بارے میں سوچے گی۔ آج کا دن وہ اپنے رنگ میں رہے گی۔ وہ سیاہ ہے اور اسے کسی دوسرے کو بچانے کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔

وہ تینوں ایک ریسٹوران میں داخل ہوئے اور ایک میز کے گرد رکھی تین کرسیاں ایک ساتھ کھینچیں۔ پھر کرسیاں کھینچتے ہاتھ تینوں کے ایک ساتھ رکے۔

گردنیں اوپر ٹی وی اسکرین کی طرف اٹھیں۔

آنکھیں وہیں ساکت ہو گئیں۔ جیسے ریسٹوران میں دوسرے لوگوں کی ہو چکی تھیں۔

اسکرین پہ وان فاتح کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ اور ساتھ چلتی خبر سب کو ہکا بکا کر گئی تھی۔

"پردھان منتری ایک نئے مسئلے کا شکار۔"

اسکرین پہ نظر آتی نیوز کاسٹر سپاٹ چہرے اور روبوٹ مسکراہٹ کے ساتھ بتا رہی تھی۔

"پردھان منتری وان فاتح بن رامزل کی پندرہ ہزار چھ سو بہتر ای میلز انٹرنیٹ پہ جاری کر دی گئیں۔ ناظرین کی معلومات کے لیے بتاتے چلیں کہ وکی لیکس ایک ایسا بین الاقوامی پورٹل ہے جہاں گزشتہ کئی برس سے سیاستدانوں' خفیہ ایجنسیوں اور سلیبریٹیز کے سیکرٹ ڈاکومنٹس' ای میلز اور پرائیوٹ ویڈیوز نشر کی جاتی ہیں۔ یہ مواد اس ویب سائٹ کو یا ہیکنگ کے ذریعے ملتا ہے یا وسل بلوورز کے ذریعے۔

"مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ وان فاتح کی جو ای میلز لیک کی گئی ہیں وہ ذاتی نوعیت کی نہیں ہیں۔ وہ سرکاری نوعیت کی ہیں۔ ان میں سیاسی دعوت ناموں سے لے کر فوجی عہدیداروں کے ساتھ کی جانے والی باتیں بھی شامل ہیں۔ ہمارے تجزیہ کار ان ای میلز کا جائزہ لے رہے ہیں لیکن ان کا کہنا ہے کہ ان میلز میں موجود مواد ملکی سلامتی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ یہ وان فاتح کے پہلے دور حکومت سے متعلق ہے اور اس میں روٹین کے امور کی بات کی گئی ہے۔ لیکن...." نیوز کاسٹر نے وقفہ دیا۔ "اگر یہ نقصان پہنچائیں گی تو صرف ایک شخص کو...."

"وان فاتح کو۔" ایڈم بے یقینی سے اسکرین کو دیکھ کے بڑبڑایا۔ داتن نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"کیوں؟ یہ ذاتی ای میلز نہیں ہیں۔ اور کہہ رہے ہیں نا کہ ان میں کوئی بہت خفیہ یا نازک باتیں نہیں کی گئیں۔ اور یہ ان کے پہلے دور حکومت کی ہیں۔ تو ان کو نقصان کیوں پہنچائیں گی؟"

"مسئلہ یہ نہیں ہے کہ ان ای میلز میں کیا ہے۔" نیوز کاسٹر اونچی آواز میں کہہ رہی تھی۔ داتن اپنا جواب اس کی رپورٹ میں ڈھونڈنے لگی۔ "مسئلہ یہ ہے کہ پردھان منتری نے یہ ای میلز اپنے اس ای میل ایڈریس سے بھیجی ہیں جو پرائیوٹ سرور پہ ہے۔ یہ پرائیوٹ سرور پردھان منتری کی اپنی ویب سائٹ کا ہے جسے وہ کئی برسوں سے استعمال کر رہے ہیں۔"

"اوہ نو! فاتح نے پی ایم بننے کے بعد ای میل سرور تبدیل نہیں کیا۔" تالیہ شاک سے اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔

"پردھان منتری گزشتہ کئی سالوں سے پرائیوٹ سرور استعمال کر رہے ہیں جو کہ ایک بہت بڑی غفلت ہے۔ اس اہم عہدے پہ ہونے والے عہدیدار کو پرائیوٹ سرور نہیں بلکہ گورنمنٹ کا سرور استعمال کرنا چاہیے تھا۔"

"گورنمنٹ کے سرور بھی ہیک ہو سکتے ہیں۔" داتن نے بے چینی سے کہا۔

"تب وہ فاتح صاحب کی غلطی نہ ہوتی۔ یہ ہے۔" ایڈم نے افسوس سے اسکرین کو دیکھا۔ "جب تک کچھ غلط نہیں ہوتا' انسان احتیاط نہیں کرتا۔ پہلے کب کسی کا پرائیوٹ سرور ہیک ہوا ہے جو وہ ایسا سوچے۔"

"یہ میلز ہیک نہیں ہوئیں۔" تالیہ نے چہرہ ان کی طرف موڑا۔ اس کی آنکھیں گلابی ہو رہی

تھیں۔ وہ شدید ڈسٹرب نظر آرہی تھی۔ "ان کا پرائیوٹ سرور بہت سیکیور تھا۔ اس کو ہیک کرنا آسان نہیں تھا۔ اس لیے ذوالکفلی نے ان کے گھر میں میشا کو داخل کروایا تھا۔ تاکہ کسی طرح اسے ان کے اسٹڈی روم تک رسائی مل جائے۔ اتنے برس میشا ان کی کمزوری ڈھونڈتی رہی۔ اور پھر ایک دن اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ پرائیوٹ سرور استعمال کر رہے ہیں۔ اسی لیے وہ ان کے گھر رہنے آئی۔ وہ رات کو ان کی اسٹڈی میں گئی اور ان کے لیپ ٹاپ کے ذریعے یہ میلز ڈاؤن لوڈ کیں۔"

اس نے کرب سے آنکھیں بند کیں۔ "میں غلط سمجھی تھی۔ میشا، وان فاتح کی زندگی میں ان کی بیوی بننے نہیں آئی تھی نہ اسے میری جگہ لینی تھی۔ وہ صرف ان کو سیاسی نقصان پہنچانے آئی تھی۔"

"اور اب وان فاتح کی کرسی خطرے میں ہے۔" داتن نے افسوس سے اسے دیکھا۔ ایڈم بھی اسے دیکھ رہا تھا۔ کتنی دیر گزر رہی تھی وان فاتح کا نام نہ لینے کے فیصلے کو؟ وہ نام تو کبھی ذہن سے محو ہی نہیں ہوتا تھا۔

"جے تالیہ.... اب آپ کیا کریں گی؟"

تالیہ کتنی ہی دیر اسکرین کو دیکھتی رہی۔ وہ ابھی تک کرسی کی پشت پہ ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔ تینوں میں سے کوئی بیٹھ نہیں سکا تھا لیکن تالیہ کی حالت سب سے مختلف تھی۔

"تالیہ...." داتن نے نرمی سے اسے پکارا۔ "تم اس کو چھوڑنے کا فیصلہ کر چکی ہو۔ تم اب اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتیں۔ اپوزیشن فاتح کو impeach کرے یا پولیس اسے غداری کے الزام میں پکڑ لے.... یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔"

"انہوں نے اتنے برس اس کرسی کے لیے محنت کی تھی۔" وہ بنا پلک جھپکے اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔ "سارے فیصلے' ساری جدوجہد اس ایک خواب کے لیے تھیں۔"

"تالیہ.... پلیز...." داتن اس کے اور اسکرین کے درمیان آ گئی۔ "یہ ہمارا ملاکہ میں آخری دن ہے۔ ہم سب اس کے بعد الگ ہو رہے ہیں۔"

"میں نے دن رات ایک کر کے ان کو چیئر مین کا الیکشن جتوایا تھا۔" وہ الجھے ہوئے انداز میں خود سے بول رہی تھی۔ "میں ان کی کافی کا کپ لیے بارشوں میں ان کے ساتھ بھاگا کرتی تھی۔ اور وہ سب ضائع چلا گیا۔"

"تالیہ.... یہاں سے چلو... کہیں اور بیٹھتے ہیں۔ جہاں اس سیاہ سیاست کا ذکر نہ ہو۔"

تالیہ نے چہرہ ان دونوں کی طرف موڑا تو اس کی حیران آنکھوں میں پانی تھا۔

"ان کی برسوں کی ریاضت رائیگاں چلی جائے گی؟ وہ ایک بے وقار' نااہل وزیراعظم کے طور پہ نکال دیے جائیں گے؟" وہ بے یقینی سے پوچھ رہی تھی۔

"آپ کو کیوں پرواہ ہے' جے تالیہ؟" ایڈم سنجیدگی سے بولا۔ تالیہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو وہاں ایک چیلنج لکھا نظر آ رہا تھا۔ داتن نے اسے ٹوکنا چاہا لیکن ایڈم بن محمد کو سچ بولنے سے کون روک سکتا تھا۔

"آپ تو ان کو چھوڑ چکی ہیں۔ آپ تو فیصلہ کر چکی ہیں کہ آپ اب کسی کو نہیں بچایا کریں گی بلکہ آپ خودغرضی کی زندگی گزاریں گی۔ کیونکہ...." وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتا دو قدم قریب آیا۔ "کیونکہ آپ کا رنگ سیاہ ہے۔"

"میرا رنگ سیاہ نہیں ہے...." وہ جواباً غرائی۔ "تالیہ سیاہ نہیں ہو سکتی۔ مجھے نہیں معلوم میرا رنگ کیا ہے۔ مجھے صرف ایک بات معلوم ہے۔ کہ میں غلط تھی۔ میں ساری دنیا کو نہیں بچا سکتی۔ لیکن میں وان فاتح کو ضرور بچاؤں گی۔ تالیہ ان کا خواب ان کے ہاتھوں سے چھننے نہیں دے گی۔"

اس نے نوچنے والے انداز میں اپنا پرس اٹھایا اور دروازے کی طرف بڑھی۔ داتن نے ہکا بکا سا اسے دیکھا۔

"تم کہاں جا رہی ہو۔" واتن اس کے پیچھے لپکی۔
"میری فلائٹ میں ابھی ایک ہفتہ ہے۔ میں اس وقت کو ضائع نہیں کروں گی۔ میں وان فاتح کی مدد کے لیے جا رہی ہوں۔"
"مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا۔"
"ہو سکتا ہے۔ تالیہ کے پاس ہمیشہ پلان ہوتا ہے۔ ییشا کی حقیقت وہ جان گئے تھے۔ انہوں نے یقیناً اسے اپنی سکیورٹی ایجنسیوں کے حوالے کر دیا ہوگا۔ میں ییشا سے ملنے جا رہی ہوں۔ مجھے چاہے ییشا کی جان بھی لینا پڑے لیکن میں اس سے یہ بات ثابت کروا کے رہوں گی کہ وان فاتح اس معاملے میں بے قصور تھے۔"
وہ باہر نکلتے ہوئے تیز تیز کہہ رہی تھی۔
اس ساری پریشانی میں تالیہ مراد نے نہیں دیکھا تھا کہ واتن نے بہت مہارت سے اس کے پرس سے وہ لفافہ نکال لیا تھا۔ پھر خط واپس پرس میں ڈال کے اس نے لفافہ احتیاط سے اپنے کوٹ کی جیب میں ڈال دیا۔
تالیہ ان سے زیادہ خود سے بولتی ہوئی اب لفٹ ہاتھ پہ آگے بڑھ رہی تھی۔

☆☆☆

سری پردانہ پہ شام کے نیلگوں سایے پھیلے تھے۔ اس اونچے محل کی ساری بتیاں روشن تھیں۔ اس کے سبز باغات میں لگے لیمپ پوسٹس بھی جلے تھے۔ پردھان منتری کے آفس کی کھڑکیوں سے البتہ باہر کی روشن رات دکھائی نہیں دیتی تھی۔ کھڑکیوں کے آگے بلائنڈز برابر تھے۔
اپنی کرسی پہ بیٹھا فاتح ٹیک لگائے، آستینیں موڑے اطمینان سے سامنے بیٹھے دونوں افراد کو دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں عمر رسیدہ تھے اور روایتی لباس میں ملبوس تھے۔ سر ٹوپیوں سے ڈھکے تھے۔ دونوں کے چہرے پریشان تھے اور وہ ایک ساتھ تیزی سے بولے جا رہے تھے۔
"آپ اس کرائسس سے کیسے نکلیں گے، داتو سری؟"
"بے فکر رہو۔" فاتح نے ابرو اچکا کے اسی مطمئن آواز میں کہا۔ "لوگوں کی ای میلز ہیک ہوتی رہتی ہیں۔ قومی سلامتی خطرے میں نہیں پڑی تو مسئلہ کیا ہے۔ وہ پرانی ای میلز تھیں ویسے بھی۔"
"داتو سری... لوگ سوال اٹھا رہے ہیں کہ جانے اور کتنی حساس ای میلز آپ نے پرائیوٹ سرور پہ بھیجی ہوں گی۔"
"اور سب آپ کو الزام دے رہے ہیں۔ پرائیوٹ سرور، پرائیوٹ سرور... اف۔" ان صاحب نے کراہ کے ماتھے کو چھوا۔
"ہاں ٹھیک ہے۔ میں نے استعمال کیا پرائیوٹ سرور۔ سب کرتے ہیں۔ اب سے نہیں کریں گے۔"
"سر، یہ معاملہ اتنا سیدھا نہیں ہے۔ یہاں کوئی ہیکر کو الزام نہیں دے گا۔ یہ لوگ میڈیا پہ آپ کے خلاف اتنی بڑی مہم چلائیں گے کہ..."
"کچھ نہیں ہوگا۔ ریلیکس۔ مجھے بتاؤ ہمیں بل منظور کروانے کے لیے کتنے لوگ چاہیے ہیں؟"
"صرف پانچ اور۔ لیکن داتو سری... اس وقت بل کو پس پشت ڈال دیجیے۔ اور اس معاملے سے نکلنے کی کوشش کریں۔"
"بل کو کیوں پس پشت ڈال دوں؟ میں سوموار کی صبح یہ بل قومی اسمبلی میں پیش کرنے جا رہا ہوں۔"
وہ اپنی نشست سے کھڑا ہوا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ "اور جس جس سے تم ملو اسے بتا دینا کہ وان فاتح کو ان ای میل لیکس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وان فاتح استعفیٰ نہیں دے گا۔"
مضبوط لہجے میں کہہ کے اس نے دونوں سے ہاتھ ملایا۔ انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور گہری سانس لے کر اسے الوداع کہا۔
وہ باہر نکلے تو فاتح کے چہرے پہ پریشانی کی رمق دکھائی دی۔ اس نے اس بورڈ کو دیکھا جو ابھی

تک آفس میں رکھا تھا۔ وہاں مختلف رنگوں کے مقناطیسی گوٹ لگے اسے بتا رہے تھے کہ ابھی تک اس کے پاس بل پاس کرنے کے لیے مطلوبہ اکثریت نہیں ہے۔ اس نے گہری سانس لی اور انٹرکام اٹھایا۔

"کیا ہے تالیہ ابھی تک بیٹھی ہیں؟"

"جی سر... وہ پچھلے بیس منٹ سے آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔"

"اگلی میٹنگ میں کتنا وقت ہے؟"

"سات منٹ۔"

"اوکے۔ تالیہ سے کہو اس کے پاس دس منٹ ہیں۔" فون رکھ کے اس نے تاثرات ویسے ہی بنا لیے۔ پرسکون، مطمئن اور قدرے سرد۔

اگلے ہی لمحے دروازہ کھلا اور ■ اندر آئی۔ وہ دور سے دیکھ سکتا تھا کہ اس کے ماتھے پہ بل تھے اور آنکھوں میں غصہ تھا۔ آج اس نے ہیٹ نہیں پہن رکھا تھا۔ بس سیاہ اسکرٹ بلاؤز پہ پیلا رومال گردن میں باندھ رکھا تھا۔

"مجھے ابھی ابھی علم ہوا ہے کہ ہیشا تاج کو کبھی گرفتار ہی نہیں کیا گیا تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب ہے کہ آپ نے اسے جانے دیا۔ کیوں، فاتح؟" وہ جارحانہ انداز میں بولتی اس کی میز کے سامنے آ رکی۔ اس کا چہرہ غم و غصے سے تمتما رہا تھا۔ "یہ سب اس نے کیا ہے۔"

"کیا فرق پڑتا ہے؟ یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔" ٹیک لگا کے بیٹھے فاتح نے کندھے اچکائے۔

"آپ کی پریمیر شپ خطرے میں ہے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ یہ بڑا مسئلہ نہیں ہے؟" وہ تعجب سے بولی۔ "اور آپ نے ہیشا کو جانے کیوں دیا؟ جب کہ آپ جانتے تھے وہ یہ کرے گی۔"

"جس وقت میں نے اسے جانے دیا، وہ اس سے پہلے ہی یہ سب کر چکی تھی۔ ہمیں معلوم اب ہوا ہے۔ اس کو روکنے سے وہ جو نقصان پہنچا چکی تھی وہ ریورس تو نہیں ہو سکتا تھا۔"

تالیہ سیدھی ہوئی اور پتلیاں سکوڑ کے اسے دیکھا۔ "آپ نے اسے کیوں جانے دیا، فاتح؟"

"کیونکہ میرے پاس اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا۔ وہ چپ چاپ چلی جائے، یہ بہتر تھا اس سے پہلے کہ کوئی نیا مسئلہ کھڑا کرتا۔ جولیانہ ڈسٹرب ہوتی۔ شرمندگی الگ ہوتی۔"

"نہیں۔ اس نے آپ کو بلیک میل کیا تھا۔ ہے نا؟" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "اس کے پاس کچھ تھا آپ کے خلاف۔"

"یہ گفتگو بے معنی ہے، تالیہ۔ تم بتاؤ تم کیوں آئی ہو؟" اس نے دھیمی آواز میں کہتے ہوئے گھڑی دیکھی۔

"کیونکہ میں آپ کی کرسی چھنتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی، فاتح۔ آپ اس مسئلے سے نہیں چھپ سکتے۔ مجھے بتائیں ہیشا کے پاس آپ کے خلاف کیا تھا تاکہ میں اس کو ڈھونڈ سکوں اور اس کو واپس لا سکوں۔"

"اس کو واپس لانے سے کیا ہوگا؟"

تالیہ دونوں ہتھیلیاں میز پہ رکھ کے جھکی اور ایک ایک لفظ پہ زور دے کر بولی۔

"وہ ساری عوام کے سامنے گواہی دے گی کہ وان فاتح نے کچھ غلط نہیں کیا۔ میں اس سے گواہی دلوا لوں گی۔ آپ صرف مجھے یہ بتائیں کہ اس نے کس چیز سے آپ کو بلیک میل کیا تھا؟" اب کے تالیہ کے انداز میں جھنجلاہٹ تھی۔ بے بسی تھی۔

"تالیہ..." فاتح نے ایک فائل قریب کرتے ہوئے نرمی سے اسے دیکھا۔ "کیا تم ملک چھوڑ کے نہیں جا رہی تھیں؟"

"وہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔" اس کی رنگت گلابی پڑنے لگی۔ وہ سیدھی ہوئی۔ "آپ اپنے مسئلے کا سوچیں۔"

"میں اپنے مسئلے خود حل کر سکتا ہوں۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ تھینکس بٹ نو تھینکس۔" وہ نرمی سے کہہ رہا تھا جیسے کسی بچے کو سمجھایا جاتا ہے۔

"لیکن یہ اسکینڈل آپ کی کرسی لے جا سکتا ہے فاتح۔" اس کی بے بسی اب پریشانی میں بدلنے لگی۔

"مگر میں نہیں چاہتا کہ تم مجھے بچاؤ۔ میں نے اس سے بڑے مسئلے دیکھے ہیں۔ میں اس میں سے بھی خود نکل آؤں گا۔" فائل قریب کرتے ہوئے اس نے عینک اٹھائی اور کھولی۔ "اور وہ پیپرز میں ابھی تک سائن نہیں کر سکا تمہاری فلائٹ سے پہلے کر کے تمہیں بجھوا دوں گا۔ ٹھیک' تالیہ؟" عینک لگاتے ہوئے اس نے فائل کھولی۔ یہ اس کو جانے کا اشارہ تھا۔

"آپ نے کہا تھا کہ کبھی کبھار ہمیں دوسروں کو اجازت دینی چاہیے کہ وہ ہمیں بچا سکیں۔" وہ دکھ سے اسے دیکھ کے بولی۔

"تمہارے لیے کہا تھا۔" وہ اب فائل پہ اوپر سے نیچے سرسری نظر دوڑا رہا تھا۔

"اس نے آپ کو کس کی وجہ سے بلیک میل کیا؟"

فاتح کا صفحہ پلٹتا ہاتھ رکا۔ "کسی بہت قیمتی شخص کی وجہ سے۔"

ایک گہری خاموشی نے ان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

"ہیشا کی دھمکی خالی بھی ہو سکتی تھی، ہو سکتا ہے وہ صرف ڈرا رہی ہو۔۔۔"

"ہو سکتا ہے۔ لیکن میرے پاس خطرہ مول لینے کی گنجائش تک نہ تھی۔" وہ اب فائل کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ تالیہ نے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا۔ یہ طے تھا کہ وان فاتح اس کو اپنی مدد کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔ اور جو اجازت نہ دے' اس کی مدد کون کر سکتا ہے بھلا؟

وہ باہر نکلنے لگی تو اسی وقت ایک ڈھیلے سوٹ میں ملبوس نوجوان اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھ کے رکا اور راستہ دیا۔ تالیہ باہر آ گئی لیکن اس نے گردن موڑ کے دیکھا وہ ایک سیاہ کور والی فائل لیے اندر جا رہا تھا۔ دروازہ بند ہو گیا تو اندر کا منظر چھپ گیا۔ وہ چند لمحے وہیں کھڑی رہی۔ باہر میز پہ بیٹھا اسٹاف اس کو یوں کھڑا ہونے پہ بھنویں بھینچے گھورنے لگا۔ مگر وہ ڈھیٹ بنی کھڑی رہی۔

وہ نوجوان باہر آیا اور دروازہ بند کیا تو وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

"میں دیکھ رہی تھی کہ آپ ہر دفعہ ان سیاہ فائلز کا ڈھیر لگاتے جاتے ہیں' لیکن پی ایم صاحب ان کو نہیں دیکھتے۔ ان میں ایسا کیا ہے؟"

شاہدان نامی وہ اسٹاف ہچکچایا۔ تالیہ نے سر جھٹکا۔ "خیر کوئی کانفیڈنشل معاملہ ہے تو میں نہیں پوچھتی۔" اور آگے بڑھنے لگی لیکن وہ فوراً بولا۔

"نہیں نہیں۔ خفیہ معاملہ نہیں ہے بلکہ ضروری معاملہ بھی نہیں ہے۔ کاش ہوتا۔ تب وہ اسے زیادہ جلدی دیکھ پاتے۔" وہ رنجیدگی سے بولا۔ تالیہ رک کے اسے دیکھنے لگی۔

"دراصل داتو سری نے کچھ عرصہ پہلے کہا تھا کہ وہ ایک پراجیکٹ جسٹس شروع کریں گے جن میں ان لوگوں کے کیسز سنے جائیں گے جو عرصے سے جیلوں میں مقید ہیں اور ان کے پاس اچھا وکیل کرنے کو رقم نہیں ہے اور سرکاری وکلا ان کے کیسز لاپرواہی سے دیکھتے ہیں۔ بالخصوص وہ لوگ جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ بے گناہ ہیں۔"

"قیدی غلام۔" وہ اداسی سے مسکرائی۔ "وہ غریب قیدیوں کو رہائی دلوانا چاہتے ہیں۔ میں سمجھ سکتی ہوں۔" اور صرف وہی سمجھ سکتی تھی۔

"جی ہاں۔ جب سے ہم نے اس پراجیکٹ کا اعلان کیا' ملک بھر سے سینکڑوں قیدیوں اور ان کے گھر والوں نے درخواستیں بھیجی ہیں۔ میں ہر ہفتے وہ درخواستیں اکٹھی کر کے، ان کو فائل میں لگا کے۔۔۔ داتو سری کے پاس لے کر جاتا ہوں۔ لیکن ان کے پاس زیادہ اہم کام ہیں۔ نہ جانے کب وہ ان درخواستوں کو دیکھ پائیں گے۔"

"جب وہ ان جمع ہوئی درخواستوں کو نہیں دیکھ

پاتے تو آپ ہر ہفتے ان میں اضافہ کیوں کرتے جاتے ہیں؟"
"درخواستیں دیکھنا ان کی جاب ہے۔ فائل ان کے پاس پہنچانا میری جاب ہے۔ کیا وان فاتح نے ہمیں یہ نہیں سکھایا کہ اگر کوئی دوسرا اپنی جاب نہ کر رہا ہو تو بھی ہمیں اپنی جاب کرنی چاہیے۔" وہ مسکرا کے بولا۔ وہ مسکرا بھی نہ سکی۔

فاتح خود کو بچائے یا نہ بچائے کیا تالیہ کو اپنی جاب نہیں کرنی چاہیے تھی؟

☆☆☆

عالم کا اپارٹمنٹ اس رات ہمیشہ کی طرح خاموش پڑا تھا۔ خاموش مگر روشن۔ آج لاؤنج میں رکھے کارنر لیمپس روشن تھے۔ ٹی وی اسکرین میوٹ پہ تھی مگر اس پہ چلتی خبریں خاموشی کے باوجود سمجھ میں آتی تھیں۔ وہ نیوز اینکرز اور تجزیہ نگاروں کی فاتح کے خلاف زہر اگلتی زبانیں سن سن کے تھک گئی تھی۔ اس لیے انہیں گونگا کر دیا تھا۔

لیکن وہ نیوز بند بھی نہیں کر پا رہی تھی۔ شاید کہیں سے کوئی اچھی خبر سننے کو مل جائے۔

حالات ہر گزرتے پل کے ساتھ بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ اور وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ جس کا دل چاہ رہا تھا، وہ فاتح کے خلاف بول کے ریٹنگ اور پیسے کما رہا تھا۔ کسی ایک کی بدنامی کی گنگا سے سب کا ہاتھ دھونا ضروری تھا۔

ینشا کا ہیپ ورک اتنا اچھا تھا کہ داتن اسے ڈھونڈ ڈھونڈ تھک گئی تھی اور اس کا کوئی نام و نشان تک نہ تھا۔ وہ کہاں سے آئی، کہاں چلی گئی، کچھ معلوم نہ ہوتا تھا۔ ایسے جیسے ہوا میں تحلیل ہو گئی ہو۔ داتن نے فون کر کے بتایا تھا کہ وہ مزید کوشش کرے گی لیکن وہ بہت پر امید نہیں تھی۔ تالیہ کی امید بھی دم توڑ رہی تھی۔ قوی امکان تھا کہ ینشا تاج اب تک ملک سے فرار ہو چکی ہو گی اور کسی دوسرے ملک میں ایک نئی زندگی شروع کر چکی ہو گی۔

ینشا تاج نے اپنے پیچھے ایک بریڈ کرمب بھی نہیں چھوڑا تھا۔ کوئی اتنا پرفیکٹ کیسے ہو سکتا تھا؟

ٹی وی ہنوز چل رہا تھا اور وہ سامنے صوفے پہ بیٹھی تھی۔ بال پونی میں باندھے، آلتی پالتی لیے... وہ گود میں رکھی ٹوکری سے چند خطوط نکال نکال کے دیکھ رہی تھی۔ یہ فاتح کے پانچ خطوط تھے جنہیں وہ اپنے ساتھ رکھتی تھی۔۔۔ یہ تالیہ مراد کی کل متاع تھے۔ وہ اداس مسکراہٹ کے ساتھ ان کو پڑھ رہی تھی۔

"ڈیئر تالیہ

میں اس امید کے ساتھ واپس آیا تھا کہ تم یہاں ملو گی لیکن تم ابھی تک نہیں آئی ہو۔ تمہارے پیچھے ملائیشیا میں بہت کچھ تبدیل ہو گیا ہے۔ خود وان فاتح تبدیل....."

ڈور بیل بجی تو وہ چونکی۔ اس وقت کون آ گیا۔ شاید داتن ہو۔ لیکن داتن گھنٹی بجانے کا تکلف کم ہی کیا کرتی تھی۔

اس نے ٹوکری میز پہ رکھی جہاں اس کا پاسپورٹ، ٹکٹ کا پرنٹ آؤٹ اور دوسرے سفری ڈاکومنٹس پڑے تھے۔ اس وقت وہ اپنے کاغذات کو ارینج کرنے بیٹھی تھی جب وہ خطوط ملے۔ اس گھنٹی نے سارے کام میں خلل ڈال دیا تھا۔

اس نے دروازے کے سوراخ سے دیکھا تو پل بھر کے لیے متعجب رہ گئی۔ پھر پٹ کھولا۔

"سکندر؟"

اس نے اچنبھے سے سامنے کھڑے نوجوان کو دیکھا۔ اس کے پیچھے دو سوٹ میں ملبوس گارڈ بت بنے کھڑے تھے۔

"مجھے آپ سے بات کرنی تھی، مس تالیہ۔" وہ تحمل سے بولا۔

"تم نے میرا گھر کیسے ڈھونڈا؟"

"میں پردھان منتری کا بیٹا ہوں۔ میرے لیے یہ مشکل نہیں ہے۔" اس کی آواز میں فخر تھا۔ تالیہ کے ماتھے پہ شکن در آئی۔

"او کے۔ تم مجھے یہ بتانے آئے ہو کہ تم مجھ سے

کتنی نفرت کرتے ہو؟" وہ بھی اسی کے انداز میں بولی۔

"میں یہ بتانے آیا ہوں کہ بیتا کو ڈیڈ نے میرے سامنے نکالا تھا۔ اور میں نے ڈیڈ سے کہا کہ یہ عورت آپ کو نقصان پہنچائے گی تو جانتی ہیں انہوں نے آگے سے کیا کہا؟"

"یہی کہا ہوگا کہ تمہارے خیال میں میں یہ بات نہیں جانتا؟"

تالیہ گہری سانس لے کر بولی تو سکندر جو کچھ کہنے جا رہا تھا' رک کے اسے دیکھنے لگا۔ اس کے ماتھے کی ایک شکن کم ہوئی۔

"آپ کو کیسے پتا؟"

"کیونکہ میں ان کو جانتی ہوں۔"

سکندر نے بھنویں اکٹھی کر کے اسے دیکھا۔

"مگر کیا آپ یہ جانتی ہیں کہ بیتا نے ڈیڈ کو کس بات پہ بلیک میل کیا تھا؟"

"ہاں' سکندر' میں جانتی ہوں۔ اس نے یہی کہا ہوگا کہ وہ کسی طرح مجھے نقصان پہنچائے گی۔ شاید میرے ماضی کے جرائم دنیا کے سامنے لا کر۔ ہے نا؟"

سکندر کے تاثرات دیکھ کے تالیہ نے رنجیدگی سے سر جھٹکا۔ "مجھے اندازہ تھا۔"

سکندر نے بولنے کے لیے ہونٹ کھولے۔ پھر بند کر دیے۔ سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے۔ تالیہ سامنے سے ہٹ گئی۔ اور اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

وہ اندر داخل ہوا۔ ایک طائرانہ نگاہ اطراف میں ڈالی۔ تالیہ نے دروازہ بند کیا اور سامنے رکھے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ ماتھے پہ شکنیں لیے وہیں کھڑا رہا۔

"میری ماں کے چھوڑے ہوئے نوادرات سے خریدا ہوگا آپ نے یہ گھر؟"

تالیہ نے افسوس سے اسے دیکھا۔

"سکندر.... میں جانتی ہوں تم مجھ سے نفرت کرتے ہو...."

"آف کورس میں آپ سے نفرت کرتا ہوں۔ اور میں آپ کو یہی بتانے آیا ہوں کہ آپ کی وجہ سے میرے ڈیڈ مشکل میں ہیں۔ آپ جب بھی ہماری زندگی میں آتی ہیں مشکلیں ہی لاتی ہیں۔ آپ نہیں تھیں تو ہم سکون میں تھے۔ آپ آئیں تو سب خراب ہونے لگا۔"

وہ دونوں لاؤنج کے وسط میں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ ان کے سروں پہ چھت سے جھولتا فانوس اپنی ساری روشنیاں اپنے اندر دفن کیے خاموشی سے ان کو دیکھ رہا تھا۔

"تو تمہیں خوش ہو جانا چاہیے کہ میں یہاں سے جا رہی ہوں۔"

"میرے ڈیڈ کو مصیبت میں پھنسا کے آپ جا رہی ہیں۔ ویری گڈ۔"

"میں نے ان کی مدد کی کوشش کی لیکن وہ نہیں چاہتے کہ کوئی ان کے لیے کچھ کرے۔ میں کیا کر سکتی ہوں؟ اور ویسے بھی میرے ہونے سے تم سب کی زندگی مشکل میں پڑ جاتی ہے۔ تمہاری ماں کا قتل بھی میں نے کیا تھا اور یہ ای میلز بھی میں نے لیک کی تھیں۔ فائن۔ کیا تمہیں کچھ اور کہنا ہے یا میں اپنے کام کروں؟" وہ تھکے تھکے انداز میں بولی۔

سکندر نے سر جھٹکا اور آگے چلا آیا۔ پھر وہ خود ہی صوفے پہ بیٹھا اور ہاتھ باہم پھنسائے سامنے دیوار گیر کھڑکی کو دیکھنے لگا۔ وہاں سے دور دور تک بلند عمارتیں دکھائی دے رہی تھیں یا نیچے سڑک پہ رواں دواں ٹریفک۔

"آپ ان کو الزام دیتی تھیں کہ وہ آپ کے لیے کچھ نہیں کرتے۔" وہ اب کے بولا تو اس کی آواز دکھی تھی۔ "آپ کے لیے انہوں نے اپنا آفس داؤ پہ لگا دیا ہے۔ آپ کی وجہ سے ان کا کیریئر تباہ ہو رہا ہے۔"

تالیہ سینے پہ بازو لپیٹے کھڑی ناپسندیدگی سے دیکھ رہی تھی۔ وہ ہر وقت کے الزام برداشت کر کر کے تنگ آ چکی تھی لیکن وہ قاتل کا بیٹا تھا۔ اس کی

بات اسے برداشت کرنی تھی۔ کچھ رشتوں کا ادب ان کے ختم ہونے یا نہ ہونے سے بالاتر ہوتا ہے۔

"میں اسی لیے انہیں چھوڑ رہی ہوں سکندر ...میری وجہ سے ان کی زندگی پیچیدہ ہو جاتی ہے۔ میں اور کیا کروں؟"

"آپ کچھ بھی نہ کریں۔ آپ بس یہ یاد رکھیں کہ ان کا کیریئر آپ نے خراب کیا ہے۔ مسز ینشا آپ کے بارے میں ٹھیک کہتی تھیں۔ آپ نہ اچھی کون وومن بن سکیں نہ اچھے فیصلے کر سکیں۔ وہ آپ سے بہتر ہی تھیں۔"

تالیہ نے بے یقینی سے ابرو اٹھائے۔ دونوں بازو پہلوؤں میں گرا دیے۔

"ایک منٹ ایک منٹ۔ یہ کب کہا اس نے؟" وہ تیزی سے اس کے سامنے والے صوفے پہ آ کے بیٹھی۔

وہ جو تیز تیز بولے جا رہا تھا۔ رک کے کوفت سے بولا۔ "جب وہ آپ کو ڈھال بنا کے ہمارے گھر سے گئیں۔"

"اس نے کیا کہا؟ مجھے اس کے الفاظ بتاؤ۔" وہ آگے کو بیٹھی، سانس روکے اس سے پوچھ رہی تھی۔ سکندر کو لگا... جیسے وہ پلک جھپکنا بھول گئی ہے۔ وہ ٹھہر گیا۔

"جب ڈیڈ نے اسے گھر سے نکالا تو اس نے جاتے وقت مجھے اور جولی کو کہا تھا کہ..." وہ اٹک اٹک کے یاد کرنے لگا۔ "کہ تالیہ سے کہنا ینشا اس سے بہتر کون وومن ہے۔ بلکہ بہترین۔ کیونکہ ینشا کو اپنی سیاہی پہ فخر ہے۔ جبکہ تالیہ مراد اپنے پیشے سے نفرت کرتی تھی۔ تالیہ مراد میدان چھوڑ کے بھاگنے والوں میں سے ہے۔ ایسا ہی کچھ کہا تھا۔"

"کیا اس نے واقعی یہ کہا؟" وہ متعجب سی اسے دیکھ رہی تھی۔ سکندر نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

"میں آپ کو یہاں ینشا تاج کے پیغامات دینے نہیں آیا بلکہ یہ احساس دلانے آیا ہوں کہ آپ کی وجہ سے......"

"میری وجہ سے سارے مسئلے ہو رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ مجھے پتا ہے۔" وہ تیزی سے بولی۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ "لیکن کیا اس نے واقعی یہ کہا؟" وہ اب حیران سے انداز میں مسکرانے لگی تھی۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ اس نے کیا کہا؟"

"پڑتا ہے نا۔ اب مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ ہم نے ینشا کو کیسے پکڑنا ہے۔"

سکندر نے بے یقینی سے اس کو دیکھا۔ "کیا مطلب؟" چند لمحے کے لیے وہ بالکل گنگ ہو گیا۔ "اس کو پکڑ کے کیا یہ بات ثابت کی جا سکتی ہے کہ ای میلز لیک ہونے میں ڈیڈ کا قصور نہیں تھا؟"

"ایک دفعہ ہم اس کو پکڑ لیں تو ہم اس سے کچھ بھی کہلوا سکتے ہیں۔ لیکن تمہیں میری مدد کرنی ہو گی۔"

سکندر کے ماتھے پہ شکنیں ابھریں۔ "میں آپ کی مدد کیوں کروں گا؟"

"دیکھو سکندر! تم میرے پاس صرف اس لیے آئے ہو کیونکہ تمہیں معلوم ہے کہ اگر تمہارے ڈیڈ کو اس کرائسس سے کوئی نکال سکتا ہے تو وہ میں ہوں۔ اس لیے مجھ سے جتنا خفا ہونا ہے وہ بعد میں ہو لینا۔ تالیہ کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ فی الحال میری مدد کرو۔ ہم نے ینشا کی پروفائل تیار کرنی ہے۔"

"ہم؟"

"ہاں۔ میں اور میری دوست لیانہ۔" تالیہ موبائل پہ نمبر ملاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"وہ بھی آپ کی طرح لوگوں کے گھر میں چوریاں کرتی ہے؟"

تالیہ نے فون کان سے لگاتے ہوئے اسے دیکھا۔ "نہیں۔ وہ بنا تکلیف دیے قتل کرنے میں بھی ماہر ہے۔"

سکندر سر جھٹک کے منہ میں کچھ بڑبڑایا۔

تالیہ فون کان سے لگائے اٹھ گئی۔ سلسلہ مل گیا تھا۔ اب وہ کچن کے سامنے چکر کاٹتے ہوئے داتن

سے بات کر رہی تھی۔
وہ واپس آئی تو سکندر ٹوکری میں رکھے کاغذات دیکھ رہا تھا۔
"آپ واقعی اگلے ہفتے جا رہی ہیں؟" اس نے پرنٹ شدہ ٹکٹ کو واپس رکھتے ہوئے سرد انداز میں پوچھا۔
"نہیں۔ یہ جعلی کاغذات ہیں جو میں نے تمہیں دھوکا دینے کے لیے میز پہ سجائے ہیں۔" وہ اسی کے طنزیہ انداز میں بولتے ہوئے ساتھ بیٹھی۔ سکندر خاموش ہو گیا۔ وہ اب فون پہ کچھ دیکھ رہی تھی۔
"آپ ییشا کو کیسے پکڑیں گی؟" کچھ دیر بعد وہ کھنکھارا۔
تالیہ نے جواب نہیں دیا۔ فون دیکھتی رہی۔ اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔
"ییشا کی باتوں میں اتنا خاص کیا تھا؟" اس نے پھر پوچھا۔
"ییشا کو ہم اس لیے نہیں ڈھونڈ پا رہے تھے کیونکہ اس کی ہر بات اس کے رول کا حصہ تھی۔ میری حمایت کرنا' مجھے اچھی نصیحت کرنا' سب دھوکا تھا۔ لیکن......" وہ مسکراتے ہوئے فون اسکرین پہ بٹن دبا رہی تھی۔ "اس نے اپنا راز کھلنے کے بعد جو بھی کہا' وہ اس کا سچ تھا۔"
"اس نے کہا کہ وہ آپ سے بہتر ہے۔"
"نہیں۔ اس نے کہا کہ وہ بہترین ہے۔ تمہیں معلوم ہے آج تک تالیہ مراد کسی کون گیم کے دوران کیوں نہیں پکڑی گئی؟ کیونکہ تالیہ کا ماننا تھا کہ بہترین کون گیم وہ ہوتا ہے جس میں خود ٹارگٹ کو بھی اپنے لوٹے جانے کا علم نہ ہو سکے۔ میں جب کون گیمز کھیلتی تھی تو لوگ مجھے حالم یعنی الوسیٹی گیمز کے طور پہ ہائر کرتے تھے۔ میں کبھی ولن بن کے نہیں بھاگی تھی جیسے ییشا بھاگی۔ لوگ مجھے خود پیسے دیتے تھے۔ اور برسوں میرے مشکور رہتے تھے۔ تالیہ آج تک اس لیے نہیں پکڑی گئی کیونکہ وہ لوگوں کو جتاتی نہیں تھی کہ وہ بہترین ہے۔ اسے معلوم تھا کہ وہ بہترین ہے اور اسے اپنی اس بات پہ فخر نہ تھا۔ جانتے ہو تالیہ کیسے پکڑی گئی؟"
"کیسے؟" وہ غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔
"اپنے ویک لنک سے۔ ہر زنجیر میں ایک کمزور کڑی ہوتی ہے۔ میری کمزور کڑی تھی عزت حاصل کرنے کی خواہش۔ اور اس خواہش کے پیچھے میں نے اپنی سیاہی کو خود سے علیحدہ کیا اور ایک صاف ستھری زندگی کو چنا۔ وہی زندگی مجھے لائم لائٹ میں لے آئی اور ایک دن پراسیکیوٹر احمد نظام نے مجھے گھیر لیا۔ اگر میں اپنی خواہش کے پیچھے نہ بھاگتی تو میں بھی پکڑی نہ جاتی۔"
"اور ییشا؟" وہ اب دھیان سے اسے سن رہا تھا۔ لاؤنج کے کارنر لیمپس کی زرد روشنی میں وہ اس تیز تیز بولتی لڑکی کو سانس روک کے سن رہا تھا۔
"ییشا کے خیال میں وہ تالیہ کی طرح میدان چھوڑ کے بھاگنے والوں میں سے نہیں ہے۔ وہ تمہارے گھر سے بھی فرار ہو سکتی تھی لیکن وہ اس وقت تک نہیں گئی جب تک فاتح نے اسے پکڑ نہ لیا۔ ییشا خود پکڑے جانا چاہتی تھی۔ اسی لیے اس نے ان کو بلیک میل کرنے کا پلان ہی بنا رکھا تھا۔"
"وہ کیوں پکڑے جانا چاہتی تھی؟"
"کیونکہ ییشا نے دو سال تک ایک کون گیم کھیلا تھا۔ دو سال' سکندر۔ اسے اس اداکاری کے لیے تعریف چاہیے تھی۔ وہ فاتح کو ان کے منہ پہ بتانا چاہتی تھی کہ اس نے ان کو دھوکا دیا۔ ییشا کو کون گیم کا پہلا اصول یاد نہیں رہا جس میں سکھایا جاتا ہے کہ بہترین دھوکا وہ ہوتا ہے جو کبھی نہ کھلے۔ بلکہ برسوں بعد بھی ٹارگٹ اس سب کو یاد کرے تو اسے لگے یہ اس کا اپنا ہی آئیڈیا تھا۔ ییشا چاہتی ہے کہ کسی فلم کی طرح آخر میں وہ اپنے ٹارگٹ کے سامنے انکشاف کرے اور اس کے چہرے کے تاثرات دیکھے۔ جانتے ہو کون لوگ ایسا کرنا چاہتے ہیں؟ ایکٹرز اور جادوگر۔ وہ اسٹیج پہ پرفارمنس دے کر تالیوں کے منتظر ہوتے ہیں۔ ییشا کو بھی تالیاں چاہیے ہیں اور اسے

پکڑنے کے لیے ہم اسے وہی دیں گے جو اسے چاہیے۔''

''مگر آپ ایک کون دو مین کو کون کیسے کریں گی؟''

''اسے ایک خواب دکھا کے۔ خوابوں کا فریب جان لیوا ہوتا ہے۔ ایک زمانے میں تالیہ اس شہر کی بہترین کون آرٹسٹ تھی۔ یشا وہی بننا چاہتی ہے۔ اس نے اتنا بڑا کام کیا ہے۔ اس نے پردھان منتری کو کون کیا ہے۔ وہ یہ ملک نہیں چھوڑے گی۔'' وہ مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''اس کا ریٹ بڑھ جائے گا۔ لوگ اسے ہائر کریں گے۔ یشا کی کمزور کڑی اس کی انا ہے۔ اسے اپنی دنیا میں نام کمانا ہے۔''

''مگر لوگ اسے کیسے ہائر کریں گے؟ اس کو تو تلاش کرنا ناممکن ہے۔''

''کیونکہ ہم اس کا اصلی نام نہیں جانتے۔ لیکن چونکہ وہ تالیہ مراد سے بہتر بننا چاہ رہی ہے' اس لیے اس کے پاس اپنے کلائنٹس سے رابطہ کرنے کا کوئی طریقہ ضرور ہوگا۔ جیسے تالیہ کے پاس تھا۔ ڈارک ویب۔ ڈارک ویب وہ ''میدان'' ہے جسے تالیہ نے چھوڑ دیا تھا۔ ہم اسے ڈارک ویب پہ ڈھونڈیں گے۔ جہاں ہیکرز سے لے کر کرائے کے قاتلوں تک نے اپنے اپنے پیج بنا رکھے ہیں۔''

تھوڑی دیر بعد لاؤنج کی روشنیاں تیز ہو گئیں اور کھڑکی کے آگے پردے ڈال دیے گئے۔ اب سامنے والے صوفے پہ داتن بیٹھی تھی اور لیپ ٹاپ کے کی بورڈ پہ انگلیاں چلا رہی تھی۔ گاہے بگاہے ایک تیز سی نگاہ اس لڑکے پہ بھی ڈالتی تھی جو اس کے مقابل بیٹھا تھا۔

''ڈارک ویب پہ کسی کانٹریکٹ کرمنل کی لوکیشن تلاش کرنا ناممکن ہے۔ لیکن مختلف فورمز پہ لوگوں نے مختلف کانٹریکٹرز کو ریویوز دے رکھے ہوتے ہیں۔'' داتن اسکرین پہ انگلی پھیرتے ہوئے بتا رہی تھی۔ ''یشا نہ ہی ہیکر ہے نہ قاتل۔ وہ گرفتر ہے۔ ان فورمز سے میں نے کے ایل میں کام کرنے والے پچیس گرفترز کی پروفائلز تلاش کی ہیں۔''

''ان میں سے عورتیں کتنی ہیں؟'' سکندر تیزی سے بولا۔ تالیہ اس وقت کچن سے نکل رہی تھی۔ ہاتھ میں ٹیک اوے کے ڈبے تھے۔ اس نے ان کو میز پہ رکھا اور چاپ اسٹکس نکال کے سب کے آگے رکھنے لگی۔

''یہاں مرد اور عورت کی تفریق کرنا ناممکن ہے۔ سب خود کو مرد ہی ظاہر کرتے ہیں۔'' داتن نے لیپ ٹاپ اسکرین اس کے سامنے کی۔ وہ صوفے پہ بیٹھی اور غور سے ان ناموں کو پڑھنے لگی۔

''آپ صرف اس کے نام سے اسے کیسے ڈھونڈیں گی؟ یہ تو کوئی بھی نقلی نام ہو سکتا ہے۔'' سکندر نے چاپ اسٹکس اٹھاتے ہوئے کہا۔ وہ اب وہاں قدرے آرام دہ انداز میں بیٹھا تھا۔

تالیہ نے اسکرین پہ ایک جگہ انگلی رکھی۔ ''یہ یشا ہے۔''

''کساتریا... ہتام؟'' داتن نے تعجب سے اس نام کو پڑھا۔ ''بلیک نائٹ؟ مگر یہ تو کوئی روسی کانٹریکٹر ہے اور اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ...''

''یہ یشا ہے۔'' وہ پورے یقین سے بولی۔ ''وہ سیاہ گھوڑوں کی تصویریں کھینچتی تھی۔ وہ فاتح کا سیاہ گھوڑا نہیں تھا۔ یشا خود کو بلیک نائٹ سمجھتی ہے۔ وہ شطرنج کا سیاہ گھوڑا ہے جسے اپنی سیاہی پہ فخر ہے۔'' اس نے انگلی سے اسکرین پہ دستک دی۔ ''یہ یشا ہی ہے۔''

''کیا اس کی لوکیشن معلوم ہو سکتی ہے؟'' سکندر تیزی سے بولا۔

''نہیں۔ وہ خود ہمارے پاس آئے گی۔ ہم اس کے ساتھ ایک کون کھیلنے جا رہے ہیں۔ میری زندگی کا آخری کون گیم۔ اور مجھے یقین ہے وہ اس پھندے سے نہیں نکل سکے گی۔'' تالیہ نے پیچھے ٹیک لگائی اور چاپ اسٹکس ڈبے کے اندر ڈالیں۔ ''اور تم......

مجھے ییشا کے بارے میں ہر وہ بات بتاؤ جو ان دو سالوں میں تم نے دیکھی ہو۔ ہر بات۔"

سکندر نے گردن ہلا دی۔ اس کے کھنچے کھنچے انداز میں البتہ کمی نہیں آئی تھی۔ وہ اب بھی تالیہ کو مشکوک نظروں سے دیکھتا تھا مگر وہاں پرواہ کسے تھی۔ وہ چپ چاپ اسنیکس سے چاؤ من کھاتے ہوئے سکندر کی بات غور سے سن رہی تھی۔

☆☆☆

اگلے دو روز تک تالیہ مراد کے لاؤنج کا منظر ایسا ہی رہا تھا۔ سکندر البتہ دوبارہ نہیں آیا تھا۔ لیکن وہاں اب ایک وائٹ بورڈ لگا تھا جس پہ مختلف کاغذ چسپاں تھے۔ داتن صوفے میں دھنسی لیپ ٹاپ پہ لگی ہوئی تھی اور تالیہ... وہ بورڈ کے ساتھ کھڑی مارکر سے مختلف کاغذوں پہ سٹور اینڈرلائن کرتی تھی۔

"سکندر نے کہا تھا کہ ییشا نے ایک دفعہ اس کی مدد کی تھی۔" تالیہ، داتن کی طرف مڑی اور چمکتی آنکھوں سے بتانے لگی۔ مارکر کی سیاہی اس کے پوروں پہ لگی تھی۔ "سکندر کا ایک دوست کلاس میں بلی کیا جا رہا تھا۔ ییشا نے اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے اس لڑکے کی آؤٹ آف دی وے جا کے مدد کی۔ اس سے ییشا کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ لیکن دیکھا جائے تو ییشا کے تعلقات ٹین ایج لڑکے لڑکیوں سے بہت اچھے تھے۔ میرا خیال ہے ییشا اپنی ٹین ایج میں اپوزیا بلنگ کی شکار رہی تھی۔ رول کے طور پہ وہ نوجوانوں کے ساتھ یہ ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس لیے ہم ییشا کو بلانے کے لیے ایک ٹین ایج نوجوان کا سہارا لیں گے۔"

"کون؟" داتن نے چونک کے اسے دیکھا۔

"اور ییشا اس کے گھر کیوں آئے گی؟"

"اسے اس گھر آنا ہوگا' داتن۔ اسی گھر سے تو یہ سب شروع ہوا تھا۔" وہ مارکر کا کیپ بند کرتے ہوئے بولی۔ اس کے انداز میں سوگواریت تھی۔ اسے ایک پرانے شناسا سے ملنے جانا تھا۔

(میں تالیہ مراد ہوں۔ اور میں اپنی زندگی کا آخری کون گیم کھیلنے جا رہی ہوں۔)

وان فاتح ایک کانفرنس روم کی سربراہی کرسی پہ بیٹھا تھا۔ ٹائی ڈھیلی کیے' آستین پیچھے کو موڑے وہ ایک کاغذ اٹھا کے کچھ کہہ رہا تھا۔ طویل میز کے دونوں اطراف قطار میں بیٹھے لوگ کاغذوں کے پلندوں میں غرق کام کرتے دکھائی دے رہے تھے۔

(میرا رنگ سفید نہیں ہے۔ میں اتنی بے داغ اور اجلی رنگت کی نہیں ہوں' میں جانتی ہوں۔ مگر میرا رنگ سیاہ بھی نہیں ہے۔)

اسٹوڈیو کی تیز روشنیوں میں سبز بیک ڈراپ کے سامنے کرسی پہ بیٹھا ایڈم سپاٹ چہرے کے ساتھ کیمرے میں دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ کس طرح وان فاتح کی ایک غلطی ان کو تباہی کے دہانے پہ لے آئی تھی۔ ڈائریکٹر نے کٹ کہا تو کیمرہ بند ہو گیا۔ ایڈم نے شرٹ پہ لگا مائیک دھیرے سے اتارا اور افسوس سے سر جھٹکتے ہوئے اسے میز پہ رکھا۔ ایک پرانے دوست کی تباہی پہ تبصرے کرنا بھی عجیب کام تھا۔ زندگی میں پہلی دفعہ اسے اپنا کام اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

(اگر میرا رنگ سیاہ ہوتا تو میں صرف اپنی پروا کرتی اور کسی دوسرے ملک جا کے اپنی زندگی بناتی۔ لیکن میرا رنگ سیاہ اور سفید کے درمیان ہے۔ معلوم نہیں کیا ہے۔ لیکن وہ کچھ اور ہے۔)

تالیہ سیاہ ہڈی پہنے' ایک گلی میں کھڑی' سر اٹھائے اس شناسا سا گھر کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے لبوں کی مسکراہٹ میں ملال بھی تھا اور رنج بھی۔ زندگی ایک دفعہ پھر اس کو اس گھر کے دروازے پہ لے آئی تھی۔ پورے دائرے میں گھومتے ہوئے وہیں اختتام ہو رہا تھا۔

(مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ میں وان فاتح کو کس لیے بچانا چاہتی ہوں۔ میں انہیں چھوڑ کے جا رہی ہوں۔ میں ان کے ساتھ نہیں رہ رہی۔ لیکن میں نہیں چاہتی کہ میرے پیچھے وہ اپنے خوابوں سے ٹوٹ کے ایک اداس زندگی گزاریں۔)

اپوزیشن کے چار اراکین ایک آفس روم میں بیٹھے پرجوش انداز میں وان فاتح کا مستقبل ڈسکس کر رہے تھے۔ صوفیہ رحمن کمرے میں دائیں سے بائیں ٹہلتی مسکراتے ہوئے ڈکٹیٹ کروا رہی تھی۔ ایک شخص لیپ ٹاپ پہ تیز تیز ٹائپ کرتے ہوئے مواخذے کے بل کا مسودہ تحریر کر رہا تھا۔ باقی افراد سر جوڑے سرگوشیاں کر رہے تھے۔

(ایسے میں جب ہر شخص ان کے خلاف ہو چکا ہے تالیہ ان کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی۔ برسوں پہلے تالیہ نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ اگر اس ملک میں سب ان کا ساتھ چھوڑ جائیں' تب بھی وہ ان کو اپنا لیڈر کہے گی۔ اور تالیہ مراد وعدے نبھانے آتے تھے۔)

☆☆☆

تنکو کامل محمد کے اسٹڈی روم میں تناؤ کی سی کیفیت تھی۔ بلکہ تناؤ ایک بہت چھوٹا لفظ تھا۔ وہ اپنی کرسی پہ بیٹھے' میز پہ رکھے ہاتھ باہم پھنسائے' تالیہ مراد کو بغور دیکھ رہے تھے جو سامنے والی کرسی پہ بیٹھی تھی۔ اس کے لبوں پہ ایک اداس مسکراہٹ تھی۔

"مجھے وقت دینے کے لیے شکریہ' تنکو کامل۔"

"جب سکندر نے کہا کہ تم مجھ سے ملنا چاہتی ہو تو میں حیران ہوا تھا۔ آخری دفعہ ہم تب ملے تھے جب تمہارے پیچھے ایڈم بن محمد جاسوسی کرنے میرے گھر آیا تھا۔" وہ واضح متعجب تھے۔ تالیہ سوگواریت سے مسکرائی۔

"افسوس کہ آپ سے میں نے ہمیشہ جھوٹ بولے تھے یا بلوائے تھے۔" وہ سیاہ ہیٹ پہنے ہوئے تھی۔ اس کی گردن میں موتیوں کی لڑی تھی اور لباس بیش قیمت تھا۔ یہاں کے گھر میں ملازمہ کی طرح کام کرنے والی تالیہ نہیں تھی۔

"تالیہ... وہ جھوٹ ماضی میں بہت پیچھے رہ گئے۔ فاتح میرا دوست تھا۔ ان گزرے برسوں میں مجھے ساری کہانی سمجھ میں آ گئی تھی۔ کچھ اس نے بتا دی تھی۔ میری بیوی کے زیورات کیسے نقلی زیورات میں تبدیل ہوئے' میرے پاس میری مخالف کمپنی کا لیپ ٹاپ کیسے آیا... اور مجھے ان کا پیٹنٹ چوری کر کے بزنس میں کتنا فائدہ ہوا... یہ ساری کڑیاں ملانا مشکل نہ تھا۔"

تالیہ نے اداسی سے اس کمرے کی دیواروں کو دیکھا۔ وہ اب بھی ویسی تھیں۔ وہی بک شیلف... وہی لکڑی کی میز۔ اور کچن سے آتی سوپ کی وہی مہک۔

"کیا آپ مجھے معاف کر دیں گے؟" وہ ان کو دیکھ کے بولی۔ تو وہ دھیرے سے مسکرائے۔ کمرے میں پھیلا تناؤ تھوڑا کم ہوا۔

"تم نے جتنی قیمت کے زیورات چرائے تھے' اس سے کہیں زیادہ مالیت کا پیٹنٹ مجھے میرے مخالف کے لیپ ٹاپ سے لا کر دیا تھا۔ جو منافع مجھے میرے لالچ نے دلوایا' وہی قیمت زیورات سے نکل گئی۔ مجھے تم پہ غصہ نہیں آیا تھا' تالیہ۔ شاید شروع میں آیا ہو۔ لیکن پھر بعد میں وہ ایک رنجیدگی میں بدل گیا۔"

"کب؟" وہ چونکی۔

"جب میں نے دیکھا کہ لوگ تمہیں عصرہ محمود کی موت کا ذمہ دار قرار دے رہے ہیں۔ تب میں نے سوچا کہ کاش تم وہی سوپ پارلر میں کام کرنے والی تالیہ ہوتیں جو اپنے بے کار باپ کے گھر کی روزی روٹی کی ذمہ دار تھی اور جس کا باپ اس کی شادی زبردستی طے کر رہا تھا۔"

تالیہ نم آنکھوں سے مسکرا دی۔ "میری کہانی اور میرا باپ اس سے بہت مختلف نہیں تھا۔"

"خیر میں جانتا تھا تم نے عصرہ کا قتل نہیں کیا۔ کیونکہ تم کسی کو اذیت نہیں دے سکتی تھیں۔ لالچ تو ہم دونوں نے کیا تھا۔ اس واقعے کے چند ماہ بعد شیلا کا مس کیرج ہوا۔ اور جب ہم نے اپنا بچہ کھویا تو ہماری زندگی میں تبدیلی آ گئی۔ اس لیے ہاں! میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔" وہ شانے اچکا کے مسکرائے۔ "اب بتاؤ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

"میں چاہتی ہوں کہ علی کامل ڈارک ویب سے ایک کانٹریکٹ تھیف کو ہائر کرے اپنی ماں کا نیکلیس چرانے کے لیے۔ وہ چوری کے لیے اس کانٹریکٹر کو دو دن کا وقت دے گا۔ ان دو دنوں میں آپ اپنے گھر ایک پارٹی منعقد کریں گے۔ وہ کانٹریکٹر اسی پارٹی کے دوران نیکلیس چرانے کی کوشش کرے گی۔"

"مگر اس طرح میں شہلا کو خطرے میں ڈال دوں گا۔" وہ فکرمند ہوئے۔

"وہ نقلی نیکلیس پہن کے پارٹی میں جائیں گی۔ اصل نیکلیس ان کے لاکر میں ہوگا۔ اور فکر نہ کریں بات نیکلیس چرانے تک نہیں آئے گی۔ ہم اس کانٹریکٹ تھیف کو اس سے پہلے ہی پکڑ لیں گے۔ پلیز... یہ فاتح کے لیے ہے کامل صاحب۔ یہ ہم سب کے گناہوں کا کفارہ ہے۔"

وہ مدھم سا مسکرا دیے۔ تالیہ نے اپنا لیپ ٹاپ کھولا اور اب اسکرین سے دیکھ کے ان کو ہدایات دینے لگی۔ وہ غور سے سنتے ہوئے سر ہلا رہے تھے۔

ان کے کچن سے ابھی تک سوپ کی مہک آ رہی تھی جس نے ماحول کو معطر بھی کر رکھا تھا اور اداس بھی۔

☆☆☆

پردھان منتری کی رہائش گاہ کا ڈرائنگ روم سنہرے رنگوں سے سجا تھا۔ وہاں اسٹینڈز پہ کیمرے سیٹ تھے۔ فلیش کی تیز روشنی سامنے رکھی دو سنہری کرسیوں پہ پڑ رہی تھی۔

ایک پہ ایڈم بن محمد بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا ٹیب تھا جس سے پوائنٹس دیکھ کے وہ سنجیدگی سے سوالات پوچھ رہا تھا۔ وہ سیاہ پینٹ پہ سفید شرٹ پہنے آج کافی عام سے حلیے میں تھا۔ جیسے انٹرویو اتنی جلدی میں سیٹ ہوا ہو کہ اسے ڈھنگ سے تیار ہونے کا وقت نہ ملا ہو۔

وان فاتح اس کی نسبت انٹرویو کے لیے تیار لگتا تھا۔ سرمئی سوٹ میں ملبوس وہ بالکل مطمئن اور پر اعتماد تھا۔ ہلکی سی مسکراہٹ جواب دیتے ہوئے لبوں سے جدا نہیں ہو رہی تھی۔

"پی ایم صاحب... کیوں نا ہم ان ای میلز کی بات کر لیں جو اس وقت آپ کے لیے بہت بڑا مسئلہ بنی ہوئی ہیں۔"

فاتح کی بات ختم ہوتے ہی ایڈم بے چینی سے پہلو بدل کے بولا۔ پروڈیوسر اس کے کان میں بار بار زچ ہو کے کہہ رہا تھا کہ اسے اس وقت کے ہاٹ ٹاپک پہ آنا ہے جبکہ پردھان منتری اپنے "تعلیمی بل" سے آگے پیچھے نہیں جا رہے تھے۔ اب کے اس نے دوسری دفعہ سوال کیا تو فاتح نے ہلکے سے کندھے اچکائے۔

"ان ای میلز میں ملکی سلامتی کو خطرے میں ڈالنے والی کوئی بات نہیں تھی۔ البتہ ہم اس معاملے کی تحقیق کر رہے ہیں۔ جو بھی نتیجہ نکلا میں اس سے آپ سب کو آگاہ کروں گا۔"

"مگر سر... آپ ایک پرائیویٹ سرور استعمال کر رہے تھے جس کے بارے میں ناقدین کہہ رہے ہیں کہ یہ ایک غیر ذمہ دارانہ فعل تھا اور..."

"جیسا کہ میں نے کہا' جو بھی اس معاملے کا قصوروار نکلا اس کو سزا دی جائے گی۔"

اس کا لہجہ مضبوط تھا۔ ایڈم خاموش ہو گیا۔ پھر سر کو اثبات میں جنبش دی۔

"کیا آپ سوموار کی صبح واقعی تعلیمی بل پیش کرنے جا رہے ہیں۔"

"بالکل۔ اور میں اپنی پارٹی اور اپنے اتحادیوں سے کہنا چاہوں گا کہ اگر وہ میرے بل کے حق میں ووٹ نہیں دیں گے تو میرا نقصان نہیں کریں گے۔ اپنے بچوں کا کریں گے۔ اور پھر یہ لوگ عوام کو کیا منہ دکھائیں گے؟ بلکہ اپنے بچوں کا سامنا کیسے کریں گے؟ کیا ان کے بچے ان سے یہ نہیں پوچھیں گے کہ ایسا بل جو ان کی کالج ٹیوشن فیس کو ساٹھ فیصد تک کم کرنے جا رہا تھا' اس کا ساتھ انہوں نے کیوں نہیں دیا؟" وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

ایڈم بن محمد بور سا ہو کے اسے سنتے گیا۔

ڈائریکٹر نے کٹ کہا اور پروگرام ختم ہوا تو فاتح کالر پہ لگا مائیک احتیاط سے اتارنے لگا۔ ایڈم نے بغور اسے دیکھتے ہوئے اپنا مائیک اتارا۔

"آپ ای میلو کے سوال سے احتراز کر رہے تھے۔"

فاتح نے مسکرا کے کھڑے ہوتے ہوئے اسے دیکھا۔ "تم میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟"

"کم از کم ایسے نہ کرتا۔" ایڈم بھی ساتھ ہی اٹھا۔ مائیک اب دونوں سے دور تھا اور کیمرہ کریو پیک اپ میں لگا تھا۔ ملٹری سیکرٹری اور باڈی مین فاصلے پہ کھڑے پردھان منتری کو اس اینکر سے بات کرتے دیکھ رہے تھے۔

"It's very lonely at the top, Adam."

"میں جس دن فاتح کو جانتا ہوں وہ کوئی بات بے معنی نہیں کہتے۔" ایڈم نے سوچتے ہوئے سوال کیا۔ "ذمہ داران کو سزا دلوانے سے آپ کی کیا مراد تھی؟"

"تمہاری تو یادداشت کھو نہیں گئی تھی؟" فاتح نے مسکرا کے اسے سر سے پیر تک دیکھا۔

ایڈم نے آنکھیں گھمائیں اور برا منہ بنایا۔ "آئی وش۔" پھر توقف سے بولا۔ "ایک آخری بات۔"

وہ جو جانے کے لیے تیار تھا' رک کے اس کی بات سننے لگا۔

پیچھے کھڑے ملٹری سیکرٹری اور باڈی مین اب بے چینی سے اس اینکر کو گھور رہے تھے جس نے پی ایم کو روک رکھا تھا۔ ایڈم قدرے قریب ہوا اور آہستہ سے بولا۔

"آپ اس کیس کے سامنے ہار نہ مانیے گا۔ چے تالیہ اس عورت کو ڈھونڈ نکالیں گی اور وہ گواہی دے دے گی۔ آپ اس اسکینڈل سے بہت آرام سے بچ نکلیں گے۔"

"ایڈم۔" وہ مسکرایا۔ "آئی ڈونٹ نیڈ سیونگ۔ مجھے معلوم ہے مجھے کیا کرنا ہے۔"

"تو پھر آپ ان کو روک لیں۔" ایڈم نے آواز دھیمی کی۔ اس کی آنکھوں میں منت تھی۔ "ان کو اس ملک سے جانے نہ دیں۔ وہ یوں خوش نہیں رہیں گی۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ چے تالیہ خوش رہیں۔"

"یہ فیصلہ اس نے خود کرنا ہے۔" اسے فاتح کی مسکراہٹ اداس لگی تھی۔

"وہ آپ کے ساتھ زندگی شروع کرنا چاہتی تھیں لیکن وہ صرف اپنے بابا کے خط کی وجہ سے کشمکش میں چلی گئی ہیں۔ انہیں لگتا ہے ان کو مراد راجہ کی بددعا لگ چکی ہے اور انہیں خوش رہنے کا حق نہیں..."

"کیسا خط؟" فاتح کے ابرو تعجب میں اکٹھے ہوئے۔ ملٹری سیکرٹری کھنکھارتے ہوئے قریب آیا لیکن فاتح نے بنا مڑے ہاتھ اٹھا کے اسے روکا۔ وہ وہیں رک گیا۔

"ان کو ایک خط ملا تھا۔ جونکر اسٹریٹ والے مین ہول سے۔ وہ ان کے بابا کی طرف سے ہے جس میں سخت باتیں لکھی گئی ہیں۔"

"اور وہ کیسے اس کا یقین کر سکتی ہے؟"

"واقعی۔ انہیں ان باتوں پہ یقین نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ مراد راجہ نے صرف ان کو تکلیف دینے کے لیے لکھی تھیں اور..."

"وہ اس بات پہ کیسے یقین کر سکتی ہے کہ یہ خط اس کے باپ نے ہی لکھا ہے۔"

اس کے لہجے کی سنگینی محسوس کر کے ایڈم ٹھہر گیا۔ پھر ابرو اچکائے۔

"چے تالیہ کو اصل اور نقل ڈاکومنٹ کی پہچان ہے۔ اس زمانے کا کاغذ' مہر... پھر ان کے بابا کی لکھائی۔"

فاتح نے گہری سانس لی۔ "ایڈم... ہر انسان کی ایک کمزور کڑی ہوتی ہے جس سے اس کو دھوکا دیا جا سکتا ہے۔" وہ مدھم آواز میں کہنے لگا۔ "میری وہ کمزور کڑی تالیہ تھی ورنہ میں ییشا کو کبھی اپنے گھر میں جگہ نہ دیتا۔ وہ میرا بلائنڈ اسپاٹ تھی۔ تالیہ کا بھی ایک بلائنڈ اسپاٹ ہے۔ اس کا باپ۔ اس کے ماضی کا

گلٹ۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ کوئی دوسرا تالیہ کے گلٹ کے ساتھ کھیل نہیں رہا؟"

ایڈم اپنی جگہ سن رہ گیا۔

فاتح اسے سر کے خم سے شب بخیر کہہ کے آگے بڑھ گیا۔ اس کے سرکاری ملازم ایڈم کو گھورتے ہوئے اس کے پیچھے لپکے۔

ایڈم چند لمحے کھڑا اس کی باتوں کو ذہن میں دہراتا رہا۔ پھر تیزی سے فون نکالا اور اپنے گلے کو وہیں چھوڑ کے باہر آگیا۔

"داتن..." کچھ دیر بعد وہ پریشانی سے فون پہ کہہ رہا تھا۔ "وہ خط... وہ مراد راجہ نے نہیں لکھا۔ مجھے لگتا ہے وہ ذوالکفلی کی کوئی چال ہے۔ کیا آپ کسی طرح سے تالیہ کی تحویل سے وہ خط چرا سکتی ہیں؟"

"چور سمجھ رکھا ہے تم نے مجھے؟ اپنی دوست کے ہاں چوری کروں گی میں؟"

وہ بگڑ کے بولی۔

ایڈم نے فون کان سے ہٹا کے اسے گھورا اور دوبارہ کان سے لگایا۔

"یعنی آپ اسے پہلے ہی چرا چکی ہیں۔"

داتن ہنس دی۔ "ہاں۔ اس کا لفافہ میں نے چرا لیا تھا اور میں اپنے ایک دوست کی لیب پہ اسے کل رات دے بھی آئی تھی۔ وہ اس پہ کچھ ٹیسٹ کرے گا اور یہ بتائے گا کہ وہ خط قدیم زمانے کے کاغذ کا ہے یا نئے زمانے کا۔"

"کب بتائے گا؟"

"اب تک رپورٹ ریڈی ہو گئی ہو گی۔ لیکن میں تالیہ کے ساتھ اس کے آخری کون کا حصہ ہوں۔ میں تنکو کامل کے گھر کے باہر کار میں ہوں۔ تالیہ اندر ہے۔ ہم میشا کے ظاہر ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"مجھے لیب کا نام اور پتا ٹیکسٹ کرو۔ میں خود وہاں جاتا ہوں۔" وہ فکرمندی سے بولا۔ اسے اس لیب کی رپورٹ ابھی اسی وقت چاہیے تھی۔ اگر وہ تالیہ پہ یہ ثابت کر دیتا کہ وہ خط ذوالکفلی نے لکھا ہے نہ کہ مراد راجہ نے تو وہ اس کے گلٹ کو ختم کر سکتا تھا۔ وہ تالیہ کو یہ یقین دلا سکتا تھا کہ اسے اس کی ہیپی اینڈنگ ملے گی۔

☆☆☆

تنکو کامل کے گھر کے لان میں پارٹی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ رات کا اندھیرا آسمان کو سیاہ کیے ہوئے تھا لیکن لان کے درختوں پہ لگی روشنیوں کی لڑیوں نے اپنے تئیں سیاہی سے لڑنے کی پوری کوشش کی تھی۔ ایک طرف باربی کیو بن رہا تھا۔ دوسری جانب مہمان ٹولیوں کی صورت ہنستے مسکراتے گفتگو میں مصروف تھے۔

شیلا کامل نیلے گاؤن میں ملبوس مسکرا کے ایک مہمان سے دوسرے کی طرف جا رہی تھیں۔ ان کی گردن میں پڑا ہیروں کا نازک سیٹ جگمگا رہا تھا۔ گیٹ پہ سیکیورٹی کی بھاری تعداد موجود تھی۔ تالیہ نے سیکیورٹی اچھی رکھنے کو کہا تھا۔ اگر وہ کمزور ہوتی تو میشا کو شک ہو جائے گا۔ اسے چیلنج پسند تھا۔ چیلنج دیکھ کے وہ بہت خوشی سے ہار چرانے آئے گی۔

وہ آئے گی... وہ ضرور آئے گی۔ تالیہ اس وقت ایک کمرے میں بیٹھی تھی۔ کمرے میں اندھیرا تھا اور وہ کھڑکی کے ساتھ لگی بیٹھی باہر کی پر رونق پارٹی کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے سیاہ جمپ سوٹ پہن رکھا تھا۔ سر پہ سیاہ ٹوپی تھی۔ وہ اس اندھیرے کمرے میں خود کو بھی دکھائی نہ دیتی تھی۔ آنکھیں باہر لگی تھیں۔

دفعتاً اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور وہ خط نکالا۔ اس کا لفافہ وہ کھو چکی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اسے داتن نے چرایا ہو گا۔ خیر......

اس نے ایک دفعہ پھر خط پہ لکھی تحریر پڑھی۔ وہ اس تحریر کو کئی دفعہ پڑھ چکی تھی۔ ہر دفعہ یہ ایک نئی طرح سے اذیت دیتی تھی۔

مراد راجہ درست کہتا تھا۔ تالیہ دنیا کے کسی حصے میں بھی چلی جائے' اس کا دل محبت سے خالی رہے گا۔ بالکل بنجر۔

اس کی آنکھوں سے ایک آنسو نکلا اور خط پہ ٹپکا۔ جہاں "تمہارا باپ" لکھا تھا' وہ ان الفاظ پہ گرا اور انہیں بھگو گیا۔ اس نے انگلیوں سے ان بھیگے لفظوں کو چھوا۔ وہ جیسا بھی تھا اور وہ جیسی بھی تھی... وہ

باپ بیٹی تھے۔
اس نے خط تہہ کر کے جیب میں ڈال لیا۔ اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ ادھر ادھر پھرتی شیلا کی گردن میں نیکلیس ابھی تک موجود تھا۔ یشا ابھی نہیں آئی تھی۔

☆☆☆

"یہ کاغذ عام کاغذوں سے بالکل مختلف ہے۔ عجیب بات ہے کہ ایسی چیز میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔"

لیب میں نیلی سفید بتیاں جلی ہوئی تھیں۔ ایک سفید کوٹ میں ملبوس ادھیڑ عمر آدمی ایڈم کو بتا رہا تھا۔ دونوں ایک میز کے اطراف میں کھڑے تھے جس پہ چند مشینیں رکھی تھیں۔ خط کا لفافہ بھی وہیں ایک ٹرے میں رکھا تھا۔

"آج کل کاغذ لکڑی کے گودے (pulp) سے بنایا جاتا ہے۔ جبکہ یہ کاغذ linen rags سے بنایا گیا ہے۔ جیسے پرانے زمانے کے کاغذات ہوتے تھے۔ اور یہ خالص موم کی مہر ہے۔ اور یہ دھاگا... یہ سنتھیٹک نہیں ہے۔ یہ سب آج کل نہیں ملتا۔ لیکن..."

ایڈم کی امید بڑھی۔ تیزی سے پوچھا۔ "لیکن؟"

"لیکن ایسے خطوط ہمیشہ لمبنگ ہوتے تھے۔ وہ کئی سو برس پرانے ہوتے ہیں۔ میں یہ نہیں سمجھ پا رہا کہ یہ خط age کیوں نہیں ہوا۔ یہ نیا نکور ہے۔"

ایڈم کا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ "ایسے جیسے کسی نے قدیم زمانے سے اسے کوریر کیا ہو۔ اور یہ ہمارے پاس پہنچ گیا ہو۔ ایج ہوئے بغیر۔"

"بالکل۔ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔" وہ پرجوش سے انداز میں بولا۔ ایڈم کے چہرے پہ پھیلی مایوسی چھپی نہ رہ سکی۔

"یعنی یہ کوئی فورجری نہیں ہے۔ یہ قدیم زمانے کا کاغذ ہے۔ اس کو نئے زمانے میں بنانے کی کوشش نہیں کی گئی۔"

"بنا تو ظاہر ہے اسی زمانے میں ہے۔ قدیم زمانے کا ہوتا تو کئی سو برس پرانا ہوتا۔"

"واٹ ایور۔" وہ تکان سے بولا۔ وہ وقت کے چکر اس شخص کو نہیں سمجھا سکتا تھا۔

"ویسے آپ کو یہ کہاں سے ملا؟"

"یہ اہم نہیں ہے۔ میں چلتا ہوں۔" ایڈم نے گھڑی دیکھی اور ہاتھ بڑھا کے لفافہ اٹھالیا۔

"تو... تو... اس کو ہاتھ نہ لگاؤ۔" اس نے ایسے کرنٹ کھا کے کہا کہ ایڈم نے جھٹکے سے لفافہ چھوڑ دیا۔ وہ نیچے جا گرا۔ ڈاکٹر جھکا اور دستانے والے ہاتھ میں ٹویزر پکڑے احتیاط سے اسے اٹھایا اور سیدھا ہوا۔

"اس میں ایسا کیا ہے؟" وہ تعجب سے بولا۔

ڈاکٹر نے لفافہ زپ لاک بیگ میں ڈالا اور سنجیدہ چہرہ اوپر اٹھایا۔

"یہ زہریلا ہے۔"

ایڈم بن محمد کو لگا.. وہ اگلا سانس نہیں لے سکے گا۔

"زہریلا؟ یہ کاغذ زہریلا ہے؟"

"کاغذ نہیں۔ اس پہ جو الفاظ لکھے ہیں "پتری تاشہ بنت مراد کے نام" وہ زہریلے ہیں۔ میں نے اس کی روشنائی کو ٹیسٹ کیا ہے۔ روشنائی نہ صرف سنتھیٹک ہے یعنی کسی فیکٹری میں بنی ہے بلکہ زہریلی بھی ہے۔"

"اس کے اندر موجود سارا خط اسی روشنائی سے لکھا گیا تھا۔" وہ چونک چونک گیا۔ دل زور سے دھڑکا۔ "یہ کس قسم کا زہر ہے؟"

ڈاکٹر نے جھرجھری سی لی۔

"یہ تو ہم ابھی تک معلوم نہیں کر سکے۔ قوی امکان ہے کہ یہ کسی زہریلے پودے سے اخذ کیا گیا ہے۔ یہ صرف گیلا ہونے پہ اثر کرتا ہے۔ سائنائیڈ سے ملتا جلتا ہے لیکن سائنائیڈ نہیں ہے۔ یہ جلد کے ذریعے جسم میں داخل ہوتا ہے۔ انگلیوں سے اندر جاتا ہے اور آہستہ آہستہ دل بند کر دیتا ہے۔ یہ ایک عجیب طرح کا زہر ہے جس سے پچھلے تین برس میں چار ہلاکتیں ہوئی ہیں۔ میں نے اس کے اجزا کو پولیس ریکارڈ سے میچ کیا تھا۔ یہ بالکل وہی زہر ہے۔"

"اور یہ چار ہلاکتیں کن کیسز میں ہوئی تھیں؟" وہ دم بخود تھا۔

"چاروں دفعہ ہیرے یا قیمتی زیورات چرائے گئے تھے۔ یوں لگتا ہے اس زہر کو استعمال کرنے والا کوئی گرفتر یا چور ہے جو اپنے شکار کو ایسی تحریر بھیجتا ہے جو اس کو ڈھیر سے ڈھیر سے مار دے۔"

ایڈم نے بے اختیار میز کا کونا تھاما۔ اس کی رنگت سفید پڑ رہی تھی۔

"آپ نے کہا یہ گیلا ہونے پہ اثر کرتا ہے؟"

"ہاں۔ سوکھے کاغذ کو چھونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن اگر یہ روشنائی بھیگ جائے اور اسے ہاتھ لگا لو تو ایک سے دو گھنٹے کے اندر موت واقع ہو جاتی ہے۔ تکلیف دہ موت۔" وہ افسوس سے کہہ رہا تھا۔

ایڈم کو لیب کی سفید ٹیوب لائٹس اپنے سر پہ گھومتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

"کیا... کیا اس زہر کا کوئی تریاق ہے؟"

"ابھی تک اس زہر کا شکار کوئی مریض بروقت اسپتال نہیں لایا جا سکا۔ ہر دفعہ وقت گزر چکا ہوتا تھا۔"

وقت... ایڈم نے گھڑی دیکھی... سارے کھیل وقت کے تھے۔

وہ اگلی بات سنے بغیر بے اختیار باہر بھاگا.... اس کے ماتھے پہ پسینہ آ رہا تھا اور اسے زمین آسمان گھومتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ ساتھ ہی وہ تیزی سے تالیہ کا نمبر ملا رہا تھا لیکن وہ فون نہیں اٹھا رہی تھی۔

ذوالکفلی نے تالیہ مراد سے بدلہ اس خط کے ذریعے لے لیا تھا۔

☆☆☆

وہ ابھی تک اس اندرونی کمرے میں بیٹھی تھی۔

کمرہ اندھیر تھا اور وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ پارٹی زور و شور سے جاری تھی۔ مدھم موسیقی پس منظر میں بج رہی تھی۔

لان کی گھاس پہ مہمان ٹولیوں کی صورت میں بکھرے تھے۔ ملازم برتن لگاتے ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ ہر طرف قمقموں اور پھولوں سے سجاوٹ کی گئی تھی۔ بغیر چیک کیے کسی مہمان کو اندر آنے نہیں دیا جا رہا تھا۔ وہ ہر نئے مہمان پہ نظر رکھے ہوئے تھی۔ میشا یقیناً کسی مہمان کے روپ میں آئے گی وہ جانتی تھی۔ تالیہ نے پولیس یا کسی پرائیوٹ سکیورٹی کا خطرہ مول نہیں لیا تھا۔ میشا کو شک ہو جاتا اور وہ نہ آتی۔ اس کو معلوم تھا کہ میشا کے لیے ایک وہی کافی تھی۔

اور تب ہی اس نے وہ آواز سنی۔

کسی جانور کے رونے کی آواز۔

کسی خواب کی سی کیفیت میں تالیہ نے چہرہ موڑا۔ اندھیرے کمرے کے دوسرے سرے پہ وہ کھڑا تھا۔

ایک سفید ہرن۔

اس کے ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔

اس کی بڑی بڑی سبز آنکھیں تالیہ پہ جمی تھیں۔

وہ ننھے غزال کی آنکھوں میں دیکھتی گویا مبہوت ہو گئی۔ پھر وہ پلٹ گیا۔ وہ بے خودی اٹھی اور اس کی جانب قدم بڑھائے۔ لیکن وہ دھیرے دھیرے اندھیرے میں تحلیل ہو گیا۔

تالیہ نے پلکیں جھپکائیں۔ ادھر ادھر دیکھا۔ وہ اب وہاں نہیں تھا۔

کیا وہ ایسی چیزیں دیکھنے لگی تھی جن کا وجود نہیں تھا؟ یہ اس کے خوابوں جیسا معاملہ نہ تھا۔ یہ کچھ اور تھا۔

اس کے سر میں ایک دم سے درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ اس نے کنپٹی کو مسلا اور واپس کھڑکی کی طرف آئی۔ متلاشی نظروں سے مسز شیلا کو ڈھونڈا۔ وہ ایک طرف گھڑی پہنتے ہوئے کسی مہمان سے بات کر رہی تھی۔ اس کی گردن خالی تھی۔

تالیہ نے بے چینی سے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ وہ تیزی سے دروازے کی سمت بھاگی۔ لاؤنج دوڑتے ہوئے عبور کیا۔ پھر لان میں آئی اور سیدھی مسز شیلا کے سر پہ پہنچی۔

اسے دیکھ کے وہ حیران رہ گئی۔ پھر ادھر ادھر دیکھا۔ "کیا ہوا؟"

تالیہ نے اس کا بازو تھاما اور اسے مہمانوں سے ذرا فاصلے پہ لے گئی۔

"آپ کا نیکلیس کہاں ہے؟"

شیلا نے فوراً گردن پہ انگلیاں رکھیں۔ پھر اسے ٹٹولا۔ گردن خالی تھی۔ اس کی آنکھیں بے یقینی سے پھیلیں۔

"ابھی... ابھی تو میری گردن میں تھا۔ اوہ گاڈ۔" اس نے پریشانی سے ادھر ادھر دیکھا۔

"مسز شیلا... مجھے یاد کر کے بتائیں... ابھی دو منٹ پہلے وہ آپ کی گردن میں تھا۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تیزی سے بولی۔ ہیشا دور نہیں گئی ہوگی۔ "ان دو منٹ میں کوئی آپ سے ٹکرایا ہے؟"

شیلا چونکی۔ "ہاں... وہ کوئی ویٹرس تھی۔ اس کے پاس گلاسز کی ٹوکری تھی۔ اس کے گلاس گرتے گرتے بچے... لیکن مجھے علم ہوئے بغیر کوئی میرا نیکلیس کیسے اتار سکتا ہے؟"

"وہ کس طرف گئی ہے؟" وہ پھولتے سانس سے بولی۔ سر میں درد بڑھتا جا رہا تھا۔

"شاید اس طرف۔" شیلا نے پریشانی سے ایک سمت میں اشارہ کیا۔ تالیہ نے گردن اٹھا کے دیکھا۔ وہاں باربی کیو ہو رہا تھا اور دوسرے بہت سے یونیفارم والے ملازم کھڑے کام کر رہے تھے۔

وہ تیزی سے اس طرف لپکی۔

"کیا کسی نے ایک ویٹرس کو دیکھا ہے جس کے پاس گلاسز کی ٹوکری تھی؟" اس نے تیزی سے پوچھا۔ دو ویٹرز نے ایک ساتھ کہا۔

"کون سارہ؟ وہ کچن کی طرف گئی ہے۔ اس نے..."

تالیہ تیزی سے اس طرف بھاگی۔ ہیشا اتنے لوگوں کے باعث تیزی سے نہیں بھاگی ہوگی۔ وہ آہستہ سے نکلی ہوگی۔ اسے معلوم تھا۔

جس لمحے وہ کچن میں پہنچی اس نے ایک جھلک دیکھی۔ سفید اور سیاہ ویٹرس یونیفارم پینٹری کی طرف غائب ہوا تھا۔

تالیہ نے رفتار کم کی اور دبے قدموں چلتی پینٹری تک آئی۔ پینٹری خالی تھی اور اسی پل عقبی دروازہ بند ہوتا دکھائی دیا۔

شاید اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اس کے تعاقب میں کوئی آرہا ہے۔

تالیہ تیزی سے دروازے سے باہر نکلی۔ عقبی دیوار پھلانگ کے سیاہ سفید یونیفارم غائب ہوا تھا۔

تالیہ نے دیوار پہ دونوں ہاتھ رکھے۔ اطراف میں اندھیرا تھا یا اسے محسوس ہو رہا تھا۔ دھند سی تھی جو چھا رہی تھی۔ اس نے پلکیں جھپکائیں۔ دھند چھٹنے لگی۔ یہ کیا ہو رہا تھا؟

اس نے دیوار پہ رکھے اپنے ہاتھ دیکھے۔ اس کے ناخنوں کا رنگ بدل رہا تھا۔ مگر اس نے سر جھٹکا۔ اور جوگر دیوار پہ رکھا۔ پوری قوت لگا کے اوپر چڑھی۔ پھر دوسری طرف پھلانگ دی۔

اس کے جوتوں کے زمین پہ لگنے کی آواز دھپ سے آئی۔

تالیہ توازن برقرار نہ رکھ سکی اور نیچے کو لڑھکی۔ ہتھیلیوں کے بل خود کو گرنے سے سنبھالنا چاہا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔

وہ گلی تاریک تھی۔ سیدھ میں جاتی اور دائیں جانب مڑ جاتی۔ اطراف میں اونچی دیواریں تھیں اور مخالف سمت میں سڑک۔

وہاں بس ایک اسٹریٹ لائٹ تھی جس کی روشنی ناکافی تھی۔ کچرے کا ایک ڈمپسٹر تالیہ کے قریب رکھا تھا۔ وہ ہتھیلیوں اور گھٹنوں کے بل زمین پہ جھکی تھی۔ سر تک نہیں اٹھایا جا رہا تھا۔ اس کی حد نگاہ میں گلی کا پکا فرش تھا۔ بہ وقت اس نے نظریں ذرا کی اٹھائیں۔

گلی کے دوسرے سرے پہ سفید سیاہ اسکرٹ والی لڑکی کے سیاہ جوتے رک گئے تھے۔ پھر اسے وہ جوتے گھومتے دکھائی دیے۔ وہ واپس اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔

وہ بہ دقت زور لگا کے سیدھی ہوئی۔ اب اس کے گھٹنے زمین پہ تھے اور چہرہ سامنے۔ وہ دیکھ سکتی تھی کہ ہیشا دوسرے کونے سے مڑ کے واپس آرہی تھی۔

آہستہ آہستہ۔

آخری قسط ان شاء اللہ آئندہ ماہ

خالدہ جیلانی

شاہین سلمیٰ ——— کراچی

رفیقوں سے رقیب اچھے جو جل کر نام لیتے ہیں
گلوں سے خار بہتر ہیں جو دامن تھام لیتے ہیں

اقراء عمر ملک ——— وہاڑی

یہ زندگی تو مجھے تیرے پاس لے آئی
یہ راستہ تو کہیں اور جایا کرتا تھا

مختاراں فضل رانا ——— کبیر والا

دیارِ حسن میں تجدیدِ عاشقی کے لیے
ہم ایسے لوگ ضروری ہیں ہر صدی کے لیے

ثنا اسلم، ثانیہ اسلم ——— [illegible]

نہ سوال سود و زیاں کا کر، وہ کیا جو مجھ کو ملا نہیں
میرے ہمسفر تو یقین کر، مجھے تجھ سے کوئی گلہ نہیں
ہیں تیرے کرم کی ہی بارشیں جو سدا ہیں میرے حال پر
کروں تجھ سے گلہ بھی، یہ محبتوں کا مسئلہ نہیں

آسیہ جاوید ——— علی پور چٹھہ

میرے شہر تجھ کو یہ کیا ہوا
تیرے سارے منظر بکھر گئے
وہ جو رونقیں تھیں دھواں ہوئیں
وہ جو لوگ تھے، وہ کدھر گئے

فائزہ بھٹی ——— پتوکی

تیرے لہجے سے مہکتا ہے میرے لفظوں کا
تیری آواز بھی خوشبو کا سفر لگتی ہے

ثمینہ ملک، ہما ملک ——— وہاڑی

تمہیں جب کبھی ملیں فرصتیں، میرے دل سے بوجھ اتار دو
میں بہت دنوں سے اداس ہوں، مجھے کوئی شام ادھار دو
کسی اور کو میرے حال سے نہ غرض ہے کوئی نہ واسطہ
میں بکھر گئی ہوں سمیٹ لو، میں بگڑ گئی ہوں سنوار دو

عائشہ، تحریم ——— گوجرہ

میں سوچتا ہوں کوئی حد نہیں محبت کی
ترے خیال کے سب دائرے بکھرے ہیں

[illegible] نعیم ——— کراچی

کبھی نغمۂ آرزو، کبھی زندگی کی پکار ہم
کبھی خاکِ کوچۂ یار ہم، کبھی شہر یارِ بہار ہم

ندا طارق ——— فیصل آباد

پتا نہیں وہ اب کس مقام پر ہو گا
سنا ہے لوگ مسافت سے تیز چلتے ہیں

فضہ طلال ——— ڈیفنس کلفٹن

دل کے سب نقش تھے ہاتھوں کی لکیروں جیسے
نقش پا ہوتے تو ممکن تھا مٹا سکتے چلتے

نادیہ یاسر ——— حیدرآباد

سنا بجا ہے بہاروں کا اب وہیں تانا
جہاں رکا تھا میں، کانٹے نکالنے کے لیے

منیبہ شہزاد ——— باغ آزاد کشمیر

اپنا اپنے دل کے اندر سمٹے ہوئے ہیں ہم دونوں
گم صم گم صم میں بھی ہوں، کھویا کھویا تو بھی ہے
ہم دونوں کی تجدید رفاقت کر لیتے تو اچھا تھا
تنہا تنہا میں بھی ہوں — ہاں تنہا تنہا تو بھی ہے

آمنہ عمران ——— کراچی

کیا روپ دوستی کا، کیا رنگ دشمنی کا
کوئی نہیں جہاں میں، کوئی نہیں کسی کا
اک تنکا آشیانہ، اک راگنی اثاثہ
اک موسم بہاراں، مہمان دو گھڑی کا

عروج ادریس ——— کورنگی

سر بازار اس کو آج بکتا میں نے دیکھا ہے
جو کہتا ہے محبت میں مجھے کھونا نہیں آتا

صائمہ سلیم ——— کے ڈی اے سوسائٹی

قاتل کی یہ دلیل بھی منصف نے مان لی
مقتول خود گرا تھا خنجر کی نوک پر

اسس عالمِ ویراں میں کیا انجمن آرائی
دو روز کی محفل ہے اک عمر کی تنہائی

پھیلی ہیں فضاؤں میں اس طرح تری یادیں
جس سمت نظر اٹھی آواز تری آئی

اک ناز بھرے دل میں یہ عشق کا ہنگامہ
اک گوشۂ خلوت میں یہ دشت کی پہنائی

اوروں کی محبت کے دہرائے ہیں افسانے
بات اپنی محبت کی ہونٹوں پہ نہیں آئی

افسونِ تمنا سے بیدار ہوئی آخر
کچھ حسن میں بے تابی کچھ عشق میں زیبائی

وہ مست نگاہیں ہیں یا وجد میں رقصاں ہے
تسنیم کی لہروں میں فردوس کی رعنائی

ان مدھ بھری آنکھوں میں کیا سحر تبسم تھا
نظروں میں محبت کی دنیا ہی سمٹ آئی

صوفی تبسم

متاعِ شام سفر بستیوں میں چھوڑ آئے
بجھے چراغ ہم اپنے گھروں میں چھوڑ آئے

ہم اپنی دربدری کے مشاہدے اکثر
نصیحتوں کی طرح کم سنوں میں چھوڑ آئے

بچھڑ کے تجھ سے چلے ہم تو اب کے یوں بھی ہوا
کہ تیری یاد کہیں راستوں میں چھوڑ آئے

ہوا ہی دن میں پرندے اڑائے پھرتی ہے
ہوا ہی پھر سے انہیں گھونسلوں میں چھوڑ آئے

کسے خبر ہے کہ زخمی غزال کس کے لیے
نشاں لہو کے گھنے جنگلوں میں چھوڑ آئے

اڑیں گے کیا وہ پرندے جو اپنے رزق سمیت
سفر کا شوق بھی ٹوٹے پروں میں چھوڑ آئے

سدا سکھی رہیں چہرے وہ ہم جنہیں محسن
بجھے گھروں کی کھلی کھڑکیوں میں چھوڑ آئے

محسن نقوی

میں شاعر ہوں تو اکثر لوگ مجھ سے
پوچھتے ہیں اس
حسین اسرار کے بارے میں کہ بتائیں تو یہ بھلا
کیا ہے
محبت آخر شے کیا ہے؟
دمی میں ہنس کے کہتا ہوں
کسی پیاسے کو اپنے حصے کا پانی پلانا بھی
محبت ہے
سمندر میں ڈوبتے کو ساحلوں تک لے کے
جانا بھی محبت ہے
کہیں ہم راز سارے کھول سکتے ہوں مگر پھر بھی
کسی کی بے بسی کو دیکھ کر خاموش رہ جانا
محبت ہے
کسی کے واسطے جبراً ہی ہونٹوں پر ہنسی لانا
محبت ہے
کہیں بارش میں بھیگے بلی کے بچے کو
ذرا سی دیر کو گھر لے کے آنا بھی محبت ہے
کوئی چڑیا جو کمرے میں بھٹکتی آن نکلی ہو تو اس
چڑیا کو پنکھے بند کر کے
راستہ باہر کا دکھلانا محبت ہے
محبت کے ہزاروں رنگ، لاکھوں استعارے ہیں
کسی بھی رنگ میں ہو یہ
مجھے اپنا بناتی ہے
یہ میرے دل کو بھاتی ہے

دمی شاہ

میں شام ہجر کو رنگ وصال دیتا ہوں
اندھیری رات کو مشکل میں ڈال دیتا ہوں

وہ دن کی لو میں جب آتی ہے مجھ سے ملنے
میں سائے تک کو بدن سے نکال دیتا ہوں

نکل ہی آئیں گے گھر سے کہیں ترے وعدے
جو ٹوٹنے کی ہوں چیزیں سنبھال دیتا ہوں

میں تم سے ہار بھی جاؤں تو جیت لوں تم کو
اگر قبول ہے سکہ اچھال دیتا ہوں

اسد نعیم

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جو شخص اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ اچھی بات کہے یا خاموش رہے۔"

انصاف،

سب سے بڑی چیز، جس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حکومت کو مقبول عام بنا دیا اور جس کی وجہ سے اہل عرب ان کے سخت احکام کو بھی گوارا کر لیتے تھے۔ یہ تھی کہ ان کا عدل و انصاف ہمیشہ بے لاگ رہا۔ جس میں دوست دشمن کی کچھ تمیز نہ تھی۔

ممکن تھا کہ لوگ اس بات سے ناراض ہوتے کہ وہ جرائم کی پاداش میں کسی کی عظمت و شان کا مطلق پاس نہیں کرتے لیکن جب وہ لوگ یہ دیکھتے تھے کہ خاص اپنی آل اولاد اور عزیز و اقارب کے ساتھ بھی ان کا یہی برتاؤ ہے تو لوگوں کو صبر آجاتا تھا۔ ان کے بیٹے ابو شحمہ نے جب شراب پی تو خود اپنے ہاتھ سے اسی کوڑے مارے اور اس صدمے سے وہ بے چارے قضا کر گئے۔

صبر و سکوت،

حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں ایک شخص نے ایک خوبصورت اور خوشنما پرندہ خریدا۔ اسے جب پنجرے میں ڈالا تو ایک اور پرندہ اڑتا ہوا اس پنجرے کے اوپر آیا اور اپنی زبان میں کچھ بول کر چل دیا۔ اس کے بعد اس قیمتی پرندے نے پنجرے میں بولنا بند کر دیا اور بالکل چپ سادھ لی۔ مالک نے یہ دیکھا تو حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس فریاد لے کر پہنچا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے پنجرہ منگوایا اور پرندے سے پوچھا۔
"تمہارے مالک نے تمہیں قیمت دے کر خریدا ہے۔ اس کا تم پر حق ہے۔ تم نے بولنا کیوں بند کیا؟"

پرندے نے جواب دیا۔ "حضور! اس سے کہہ دیجیے کہ میرا خیال چھوڑ دے۔ میں جب تک پنجرے میں بند ہوں، کبھی نہ بولوں گا۔"
فرمایا۔ "کیوں؟"
اس نے کہا۔ "حضور! میں وطن اور اولاد کی محبت میں روتا تھا کہ میرے ایک بھائی نے آکر کہا، "ناداں! رونے دھونے کو چھوڑ ورنہ عمر بھر پنجرے میں ہی قید رہے گا۔ صبر و سکوت اختیار کر، دیکھ تو کیا ہوتا ہے کہ نہیں۔"

سلیمان علیہ السلام نے اس شخص سے پرندے کا جواب بیان کیا تو اس نے کہا۔
"پھر اسے آزاد کر دیجیے۔ میں نے تو اسے خوش نوائی کے لیے خریدا تھا۔"
چنانچہ سلیمان علیہ السلام نے اپنی گرہ سے قیمت دے کر پرندے کو آزاد کر دیا۔

مہکتے الفاظ،

* کسی کو اتنی عزت بھی نہ دو کہ وہ آپ کی بے عزتی کرنا اپنا حق ہی سمجھ لے۔
* تقریباً اٹھارہ ہزار مخلوقات میں سے صرف انسان ہی پیسہ کماتا ہے۔ کوئی مخلوق کبھی بھوکی نہیں رہتی اور انسان کا کبھی پیٹ نہیں بھرتا۔

- اچھے لوگوں کو ٹھکرا دو گے تو وہ ٹوٹیں گے نہیں۔ لیکن پھسل کر تمہاری زندگی اور ہاتھ سے دور چلے جائیں گے۔
- گھڑی وقت بتاتی ہے اور وقت لوگوں کی اوقات۔
- محبت اور عزت کا کوئی مقابلہ نہیں لیکن کبھی کسی ایک کو چننا پڑے تو عزت، پھر عزت، ہر بار عزت ہے۔
- ویسے تو لیکن کچھ بتو! کیونکہ لوگ وقت کے ساتھ خیریت کے بجائے حیثیت پوچھنے لگتے ہیں۔
- کسی رشتے کو کتنی ہی محبت سے باندھا گیا ہو، اگر عزت اور لحاظ چلا جائے تو محبت بھی چلی جاتی ہے۔

حرا ملک ۔ وہاڑی

ققنس

ققنس کا ذکر قدیم یونانی، مصری اور چینی روایتوں سے ملتا ہے۔ یہ نہایت خوبصورت پرندہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس پرندے کی عمر نہایت طویل ہوتی ہے۔

مشہور ہے کہ یہ ہر قسم کا راگ گاتا ہے۔ اس کی چونچ میں تین سو ساٹھ سوراخ ہوتے ہیں۔ جب مرنے کے قریب ہوتا ہے تو سوکھی لکڑیاں جمع کر کے ان میں بیٹھ کر ایسا گیت گاتا ہے جس کی وجہ سے اس کی چونچ سے چنگاریاں نکلنے لگتی ہیں۔ جس سے لکڑیوں میں آگ لگ جاتی ہے اور یہ جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ جب راکھ پر مینہ برستا ہے تو اس راکھ سے انڈا پیدا ہوتا ہے اور اس میں سے پھر ققنس پیدا ہوتا ہے۔

دیباچہ لکھنا

ایک زمانہ تھا جب دیباچہ لکھنا خاصا مشکل کام تھا۔ اس کا ہمیں خود تجربہ ہے۔ دو چار کتابوں پر دیباچے لکھنے کا اتفاق ہوا۔ ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ کسی کتاب پر دیباچہ لکھنا اور پہاڑ کھودنا ایک ہی جیسے کام ہیں کیونکہ دیباچہ نگار کو کتاب کی خوبیاں تلاش کرنا پڑتی ہیں، جو اس میں نہیں ہوتیں۔

(مشفق خواجہ - سخن در سخن)

خوشبو جیسی باتیں

- جب عمر رفتہ کا غبار جھریوں میں ڈھل جاتا ہے تو یہ معلوم کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ خوشیاں کہاں کہاں سجائی گئیں۔
- جتنا کسی کا ساتھ پرانا ہو، اتنا ہی اس کی بے وفائی کے لیے تیار رہنا چاہیے کیونکہ تبدیلی کائنات کا خمیر ہے۔
- محبت کے بغیر ہر حق ایسے ملتا ہے جیسے بھکاری کو بھیک ملتی ہے۔
- زخم ہمیشہ اسی سے ٹھیک ہوتے ہیں جو انہیں عنایت کرتا ہے لیکن کبھی کبھی، تو یہ اس کے بس کی بھی بات نہیں رہتی۔
- ہر رابطے، رشتے اور تعلق کی ایک متعین عمر ہوتی ہے۔ اس دوران بھی جوانی، بڑھاپا آتا ہے۔ مزاج، ترجیح اور پسند مختلف ہو تو سارے تعلق اور محبتیں بھی عمر سے پہلے اپنی عمر پوری کر لیتے ہیں۔

پریشانی

ایک دفعہ جہاں زیب سلیم سے ملنے ان کے دفتر گئے۔ ابھی سلیم نے ان کے لیے چائے منگوائی ہی تھی کہ بارش شروع ہو گئی۔ جہاں زیب بڑے مضطرب سے نظر آئے۔ سلیم کے پلے کچھ نہ پڑا کہ بارش شروع ہونے سے جہاں زیب اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہیں۔ بالآخر سلیم نے پوچھ ہی لیا۔

جہاں زیب صاحب نے کہا۔ "آپ کی بھابھی صدر گئی ہوئی ہیں اور بارش شروع ہو گئی۔"

"تو اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ کوئی بچی تو نہیں ہیں کہ بارش میں بھیگ جائیں گی۔ بارش سے بچنے کے لیے کسی نہ کسی شاپنگ مال میں چلی جائیں گی۔" سلیم نے تسلی دی۔

"یہی تو پریشانی کی بات ہے۔" جہاں زیب صاحب نے جیب پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

سیکیورٹی،

ایک وزیر صاحب نے گوشت مارکیٹ کا دورہ کیا اور انتہائی صاف شفاف مارکیٹ میں چہل قدمی کرتے ہوئے ایک قصائی کے پاس جا کر کھڑے ہوئے اور اس سے بات چیت کے بعد اس کے پاس موجود صاف گوشت دیکھ کر تعریف کی اور پوچھا۔

"گوشت تو خوب بکتا ہوگا؟"

"گوشت تو واقعی اچھا ہے لیکن ابھی تک صبح سے ایک کلو بھی فروخت نہیں ہوا۔" قصائی نے جواب دیا۔

"وزیر: "فروخت نہ ہونے کی کیا وجہ ہے؟"

قصائی: "کیونکہ آپ کے آنے کے سبب خریداروں کو مارکیٹ آنے ہی نہیں دیا گیا۔"

وزیر: "اوہو پھر تو میں چار کلو خرید لوں گا۔"

قصائی: "میں آپ کو گوشت نہیں دے سکتا۔"

وزیر: "کیوں؟"

قصائی: "کیونکہ آپ کی حفاظت کے لیے ہم سے چھریاں لے لی گئی ہیں۔"

وزیر: "تم بغیر کاٹے ہی مجھے دے سکتے ہو۔"

قصائی: "نہیں میں نہیں دے سکتا۔"

وزیر: "کیوں؟"

قصائی: "کیونکہ میں سیکیورٹی ادارے کا افسر ہوں قصائی نہیں۔"

وزیر: "(غصے سے) جاؤ فوری طور پر اپنے سینئر افسر کو بلا کر لاؤ۔"

قصائی: "سوری سر! ایسا نہیں ہو سکتا۔"

وزیر: "کیوں؟"

قصائی: "کیونکہ سامنے والی دکان پر وہ مچھلی فروخت کر رہے ہیں۔"

نادیہ یاسر۔ گوجر خان

غور و فکر کی باتیں،

- فیشن اور رشتہ دونوں نازک ہوتے ہیں شیشہ غلطی اور رشتہ غلط فہمی سے ٹوٹتا ہے۔
- برے سلوک کا بہترین جواب اچھا سلوک ہے اور جہالت کا بہترین جواب خاموشی ہے۔
- اچھی کتابیں اور اچھے لوگ فوراً سمجھ میں نہیں آتے انہیں سمجھنا پڑتا ہے۔
- زندگی میں دو باتیں یاد رکھیں۔
1. جب غصہ آئے، تب کوئی فیصلہ مت کریں۔
2. جب خوش ہوں، تب کوئی وعدہ مت کریں۔
- دوسروں کے بھلے ہونے کا انتظار نہ کریں بلکہ اچھا بن کر دکھائیں کہ اچھا انسان کیسا ہوتا ہے۔
- طاقت کی ضرورت تب ہوتی ہے جب کچھ برا ہو، ورنہ دنیا میں سب کچھ پانے کے لیے آپ کا عمل، اخلاق و کردار ہی کافی ہے۔
- شریعت کی پابندی ہے ورنہ امیر لوگ اپنے حصے کی نمازیں بھی غریب کو اجرت دے کر پڑھواتے۔

فہمیدہ جاوید۔ ملتان

اے کاش،

کسی عورت کو دیکھ کر کیا تمہارے دل میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ کاش تمہاری شادی نہ ہوئی ہوتی؟" ایک شخص نے اپنے دوست سے کہا۔

"کیوں نہیں، سو فیصد ہوتی ہے۔" دوست نے فوراً جواب دیا۔

"اچھا! بھلا بتاؤ تو کسے؟" اس شخص نے دلچسپی سے پوچھا۔

"اپنی بیوی کو۔" دوست نے منہ بسورتے ہوئے جواب دیا۔

شبانہ عندلیب۔ گوجرانوالہ

بقیہ ہمارے نام

جہاں تک عالم کے بارے میں بہنوں کی آرا کا تعلق ہے تو ہماری بہت سی بہنیں اسے پسند بھی کرتی ہیں

اور وہ اس کا اظہار بھی کرتی ہیں۔ اسی طرح کچھ بہنوں کو یہ ناول پسند نہیں ہے تو انہیں بھی اظہار کا حق حاصل ہے۔ عالم کی اقساط کے بارے میں بیج کا شکریہ۔

ثانیہ بلال..... عالی والا

آپی مجھے جنوری 2021 کا خواتین نہیں ملا۔ میں بہت اداس ہوں۔ میرا رسالوں سے بہت پرانا رشتہ ہے۔ میں نے خواتین عالم کی پہلی قسط سے پڑھنا شروع کیا اور اب تک پڑھ رہی ہوں۔ میں کھانے کے بغیر زندہ رہ سکتی ہوں لیکن رسالوں کے بغیر نہیں۔ راحت جبیں کا نیا ناول بہت ہی اچھا ہے۔ عفت سحر طاہر کا ناول بہت چٹکیاں کرتا ہے۔ ''رقص شرر'' بہت ہی مزے دار ناول ہے۔ عدنان بھائی کے مشورے بہت اچھے ہوتے ہیں۔ اور آپ نے کہا تھا کہ آپ کے پاس مرحومہ ''آسیہ رزاقی'' کا کوئی انٹرویو ہے، پلیز وہ ضرور شائع کریں۔ میں انتظار میں ہوں۔ نمرہ احمد کا انٹرویو لیں اور عمرہ احمد اور سمیرا حمید، سائرہ رضا، فرزانہ کرل کا بھی۔ فرزانہ کھرل آپی آپ تو بہت ہی کمال ہیں۔

☆ پیاری ثانیہ! آپ کا خط تاخیر سے موصول ہونے کے باوجود ہم نے شامل کرلیا ہے۔ آئندہ خط ذرا جلدی بھجوائیں۔ آسیہ رزاقی کا انٹرویو ضرور شامل کریں گے، ان شاءاللہ۔

فوزیہ سرور..... لاہور

خواتین ڈائجسٹ میرے سامنے کھلا ہے۔ آہ خالدہ جیلانی! دل دکھ سے لبریز ہو گیا۔ جب سے ڈائجسٹ کا مطالعہ شروع کیا تب سے اس نام سے آشنا ہیں۔ خاص طور پر پکوان، خالدہ جیلانی کی کھانے پکانے کی تراکیب آزمائیں اور واہ واہ سمیٹی۔ میں تہ دل سے ان کی مغفرت کے لیے دعا گو ہوں۔ آپ لوگوں کے نزدیک فوزیہ سرور غیر اہم ہو گی لیکن میرے لیے آپ سب بہت اہم ہیں۔

ایک دفعہ واصفہ سہیل سے بات ہوئی، انہوں نے مژدہ سنایا کہ آپ کی بھیجی گئی کہانی قابل اشاعت ہے۔ ایک کہانی تین سال پہلے رمضان المبارک کے مہینے کی مطابقت سے لکھ کر بھیجی لیکن رمضان گزر گئے۔ کہانی نہ لگی۔ یہی کہا گیا رمضان میں لگے گی۔ اب ہم پچھلے آٹھ ماہ سے شادی شدہ کے منصب پر فائز ہو چکے ہیں۔ شادی کے بعد اور شادی سے پہلے، زندگی میں اتنا تغیر، پہلے فراغت وافر تھی۔ اب مصروفیات ہیں۔ بہر حال اللہ گھر آباد رکھے۔ شوہر کو اللہ خوش رکھے۔ انہوں نے میرے شوق کی حوصلہ افزائی کی، لکھنے سے منع نہیں کیا۔ ہر ماہ ڈائجسٹ وقت پر لا کر دیتے ہیں۔ اب ان شاءاللہ مزید کہانیاں ارسال کروں گی۔

''رقص شرر'' فائزہ شیرین کا بہت اچھا ناول تھا۔ بشریٰ یاسین ملک، بہن کو سب کے سامنے بد سلیقہ کہہ دیا۔ کیا گزرے گی، اس بے چاری کے دل پر۔ سر پر جب پڑتی ہے نا سب سلیقہ آ جاتا ہے۔ ''کالی کوٹھڑی'' افسانہ پڑھا۔ سات بیٹوں نے باپ کو کالی کوٹھڑی میں ڈال دیا۔ بس اللہ سے ڈرنا چاہیے۔ ''نفسیاتی ازدواجی الجھنیں'' بھی پڑھیں اور ہمیشہ پڑھتی ہوں۔ اللہ سب کو خوش رکھے اور ہدایت سے نوازے۔ ''کرن کرن روشنی'' تو میں ضرور پڑھتی ہوں۔ دل ایمان سے بھر جاتا ہے۔

☆ فوزیہ بہن! شادی مبارک۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوشیوں سے نوازے، آمین۔

معذرت خواہ ہیں کہ آپ کی کہانیاں اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود شائع نہیں ہوئیں جبکہ وہ قابل اشاعت تھیں۔ تھوڑا سا ہمارے ساتھ مسئلہ ہوا ہے۔ دو سال پہلے جب ثاقب نثار نے اچانک حکم صادر کر دیا کہ جس بلڈنگ میں ہمارا آفس ہے، اسے تین دن میں خالی کر دیا جائے۔ اب سارے مسودے ہم نے جلدی جلدی کارٹنوں میں بھرے۔ بعد میں یہ حکم واپس لے لیا گیا۔ کچھ کارٹن اس گڑبڑ میں ادھر ادھر ہو گئے۔

اگر آپ کے پاس کہانیوں کی نقل ہے تو ہمیں ارسال کردیں یا کوئی نئی کہانی لکھ کر بھجوا دیں۔

فوزیہ سرور کوئی ہمارے لیے غیر اہم نہیں ہے یہ سوچیں بھی نہیں ہمارے لیے ہماری قارئین اور مصنفین دونوں ہی بہت اہمیت رکھتی ہیں۔

مریم خان...... بھلروان سرگودھا

بڑی مشکل سے ٹائم نکالا ہے، بچوں کے پیپرز ہو رہے ہیں، چھوٹے بچے ہیں میرے۔ پہلے ٹیوشن جاتے تھے مگر اس ماہ میں نے پیپرز کی تیاری کے لیے خود پڑھایا ہے۔ اب چلتے ہیں رسالے کی طرف۔ ''کہنی سنی'' میں خالدہ جیلانی کے بارے میں پتا چلا، اللہ پاک مرحومہ کی مغفرت فرمائے آمین۔

''کرن کرن روشنی'' سے اپنے آپ کو کچھ مسلمان بنانے کے لیے علم حاصل کیا۔ راحت جبیں ایک اچھا اور سوشل ناول لے کر آئیں، اس کے لیے مبارک باد۔ اس کے بعد زرقا سکندر کا افسانہ پڑھا۔ ہم لڑکیوں کو ''سنی'' سے سبق ملا۔ میں خود بھی ایسی ہی ہوں۔ آگے چھلانگ لگائی ''رقص شرر'' اتنا اچھا ناول لکھنے پر فائزہ شیرین کو مبارک باد۔ باقی رسالہ ابھی نہیں پڑھا۔ نمیرہ جاوید نے ''خاموشی کو بیاں ملے'' میں اچھا لکھا اور مجھ میں بشریٰ یاسمین بھی میری طرح لگیں کہ مجھ کو میں بھی صاف ستھرا رکھتی ہوں۔

☆ پیاری مریم! آپ نے مصروفیت کے باوجود ہمیں یاد رکھا، بہت شکریہ۔

ریحانہ چوہدری...... مدوکے (اندرون باگڑیاں)

ماڈل کا میک اپ خصوصاً لپ اسٹک پھیلی ہوئی لگ رہی تھی جس نے طبیعت کو قدرے مکدر کر دیا۔ جب کہنی سنی تک پہنچے تو خالدہ جیلانی کے بارے میں پڑھ کر دل بہت ہی پریشان ہوا، بے شک ان سے ملاقات نہیں تھی مگر آپ سب کے خراج تحسین کے لیے ادا کیے گئے الفاظ سے ان کا جو خاکہ ذہن میں بنا، یوں محسوس ہوا کہ ان کی شخصیت سے دیرینہ شناسائی رہی ہو۔

جب بھی ڈائجسٹ کھولتی ہوں، ان کا نام دیکھتی ہوں تو دل غم کی کیفیت میں ڈوب جاتا ہے۔ آج کسی بھی تحریر پر تبصرہ کرنے کو دل آمادہ نہیں ہو رہا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، آمین۔

الفاظ بغاوت پر آمادہ ہیں۔ جذبات کی تصویر بن سکتی تو انہیں مجسم آپ تک پہنچاتی۔ دل ان کی فیملی کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ مگر کچھ خبر نہ ملی۔

ج: پیاری ریحانہ! آپ ہم سے اور خالدہ سے کبھی نہیں ملیں اس کے باوجود ایسا لگ رہا ہے کہ آپ نے ہمارے دلوں کی ترجمانی کی ہو۔ ایک حساس دل ہی دوسروں کے احساسات وجذبات سمجھتا ہے۔ خالدہ شادی شدہ نہیں تھیں، اپنی بھابھی کے ساتھ رہتی تھیں۔

افسانہ تاخیر سے ملا۔ ابھی پڑھا نہیں جلد پڑھ کر بتائیں گے ویسے ابھی تک آپ کی کوئی تحریر ریجیکٹ تو نہیں ہوئی۔

عائشہ قیوم خان...... لاہور

نمرہ احمد کا ہر ناول زبردست رہا ہے۔ مجھے حالم بہت زیادہ پسند ہے۔ ویلڈن نمرہ جی۔ ''زندگی ہم تجھے گزاریں گے۔'' اسٹارٹ سے ہی زبردست ہے۔ راحت جی بہت خوب۔ ''رقص شرر'' کا اسٹارٹ اور اینڈ خوب صورت ترین تھا۔ امانت علی کا اسٹارٹ اور اینڈ بہت اچھا لگا۔ فائزہ شیرین آپ خاص ٹاپک لے کر آئیں۔ اس وقت تو میری مسجا لیس کو عبور کر چکی ہے۔ اب سمجھ آئی کہ سیڈ سونگ مجھے بھی اچھے نہ لگے۔ وجہ مجھے عجیب اکتاہٹ اور اداسی محسوس ہوتی تھی۔ جس کا مطلب ہے۔ موسیقی انسان کو سکون نہیں بے سکون دیتی ہے۔ ایک عرصے سے ایک گانے سے زیادہ نہیں سنتی۔ عجیب گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔ اس مکمل ناول کی جتنی تعریف کروں کم ہے۔ بہت خوب صورت اینڈ لگا۔ جب امانت علی نانا اور قاری عبدالوہاب ساتھ تھے اور حبیب نے تلاوت کی۔ بہت زبردست رہا۔ نعیمہ ناز کا ''ایک تھی ماں'' بھی اچھا لگا۔ ناولٹ بھی اچھا تھا۔ عائشہ نصیر نے بہت زبردست لکھا۔ اشنا کی سمجھ داری بہت اچھی لگی۔ اور تمریز کی دل کی دعا اللہ نے قبول کی۔

اس بار کے خواتین کی ہر کہانی بہت زبردست اور اعلا تھی۔ ناول، مکمل ناول، ناولٹ، افسانے بھی سب بہت اچھے تھے۔

پیاری عائشہ! جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے، اس سے پہلے ہمیں آپ کا کوئی خط موصول نہیں ہوا۔ ہم آپ کو خواتین کی محفل میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

سیدہ بخاری اینڈ بخاری سسٹرز...... کبیر والا

کبھی کھائی ہے توے سے فوری اتری ہوئی پکی پکی گرم گرم روٹی؟ کچھ ایسے ہی آج کل تینوں شماروں کی

کہانیاں پڑھتی ہوں۔ ایک دو دن کے لیے گھر جاتی ہوں جلدی جلدی بس یہی کوشش ہوتی ہے کہ کسی طرح قسطیں پڑھ لوں۔ عفت سحر کی کہانی مجھے بہت پسند ہے۔ سچ طور پر جو کہانی ٹف ٹائم دیتی ہے، وہ ہے حالم۔ یہی بات ہے دماغ کی دہی بن جاتی ہے یہ کہانی پڑھتے ہوئے۔ لیکن پڑھتی بھی ضرور ہوں پر ''نچیاں'' (اندر ہی اندر غصہ) بھی بڑی پڑھتی ہیں۔ سال کی بہترین کہانی ''رقص شرر'' قلم کا حق ادا کر دیا ہے۔

ج: پیاری سیدہ بہت اچھا لگا آپ کا خط پڑھ کر۔

آپ کی تحریر کی روانی بے مثال ہے۔

خواتین سے آپ کی محبت اور پسندیدگی ہماری محنتوں کا حاصل ہے۔ بہت شکریہ۔

خدیجہ اکرم ...... کراچی

خالدہ جیلانی اور ماریہ تحریر کی والدہ کا سن کر بہت افسوس ہوا، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ کرن کرن روشنی پڑھا کافی معلومات ملتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب سے ملاقات بھی اچھی رہی۔ ہمارے نام تو بہت ہی شوق سے پڑھتی ہوں، سب بہنوں سے ملاقات ہو جاتی ہے جب سے رسالہ لگوایا ہے، بہت آسانی ہو گئی ہے ہم تیسرے فلور پر رہتے ہیں، وہ صاحب آ کر کال کرتے ہیں میں تھیلا پھینک کر رسالہ لے لیتی ہوں، موبائل بھی ہے وائی فائی بھی ہے لیکن جو سواد رسالوں میں ہے نا۔ وہ کہیں اور کہیں ہے، یہ رسالے تو میری جند جان ہیں (ہاہاہا)۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ ان کے بغیر میں کچھ نہیں۔ یہ میرے دوست ہیں، ساتھی۔ ہیں ساری دوپہر میری ان کے ساتھ گزرتی ہے۔

''زندگی ہم تجھے گزاریں گے'' بہت زبردست جا رہا ہے۔ ''چاندنی چوک کی نمی'' بہت اچھا سبق دیا کہ اس کی ماں بہن جیسی تھی، وہ ویسی نہ نکلی۔ سسرالی تعریف کریں بڑی بات ہے۔ ''ایک تھی مالو'' کا اینڈ بھی بہت اچھا رہا۔ دکھاوے نے ہی تو دنیا کی مت ماردی ہے۔ زندگی کے نئے راستے بھی اچھا رہا۔ آفرین نے کتنے رشتے بچالیے۔ ''تو ہے وہ خواب'' بہت زبردست۔ بہت اچھا سبق ملا۔ رقص شرر کا اینڈ بہت اچھا رہا آخر میں گانے بجانے کے بجائے قرآن ہی کی جیت ہوئی۔ خاموشی کو بیان ملے میں، میں بھی حصہ لے سکتی ہوں کیا۔

عدنان بھائی والا سلسلہ اور بیوٹی بکس بہت اچھے ہیں جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

ج: پیاری خدیجہ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ شاعری کے لیے ہم نے صرف دو صفحات مختص کیے ہیں۔ ہماری بہت سی قارئین شاعری کی دلدادہ ہیں۔ اس لیے یہ دو صفحات ان کے لیے بھیجیں۔ آپ ''خاموشی کو بیاں ملے'' میں ہی نہیں، ہر سلسلے میں حصہ لے سکتی ہیں۔

عظمیٰ مجید ...... سیٹھی ٹاؤن پشاور سے

میں جو اتنے دن سے انتظار کر رہی تھی تو اس واسطے کہ رسالہ ملنے پر چار پانچ بار نظر دوڑا دوڑا کے خود کو تھکا دوں اور پھر بھی اپنا خط نا ہی افسانہ......؟ یعنی کہ محنت، انتظار اور امید تینوں لاحاصل ٹھہرے اور انتظار عبث...... ناانصافی کی زیادتی اور اتنے سنگین ظلم کی میں متوقع نہیں تھی۔

کسی بہن کو پڑھا کہ افسانہ لکھا اور اگلے ماہ شائع بھی ہو گیا واہ بھئی ہم تو چھ ماہ سے انتظار میں ہیں، لگتا ہے میری تحاریر پیدل مارچ کر کے آپ کے دفتر کی سمت بڑھ رہے ہیں۔ پشاور والوں کو ان کے فاصلے کی وجہ سے پہلی ترجیح پر رکھا کریں۔

شائع نہیں کرنے تو خط لکھنے، افسانے بھجوانے، تبصرے کرنے کا بھلا فائدہ کیا؟

اس لیے بالکل تبصرہ نہیں کروں گی کہ فروری کا شمارہ کتنا زبردست تھا۔

خالدہ جیلانی کی روح کے لیے دعائیں۔ عباس اشرف کا پیارا انٹرویو ان کے بھائی عمران عباس بھی اسی طرح عاجز مزاج ہیں۔ کوشی بہنا! میں نے سیاست پر اسٹوری لکھی تو ہے لیکن بھیجوں گی نہیں ابھی، جب تک پہلی تین کی خیر خبر نہ وصول ہو جائے۔

ج: پیاری عظمیٰ! ہمیں افسوس ہے آپ کو انتظار کی اذیت سے گزرنا پڑا۔ فی الحال آپ مطالعہ پر توجہ دیں۔ کہانیوں کے لیے معذرت۔ پشاور والوں کے لیے ہمارے دل میں بہت عزت ہے اور بہت ساری محبت بھی۔ ہمیں یقین ہے کہ ایک دن آپ بہت اچھے افسانے لکھیں گی اور وہ شائع بھی ہوں گے۔

انشراح ایمان ...... جلبین

سرورق پر نگاہ پڑتے ہی ارے یہ کیا روبی بٹ کے نچلے ہونٹ کی ساری لپ اسٹک پھیلی ہوئی تھی۔

اللہ پاک خالدہ آنی کو جنت الفردوس میں اعلا مقام دے (آمین) کرنگ ریز میرے غائب تھا۔ ہر دوسرے ماہ غائب ہوتا ہے۔ ”حالم“ ناول بہت اچھا تو نہیں لیکن پھر بھی اچھا ہے۔ ”زندگی ہم تجھے گزاریں گے“ راحت آپی کو دوسری بار پڑھ رہے ہیں ٹھیک ہو راحت آپی۔ اس ناول کی اسٹوری بہت اچھی ہے۔ چلیں اب بات ہو جائے مکمل ناول کی ”رقص شرر“ فائزہ آپی کو مبارک باد اتنا اچھا ناول لکھنے کے لیے۔ ”ایک تھی مانو“ کہانی کے شروع میں تو ہم نے بھی مانو کی شیخیاں انجوائے کیں۔ بچوں کو بگاڑنے میں تھوڑا نہیں بلکہ بہت زیادہ ہاتھ بڑوں کا ہوتا ہے۔ ناولٹ بس ایک ”تو ہے وہ خواب“ فردوس کے خواتین میں یہ بیسٹ اسٹوری تھی اشنا نام یونیک۔ چاندنی چوک کی تھی، زندگی تم سے ہے، روشنی کا سفر، کالی گھٹڑی افسانے سارے ہی لاجواب تھے۔ ہمارے نام میں سب شہزادیوں کے تبصرے اچھے ہوتے ہیں۔ ارے یہ کیا کچن میں ہماری کیوٹ سی بشریٰ براجمان ہیں۔ آپ کی شرکت بالکل ایسے ہی جیسے گرمیوں میں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا۔

ج: پیاری انشراح ...... بہت مزا آیا آپ کا خط پڑھ کر۔ آپ بھی ڈاکٹر فریال سے کم نہیں ہیں۔ ماشاء اللہ ہنستی کھلکھلاتی رہتی ہیں۔ آدھا خط ہاہاہا پر مشتمل ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ اسی طرح ہنستا کھلکھلاتا رکھے۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کا جان کر خوشی ہوئی۔

فرزانہ جبیں ...... کراچی

میں اگرچہ آپ کے لیے اجنبی ہوں لیکن آپ میرے لیے اتنی ہی شناسا ہیں جتنا کہ میرا بچپن۔ آپ کو یہ جان کر ”حیرت آمیز خوشی ہوگی کہ میں 1982 سے اس ماہنامے کی مستقل قاری ہوں اس طویل عرصے میں کوئی بھی پرچا نہیں جو میں نے نہیں پڑھا ہو۔ ”خوشی کا موسم رہا یا دکھوں کی ”رت“ اس نے ایک دیرینہ دوست اور ہمدرد غمگسار کا کردار ادا کیا۔ میں اس کے کرداروں کے ساتھ ہنسی اور روئی ہوں۔ الحمدللہ زندگی کی پچپن بہاریں دیکھ چکی ہوں۔ پیشے کے اعتبار سے معلمہ ہوں۔ ماشاء اللہ ایک بچی اور دو بیٹوں کی والدہ محترمہ ہوں۔

کبھی ہمارا نام بھی مختلف سلسلوں کی زینت بنا کرتا تھا۔ کیا زمانہ تھا؟ ”اب تو دیوانے کا خواب“ ہو گیا ہے۔ سچ پوچھیے تو پائی پائی جوڑ کر ڈائجسٹ خریدتے۔ ڈائجسٹ ہاتھ میں کیا آتا گویا ہفت اقلیم کی دولت مل آجاتی۔ ”سونے پر سہاگہ“ جب اپنے نام پر نظر پڑتی پھر تو گویا ہم آسمان سر پر اٹھا لیتے، باچھیں چر جاتیں، پاؤں زمین پر نہ ٹکتے، ہواؤں میں اڑتے، شیخیاں بگھارتے، دوستوں کی طرف یوں دیکھتے جیسے کہہ رہے ہوں ”ہم سا ہو تو سامنے آئے۔“

وہ سفر جو ہم نے ”فریال“ سے شروع کیا تھا وہ ”حالم“ تک آ پہنچا۔ بشریٰ رحمٰن، رضیہ جمیل، رخسانہ بٹ، سیما مناف، ساجدہ حبیب، نسیم سحر، افسانہ نگار رفعت سجاد، عمیرہ سید، عمیرا احمد، سائرہ رضا، فرحت اشتیاق اور بہت سی مصنفین جن کی تحریریں روشن چراغ کی مانند ہیں۔

عمیرہ احمد کی تحریریں میں نے ایسے پڑھی ہیں گویا سانس لی تو ماحول کا فسوں ٹوٹ جائے گا۔ شکریہ نمرہ تم نے ہماری بیٹیوں کی صحیح سمت میں رہنمائی کی۔

نیرہ ناز کی بنگال سے متعلق تحریریں پڑھ کر بچپن شدت سے یاد آتا ہے۔

خواتین ڈائجسٹ کی تعریف کی سند میرا چالیس سالہ ساتھ ہے۔ یعنی ایک پوری زندگی۔ جی ہاں اتنا ساتھ کون نبھاتا ہے؟ کرن کرن روشنی بہترین سلسلہ ہے۔ ہم قرآن پاک تو پڑھ لیتے ہیں مگر احادیث کا مطالعہ نہیں کرتے۔ اس سے ہمیں بہت سے مسائل کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ ”خامشی کو بیان ملے“ میں فہمیدہ جاوید کو پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ ان کی فرمائش پسند آئی۔ ایسی تحریریں بھی پرچے کی زینت بنی چاہئیں۔ جن میں بڑے بڑے دروازے والی حویلیاں ان میں بسنے والی سادگی، غرارہ اور نولکھا ہار پہننے والی خواتین۔ رشتوں کی مٹھاس اور بزرگوں کا سائبان ہو۔ حالم اگرچہ حقیقت سے دور ہے مگر نمرہ کا خوب صورت انداز اپنے سحر سے نکلنے نہیں دیتا۔

”زندگی ہم تجھے گزاریں گے“ شروعات اچھی ہے۔ عائشہ نصیر احمد کا ناولٹ بازی لے گیا عزت نفس سے

بڑھ کر کچھ نہیں۔ سلوی سیف کا روشنی کا سفر بہترین۔ چادر
کے مطابق پاؤں پھیلانے میں ہی عافیت ہے۔ "رقص
شرر" میں پیغام تو اچھا تھا مگر تحریر نے متاثر نہیں کیا۔

ج: پیاری فرزانہ! سب سے پہلے تو آپ کا تہہ دل
سے شکریہ۔ آپ اندازہ نہیں کرسکتیں کہ آپ کا خط پڑھ کر
ہمیں کتنی خوشی ہوئی ہے۔ ہمارا اعتماد کتنا بڑھا ہے۔ بالکل
صحیح کہا ہے آپ نے کہ اتنا ساتھ کون نبھاتا ہے۔ یہ آپ
کی محبت اور قدر دانی ہے اور یقین کریں کہ ہم دل سے اس
کی قدر کرتے ہیں۔

آپ کا خط پڑھ کر اس لیے بھی خوشی ہوئی کہ آپ
نے بہت صاف ستھری لکھائی میں بہت روانی سے لکھا
ہے۔ آپ خواتین کے دوسرے سلسلوں میں بھی شرکت
کریں۔ ہمیں بہت اچھا لگے گا۔ آپ جیسی قارئین ہی
ہمارا سرمایہ، ہماری محنتوں کا حاصل ہیں۔

صفا اکبر...... خیابان علی بہاول پور

میں ماہنامہ خواتین اور شعاع کی بلاناغہ تقریباً بارہ
سال سے خاموش قاری ہوں۔ ٹائٹل گرل خوب صورت
لگی۔ فروری کا سرورق ہمیشہ کی طرح بہترین تھا۔ کرن
کرن روشنی میں احادیث سبق آموز تھیں۔ خطوط پڑھنے
کے بعد دل میں لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ "زندگی ہم تجھے
گزاریں گے" اچھا لگا۔ راحت جبیں آتے ہی چھا گئیں۔
"چاندنی چوک کی ٹمی" سبق آموز تھا۔ "ایک تھی مانو" بہت
خوب لگا۔ باقی تمام افسانے اور ناولز بھی لاجواب تھے۔
"رقص شرر" میں فائزہ شیرین نے تو کمال کردیا۔ بیک
ٹریکنگ کے بارے میں بالکل بھی نہ پتا تھا۔ تب ہی اسلام
میں موسیقی کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

☆ پیاری صفا! آپ نے خط لکھا، بہت
خوشی۔ آپ نے خط لکھنے میں بارہ برس لگا دیے۔ جبکہ
آپ بہت اچھا خط لکھتی ہیں۔ اب ہمیں خط لکھتی رہیے گا
اور دوسرے سلسلوں میں بھی شرکت کیجیے گا۔ آپ کی تمام
فرمائشیں نوٹ کرلی ہیں۔

صفیہ مہر...... کوٹلی مراد

ہمارے پیارے خواتین کی نوک پلک سنبھالنے والی
خالدہ جیلانی راہی ملک عدم ہوئیں یہ جان کر گہرا دکھ ہوا۔
ان کی کوئی پکچر بھی ساتھ لگا دیتیں۔ پھر اپنے پسندیدہ ناول
"رقص شرر" پر جا پہنچے۔ ایسی اصلاحی اسٹوری کے ہم پھر
سے منتظر رہیں گے فائزہ شیرین۔ راحت جبیں کی کہانی
"زندگی ہم تجھے گزاریں گے" پہلی قسط سے انٹرسٹنگ لگی
ہے یہ واحد کہانی ہے جس میں موبائل، گاڑی، بنگلہ، لیپ
ٹاپ نہ ہونے کے باوجود دل میں اترتی جارہی ہے۔ مراد
کی خودداری اور ارادوں کا استحکام زرمین کی معصومیت اور
سادگی دونوں کا ملاپ انہیں آسمان کی بلندیوں کو چھونے
میں مدد دے گا۔ "عشق تم سے ہے" نوشین فیاض بڑا تیز قلم
ہے آپ کا۔ جلد جلد اور پیاری کہانیاں دے رہا ہے۔

ناولٹ "تو ہے وہ خواب" عائشہ نصیر احمد اشا نے
حلوائی بھائی جان کو سلیکٹ کرکے لڑکیوں کی جماعت کا
سر فخر سے بلند کردیا۔ افشاں اب ساری زندگی سموسے اور
مٹھائیاں کھاتی رہنا افسانے "چاندنی چوک کی ٹمی" زرقار
سکندر سے کہنا ہے کہ اتنی پیاری ٹمی آپ کو کہاں ملی۔

عندلیب زہرا کا افسانہ "زندگی تم سے ہے" شکر ہے کہ
آفرین کے ساتھ اچھا ہوگیا۔ سلوی سیف اللہ بٹ کا
افسانہ "روشنی کا سفر" شکر کہ نازیہ کو بروقت عقل آگئی۔
افسانہ "کالی کوٹھڑی" کی تخلیق کار کیا ہماری قاری بہن
اقرا سرور ہے کیا۔ تو پھر وہ اقرا بنت سرور کیوں لکھا؟ اکثر
خواتین پڑھنے والی بہنیں ہاؤس وائف ہوتی ہیں گھر میں
بیٹھ کر موٹاپے کا شکار ہوجاتی ہیں تو پلیز اس سے بچنے کے
طریقے بتاتی رہا کریں۔

"آپ کا باورچی خانہ" میں مجھے آپ نے جگہ دی
(شکریہ) بہن بشریٰ یامین بھی باورچی خانہ میں جگنو کی
کام کرتی اچھی لگ رہی تھیں۔ "نامے میرے نام" میرا
پسندیدہ سلسلہ پیاری کوثی آپ کی اماں کو گرمی تو لگتی ہی تھی
انگیٹھی ساتھ دو لحاف پھر ایسی کی تیسی (ہاہا)

ج: پیاری صفیہ! بہت اچھا تبصرہ کیا ہے آپ۔
پڑھ کر مزا آیا، بہت شکریہ۔

عفیفہ اقبال...... حیدرآباد

پہلا خط بہت ہی غیر روایتی سا تھا۔ اس بات کا
احساس اپنے شائع ہوئے خط کو پڑھ کر ہوا۔ اور پھر شرم
امی جان (عفت اقبال) نے دلائی۔
خط لکھنے کا اپنا ہی مزا ہے، اس بات کا احساس ہوا کا

جواب مل جانے پر ہوتا ہے۔ آپ نے عہد الست کا ذکر کیا کیا ہی خوب ناول تھا۔ ”عہد الست اور زمین کے آنسو“ بہترین ناولوں میں سے ہیں۔ تنزیلہ ریاض کا ناول ”نور القلوب“ بھی زیر مطالعہ ہے۔ وہ ہر بار کی طرح اس بار بھی دلچسپ موضوع لے کر آئی ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ خواتین ڈائجسٹ اور شعاع نے ہمیں کیا دیا؟ ہماری امی جان کو زیادہ بولنے کی عادت نہیں ہے اور نہ ہی وہ کسی بات کو تفصیل سے سمجھانے کی قائل ہیں (ہمیں ان کی یہ عادت پسند بھی ہے) شعور کی سیڑھیاں چڑھنے لگے تو ایک ہاتھ جہاں والدہ نے تھاما تو وہیں دوسرا ہاتھ خواتین ڈائجسٹ نے تھام لیا۔ زندگی کے گر افسانے اور ناول سمجھانے لگے۔ ”نفسیاتی الجھنوں“ نے دوسروں کو سمجھنا اور اللہ کا شکر ادا کرنا سکھایا۔ کئی بار تو اس کو پڑھ کر اپنے مسائل کا حل بھی ملا۔ یوں سمجھیں، ہماری ماں کے بعد ہماری تربیت خواتین ڈائجسٹ نے کی۔

اس کا سہرا بھی آپ کے سر بندھتا ہے اور آپ پر جچتا بھی ہے۔

بہت سے لوگ ڈائجسٹ پڑھنے کو معیوب گردانتے ہیں اور میں اس بات پر حیران ہوتی ہوں۔ کیونکہ یہ ڈائجسٹ زندگی کے ادب و آداب اور شعور سکھاتا ہے۔ رشتوں کو برتنا سکھاتا ہے اور رشتوں کی پہچان بھی۔

ج: پیاری حنیفہ! آپ خواہ مخواہ شرمندہ ہو گئیں۔ آپ کا پچھلا خط بھی بہت اچھا تھا اور یہ خط بھی بہت خوب ہے۔ بس ایک کمی محسوس ہوئی کہ آپ نے چونکہ پرچہ پڑھے بغیر خط لکھا ہے اس لیے اس کی کہانیوں کے بارے میں آپ کی رائے نہ جان سکے۔ آئندہ خط لکھیں تو خواتین کی تحریروں پر بھی تبصرہ کریں۔ اپنی امی کو ہمارا سلام کہہ دیں۔

سلمیٰ مسرت......راولپنڈی

دسمبر کی بے حد مصروفیت کے باوجود میں نے بہت دل سے سال نو کے سروے میں شرکت کی تھی۔ لیکن آپ نے سب کے سروے شائع کیے اور مجھے نکال دیا۔ قارئین بہنوں سے بھی شکوہ ہے پورا سال میں نے باقاعدگی سے شرکت کی کسی نے ذکر تک نہ کیا۔ ہماری 35 سالہ رفاقت کا کچھ تو صلہ دیں۔ کبھی کبھار جگہ دے دیا کریں ویسے بھی بونس والی زندگی شروع ہو گئی ہے پتا نہیں کب زندگی کی شام ہو جائے۔ زندگی کے 50 سال گزر گئے بہت کچھ دیکھا سیکھا، لکھنے کا بے تحاشا شوق تھا لیکن زندگی کے امتحان اور قسم کے تھے، بہر حال زندگی بہت خوب صورت گزری اور گزر رہی ہے جن لوگوں سے ہم نے حوصلہ سیکھا ان کے لیے ڈھیر ساری دعائیں (خواتین کی اور شعاع بکس)۔ خواتین اور شعاع میں شامل رائٹرز کے مختصر افسانے بہت زبردست ہیں۔ مجھے سکون محسوس ہوتا ہے کہ جو بات میں لکھنا چاہتی ہوں، کہنا چاہتی ہوں وہ ذمہ داری حمیرا شیخ، زینب نور اور دیگر خوش اسلوبی سے ادا کر رہی ہیں راحت جبین کا پچھلا ناول بھی شاندار تھا اور یہ ناول بھی زبردست ہے۔ ”رقص شرر“ فائزہ ثمرین شاباش جزاک اللہ الخیر۔ موسیقی شیطان کی آواز اور اس کا سب سے بڑا ہتھکنڈہ، میں نے خود اس سے بہت مشکل سے نجات حاصل کی۔ قرآن کی تفسیر نے یہ کمال کیا۔ اس موضوع پر قلم اٹھا کر آپ نے کمال کر دیا۔ دل خوش کر دیا۔ جنوری میں بے حد خوب صورت پوتی سارہ اور پوتے محمد زید کا اضافہ ہوا ہے اللہ ان کو نیک اور صالح بنائے آمین۔

☆ پیاری سلمیٰ! سالگرہ مبارک۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت مند اور خوش و خرم رکھے، آمین۔ سب سے پہلے معذرت کہ آپ سروے میں شامل نہ ہو سکیں۔ پیاری بہن! آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ ہمیں کتنی بڑی تعداد میں خطوط اور سروے کے جواب موصول ہوتے ہیں۔ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ہماری زیادہ سے زیادہ قارئین شامل ہوں۔ آپ کا سروے شامل نہ ہو سکا۔ اس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔ آئندہ سروے میں ہم آپ کا خاص طور پر خیال رکھیں گے۔ سارہ اور محمد زید کے لیے دعائیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں دنیا کی ہر نعمت سے سرفراز کرے۔ آمین۔

❋

سرورق کی شخصیت

ماڈل ...... کرنین
میک اپ ...... روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافر ...... موسیٰ رضا

ہیں۔ حانیہ، آئمہ، اور دوسرے لوگوں کے لباس اور انداز ذرا بھی پی ایس ایل کی تقریب سے میچ نہیں کرتے۔ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔"

منافقت

ثروت گیلانی نے بھی بالآخر وہی کیا جو اکثر مشہور شخصیات کرتی ہیں۔ اپنے ایک حالیہ انٹرویو میں انہوں نے فیمنزم کی تعریف کی دیں انہوں نے کہا کہ "وہ فیمنسٹ نہیں ہیں۔" (کیا یہ دہرا معیار نہیں ہے؟) کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ثروت گیلانی کو اس کی سوجھ بوجھ ہی نہیں۔

ثروت گیلانی کا کہنا ہے کہ "میں یہ نہیں کہوں گی کہ ہر جگہ عورت ہی عورت ہو۔ گفتگو صرف خواتین تک محدود نہیں رہنی چاہیے۔"

خبریں ویریں

وامدہ سہیل

ثقافت

پی ایس ایل کے گانوں کو کسی کی نظر لگ گئی ہے۔ پی ایس ایل فائیو کی تقریب اور گانے کا غم ابھی کم نہ ہوا تھا (کیوں کہ بہت مذاق بنا تھا اس تقریب میں تمام عالم اور گانے کا) کہ پی ایس ایل کے چھٹے سیزن کا گانا "گروو میرا" منظر عام پر آ گیا۔ (لوگ صدمے سے بے ہوش ہونے والے ہو گئے) کرکٹ کے دیوانے حیران رہ گئے اس طرح کے نغمات، آواز، اور ڈریسنگ مطلب ہم کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں دنیا پر......؟ نصیبو لعل کا اس میں کوئی قصور نہیں ان بے چاری کو لینے والوں نے ان کا مذاق بنوا دیا۔ ایک مخصوص کلچر کو دکھا کر آپ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

سونے پر سہاگا ترکی میں افتتاحی تقریب (کیا افتتاحی تقریب واقعی ترکی میں فلمائی گئی تھی؟) میں بھی نہ جانے ہم دنیا کو کون سا پیغام دے رہے

قابل ذکر بات یہ ہے کہ پاکستان میں ہر جگہ بس عورت کا ہی معاملہ ہے۔ اب بھی خواتین کے مسائل مرکزی دھارے میں آنے والی گفتگو کا حصہ نہیں بنتے ہیں۔ ہماری سیاسی جماعتوں کی اعلا قیادت مردوں کے پاس ہے۔

ثروت گیلانی نے ایک اور نکتہ پیش کرنا چاہا تھا کہ خواتین کو مردوں کی ضرورت ہے لیکن وہ آزاد ہیں۔ پاکستان میں۔ خواتین کے حقوق کے لیے کام کرنے میں مرد حضرات کا بھی کردار ہے (اور حقوق غصب کرنے میں خواتین ہی کا کردار ہے اس کی مثال حالیہ وائرل ہوئی ایک ویڈیو ہے جس میں بہو بوڑھی ساس کی پٹائی کر رہی ہے۔ دوسری طرف کوئی ساس بہو کو جلا کر مار رہی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ عورت پہلے دوسری عورت کے حقوق تسلیم کرلے۔ تو

مردوں کے لیے آسانی رہے گی۔)

خود پسندی

اداکار یاسر حسین ارطغرل غازی کے بارے میں اکثر بات کرتے نظر آتے ہیں۔ ترک ڈراما سیریل ارطغرل غازی کے پاکستان میں نشر ہونے کے بعد یاسر حسین نے اپنے تحفظات کا اظہار کیا تھا کہ" ارطغرل غازی کو پاکستان میں نشر کرنے کے خلاف ہیں (پر کیوں؟) حد تو یہ کہ یاسر نے ترک اداکاروں کو کچرا تک کہہ دیا تھا۔ وہ ترک فنکاروں کے پاکستانی اشتہارات میں کام کرنے کے بھی مخالف ہیں (وہ تو ہم بھی ہیں، ہمارے ہاں اداکاروں کی کمی تو نہیں پھر اپنا پیسہ باہر کیوں جائے؟)

اب یاسر نے یوٹرن لیتے ہوئے کہا ہے کہ ان کو مسئلہ ارطغرل سے نہیں پی ٹی وی سے ہے (لو جی کرلو گل!) پی ٹی وی ہمارا ادارہ ہے (اسے لوٹنے کا حق بھی صرف ہمیں ہے) اسے غیر ملکی ڈرامے نشر کرنے کے بجائے اپنا نیا مواد بنانا چاہیے۔ (ہاہاہا)۔

ہم آج ماضی کے مقابلے میں ٹیکنالوجی میں بہت آگے ہیں (ماضی میں ہم نے شاندار ڈرامے بنائے ہیں) آج ہمارے شوز کے جو سیٹس ہوتے ہیں، جو کیمرے ہم استعمال کررہے ہیں ماضی میں ہم اس طرح کے سیٹس اور ٹیکنالوجی کے ساتھ کام نہیں کرتے تھے۔ پی ٹی وی پر جب شوز ہوا کرتے تھے تو صرف چار لائٹیں لگی ہوتی تھیں اور سامنے انور مقصود صاحب بیٹھے ہوتے تھے۔ (یاسر اگر آپ کے پاس اتنی عقل ہوتی تو آپ جان جاتے کہ وہ چار لائٹوں اور انور مقصود صاحب کے شوز کس اعلا معیار کے ہوتے تھے۔ آج جدید ترین ٹیکنالوجی کے باوجود اس پائے کے پروگرام آپ کر ہی نہیں سکتے اور نہ کررہے ہیں اس لیے فراغت کو مطالعے یا مشاہدے کو وسیع کرنے میں استعمال کریں۔ ورنہ یہ ٹیکنالوجی اور جدیدیت کے ساتھ پھکڑپن کا مزاج کرنے والے ارطغرل کی پروڈکشن کا معیار دیکھ کر کچھ ضرور سیکھتے) ماضی کے مقابلے میں ہمارے پاس اچھا مواد بھی ہے۔ (وہ جو آپ کی کار میں ایک فلم تھی اس کا مواد؟) سیٹس اور ٹیکنالوجی بھی ہے تو ہمیں اپنے ڈرامے خود پروڈیوس کرنے چاہئیں (تو ارطغرل سے بہتر شاہکار آپ کب لارہے ہیں؟)

نہیدہ جاوید کی ڈائری سے

تہذیب حافی بہت اچھے شاعر ہیں۔ ان کی یہ غزل قارئین کے لیے۔

تیرا چپ رہنا مرے ذہن میں کیا بیٹھ گیا
اتنی آوازیں تجھے دیں کہ گلا بیٹھ گیا

یوں نہیں ہے کہ فقط میں ہی اسے چاہتا ہوں
جو بھی اس پیڑ کی چھاؤں میں گیا بیٹھ گیا

اتنا میٹھا تھا وہ غصے بھرا لہجہ مت پوچھ
اس نے جس کو بھی جانے کا کہا بیٹھ گیا

اپنا لڑنا بھی محبت ہے تمہیں علم نہیں
چیختی تم رہیں اور میرا گلا بیٹھ گیا

اس کی مرضی وہ جسے پاس بٹھا لے اپنے
اس پہ کیا لڑنا فلاں میری جگہ بیٹھ گیا

بات دریاؤں کی سورج کی نہ تیری ہے یہاں
دو قدم جو بھی مرے ساتھ چلا بیٹھ گیا

بزم جاناں میں نشستیں نہیں ہوتیں مخصوص
جو بھی اک بار جہاں بیٹھ گیا بیٹھ گیا

زبیدہ طلب کی ڈائری سے

رئیس اختر شوق بہت اچھے پروڈیوسر اور صداکار ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ ان کی یہ غزل پڑھیے۔

آوارگان شوق سب ہی گھر کے ہو گئے
اک ہم ہی ہیں کہ کوچۂ دلبر کے ہو گئے

پہلے ملال ہوا کہ تجھ سے بچھڑنا پڑا ہمیں
پھر یوں لگا کہ شہر سمندر کے ہو گئے

کچھ ڈر سے تغیر دنیا کے ساتھ ساتھ
ایسے کھنچے کہ ایک ہی محور کے ہو گئے

اس شہر کی ہوا میں ہے ایسا بھی اک فسوں
جس جس کو چھو گئی سب ہی پتھر کے ہو گئے

سورج ڈھلا ہی تھا کہ وہ سائے بڑھے شوق
کم قامتان شہر برابر کے ہو گئے

جبین خان کی ڈائری سے

وصی شاہ کی یہ غزل مجھے بہت پسند ہے۔ آپ سب کو بھی ضرور پسند آئے گی۔

نہ دکھا پائے گا تو خواب میری آنکھوں کو
اب بھی کہتا ہوں معبود میرا چہرہ نہ بنا

بارہا تجھ سے کہا تھا مجھے اپنا نہ بنا
اب مجھے چھوڑ کے دنیا میں تماشا نہ بنا

اک یہی عمر میرے لیے کافی ہے
جیسا تو چاہتا ہے مجھ کو ویسا نہ بنا

ایک بات اور ہے کہ میں بتاؤں تجھ کو
آخرت بنتی چلی جائے گی دنیا نہ بنا

یہ خدا بن کے رعایت نہیں کرتے ہیں وصی
حسن والوں کو کبھی قبلہ و کعبہ نہ بنا

آپ کا باورچی خانہ

سیدہ بخاری

س: کھانا پکاتے وقت کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟

ج: کھانا اچھا بنے، چیزیں نہ بکھریں اور جلدی بن جائے۔

س: گھر میں اچانک مہمان آجائیں کھانے کا وقت ہو تو آپ کیا کرتی ہیں۔ کوئی آسان ترکیب؟

ج: ناں بھاؤ! ہمارے گھر جو بھی آئے بتا کر آئے اگر کبھی ایسا ہو جائے بلکہ اکثر ہو جاتا ہے تو بس ہم بہنیں ٹکر ٹکر ایک دوسرے کی شکل دیکھتے ہیں کہ اب کیا کریں۔ گاؤں میں گھر ہے ناں تو ارد گرد قریب کوئی دکان ہی نہیں ہے۔ اگر گرمیاں ہوں تو بچے کو بھیج کر باغ میں سے لیموں تڑوا لیے اور سکنجبین بنالی، سردیوں میں چائے اگر کھانے کا وقت ہو جائے تو بھائی کو فون کرتے ہیں وہ انتظام کر دیتے ہیں۔

بہر حال منگواتے پکاتے کافی ٹائم ہو جاتا ہے لہٰذا انتظار کروایا جائے۔

سہولیات ساری ہیں ہمارے گھر بجلی گیس فریج وغیرہ بس دکانیں مارکیٹ وغیرہ نہیں اور پہلے سے کچھ منگوا کر رکھ نہیں سکتے ایک دن سے زیادہ ہم بہنیں صبر ہی نہیں کر سکتیں۔ جو کچھ پڑا ہو کھالی جاتی ہیں۔ بقول میری امی کے کوئی مہمان آجائے تو "حاضر خیر" ہے آپ خود بتاؤ لڑکیوں والے گھر میں بوتل، نمکو بسکٹ، گوشت وغیرہ بھلا زیادہ دن رکھا جا سکتا ہے (ہاہاہا)

بہر حال مہمانوں کی نوعیت کے مطابق ہی کھانے کی تیاری ہوتی ہے اور سب بہنیں مل کر بناتی ہیں۔

ترکیب کوئی خاص تو نہیں ہے ہاں ایک بہت آسان ترکیب ہے آج کل کے موسم کے حساب سے بہت مزے کی چیز ہے۔ میں نے اسے گاجر کا ملک شیک کا نام دیا ہے۔ ایک کلو دودھ میں الائچی ڈال کر ابال لیں پھر اس میں تقریباً آدھا کلو گاجریں کاٹ کر ڈال دیں، کش کر لیں آپ کی مرضی، حسب ذائقہ چینی ڈالیں جب گاجریں اچھی طرح گل جائیں اور ایک حصہ دودھ خشک ہو جائے، یاد رہے بالکل خشک نہیں کرنا تو گھوٹنے سے گھوٹ لیں یا گرینڈ کر لیں۔

صبح صبح نہار منہ یا اسی وقت فریج میں ٹھنڈا کر کے استعمال کریں بہت مزا دے گا اور معدہ بھی ٹھنڈا ہوتا ہے اس سے مزا بھی صحت بھی۔ بہت آسان آدھے گھنٹے میں تیار ہونے والی ڈش ہے۔

س: کچن عورت کی سلیقہ مندی کا آئینہ دار ہوتا ہے اس کی صفائی کا کیا اہتمام کرتی ہیں۔

ج: ہمارا تو کچن ہی نہیں ہے۔ پہلے جب گیس نہیں تھی تو باہر صحن میں مٹی کا چولہا تھا۔ کمرے میں مسالوں والے ڈبے رکھے ہوئے تھے اب گیس ہے تو ہم نے "چھپر" کے نیچے چولہے رکھے ہوئے ہیں۔ بڑا سارا کچا "چھپر" ہے وہی ہمارا کچن بھی ہے اور گیراج بھی اسٹور بھی اور بھائی کا بیڈ روم بھی (ہاہاہا)

اسی میں میز پر رکھ کر اس پر آٹو میٹک چولہا رکھا ہے ایک چولہا نیچے، اگر کوئی بیٹھ کر کام کرنا چاہے تو گھڑونچی برتنوں کے لیے، فریج اور کچن کا تمام سامان ایک سائیڈ پر کھاد اسپرے اور بھائی کی کھیتی کا سامان (بھائی زراعت آفیسر ہیں) اور بھائی کی گاڑی اور ٹریکٹر بھی اسی میں کھڑا ہوتا ہے کر لو گل!

تو کچن کی چیزیں ساتھ کے ساتھ سمیٹی جاتی ہیں چولہے بھی تقریباً روزانہ صاف ہو جاتے ہیں چھپر کی سرسری صفائی، جھاڑو پونچھا روزانہ ہوتا ہے باقی تفصیلی صفائی کبھی کبھی تبدیلی کے ساتھ خاص کر جو بہن ہاسٹل سے کافی دنوں کے بعد آئے نئے جوش اور جذبے کے ساتھ افتتاح ہوتی ہے بقول "مدثر شاہ" کے لگدا نوے ڈی سی صاحب آئے نے (لگتا ہے

نئے ڈی سی صاحب آئے ہیں) کہتا ہے جب بھی کسی علاقے میں نیا ڈی سی آئے تو شروع شروع میں بڑی تبدیلیاں کرتا ہے اور پھر......

اور بیڈروم اس طرح کہ گھر اور ان سب چیزوں کی رکھوالی کے لیے بھائی کی چارپائی چھپر کے نیچے ڈالی جاتی ہے۔

س: صبح کا ناشتہ کیا بناتی ہیں؟

ج: کوئی خاص اہتمام نہیں ہوتا۔ وہی بچا ہوا چائے اور رات کا سالن، بھائی خشک روٹی لیتے ہیں ہم پراٹھے کبھی بھی شوق ہو تو آلو والے پراٹھے بنا لیتے ہیں۔ گرمیوں میں سالن بچ جائے تو میری امی انہیں آٹے میں گوندھ کر تندور پر روٹیاں بنا لیتی ہیں پھر مکھن سے چپڑ کر لسی کے ساتھ کھا لیتے ہیں بڑا مزا دیتی ہیں۔

س: مہینے میں کتنی دفعہ ہوٹل جاتی ہیں۔

ج: (ہم تو روز ہمادہ اور المائدہ میں کھانا کھاتے ہیں (بقول چھوٹی عائشہ کے) ایک دفعہ بھی نہیں اسی ایک سوال کے لیے تو اتنے سوالوں کے جواب لکھے ہیں اپنی ازلی سستی کے باوجود ہوٹل کا کھانا گھر آسکتا ہے ہم ہوٹل نہیں جاسکتے اگر بھی موڈ میں آکر بھائی شہر لے جائیں تو آئس کریم فالودہ وغیرہ گاڑی میں آئے گا۔ گڈی توں تھلے کٹ نہیں رکھنی (گاڑی سے نیچے پاؤں نہیں اتارنا) کہانیوں میں پڑھ پڑھ کر اتنا شوق ہے ہوٹل جانے پوری زندگی میں ایک دفعہ ہوٹل گئی وہ بھی ایسے کہ بس چار سال پہلے میری خالہ کہتی۔

"ملتان آنجیو پیزا کھویساں (ملتان آؤ تمہیں پیزا کھلاؤں گی)

ملتان نانی کے گھر جانا ہوا۔ خالہ پیزا ہٹ لے گئیں بڑا جوش و خروش تھا پتا نہیں کیسا ہوتا ہے پیزا نام سن رکھا تھا کھایا نہیں تھا بلکہ دیکھا بھی نہیں تھا اور جب پیزا آئے پتا نہیں کیا عجیب عجیب نام تھے چکن اچاری اور پتا نہیں کیا الابلا، ایک سے دوسرے لقمے میں بس ہو گئی مریم کہتی کھاؤ مجھ سے کھایا نہ جائے اوپر پتا نہیں کیا لیس سی تھی میں نے کہا یہ کیا ہے کہنے لگی

''چنز'' ہے۔ میں نے کہا وہ کیا بلا ہوتی ہے بولی وہ بھی ہوتی ہے۔ ''تم کھاؤ'' میرا جواب۔

بڑی مشکل سے انہوں نے ختم کیا۔ خالہ کہتیں ''جتی جتی میڈے سارے پیسے ضائع کرادے سی۔'' (جتنی پینڈو نے میرے سارے پیسے ضائع کرادیے ہیں)

عفت اور میں اسی خالہ کے گھر گئے کھانے کے وقت۔ خالہ نے کہا ذرا بھوک رکھ کر کھانا میں نے ڈرم اسٹکس منگوائی ہے۔ وہ بھی آپ لوگوں نے کھانی ہے۔

ہم نے رج کر کھانا کھایا اور بیٹھ گئیں۔ ہم نے کہا ہوگی کوئی کھیر یا آئس کریم ٹائپ میٹھی چیز۔

لیکن جب وہ سامنے آئی تو وہ مجھے دیکھے اور میں اسے۔

ہیں یہ تو مرغی کی بوٹیاں ہیں ابھی بھی ہم یاد کرتی۔ ہیں تو بہت ہنسی آتی ہے تو قارئین! یہ ہے ہماری ہوٹلنگ اور ہوٹل کے کھانوں کے متعلق معلومات۔

س: کھانا بناتے وقت موسم کو مدنظر رکھتی ہیں۔

ج: ہم گاؤں والے تو کھاتے پکاتے وہی موسمی سبزیاں ہیں ـــ بے موسمی تو ''شادی'' بھی ناگوار گزرتی ہے بے موسمی سبزی یا پھل نظر آجائے تو سیدھا ہینڈ ہے جی بیچنے والا اور اگر آپ کی مراد موسم سے برسات وغیرہ ہے تو جی یہ تو شہریوں کے چونچلے ہیں۔ ہمارے سوچتے سوچتے بادل لپھور نکھ جاندے نے۔

س: اچھا کھانے کے لیے کتنی محنت کی قائل ہیں۔

ج: سو فیصد محنت ہونی چاہیے۔ مجھے تو گرینڈر میں پیا مسالا بالکل اچھا نہیں لگتا نہ ہی کھانا جرے کا کونڈی ڈنڈے میں پسے مسالے کی بات ہی کچھ اور ہے محنت تو ہوتی ہے ہر کام میں۔

س: کچن کی کوئی ٹپ؟

ج: ایک ٹپ ہے چھپکلیاں بھگانے کے لیے شاید کسی کے کام آجائے۔ یہ نگہت باجی نے بتائی تھی جو کہ میری بڑی بھابھی ہیں۔

ہوا کچھ یوں کہ ہمارے کمرے میں بہت موٹی موٹی چھپکلیاں تھیں۔ بڑا پریشان کرر کھا تھا انہوں نے، ایک دن نگہت باجی نے کہا جہاں مور کے پر رکھ دو وہاں چھپکلیاں نہیں آتیں۔ میں نے اسی کے شوق سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس سے مور کا پر لیا 4,3 فٹ لمبا پر تھا۔ میں نے اس کے ساتھ اچھل اچھل کر چھپکلیوں کو بھگانا شروع کر دیا ان میں ہلچل سی مچ گئی وہ ادھر ادھر بھاگنے لگیں۔ آہا ڈر رہی ہیں میں اور جوش سے مارنے لگی۔ اور اچانک...... میری چیخیں میرے ساتھ عائشہ، طوبیٰ اور پڑھنے والی بچیوں کی چیخیں۔ ہوا یہ کہ اچانک ایک چھپکلی نے جھپٹ کر مور کا پر منہ میں دبا لیا۔ اب ایک سرا میرے ہاتھ میں تھا دوسرا چھپکلی کے منہ میں، مجھے یہ عقل نہ آئی کہ پر چھوڑ دوں۔ بس چیخیں مارے جارہی تھی۔

عائشہ، طوبیٰ اور سب کمرہ چھوڑ کر باہر بھاگ گئیں دروازے میں کھڑے ہو کر چیخنے لگیں۔

''آپی چھوڑ دو، آپی تم تو چھوڑ دو۔'' آخر میں نے پر چھوڑ دیا پر چھپکلی نے نہ چھوڑا۔ منہ میں دبوچے پورے ڈیلے پھاڑے بیٹھی تھی۔ میں نے نگہت باجی سے شکوہ کیا ''آپ تو کہہ رہی تھیں چھپکلیاں ڈر جاتی ہیں اس سے، انہوں نے تو ہمیں ڈرا دیا ہے۔'' وہ کہنے لگیں۔

''بے وقوف! میں نے یہ تو نہیں کہا تھا ان سے پنگے بازی شروع کر دو بس رکھ دیتیں تو ڈر جاتیں اب ان کا ڈر تو تم نے خود ختم کیا ہے۔''

بہرحال شاید اس ٹپ سے آپ کا کام بن جائے ہماری تو چھپکلیاں تو چھپکلیاں کوے بھی اتنے جی دار ہیں چھپر کے نیچے آکر منہ میں سے لقمہ چھین کر بھاگ جاتے ہیں۔

ویسے جہاں چھپکلیاں ہوں وہاں نسوار لگا دو تو بھی بھاگ جاتی ہیں۔

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

اسپائسی ہاٹ پیزا

ضروری اشیاء:

برائے ڈو:

میدہ	ایک کپ
انڈا (پھینٹ لیں)	ایک عدد
تیل	دو کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
دودھ	تین، چار کھانے کے چمچے
خمیر	ایک چائے کا چمچ
شکر	ایک چائے کا چمچہ

برائے فلنگ:

قیمہ (پکا ہوا)	ایک کپ
شملہ مرچیں	ایک یا دو عدد
پیاز (چوپ کر لیں)	دو عدد
ٹماٹو کیچپ	حسب پسند
اجوائن پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچ
ہرا دھنیا	حسب پسند
پیپریکا پاؤڈر	حسب ضرورت
پنیر موزریلا چیڈر	حسب ضرورت

ترکیب:

ایک پیالے میں شکر اور خمیر کو چھ کھانے کے چمچے گرم پانی میں مکس کریں اور پندرہ منٹ کے لیے کسی گرم جگہ پہ رکھ دیں۔ ایک تسلے میں میدہ ڈال کر چھانیں۔ اس کے بعد اس میں تیل، نمک، دودھ، انڈا اور خمیر کا مکسچر ڈال کر گوندھ کر ایک نرم ڈو بنالیں۔ ڈو کو تیل سے چکنے کیے ہوئے کسی صاف ستھرے برتن میں رکھ کر گیلے کپڑے سے مضبوطی سے ڈھک کر کسی گرم جگہ پر پچیس تیس منٹ کے لیے رکھ دیں۔ خیال رہے برتن بڑا ہونا چاہیے تاکہ خمیر اچھی طرح اٹھ جائے۔

خمیر اٹھے میدے کو ہلکے ہاتھ سے بیل کر اس کی روٹی بنائیں۔ اس روٹی کو ایک چکنی کی ہوئی بیکنگ ڈش میں رکھ کر کانٹے سے گودھ لیں۔ اس کے اوپر ٹماٹو کیچپ کی تہہ لگائیں اس کے بعد قیمہ ڈالیں۔ پیاز، اجوائن پاؤڈر اور شملہ مرچ کی تہہ لگائیں اور آخر میں اس کے اوپر کدوکش کیا ہوا پنیر چھڑک کر چوپ کیا ہوا ہرا دھنیا ڈالیں۔ اوون میں رکھیں اور درمیانی آنچ پر پندرہ بیس منٹ تک بیک کریں۔ جب پنیر پگھل جائے تو ٹرے کو اوون میں سے نکال لیں۔ پیزا کو ایک سرونگ پلیٹ میں نکال لیں، اور اس کے اوپر پیپریکا پاؤڈر چھڑکیں۔ اسپائسی ہاٹ پیزا تیار ہے۔ گرم گرم پیش کریں۔

لب شیریں

دودھ	ایک کلو
رنگین سویاں	آدھا کپ
کارن فلور	دو چمچے
کھویا	دو کھانے کے چمچے
جیلی	دو پیکٹ
کیلے	دو عدد
سیب	دو عدد
بادام	آٹھ عدد

دودھ چولہے پر ابلنے کے لیے رکھ دیں۔ جیلی کو الگ پکا کر جمنے کے بعد چوکور یا حسب پسند کاٹ لیں۔ دودھ گاڑھا ہو جائے تو سویاں ڈال دیں۔ سویاں نرم ہو جائیں تو کارن فلور اور چینی (حسب پسند) ڈال دیں۔ چمچہ مسلسل چلاتی رہیں۔ کھویا ڈال کر چند منٹ پکائیں اور چولہے سے اتار کر کسی ڈش میں نکال لیں ٹھنڈا ہونے پر جیلی اور کٹے ہوئے پھل اس پر پھیلا دیں۔ بادام باریک کتر کے چھڑک دیں اور فریج میں رکھ دیں۔ ٹھنڈا ہو جائے تو پیش کریں۔ مزے دار لب شیریں تیار ہے۔

ش۔گ

میں آپ کو اس سے پہلے دو خطوط لکھ چکی ہوں۔ تب میری شادی نہیں ہوئی تھی۔ اپنے پہلے خط میں، میں نے شادی کے بعد کی مشکلات اور کچھ خدشات کا اظہار کیا تھا۔ دراصل مجھے خود کلامی کی عادت تھی۔ اب میری شادی کو ایک سال ہو چکا ہے۔ میں ایک بچی کی ماں بھی بن چکی ہوں (یہ اور بات ہے کہ میری بچی میرے پیٹ میں ہی فوت ہو گئی تھی) وہ پورے نو ماہ کی تھی۔ اچانک آل پھٹنے کی وجہ سے وہ مجھ سے جدا ہو گئی۔

آپ نے بالکل ٹھیک کہا تھا کہ شادی کے بعد چھوٹے موٹے نفسیاتی مسئلے خود ہی حل ہو جاتے ہیں۔ خود کلامی کی عادت ختم ہو گئی مگر جن مسائل نے جنم لیا ہے، وہ بہت خطرناک ہیں۔ میرا صرف ایک دیور ہے جو شادی شدہ ہے۔ دیورانی کے علاوہ دو کنواری نندیں گھر میں موجود ہیں۔

میرے سسر کو اللہ پاک جنت نصیب فرمائے، آمین۔ انہوں نے نجانے کیوں اپنے گھر میں اپنے بڑے بیٹے (یعنی میرے جیٹھ) کی عمر کے لڑکے کو اپنا بیٹا بنا کر گھر میں رکھ لیا تھا۔ اس وقت اس کی عمر نو سال تھی۔ اب وہ لڑکا چالیس سال کا ہو چکا ہے۔ میرے ساس سسر اس دنیا میں نہیں ہیں۔ میرے جیٹھ کا دوست خالد اب بھی گھر میں موجود ہے۔ خالد کے مطابق مرحومہ ساس جاتے جاتے یہ گھر اور اپنے بیٹوں کی ذمہ داری اس پر ڈال کر گئی ہیں۔ بغیر کسی شرعی رشتے کے وہ اور میری ایک نند اکیلے کمرے میں سوتے ہیں۔ نند خالد سے ایک سال بڑی بھی ہیں۔ دونوں کے مطابق اب وہ منگیتر ہیں۔ اس ساری صورت حال پر دونوں بھائی خاموش تماشائی ہیں۔ گناہ کا یہ کھیل سالوں سے جاری ہے۔ میری نند اور خالد گھر کے سربراہ بنے ہوئے ہیں۔ بھائی بہنوں سے بہت ڈرتے ہیں۔ گھر پر مکمل کنٹرول ہے، انتہائی بے حس لوگ ہیں۔

میری جیٹھانی ہر وقت میری کوئی نہ کوئی کمزوری ڈھونڈ کر میری نندوں کے کان بھرتی ہے اور وہ میرے ساتھ بہت سختی سے پیش آتی ہیں۔ بڑی نند سرکاری ٹیچر ہے، اس کے مختلف لوگوں سے غلط تعلقات ہیں اور اس نے بڑی بھابھی کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور نند جو کہ شادی شدہ ہے، وہ انتہائی بے راہ روی کا شکار ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اقبال اور میری نند نے بہت قرضہ لے رکھا تھا جو کہ ابھی تک ختم ہونے میں نہیں آ رہا۔ ہم لوگ لاکھوں کے مقروض ہیں۔ شادی کے ایک مہینے بعد یہ لوگ میرا زیور بھی بیچ کے کھا گئے ہیں۔ یہ پورا سال جو شادی کے بعد میں نے گزارا ہے، بہت آزمائش میں گزرا ہے مگر جب میں امید سے ہوئی تو بچے کے احساس سے بہت خوش رہتی تھی، اس کے بارے میں سوچ کر ہر تکلیف بھول جاتی تھی۔ مگر جب سے بچی کا حادثہ ہوا ہے، میری برداشت بالکل جواب دے گئی ہے۔

ان لوگوں نے میرے ساتھ تب بہت برا سلوک کیا۔ مجھے کھانا کوئی نہیں دیتا تھا، خود اٹھ کے کام کرنے لگی تو ٹانکے کھل گئے اور پورا جسم کھل گیا تھا۔ تب انہوں نے مجھے میکے بھجوا دیا، جیسے ہی ٹھیک ہوئی تو بلوا لیا کہ اب آ کے گھر سنبھالو۔ کام کرو، یہ لوگ مجھ سے بہت کام کرواتے ہیں۔ اتنی تھک جاتی ہوں۔ اپنے حق میں بولنا چاہتی ہوں مگر بول نہیں پاتی۔

ایک دن کسی بات پر غصہ آیا تو جواب دے دیا نند کو۔ بات بہت بڑھ گئی۔ ان لوگوں نے شور شرابا کر دیا اور میرے شوہر کے کزن کے سامنے مجھے چپل سے مارنے لگیں۔ وہ بہت اچھے انسان ہیں۔ وہ میرے ابا کی عمر کے ہیں۔ انہوں نے علیحدہ لے جا کر مجھے سمجھایا کہ تم اپنے اندر جرأت پیدا کرو اور اپنا ویک پوائنٹ انہیں نہ دیا کرو۔ تم نے شروع دن سے ان کی ہر بات مان کر انہیں سر چڑھایا ہے۔ اب آہستہ آہستہ یہ چیز ختم کرو۔

مجھے ان کی بات میں وزن محسوس ہوتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اپنے حق کے لیے بول سکوں مگر ان لوگوں نے مجھے اتنا دبا لیا ہے کہ اتنی زیادتیوں پر بول نہیں پاتی۔ جسم کانپنے لگ جاتا ہے۔ خود اعتمادی ختم ہو گئی ہے حالانکہ میں ایم اے بی ایڈ ہوں۔ کالج میں لیکچرار رہ چکی ہوں۔ ان لوگوں نے مجھ سے جاب بھی کروائی اور ساری تنخواہ خود لے لی۔ اب بھی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں کہ کہیں اچھی جگہ میری جاب لگے اور یہ لوگ تنخواہ کھائیں مگر ان سب مسائل کے باوجود مجھ پر اللہ کا خاص کرم یہ ہے کہ میرے شوہر بہت زیادہ اچھے ہیں اور مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ میری تکلیفوں پر تڑپ جاتے ہیں مگر کیونکہ وہ سب بہن بھائیوں میں چھوٹے ہیں تو ان کی پوزیشن بہت کمزور ہے۔ وہ اسٹینڈ نہیں لے سکتے۔ اب آپ ہی مجھے کچھ مشورہ دیں کہ اپنے اندر جرأت کیسے پیدا کروں؟ میری جیٹھانی بالکل جاہل ہے مگر اس نے نندوں کو قابو کیا ہوا ہے۔ ویسے تو بہت بڑی اور تیز بنتی ہیں مگر وہ انہیں دبا لیتی ہے۔ میں بھی کوشش کرتی ہوں کہ اپنے ساتھ زیادتی نہ ہونے دوں مگر جب نہیں کر پاتی تو بہت دکھی ہو جاتی ہوں۔ بھائی! آپ بتائیں کیا مجھے پہلے کی طرح خاموش ہو کر سب سہنا چاہیے یا بولنا چاہیے۔

ج: ابھی جو حالات آپ نے لکھے ہیں، انہیں ٹھیک کرنا آپ کے لیے مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ ویسے بھی آپ کے سوا گھر کے تمام افراد ان حالات میں مطمئن اور خوش ہیں۔ آپ کی نندوں کا معاملہ بہت الجھا ہوا ہے۔ ایک غیر شخص اتنے سالوں سے گھر میں رہ رہا ہے۔ ایک نامحرم شخص کے ساتھ ایک ہی کمرے میں رہنا شرعاً اور اخلاقاً جائز نہیں ہے۔ یہ بات حیران کن ہے کہ اگر منگنی ہو چکی ہے تو پھر شادی میں کیا رکاوٹ ہے۔ شرعی لحاظ سے منگنی کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ دوسری نند کی بھی شادی نہیں کر رہے ہیں۔ یہ لوگ بے حسی کے جس مقام پر پہنچ چکے ہیں، ان پر کسی بات کا اثر ہونا مشکل نظر آتا ہے۔ آپ کا ساتھ کوئی نہیں دے گا۔ حتیٰ کہ آپ کی دیورانی بھی آپ کے ساتھ نہیں۔

آپ کے خط اور آپ کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ذہین اور ذمہ دار خاتون ہیں۔ آپ کی خود اعتمادی ان حالات کی وجہ سے دب گئی ہے۔ تھوڑی سی کوشش کریں تو آپ مضبوط اور پر اعتماد شخصیت بن سکتی ہیں۔ خاموش ہو کر سہنا بہت مشکل ہے کیونکہ وہ آپ پر جسمانی تشدد بھی کرتے ہیں۔ آواز اٹھائیں گی تو نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنے گا، ہو سکتا ہے، آپ کے شوہر بھی اس بات کو ناپسند کریں۔

سب سے پہلے تو آپ کوئی جاب تلاش کریں تاکہ کچھ وقت آپ اس گھر سے دور رہ سکیں۔ اس سے نہ صرف آپ کے ذہن پر خوش گوار اثرات ہوں گے بلکہ آپ کچھ پیسے بھی کما سکیں گی۔

آپ اپنے شوہر کو رضامند کریں کہ وہ اس گھر کو چھوڑ دیں۔ اگر ان کی اتنی حیثیت ہے کہ وہ علیحدہ گھر خرید سکیں تو گھر لے لیں ورنہ کرائے پر گھر لے لیں۔ یہی آپ کے حق میں بہتر ہے۔

بیوٹی بکس

امتہ الصبور

عطیہ رحیم...... حیدر آباد

س: آپی! میرے ساتھ بہت سارے مسائل ہیں۔ پلیز ان سب کے حل بتائیں۔ پہلا مسئلہ یہ ہے کہ میرے بال بڑھتے نہیں ہیں۔ کچھ ایسا بتائیں کہ میرے بال لمبے اور گھنے ہو جائیں۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے ہاتھ اور پاؤں باقی جسم کے مقابلے میں بہت کالے ہیں۔ آپی! میرے گال بھی بہت پچکے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے چہرہ بالکل اچھا نہیں لگتا۔ میں چاہتی ہوں میرے گال بھرے بھرے ہو جائیں اور پلکیں بھی لمبی اور گھنی ہو جائیں۔ میری آنکھیں بھی اکثر زردی رہتی ہیں۔ آپی! کچھ ایسا ٹوٹکا بھی بتائیں کہ میرے ہونٹ چمکیلے اور گلابی ہو جائیں۔ میری عمر پچیس سال ہے۔ نسوانی حسن کی بھی بے حد کمی ہے۔

ج: عطیہ! بال لمبے اور گھنے ہونے میں اچھی صحت کا بہت دخل ہے۔ اپنی صحت کا خاص خیال رکھیں۔ ناریل یا سرسوں کے تیل کی مالش کریں۔ بہتر ہوگا، مساج سے قبل تیل گرم کریں۔ سر دھونے سے قبل بالوں کی جڑوں میں لیموں کا رس لگائیں پھر کسی اچھے صابن یا شیمپو سے سر دھولیں۔ یہ سکری کے لیے بے حد مفید ہے۔ ریٹھا، آملہ اور سکاکائی کا پیسٹ بنا کر سر پر لگائیں۔ ایک گھنٹے بعد سر دھولیں۔

ہاتھ پاؤں کا رنگ صاف کرنے کے لیے لیموں کے چھلکوں سے دس منٹ تک روزانہ رات کو مساج کریں۔ خیال رہے لیموں کا مساج دن میں کر کے دھوپ میں نہ نکلیں۔ اس سے جلد جھلستی ہے۔

چار چمچے عرق گلاب، دو چمچے گلیسرین اور آدھا لیموں کا رس ملا کر محلول بنائیں۔ چہرے، گردن، ہاتھ اور پاؤں پر نرم ہاتھوں سے روزانہ مساج کریں۔

ایک چمچہ چنبیلی کے تیل میں ایک چمچہ لیموں کا رس ملا کر چہرے پر مساج کریں۔ رخسار بھرے بھرے ہو جائیں گے۔

پلکوں پر زیتون کا تیل یا روغن بادام لگائیں۔

ہونٹ گلابی کرنے کے لیے کچے دودھ میں زعفران ملا کر لگائیں۔

آنکھوں پر کھیرے کے قتلے رکھا کریں اور دن میں کئی مرتبہ ٹھنڈے پانی کے چھینٹے ماریں۔ گاجر کھائیں۔

نسوانی حسن میں اضافے کے لیے پنیر بہت مفید ہے۔ روزانہ ایک چھٹانک پنیر استعمال کریں۔

ارم طاہر...... لاہور

س: میرے نقوش اچھے ہیں، رنگ بھی صاف ہے لیکن چہرہ ــــ بہت بے رونق ہے۔ چہرے پر مہاسے بھی نکلتے ہیں جو نشان چھوڑ جاتے ہیں، جلد چکنی ہے۔

ج: ایک چمچہ لیموں کا رس، ایک چمچہ شہد، ایک گلاس میں نیم گرم پانی میں ملا کر نہار منہ پئیں۔ چند دنوں میں آپ حیرت انگیز تبدیلی محسوس کریں گی۔ جلد کی خوب صورتی کے لیے لیموں کے ان گنت فائدے ہیں۔ شہد فوری توانائی دیتا ہے اور قبض دور کرتا ہے۔

☆